اسلامی نظریۂ حیات

مؤلفہ

خورشید احمد

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
جامعہ کراچی

Marfat.com

اسلامی نظریۂ حیات

مؤلفہ
خورشید احمد
صدر نشین
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز
حکومت پاکستان
سابق نائب صدر نشین، منصوبہ بندی کمیشن۔ ناظم اعلیٰ اسلامک فاؤنڈیشن لندن
سابق استاد، شعبۂ معاشیات، کراچی یونیورسٹی

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کراچی یونیورسٹی، کراچی

Marfat.com

297
خ 85 ج
171941

جملہ حقوق محفوظ

یہ کتاب یا اس کا کوئی جز و یا اس کا ترجمہ، کسی بھی طریقۂ طباعت سے چھاپنے یا سائیکلو اسٹائل کرنے یا تجارتی اغراض سے فوٹو کاپی تیار کرنے کے لیے ناظم شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی کی تحریری اجازت لازمی ہے۔

پندرھویں اشاعت ۲۰۰۸ء

قیمت: ۱۵۰/- روپے

ISBN 969-404-001-9

طابع و ناشر:

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی

Marfat.com

حرفِ آغاز

شیخ الجامعہ، پروفیسر ڈاکٹر ظفر سعید سیفی

جامعہ کراچی نے اپنے نصاب اور تدریس کے ضمن میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی نظامت میں جو انقلاب آفرین فیصلے کیے تھے، ان میں جامعہ کی کل تدریسی سطح پر اردو زبان کا نفاذ بطور ذریعۂ تعلیم اور ساتھ ہی گریجویشن کی سطح پر اردو اور اسلامیات کی بطور لازمی مضامین شمولیت تھی۔ ان دونوں کے نفاذ کے فیصلے قومی اور ملی سطح پر نہایت مفید اور دوررس ثابت ہوئے۔ ملک کی متعدد جامعات نے ان فیصلوں کے زیر اثر اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر اختیار کیا اور اسلامیات بھی گریجویشن کی سطح پر رائج کر لی گئی۔

اسلامیات کی تدریس کے لیے نصاب کی عدم موجودگی کے باعث ایک بہت مناسب اور معیاری نصاب کی ترتیب کی ذمہ داری اس وقت جامعہ کراچی کے ایک فاضل پروفیسر ڈاکٹر خورشید احمد صاحب نے پوری کی اور ایسا عمدہ نصاب ترتیب دیا جو مندرجات اور معیار اور ساتھ ہی اپنے اثرات کے باوصف بجا طور پر مثالی اور منفرد ثابت ہوا، اور یوں زیر نظر تالیف ''اسلامی نظریہ حیات'' وجود میں آئی، جو اپنے موضوعات کی ہمہ جہتی وافادیت اور اپنے معیار کی توقیر کے لحاظ سے اپنا کوئی ثانی نہ رکھنے کی وجہ سے ملک کی دیگر جامعات کے متعلقہ نصابوں میں بھی شامل کر لی گئی۔

جامعہ کراچی کی سطح پر اسلامیات کے بطور لازمی مضمون نفاذ کے پس پشت جو مقاصد کارفرما تھے کہ ——— ایک ایسا نصاب رائج ہو کہ اس میں حالات حاضرہ کے تناظر میں اسلام کو بطور ایک کامل نظریہ حیات اسی طرح پیش کیا جائے کہ طلبہ مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت کو اس طرح سمجھ سکیں کہ ان کے ذہن تشکیک سے پاک ہو کر علم و بصیرت بھی حاصل کر سکیں اور اسلام کے نظریہ اور پیغام پر ان کا اعتماد مستحکم ہو سکے اور وہ حقیقی صورت میں ایمان کی دولت سے مالا مال ہو جائیں۔

Marfat.com

یہ مقصد، مقامِ مسرت ہے کہ، بڑی حد تک پورا ہوا اور چند ہی برسوں میں نوجوانوں کی ایسی نسل ابھر آئی ہے، جس میں اسلام سے نسبت و تعلق کا جذبہ گہرا اور اسلام پر اس کا یقین غیر متزلزل نظر آتا ہے۔ محسوس ہونے لگا۔ اس نصاب کے نفاذ کے وقت اشتراکیت، مادیت، لادینیت اور وطنیت کے وہ تصورات، جو ہمارے نوجوانوں اور ہماری معاشرت میں فیشن کے طور پر رائج ہو گئے تھے، اب بڑی حد تک قصہ پارینہ نظر آتے ہیں۔ آج نوجوانوں کی اکثریت مغربی تصورات کے روبرو مذہب اور اسلام کے معاملے میں کوئی مفاہمانہ رویہ نہیں رکھتی۔ یہ نظریاتی لحاظ سے کہیں زیادہ پرجوش اور ولولہ خیز ہے۔

جامعہ کراچی کے لیے یہ امر باعثِ اطمینان ہے کہ زیرِ نظر تالیف کو شائع کرتے ہوئے سابق شیخ الجامعہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی یہ خواہش ہے کہ "وہ ایسے عالم پیدا کریں جو عصر جدید کے تقاضوں اور اسلام کی تعلیم و فلسفہ سے واقف ہوں اور مصلین کے نیم مردہ دلوں میں ایمان کی حرارت پیدا کریں،" آج کے نوجوانوں میں، مذہب کی مقبولیت کو بڑھتے ہوئے دیکھ کر، پوری ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔

آج پھر اسی جذبہ و احساس کے ساتھ زیرِ نظر تالیف کی سیزدہم اشاعت کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔

Marfat.com

پیش لفظ

(اشاعت اول)

پاکستان کا قیام اس لیے ممکن ہوا کہ مسلمان یہ چاہتے تھے کہ وہ آزاد رہ کر اپنے دین اور اپنی ثقافت کو، جس کی بنیاد اسلام پر قائم ہے، زندہ رکھ سکیں۔ لیکن افسوس کہ قیام پاکستان کے بعد ملت و حکومت دنیوی منافع کے اکتساب میں ایسی مشغول ہو گئی کہ اصل مقصد آنکھوں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ دین اور اسلامی ثقافت سے سرد مہری بڑھتے بڑھتے اب ایک ایسے مزمن مرض کی صورت پکڑ چکی ہے کہ اگر اس کا علاج جلد نہ کیا گیا تو ملت کی بقا دشوار ہے، نہ ایمان پاس رہے گا نہ ملک، اور حصول حکومت سے جو منافع مادی خوشحالی و آسائش کی صورت میں بعض لوگوں کو حاصل ہوئے ہیں وہ تو حباب آسا کچھ دیر کے ہی مہمان ثابت ہوں گے۔ ملتوں میں عزم اور زندگی کی خواہش ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر مقصد حیات ہی ضائع ہو جائے اور اس کی جگہ مال و دولت کی ہوس لے لے تو پھر زندگی کے دن بھی لمبے نہیں ہوتے۔

ہماری درسگاہوں میں یہ روح فرسا منظر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کا ایمان متزلزل ہے جس کی وجہ سے نہ ان میں کردار کی بلندی باقی رہی ہے نہ صحیح ترقی کا ولولہ۔ یہی نہیں کہ ان کے عمل سے اسلام کی بو نہیں آتی بلکہ ان کے دل بھی اسلام کی محبت سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ پاکستان سے محبت کا جذبہ بھی کمزور پڑ گیا ہے۔ انہیں اپنے والدین اور بزرگوں کی زندگی میں اسلام نظر نہیں آتا تو وہ اپنے آبائی دین کی عظمت کو کیسے سمجھیں؟ ہماری درسگاہیں جسد بے جان ہیں جہاں نہ علم ہے نہ کردار، نہ دین، نہ جذبہ، ان سے تعلیم پا کر نوجوان جوش و ولولہ کہاں سے لائیں؟ ان کے دل پر جب اغیار کی عظمت کے نقوش ثبت ہیں تو وہ اپنی کسی چیز پر فخر کیسے کریں؟ اگر ان کے کانوں میں مغربی تہذیب کے راگوں کے الاپ ہی پڑے ہیں تو وہ اپنی تہذیب میں کسی خوبی کا نشان کیسے پائیں گے؟ اور ثقافت اور دین کا چولی دامن کا تعلق ہے لہذا ان کے دل اگر ارتداد کی طرف مائل ہوں تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے!

Marfat.com

کوئی جامعہ اتنی تھوڑی سی مدت میں جب نوجوان اس کی عاطفت میں ہوتے ہیں نہ ان کے گھروں کے اثر کو زائل کر سکتی ہے نہ ماحول سے لگے ہوئے مرض کا علاج کر سکتی ہے ۔ دراں حالے کہ اس میں خود مختلف مقامات پر ایسے افراد ہوتے ہیں جو دین سے اپنے بُعد پر علانیہ فخر کرتے ہیں اور اس کے طلبہ کی جماعت میں خصوصیت سے ایسے نوجوان موجود ہوتے ہیں جو اسلام دشمن اثرات کی وجہ سے دن رات اسلام کی بیخ کنی کے کوشاں ہوتے ہیں ۔

ان مشکلات کا ہمیں احساس ہے ۔ لیکن کیا ان کے سامنے ہم سپر انداز ہو جائیں ؟ ہمت ہارنا بھی فرار کی ایک شکل ہے اور کسی جامعہ میں فراریت کو دخل نہیں ہونا چاہیے ۔ استاد اللہ کے سامنے مسئول ہے ، وہ مشکلات سے خوف زدہ ہو کر اپنے فرض، کو ترک نہیں کرسکتا ۔ اس لیے ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ہم حتی المقدور کوشش کرتے رہیں گے اور تائید ایزدی کے امیدوار رہیں گے ، السعی منا و الاتمام من اللہ ۔ یہی سبب ہے کہ جامعہ کراچی نے شعبۂ اسلامیات کو ترقی دی ہے اور مسلمان طلبہ کے لیے اسلامی تعلیم سال بھر کے لیے لازمی قرار دی ہے ۔ وسائل کی تنگی کے باوجود ہمارا ارادہ ہے کہ اس شعبہ کو ترقی دیں اور یہاں سے ایسے عالم پیدا کریں جو عصر جدید کے تقاضوں اور اسلام کی تعلیم و فلسفہ سے واقف ہوں ۔ ہماری یہ کوشش بھی ہوگی کہ اپنے نوجوان محصلین کے نیم مردہ دلوں میں پھر ایمان کی حرارت پیدا کریں ۔ یہ کام بہت بڑا ہے اور ہماری کوشش ضعیف ، ایک پہاڑ کو کاٹ کر جوئے شیر نکالنی ہے اور ہمارے ہاتھوں میں نہ قوت ہے نہ ہمارے تیشہ میں دھار ، پھر بھی اگر توفیق الٰہی شامل ہوئی تو ہم کامیاب ہوں گے ورنہ کم از کم ایک عظیم مقصد میں اپنے دست و بازو کو شل کرنے کی سعادت ہی سے بہرہ مند ہوں گے ۔

ہم اپنے مسلم طلبہ کو بلا تفریق مذاہب اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں ۔ ہم کسی مذہب کی فقہ انہیں نہیں پڑھاتے ، ہم کوئی مختلف فیہ بات انہیں نہیں بتاتے ، ہم انہیں قریب لانا چاہتے ہیں ، ان میں بُعد نہیں کرنا چاہتے ۔ ہمارے اساتذہ میں مختلف اسلامی عقاید کے افراد موجود ہیں ۔ ہم اسلام کی عظمت کا درس دینا چاہتے ہیں ، ہم طلبہ کے دل میں اسلام سے محبت کی آگ سلگانا چاہتے ہیں ، ہم ان کی شمع ایمان کو فروزاں کرنا چاہتے ہیں ، فروعی مسائل وہ خود اپنی مستند کتابوں سے سیکھ لیں گے ۔

Marfat.com

اسی مقصد کے پیش نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے ۔ اللہ تعالیٰ مؤلف کی اس کوشش کو قبول فرمائے اور اسے سعادت تاثیر عطا فرمائے۔ یہ کتاب اگرچہ اس جامعہ کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ اسے دوسری درسگاہیں بھی مفید پائیں گی اور عام پڑھے لکھے مسلمان بھی اس سے مستفید ہو سکیں گے ۔

یہ پیش لفظ محض میرے خیالات کا آئینہ دار نہیں ہے بلکہ میرے متعدد رفقائے کار کے خیالات کو پیش کرتا ہے جن کی اعانت کے بغیر کوئی اصلاحی تحریک بروئے کار نہیں آ سکتی ۔ اس میں میرا اپنا حصہ بہت تھوڑا ہے اس لیے اس آخری حصہ کے علاوہ میں نے صیغہ واحد متکلم استعمال نہیں کیا ۔ قارئین سے درخواست ہے کہ اس مقصد کی کامیابی کے لیے جس کے پیش نظر یہ کتاب مرتب کی گئی ہے دعا فرمائیں ۔

اشتیاق حسین قریشی
شیخ الجامعہ

جامعہ کراچی
۲۲ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ

Marfat.com

دیباچہ طبع سوم

اسلامی نظریہ حیات کا تیسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے جو قبولِ عام عطا فرمایا ہے اس کے لیے ہمارا سر اس کے حضور میں سجدہ ریز ہے۔ یہ صرف اس کا فضل تھا کہ یہ کتاب تیار ہوئی اور یہ محض اسی کا کرم ہے کہ اس نے ہمارے نوجوانوں کی دینی تعلیم و تربیت میں ایک حقیر سا حصہ ادا کیا۔ گذشتہ دس سال میں مختلف علمی حلقوں میں اس کتاب کی جس طرح پذیرائی ہوئی ہے اس کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس وقت اردو ادب میں ایک خاص علمی سطح پر اسلام کے جامع اور ہمہ پہلو تعارف، اور اس کی بنیادی تعلیمات کے مجموعے کی حیثیت سے اس کتاب کو ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب صرف پاکستان کی جامعات ہی میں استعمال نہیں ہو رہی بلکہ پورے پڑھے لکھے طبقے کے دلوں میں اس نے اپنے لیے جگہ بنالی ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب میں اسلام کے پیغام کو اس شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جیسا کہ وہ ہے۔ نیز مدافعانہ یا معذرت خواہانہ انداز کے مقابلے میں اعتماد اور ایقان کے ساتھ داعیانہ انداز میں حق کی تعلیمات کو پیش کیا گیا ہے اور پوری کوشش کی گئی ہے کہ اعتدال اور توازن کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔

اسلام ان ابدی صداقتوں کے مجموعے کا نام ہے جنہیں زمین و آسمان کے مالک نے انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے انبیا کے ذریعے سے بیان فرمایا ہے اور جن کو اپنی مکمل ترین شکل میں آخری پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور اپنے عمل کے ذریعے سے انسانیت کو تفویض فرمایا۔ یہ وہ صداقتیں

Marfat.com

ہیں جن پر کبھی کہنگی اور فرسودگی کا سایہ نہیں پڑ سکتا ، جو ہر دور اور ہر زمانے کے لیے مساوی طور پر سچی ہیں اور جن میں مرور زمانہ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا ۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ کسی انسان کے ذہن کی پیداوار نہیں ہیں جو زمان و مکان کی دقتیں ان کے لیے زنجیر پا بن سکیں ۔ ان کو جس خالق حقیقی نے بیان کیا ہے اس کے لیے ماضی ، حال اور مستقبل یکساں ہیں اور اسے زمان و مکاں کی کوئی مجبوری لاحق نہیں ۔ جس طرح سورج " پرانا " ہونے کے باوجود ہر صبح نو کے دامن کو نئی روشنی سے بھر دیتا ہے اسی طرح اسلام کی تعلیمات بھی تہذیب کی ہر گردش اور تاریخ کی ہر پیش قدمی کے لیے تازہ پیام کی علم بردار ہیں ۔ البتہ ہر دور اور ہر زمانے میں جو ضرورت ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ ان ابدی صداقتوں اور ان کے تقاضوں کو اس زبان میں بیان کیا جائے جو اس دور میں معروف اور جس کے ذریعہ اس دور کا ذہن ان کو پوری طرح سمجھ سکے اور انہیں اپنی گرفت میں لے کر نئی زندگی کی تعمیر و تشکیل کا کام انجام دے سکے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ہر دور میں مسلمانوں کے ثقہ اہل علم نے اسلامی تعلیمات کو اسی دور کی زبان میں پیش کیا ہے اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اس پہلو سے اردو کا دامن بڑا مالا مال ہے ۔ عربی کے بعد اسلامی علوم کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی میں ہے اور خصوصیت سے گذشتہ پچاس سال تو تجدید و احیائے دین کی مساعی کے سلسلے میں اردو زبان میں اس دور کا بہترین دینی ادب وجود میں آیا ہے یہ ادب اسلام کی نمو اور عہد آفریں قوت کا مظہر اور نشان ہے ۔ یہ دعویٰ کہ اسلام زندگی کے تمام مسائل کو بہ حسن و خوبی حل کرتا ہے اور دنیا کا کوئی نظام یا نظریہ حیات اس پہلو سے اسلام کا مقابلہ نہیں کر سکتا محض ایک جذباتی دعویٰ نہیں ہے ۔ ہر وہ شخص جو اسلام کا مطالعہ بغیر کسی تعصب کے کرے گا وہ اس دعویٰ کی تصدیق کرے گا ۔ ہماری اپنی زبان کا ایک وسیع لٹریچر اس کی شہادت میں موجود ہے ۔ البتہ اس بات کی ضرورت ایک عرصے سے محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی ایسی کتاب موجود ہو جس میں اختصار مگر جامعیت کے ساتھ اسلامی نظریہ حیات کی فکری بنیادوں اور زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اس کا عملی پروگرام پیش دیا گیا ہو۔ ایک عام طالب علم کے لیے ان موضوعات پر لکھی ہوئی ان بے شمار کتابوں سے جو ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں استفادہ مشکل ہو جاتا ہے ۔ پھر جامعہ کراچی میں ڈگری کلاسوں میں اسلامیات کے مضمون کے اضافے نے اس ضرورت کو اور بھی شدید کر دیا ۔ اس شدید ضرورت کے پیش نظر

Marfat.com

محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب شیخ الجامعہ کراچی یونیورسٹی کے ارشاد پر میں نے یہ کتاب مرتب کرنے کی کوشش کی اس کتاب میں جس امر کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے دور کے حالات و مسائل کی روشنی میں اسلام کو پیش کرنے کی جو بہترین کوششیں ہوئی ہیں ان کا عطر اور جوہر پیش کر دیا جائے تاکہ نوجوانوں کے دل و دماغ اسلام کی حقانیت اور اس کے پیغام کی صداقت پر اعتماد اور یقین کی دولت سے مالامال ہو سکیں اور ان کو وہ علم و بصیرت حاصل ہوسکے جس کے ذریعے وہ اسلام کے بہتر نمونے بن سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے زیر نظر کتاب میں اسلامی نظریہ حیات کے تمام اہم پہلوؤں کو اختصار کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے ذہن میں اسلام کے پورے نظام فکر و عمل کا ایک واضح نقشہ مرتب ہو جائے اور اسلام کے تقاضوں کا شعور بھی اس میں پیدا ہو جائے۔ اس کتاب کے اصل مخاطب مسلمان نوجوان ہیں اور ہماری مخلصانہ کوشش ہے کہ ایک طرف وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان دلائل سے بھی روشناس ہو جائیں جو ان تعلیمات کی حقانیت کو ثابت کرتی ہیں۔ اور دوسری طرف جس دین کے وہ پیرو ہیں اور جسے وہ اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں اس کے داعی اور مبلغ بن کر اٹھیں اور ساری دنیا میں اس کا پیغام پہنچا دیں تاکہ خدا کی زمین پھر اسلام کی برکتوں سے معمور ہو جائے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں ان مسائل پر بحث کی گئی ہے جو دور جدید کی فکری اور علمی تحریکات نے پیدا کیے ہیں اور جن کا سطحی مطالعہ ہمارے کچھ نوجوانوں کے ذہن میں مذہب کے خلاف ایک رد عمل پیدا کرتا ہے۔ اس حصے میں غلط نظریات کا ابطال کیا گیا ہے اور مذہب کی ضرورت اور زندگی میں اس کے اصلی مقام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں مثبت طور پر اسلام کی فکری بنیادوں اور اس کے اساسی عقائد سے بحث کی گئی ہے اور اسلام کے تصور حیات کو واضح کیا گیا ہے اور تیسرے حصے میں اسلامی نظام زندگی کا ایک واضح نقشہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اسلام کس قسم کا انسان اور کس نوعیت کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ آخری باب میں اسلام کے تقاضوں کو اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

Marfat.com

مندرجہ بالا تمام ابواب کو ان حضرات کی تحریروں سے مرتب کیا گیا ہے جو دور حاضر میں اسلام کے بہترین ترجمان ہیں۔ کتاب کی ضخامت کو مناسب حدود میں رکھنے کے لیے ہمیں اخذ و تلخیص اور ترتیب نو کا راستہ اختیار کرنا پڑا ہے تاکہ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ مواد پیش کیا جاسکے۔ لیکن ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ مصنفین کا مدعا واضح ہو جائے اور ان کے استدلال کا زور قائم رہے۔ تقریباً آٹھ دس ہزار صفحات کا مطالعہ کر کے یہ مضامین منتخب کیے گئے ہیں اور دور حاضر میں اسلام کی دعوت کو جس طرح پیش کیا گیا ہے اس کا نچوڑ اس کتاب میں آگیا ہے۔ کتاب میں منطقی ربط قایم رکھنے کے لیے قطع و برید سے بھی کام لیا گیا ہے اور جہاں جہاں موٹے خلا باقی رہ گئے تھے انہیں نئے اضافوں کے ذریعے مرتب نے پُر کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ کتاب کا تسلسل متاثر نہ ہونے پائے۔ ہمیں توقع ہے کہ اپنی موجودہ شکل میں یہ کتاب اسلامی نظریہ حیات کے ایک ابتدائی لیکن سیر حاصل تعارف کا موثر ذریعہ بنے گی۔ ہر باب کے آخر میں مزید مطالعہ کے لیے کتب کی نشان دھی بھی کر دی گئی ہے تاکہ جو حضرات تحقیقی مطالعہ کرنا چاھیں انہیں ضروری رہنمائی مل جائے۔ مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب طلبہ اور دوسرے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بڑی مفید ثابت ہوگی۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۳ میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن نمایاں تبدیلیوں کے ساتھ سنہ ۱۹۶۸ میں شائع ہوا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اب ہم اس کا تیسرا ایڈیشن پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشنوں کی ترتیب میں ہم نے کوشش کی ہے کہ پورے مسودے پر مکمل نظرثانی کر لیں اور جہاں جو کمی محسوس ہو اس کو دور کرنے کی سعی کریں۔ اس موقعہ پر نمایاں اضافے بھی کیے گئے ہیں اور عبارت کو سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ دوسرے ایڈیشن میں تین نئے ابواب کا اضافہ کیا گیا تھا اور اب ایک باب مزید بڑھایا گیا ہے۔

"اسلامی نظریہ حیات" کی اولین ترتیب، مواد کی تلاش اور اس کی تلخیص و ترتیب میں مجھے جناب ظفر آفاق انصاری، جناب نسیم احمد، جناب نثار احمد، جناب احمد انس اور جناب انیس احمد کی خصوصی معاونت حاصل رہی ہے۔ برادران ڈاکٹر منظور احمد اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کے مشورے اور معاونت بھی

Marfat.com

مجھے ہر قدم پر حاصل رہی ہے - میں محترم مولانا منتخب الحق صاحب صدر شعبہ معارف اسلامیہ کا ممنون ہوں کہ موصوف نے میری درخواست پر پورے مسودے کا مطالعہ فرمایا - متعدد مقامات پر قیمتی اصلاحات کیں اور دوسرے مشوروں سے نوازا - اس طرح میں مخدوم محترم ڈاکٹر محمد محمود احمد مرحوم سابق صدر شعبہ فلسفہ کا بھی ممنون احسان ہوں جن کے قیمتی مشورے میرے لیے دلیل راہ رہے - اور جن کی حوصلہ افزائی میری قوت کار کے لیے مہمیز کا کام کرتی رہی - افسوس کے اس تیسرے ایڈیشن کی تیاری کے وقت وہ ہمارے درمیان نہ رہے - اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں بہترین اجر سے نوازے - سب سے زیادہ میں محترم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کا ممنون ہوں جن کے ارشاد کی تعمیل میں یہ کتاب تیار ہوئی اور جن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کے بغیر یہ کبھی مکمل نہ ہوتی - میں ڈاکٹر صاحب کا اس لیے بھی شکر گزار ہوں کہ اپنی بے پناہ مصروفیت کے باوجود آپ نے اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے مسودے کا مطالعہ کیا ، بڑے قیمتی مشوروں سے مجھ کو نوازا اور اس کے لیے پیش لفظ تحریر فرمایا -

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو کچھ حق اور صحیح ہے اسے لوگوں کے دلوں میں اتارے اور اگر کچھ غلط اور باطل ہے تو اس سے ہر پڑھنے والے کو محفوظ رکھے - وما توفیقی الا باللہ

خورشید احمد

۲۸ مارچ ۱۹۷۱ء
لیسٹر — انگلستان

Marfat.com

اظہار تشکر

ہم ان تمام اہل علم کے بے حد ممنون ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تجویز و تالیف کو غیر معمولی طور پر سراہا اور صرف خدمت دین کے جذبہ سے اپنی قیمتی نگارشات کو بلا معاوضہ اس میں شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس سلسلہ میں ہم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ، مولانا محمد منظور نعمانی، مدیر ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ، ڈاکٹر مصطفیٰ زرقا، سابق وزیر قانون شام و پروفیسر کلیۃ الشرعیہ، دمشق یونیورسٹی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مدیر "ترجمان القرآن"، لاہور، مولانا امین احسن اصلاحی، سرپرست ماہنامہ "میثاق"، لاہور، ڈاکٹر محمد حمیداللہ، پروفیسر پیرس یونیورسٹی، مولانا صدرالدین اصلاحی، ناظم اسلامک ریسرچ سینٹر، رامپور، جناب نعیم صدیقی، مدیر ماہنامہ "سیارہ"، لاہور، پروفیسر عبدالحمید صدیقی، لاہور، ڈاکٹر آصف حسین قدوائی، مدیر معاون، ندائے ملت، لکھنؤ، اور مولانا افتخار احمد بلخی، کراچی کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں۔ اسی طرح جناب سلمان ندوی لیکچرار سندھ یونیورسٹی کے بھی ہم شکر گذار ہیں کہ انہوں نے اپنے والد محترم مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی تصنیفات سے تلخیص و اقتباس پیش کرنے کی اجازت دی۔ سید قطب شہید کے ورثاء کے بھی ہم شکر گذار ہیں جنہوں نے ان کی کتب کے اقتباسات شامل کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

خورشید احمد

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

پیش لفظ	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	
دیباچہ طبع سوئم	خورشید احمد	
اظہار تشکر	مرتب	
باب ۱۔ اسلامی نظریہ حیات	ابتدائی تعارف	۱ - ۱۰

حصہ اول ۔ مذہب اور دور جدید

تعارف	۱۳ - ۱۵
باب ۲۔ زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل	۱۶ - ۳۱
باب ۳۔ دور حاضر اور مذہب	۳۲ - ۴۹
باب ۴۔ مذاہب عالم : ایک تقابلی مطالعہ	۵۰ - ۷۱
باب ۵۔ دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب	۷۲ - ۱۰۳
باب ۶۔ اسلام اور تبدیلیٔ زمانہ	۱۰۴ - ۱۱۹

حصہ دوم ۔ اسلامی فلسفہ حیات

تعارف	۱۲۳ - ۱۲۶
باب ۷۔ اسلام کا تصور زندگی	۱۲۷ - ۱۴۷
باب ۸۔ اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات	۱۴۸ - ۱۶۳
باب ۹۔ اسلام کے بنیادی عقائد	۱۶۴ - ۱۸۲

Marfat.com

باب ۱۰۔ توحید ۱۸۳ - ۲۱۶

باب ۱۱۔ رسالت ۲۱۷ - ۲۵۳

باب ۱۲۔ اسوۂ حسنہ ۲۵۴ - ۲۸۰

باب ۱۳۔ عقیدۂ آخرت ۲۸۱ - ۳۰۲

باب ۱۴۔ اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات ۳۰۳ - ۳۳۵

حصہ سوم ۔ اسلامی نظام حیات

تعارف ۳۳۹ - ۳۴۲

باب ۱۵۔ شریعت اسلامی کے ماخذ ۳۴۳ - ۳۸۴

باب ۱۶۔ اسلامی نظام اخلاق ۳۸۵ - ۴۰۴

باب ۱۷۔ اسلام کا معاشرتی نظام ۴۰۵ - ۴۱۹

باب ۱۸۔ اسلام کا نظریہ تعلیم ۴۲۰ - ۴۴۵

باب ۱۹۔ اسلام کے معاشی اصول ۴۴۶ - ۴۶۵

باب ۲۰۔ اسلام کا سیاسی نظام ۴۶۶ - ۵۱۳

باب ۲۱۔ اسلام کے تقاضے ۵۱۴ - ۵۴۴

اشاریہ ۵۴۵ -

Marfat.com

۱

اسلامی نظریۂ حیات: ابتدائی تعارف

اسلام کسی ایسے مذہب کا نام نہیں ہے جو صرف انسان کی نجی اور انفرادی زندگی کی اصلاح کا داعی ہو اور جس کا کل سرمایۂ حیات کچھ عبادات، چند اذکار اور مٹھی بھر رسوم پر مشتمل ہو بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو خدا اور اس کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے تمام شعبوں کی تعمیر اور صورت گری کرتا ہے اور زندگی کے ہر پہلو کو ہدایتِ الٰہی کے نور سے منور کرتا ہے خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، معاشرتی ہو یا تمدنی، مادی ہو یا روحانی، معاشی ہو یا سیاسی اور مُلکی ہو یا بین الاقوامی۔ اسلام کی اصل دعوت یہ ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری و ساری ہو اور دل کی دنیا سے لے کر تہذیب و تمدن کے ہر گوشے تک خالقِ حقیقی کی مرضی پوری ہو۔

علامہ اقبال ''اسلامی ثقافت کی روح''[1] پر گفتگو کرتے ہوئے محدود مذہبی نقطۂ نظر اور اسلام کے انقلابی نقطۂ نظر کا فرق بڑی خوبی سے واضح کرتے ہیں۔ ایک صوفی بزرگ واقعۂ معراج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

محمد عربی بر فلک الافلاک	محمد عربی آخری آسمان پر گئے اور واپس آگئے۔
رفت و باز آمد واللہ اگر من	قسم خدا کی اگر میں (اس معرفت و بلندی پر)
رفتمے ہر گز نیامدے۔	گیا ہوتا تو کبھی واپس نہ آتا۔

یہ ایک جملہ محدود مذہبی نقطۂ نظر اور انبیا کے انقلابی نقطۂ نظر کے فرق کو واضح کر دیتا ہے۔ جس شخص کے پیشِ نظر صرف اپنی ذات کی اصلاح اور خود کو روحانی رفعتوں اور بلندیوں سے آشنا کرنا ہو وہ حق

۱۔ ڈاکٹر محمد اقبال، ''تشکیل جدید حیات اسلامیہ'' (ترجمہ سید نذیر نیازی)۔ بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۸، صفحات ۹۸۸ - ۹۸۹۔

Marfat.com

باری تعالیٰ تک پہنچنے کو اپنا منتہیٰ سمجھے گا اور اس اونچے مقام کو حاصل کرنے کے بعد دنیا کی طرف لوٹنا اور زمانے کے تلاطم میں داخل ہونا گوارا نہیں کرے گا - لیکن اس کے برعکس نبی کا رویہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس بلندی پر پہنچنے کے بعد آب و گِل کی دنیا کی طرف واپس آتا ہے اور جو معرفت اور روشنی اسے حاصل ہوتی ہے اس کی مدد سے ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے - وہ تاریخ ساز قوتوں پر غلبہ حاصل کرتا ہے اور انسانی تہذیب و تمدن کی تشکیلِ جدید کا انقلابی کام انجام دیتا ہے - خدا نے اپنے انبیا اس لیے بھیجے کہ وہ ہدایتِ ربانی کے نور سے پوری دنیا کو منور کر دیں اور دینِ حق کی رہنمائی میں ایک نیا انسان اور ایک نیا معاشرہ قایم کریں - تمام انبیا اسی مشن کو لے کر آئے اور اس کام کو اپنی آخری ، مکمل ترین اور معیاری شکل میں ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا - اسلام زندگی سے فرار کی نہیں ، زندگی کی تعمیر کی تعلیم دیتا ہے اور پوری زندگی کو سنوارنے کے لیے ہدایت کا ایک مکمل نظام بھی پیش کرتا ہے - ہدایت کے اسی نظام کا نام دین اور اسلامی نظریہٴ حیات یا اسلامی آئیڈیولوجی ہے -

دین کا مفہوم

دین کا لفظ کلام عرب میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے - لیکن اس کے سارے استعمالات کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ چار بنیادی تصورات کی ترجمانی کرتا ہے ، یعنی (ا) غلبہ و تسلط ، کسی ذی اقتدار کی طرف سے ؛ (ب) اطاعت اور بندگی ، صاحب اقتدار کے آگے جھک جانے والے کی طرف سے ؛ (ج) قاعدہ و ضابطہ اور طریقہ جس کی پابندی کی جائے ؛ اور (د) محاسبہ اور فیصلہ اور جزا و سزا - قرآن کی زبان میں لفظ دین ایک پورے نظام زندگی کی نمائندگی کرتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی یہ چار ہیں:

۱ - اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کا اقتدار اعلیٰ ؛
۲ - اس حاکمیت کے مقابلے میں تسلیم و اطاعت ؛
۳ - وہ مکمل نظام فکر و عمل جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہے ؛
۴ - جزا و سزا جو اقتدار اعلیٰ کی طرف سے اس نظام کی وفاداری و اطاعت یا اس سے سرکشی و بغاوت کے صلے میں دی جائے -

قرآن 'دین' کو ایک جامع اصطلاح کی حیثیت سے استعمال کرتا ہے

Marfat.com

اور اس کی زبان میں اس سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرماں برداری قبول کرے۔ اس کے حدود و ضوابط و قوانین کے تحت زندگی بسر کرے۔ اس کی فرماں برداری پر عزت، ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔[۱] حاکمیت کا یہ مقام خدائے واحد کو حاصل ہے اور اسلام وہ دین ہے جو اس حاکمیت کی اساس پر قایم ہے اور جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے صحیح طریقۂ زندگی قرار دیا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کردیں اور تمہارے لیے 'اسلام' (بحیثیت) دین پسند کیا۔ (المائدہ۔ ۳)

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

بے شک خدا کے نزدیک تو اصل دین 'اسلام' ہے۔ (آل عمران۔ ۱۹)

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

اور جو 'اسلام' کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔ (آل عمران۔ ۸۵)

اسلام کے لغوی معنیٰ اطاعت، جھکنے، سرِ تسلیم خم کرنے اور مکمل سپردگی کے ہیں۔ اس کے دوسرے لفظی معنیٰ امن، سلامتی اور آشتی کے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک پورا ضابطۂ زندگی پیش کرتا ہے، اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اسے قبول کرے اور اس کی پیروی کرے کیوں کہ خدا کے قانون کے آگے جھکنے اور اس کی اطاعت کرنے کا نام اسلام ہے۔ اور اس میں یہ حقیقت بھی پوشیدہ ہے کہ خدا کی بندگی اور اطاعت کے نتیجے میں زندگی کا جو نقشہ ابھرے گا وہ امن، سلامتی اور آشتی کی نعمتوں سے مالا مال ہوگا، اس میں قلب کو اطمینان حاصل ہوگا اور انسانوں کی انفرادی

۱۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ''قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں''، اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، باب پنجم۔ نیز ملاحظہ ہو، سید قطب، ''جادہ و منزل'' (ترجمہ ''معالم فی الطریق''، از خلیل حامدی)، لاہور، ۱۹۶۸، باب دوم و سوم۔

Marfat.com

اور اجتماعی زندگی میں حقیقی امن اور سکون قایم ھوگا نیز اس زندگی کے بعد بھی انسان کو اس ابدی زندگی میں سلامتی اور آشتی میسر آئے گی۔

اسلامی نظریۂ حیات کیا ہے؟

مکمل ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ھیں: ایک طرف اسلام زندگی کی بنیادی حقیقتوں پر روشنی ڈالتا ہے اور ھمیں بتاتا ہے کہ اس کائنات کی حقیقت کیا ہے، اس میں انسان کا اصل مقام کیا ہے، زندگی کا مقصد کیا ہے اور جو اساسی قانون اس میں کار فرما ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اسلام بنیادی عقائد کی شکل میں زندگی کی حقیقتوں سے انسان کو روشناس کراتا ہے اور کائنات اور حیات کے بارے میں اسے صحیح زاویۂ نظر عطا کرتا ہے۔ دوسری طرف اسلام زندگی کا مفصل قانون پیش کرتا ہے تاکہ انسان افراط اور تفریط سے بچ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اعتدال و توازن کی بنیادوں پر استوار کرے اور کامیاب و کامران رہے۔ عقائد اور ضابطۂ عمل کے اس مجموعے کا نام 'اسلامی نظریۂ حیات' ہے اور علوم عمرانی کی اصطلاح میں عقائد اور ضابطۂ عمل کے اسی مجموعے کو 'آئیڈیولوجی' کہا جا سکتا ہے۔ جدید عمرانی لٹریچر میں یہ لفظ ایک ایسے ضابطۂ فکر و عمل اور اجتماعی پروگرام کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی فکری اور فلسفیانہ بنیادیں رکھتا ھو اور سیاست اور تمدن و معاشرت کے لیے بھی ایک واضح لائحۂ عمل پیش کرتا ھو۔ 'لغت فلسفہ' میں ڈاکٹر جارج بوآس اس کی یہ تعریف کرتے ھیں:

> "عام نظریات کا کوئی ضابطہ یا کوئی ایسا پروگرام جس کی اساس فکر و فلسفہ پر ھو۔"[1]

اسی طرح مشہور ماہر لسانیات ویبسٹر اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

> "کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرتی تحریک کے عام منصوبے یا لائحۂ عمل کا علمی بیان۔"

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ھو جاتی ہے کہ نظریۂ حیات سے کسی تحریک یا نظام تمدن کی فکری بنیادیں اور ان سے ماخوذ تہذیبی،

۱۔ Runes, D.D. (Ed.), *Dictionary of Philosophy*. Philosophical Library: New York, p. 140.

Marfat.com

سیاسی اور معاشرتی پروگرام و لائحہ عمل مراد ہے اور جب ہم 'اسلامی نظریہ حیات' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ نظام فکر اور وہ تہذیبی اور تمدنی لائحہ عمل مراد ہوتا ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ نظریہ حیات کی اصل خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ اپنے خاص نظامِ فکر کی روشنی میں زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق رہنمائی کرتا ہے۔ اور جس طرح ہار کے موتیوں کو ایک سرشتہ باہم منسلک کر دیتا ہے اسی طرح ہر نظریہ حیات کی ایک مشترک روح زندگی کے تمام شعبوں کے پروگراموں کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ ہر شعبے میں یہی ایک روح اور فکر کار فرما ہوتی ہے۔ اس طرح ایک مکمل ضابطہ فکر و عمل رونما ہوتا ہے جس میں زندگی کی حقیقی وحدت جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں حیاتِ انسانی کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی رونما ہوتی ہے۔ اور اس یک رنگی سے زندگی میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے اور ایک کے بغیر دوسرا در اصل نامکمل رہتا ہے۔

مغرب کا اصل مسئلہ

مغربی دنیا کا المیہ یہ ہے کہ وہ ایک طویل مدت سے کسی حیات بخش نظریہ حیات سے محروم رہی ہے۔ عیسائیت اسے کوئی مکمل نظام حیات نہ دے سکی۔ نتیجتاً مغرب کا انسان الہامی ہدایت سے محروم ہو کر صرف انسانی ذہن و فکر پر تکیہ کرنے پر مجبور ہوا اور ایک جامع اور متوازن نظام قائم کرنے میں ناکام رہا۔ ان ناکامیوں نے اس میں مایوسی کی کیفیت کو جنم دیا اور بالآخر وہ آہستہ آہستہ ایک جامع نظریہ حیات کی ضرورت کا ہی منکر ہو گیا۔

جدید مغربی فکر کا ارتقا جن خطوط پر ہوا ہے وہ زندگی کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے ہیں۔ سب سے پہلے دیکارت نے روح اور مادے کے وجود کی وحدانیت کا ابطال کیا۔ اس کے فلسفہ ثنویت میں روح اور مادہ دو مستقل بالذات وجود ہیں۔ لائبنز نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مستقل بالذات وجود کی کثرت کا نظریہ پیش کیا۔ اب ہر 'روحیہ' یا جوہر[1] خود ایک کائنات تھا۔ اور اپنا جداگانہ وجود رکھتا تھا اور اپنی مخصوص نظر سے پوری کائنات کی عکاسی کر رہا تھا۔ لاک اور ہیوم کے زیر اثر کمیت کی اہمیت بڑھ رہی تھی اور کیفیت کی قدر کم ہو رہی تھی۔ طبیعیات اور حسابیات کی ترقی نے اس رجحان کو

۱۔ Monad

اور بھی تیز کر دیا اور نتیجتاً مغربی فکر کی سب سے اہم خصوصیت 'کُل' سے 'جُزو' کی طرف مراجعت ہوگئی۔ اس کیفیت کو جدید اہل قلم جوہری حسیّاتیت[1] سے موسوم کرتے ہیں۔

اس فکری رجحان کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں انتشار اور جزو پرستی رونما ہوئی۔ عالمی ریاست کا تصور قومی ریاست کے تصور سے بدل گیا اور سلطنت روما چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں بٹ گئی۔ مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے بالکل جدا کیا گیا اور سیاست میں انفرادیت کا غلبہ ہوا۔ معاشیات میں تخصیص اور تقسیم پسندی کا رجحان رونما ہوا اور پوری صنعتی اور تجارتی ترقی انہی خطوط پر ہوئی۔ قومیت (نیشنلزم)، لادینیت (سیکولرزم)، انفرادیت، اور صنعتیت اسی ذہنیت کی پیداوار ہیں۔

مغربی فکر کے اس رجحان کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا کہ کوئی ایک نظریۂ حیات ایسا نہیں ہوسکتا تھا جو زندگی کے تمام شعبوں میں یک رنگی پیدا کرسکتا۔ لادینیت یا دُنیویت اور مادّیت منفی تحریکیں تھیں۔ وہ کوئی مثبت نظام زندگی فراہم نہیں کرسکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے کا ارتقا جدا جدا بنیادوں اور مختلف تمدنی خطوط پر ہوا اور زندگی میں کوئی وحدت باقی نہ رہی۔ معیشت کسی سمت میں جا رہی ہے تو معاشرت کسی اور سمت میں۔ سیاست کا انداز کچھ ہے تو اخلاق و تمدن کا کچھ اور۔ ہر معاملے میں متعدد معیار بن گئے اور کوئی ایک پیمانہ ایسا نہ رہا جس سے حیات کے ہر پہلو کو ناپا جاسکتا۔ یورپ کی زندگی کا جدید انتشار اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتا جب تک مندرجہ بالا حقیقت کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔ تاریخ کا طالب علم جب یہ دیکھتا ہے کہ سیاست میں جمہوریت اور معاشیات میں صنعتی استبداد اور مزدوروں پر مظالم ساتھ ساتھ رونما ہوتے ہیں، جب وہ سامراج اور آزادی پسندی کو ہم آغوش دیکھتا ہے تو پریشان ہوجاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تضاد اور تناقص اس لیے پایا جاتا ہے کہ ایک منفی چیز پر تو سب مشترک ہیں لیکن کوئی ایسا مثبت نظریۂ حیات موجود نہیں جو زندگی کی وحدت کو قایم رکھتے ہوئے علمی اور عملی دائروں میں مکمل رہنمائی فراہم کرسکتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبہ ہیں مختلف سمتوں میں ترقی ہوئی ہے اور آج اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب اندرونی انتشار کا شکار ہے۔

---

۱. Atomic sensationalism

Marfat.com

اشتراکیت

یورپ کی جدید تاریخ میں، اسی انتشار اور ژولیدگی کے رد عمل کے طور پر، اشتراکیت بہ حیثیت ایک نظریہ حیات اور ایک تحریک رونما ہوئی، اور آج کی دنیا میں اس کو جو بھی کامیابی حاصل ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس کے پاس بہ نظر ظاہر ایک ضابطہ حیات ہے۔ اسی میں اس کی کشش کا اصل راز مضمر ہے۔ لیکن چوں کہ اشتراکیت بھی مغربی فکر کی منفی رو سے اپنے کو آزاد نہ کرسکی، وہ بھی مادہ اور روح اور زندگی اور اخلاق کی تقسیم پر مبنی ہے، نیز انسانی سماج کی طبقاتی تقسیم پر اس کی اساس ہے، اس لیے اس نے ایک ضابطہ عمل تو دیا مگر ایک صحت مند اور حیات بخش نظریہ حیات پیش کرنے سے قاصر رہی[1]۔ جب تک اشتراکیت محض ایک نظریہ رہی اس کی کشش دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی رہی لیکن اب جب کہ اس کے عملی نتائج بھی سامنے آگئے ہیں اس کی جاذبیت برابر کم ہورہی ہے کیوں کہ انسان یہ دیکھ رہا ہے کہ

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا؟
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی! (اقبال)

ایک طرف تو جدید دنیا میں کسی صحت بخش نظریہ حیات کا فقدان ہے اور دوسری طرف ایک ایسے نظریے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے جو زندگی کے مسائل کو صحت مند بنیادوں پر حل کرے اور انسان کی مادی ترقی کو اس کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کرسکے۔ تجربے نے ثابت کردیا ہے کہ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ انسان کی شخصیت ایک ہی ہے اور وہ بہ یک وقت دو متضاد اور متناقض کردار ادا نہیں کرسکتا اور اگر کرے گا تو اس کی شخصیت انتشار کا شکار ہوجائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان ایک انتشار زدہ شخصیت کا حامل ہے۔ سماجی بے اطمینانی، معاشرتی کشمکش، نوجوانوں کی بے راہ روی، خودکشی اور ذہنی امراض جس تیزی سے بڑھ رہے ہیں وہ اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ انہی حالات سے متاثر ہوکر پروفیسر جوڈ نے کہا تھا کہ ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب چہارم۔ نیز دیکھیے چراغ راہ، "سوشلزم نمبر"، کراچی، ۱۹۶۷، اور خورشید احمد، "سوشلزم یا اسلام" مکتبہ چراغ راہ، کراچی، ۱۹۶۹۔

Marfat.com

کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا ہمیں ابھی تک نہیں آیا ہے۔[1]

زندگی کی وحدت

یہ صحیح ہے کہ عملی سہولت کی خاطر حیات انسانی کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن ہر شعبے کو ایک آزاد اور جداگانہ جزیرے کی شکل دے دینا نہایت مہلک ہے۔ انفرادی اور اجتماعی، سیاسی اور معاشی، معاشرتی اور تمدنی یہ تمام شعبے ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوئے ہیں کہ انہیں بالکل الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی زندگی میں مختلف شعبوں کے درمیان امتیاز و تفریق ممکن نہیں۔ جب تک تمام شعبوں کو درست نہ کیا جائے اور سب میں یک رنگی اور ہم آہنگی نہ ہو اس وقت تک انسانی زندگی خوشحالی اور کامرانی سے ہم کنار نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ ممکن نہیں کہ آپ کا نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نصف پر مسکراہٹ نہ آئے تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ صرف معیشت یا سیاست کی تنظیم سے پوری زندگی سنور جائے۔ اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بہ یک وقت مختلف سمتوں میں چل سکے یا دو مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیوں پر سوار ہو اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ انسان کی زندگی کے مختلف شعبوں کو بہ یک وقت مختلف منزلوں کی طرف سرگرمِ عمل کیا جا سکے۔ تجربے نے آج کے انسان کو اچھی طرح سکھا دیا ہے کہ اگر وہ اپنی شخصیت کا استحکام اور تمدن کی حقیقی ترقی چاہتا ہے تو اسے جزو پسندی کے مقابلے میں تہذیبی وحدت کی راہ اختیار کرنی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ایک ایسا صحت مند نظریہ' حیات ہے جو دنیا کو اس انتشار سے نکال دے جس میں وہ گھیر گئی ہے اور جو اس کے لیے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔

وقت کی ضرورت

پھر جو کچھ ہم نے عرض کیا وہ تہذیبِ انسانی کی اندرونی کیفیت ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ کچھ ایسے بیرونی اسباب بھی پیدا ہو چکے ہیں جو آج اس سمت کشاں کشاں لا رہے ہیں۔ پہلی چیز تو ریاست کا جدید تصور ہے۔ آج کی ریاست، ایک خاموش سیاسی انقلاب کے نتیجے کے طور پر، ایک ہمہ گیر

۱۔ Joad, C.E.M., *Counter Attack from the East*

Marfat.com

ریاست بن چکی ہے۔ جیمز اسٹورٹ مِل اور لارڈ میلبورن کے تصور کی "محض انتظامی ریاست" کا آج کی دنیا کے کسی کونے میں بھی کوئی وجود نہیں۔ اب ریاست ایک مثبت ریاست ہے جسے تعلیم، ثقافت، سماج، معیشت، نشر و اشاعت غرض ہر میدان میں ایک پالیسی اختیار کرنی ہے اور ہر شعبے کی صورت گری کرنی ہے۔ محض منفی تصورات کے سہارے ایسی کوئی ریاست قایم نہیں ہو سکتی۔ لادینیت اور آزاد خیالی آج کے مسائل کا حل نہیں۔ مذہب کو آپ زندگی سے نکال بھی دیں تو کریں گے کیا؟ لادینیت کوئی مثبت پروگرام نہیں دیتی۔ آزاد خیالی کے سہارے آپ ماضی کے خلاف بغاوت تو کرسکتے ہیں اور روایات کو ترک بھی کرسکتے ہیں لیکن آپ کا مثبت اقدام آخر کیا ہوگا؟ آزاد خیالی کوئی مثبت نظریہ' حیات فراہم نہیں کرتی۔ جمہوریت بھی آپ کو زیادہ سے زیادہ یہ بتاتی ہے کہ "وہ کرو جو عوام چاہیں"۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عوام کیا چاہیں؟ کوئی مثبت نظریہ، کوئی تعمیری لائحہ' عمل جب تک عوام کے پاس نہ ہو وہ کیا کرسکتے ہیں؟ جس پہلو سے بھی آپ غور کریں گے آپ محسوس کریں گے کہ آج ایک طرف ہمارے زمانے کے رائج فلسفے ایک صحت مند نظریہ' حیات فراہم کرنے میں ناکام ہیں اور دوسری طرف آج کی دنیا میں فرد اور ریاست دونوں کے لیے نظریہ' حیات اتنا ضروری ہوگیا ہے جتنا انسان کے لیے ہوا اور پانی۔ اس کے بغیر ریاست کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر سیاسی مفکرین بیسویں صدی کی ریاست کو 'نظریاتی ریاست' کے نام سے پکارتے ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ فنی، اور میکانکی ترقی نے اب ان تمام منتشر جزیروں کو ملا دیا ہے جن میں آج سے پہلے زندگی کو تقسیم کیا گیا تھا۔ وسائلِ نقل و حرکت نے جغرافیائی بُعد کو دور کر دیا ہے۔ تعلیم، پروپیگنڈے، ریڈیو اور ابلاغِ عامہ کے جدید ذرائع نے زندگی کے تمام شعبوں کو مربوط کردیا ہے۔ زمان و مکان کی تسخیر نے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ اب پوری دنیا ایک شہر اور پوری انسانیت ایک خاندان بنتی جا رہی ہے۔ وحدت کی طرف دنیا کی اس پیش قدمی کے زمانے میں 'کثرت' اور 'تقسیم' کے وہ تمام فلسفے بے کار ہوگئے ہیں جو آج تک اس کا سرمایہ' حیات رہے ہیں۔ نیا زمانہ مغرب کے تمام جزوی فلسفوں کو مخاطب کرکے کہہ رہا ہے:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہوگئے پرانے

اب دنیا کو ایک ایسے نظریے ، ایک ایسی آئیڈیولوجی کی ضرورت ہے جو کثرت کو وحدت میں بدل دے اور ان نئے حالات میں انسان کو رہنے کا سلیقہ سکھائے تاکہ وہ اپنی حاصل کی ہوئی نئی قوتوں کو تعمیر و تشکیل کے لیے استعمال کرسکے۔ ورنہ اس بات کا شدید اندیشہ ہے کہ آج تک انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ نفرت ، تقسیم پسندی اور جزو پرستی کے فلسفوں کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

اسلام ایک مکمل ضابطہ زندگی

دور جدید کی اس سب سے بڑی ضرورت کو اسلام پورا کرسکتا ہے بلکہ صرف اسلام ہی پورا کرتا ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے۔ جو ایک طرف زندگی کے مسائل کا ایسا معقول اور سائنٹفک حل پیش کرتا ہے جو فکر و نظر کی ہر الجھن کو دور اور ہر عقدے کو حل کردیتا ہے اور دوسری طرف تہذیبی اور تمدنی زندگی کے لیے ایک مفصل لائحہ عمل دیتا ہے جو انسانی معاشرے کی تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اور صحت مند بنیادوں پر اس کے مستقبل کے ارتقا کی راہیں ہموار کرتا ہے۔ اسلام پوری قوت کے ساتھ زندگی کی روحانی حقیقت کا اظہار کرتا ہے اور مادی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتا ہے۔ وہ نہ دوسرے مذاہب کی طرح مادی زندگی سے صرف نظر کرتا ہے اور نہ دور جدید کی مادیت کی طرح مادی پہلو کو ہر دوسرے پہلو پر حاوی اور غالب کرتا ہے۔ وہ انسان میں یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز تیرے لیے ہے لیکن تیرے مقاصد بہت بلند و بالا ہیں۔ بہ قول اقبال

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے ، تو نہیں جہاں کے لیے

Marfat.com

حصہ اول

مذہب اور دور جدید

Marfat.com

Marfat.com

دنیا میں انسان کی دو بنیادی ضرورتیں ہیں - ایک طرف جسم اور روح کے رشتے کو قایم رکھنے کے لیے اسے مادّی اور جسمانی وسائل درکار ہیں اور دوسری طرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اخلاق اور تمدنی اصولوں کی ضرورت ہے - اللہ تعالیٰ نے انسان کی ان دونوں ضرورتوں کو پورا کیا ہے - مادی اور جسمانی احتیاجات کی تسکین کے لیے وسائل کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ زمین و آسمان میں ودیعت کر دیا ہے اور اخلاق و تمدنی رہنمائی کے لیے اس نے انبیا بھیجے جنہوں نے انسان کو زندگی گذارنے کا طریقہ سکھایا - زندگی گذارنے کے اس طریقے کا نام مذہب ہے -

مذہب انسان کی سب سے اہم اور بنیادی ضرورت ہے - یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی میں کوئی معاشرہ ، کوئی تمدن اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جو مذہب سے کلیتاً بے نیاز رہی ہو - لیکن دور جدید کی یہ بدقسمتی ہے کہ اس میں مذہب سے انحراف کا ایک بہت واضح اور نمایاں رجحان رونما ہوا اور بالآخر جدید مغربی تہذیب لامذہبیت کی بنیاد پر قایم ہوئی - ماضی میں بھی اس نوعیت کی کوششیں ہوئی ہیں لیکن جدید تجربے کی طرح وہ بھی ناکام رہی ہیں - انسانی تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مذہب کو ترک کر کے انسان نہ صرف یہ کہ اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جاتا ہے بلکہ خود مادی وسائل کے استعمال میں بھی وہ توازن برقرار نہیں رکھ سکتا جو فلاح و خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوت و اقتدار میں اضافہ خیر و صلاح اور نیکی و فلاح میں اضافے کا باعث نہیں ہوتا - علامہ اقبال نے اس صورت حال کی بڑی اچھی عکاسی کی ہے :

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا

زندگی کی شب تاریک صرف مذہب ہی کی روشنی سے منور ہو سکتی ہے -

کتاب کے اس حصے میں ہم نے دور جدید کے پس منظر میں مذہب اور اس سے پیدا ہونے والے سوالات سے بحث کی ہے - پہلا مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کی تحریرات سے ماخوذ ہے - اس میں زندگی کے بنیادی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور ان ذرائع علم سے بحث کی گئی ہے جن کی مدد سے انسان

Marfat.com

ان سوالات کو حل کر سکتا ھے ۔ اور پھر ان مختلف تمدنی نظاموں کے خد و خال واضح کیے گئے ھیں وہ مختلف قسم کے جوابات کی بنیاد پر قایم ھوتے ھیں ۔

دوسرا مضمون جناب ڈاکٹر منظور احمد صاحب کا تحریر کردہ ھے ۔ اس مضمون میں مذھب کی ضرورت اور انسانی زندگی میں اس کے مقام کو بیان کیا گیا ھے ۔ نیز اس پوری بحث میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ علمی اور عقلی نقطہ نظر سے مذھب کی اصل حقیقت کو واضح کیا جائے تا کہ جدید اذھان میں جو شبہات پیدا ھوتے ھیں ان کا موثر طریقے پر ازالہ ھو سکے ۔

تیسرا مضمون ظفر آفاق انصاری صاحب نے مرتب کیا ھے اور اس میں دنیا کے اھم مذاھب کا ایک تقابلی مطالعہ کیا گیا ھے ۔ اس باب میں ھندو مت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کی بنیادی تعلیم کو نہایت اختصار کے ساتھ پیش کیا گیا ھے ۔ ان مذاھب کی مختصر تاریخ اور موجودہ عالمی مقام پر روشنی ڈالی گئی ھے اور ایک عمومی جائزے کے ذریعے سے ان کی تعلیمات پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ھے ۔

چوتھا مضمون پروفیسر عبدالحمید صدیقی صاحب کے قلم سے ھے ۔ اس میں جدید مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور اس کی فلسفیانہ بنیادوں کو پیش کیا گیا ھے اور ان پر علمی تنقید کے ذریعے سے بتایا گیا ھے کہ مذھب سے بغاوت پر جو نظام بھی بنے گا انسانیت کے لیے تباھی کا باعث ھو گا ۔ اس مقابلے میں ان نئی فکری اور عملی تحریکوں، خصوصیت سے لا دینیت اور اشتراکیت پر علمی تنقید کی گئی ھے جو مذھب اور مذھبی فکر کی بیخ کنی پر آمادہ ھیں تا کہ آج کا نوجوان ان تحریکوں کی ظاھری چمک دمک سے متاثر ھو کر ان کے "تاریک تر" اندرون کو نظر انداز نہ کر دے ۔ چوں کہ یہ مضمون کئی سال پہلے لکھا گیا تھا اس لیے مرتب نے جگہ جگہ اس میں تازہ ترین مواد کا اضافہ کر دیا ھے ۔ یہ اضافے بڑی حد تک مضمون کے معلوماتی پہلو کے سلسلے میں تجزیاتی ھیں ۔

آخری باب میں اسلام اور تبدیلی زمانہ کے موضوع سے بحث کی گئی ھے اور یہ بتایا گیا ھے کہ زمانی تغیر کی حقیقی نظریاتی اور تہذیبی حیثیت کیا ھے اور مذھب — اور خصوصیت سے اسلام — سے اس کے تعلق کی کیا نوعیت ھے ۔

Marfat.com

اس فصل میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کیا گیا ہے کہ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ مذہب کو بھی بدلنا چاہیے - یہ باب مرتب نے لکھا ہے -

ہمیں توقع ہے کہ اس حصے کے مضامین ذہن سے ان تعصبات اور شکوک و شبہات کو دور کرنے میں مفید ثابت ہوں گے جو مغربی اثرات کے زیر اثر ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا ہو گئے ہیں - ان مباحث کو سمجھ لینے کے بعد اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اس کے نظامِ حیات کو سمجھنا آسان ہو جائے گا -

مرتب

Marfat.com

۲

زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل*

مذہب، فلسفہ اور تمدن کے کچھ بنیادی سوالات ہیں جن کے حل پر انسانی زندگی کا انحصار ہے، وہ بنیادی سوالات یہ ہیں۔

بنیادی سوالات

اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟ کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟ اگر ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کے لیے اس زندگی میں کیا ہدایات ہیں؟

نیز یہ کائنات بہ حیثیت مجموعی کیا ہے؟ اس کو نظم و ضبط میں رکھنے والی اور ایک ہمہ گیر اور محکم قانون کے مطابق چلانے والی ذات کون سی ہے؟ اور اس کی کیا صفات ہیں؟ اس کا انسانوں سے کیا تعلق ہے، اور انسانوں کا اس سے کیا تعلق ہونا چاہیے؟

کیا ان قوانین طبعی کے علاوہ جو اس عالم میں کارفرما ہیں کوئی اخلاقی قانون بھی ہے؟ اگر ہے تو اس کی تفصیلات کیا ہیں؟ انسان کی اس کائنات میں صحیح حیثیت اور منصب کیا ہے؟ وہ خود مختار ہے یا کسی کا ماتحت؟ کسی دوسری طاقت اور عدالت کے سامنے جوابدہ ہے یا آزاد اور غیر ذمہ دار؟ اس کا کمال مطلوب کیا ہے؟

یہ اولین اور بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی ایسا نظام ایک لمحہ کے لیے بھی نظر انداز نہیں کرسکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو اور جس کی جڑیں

* یہ مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصنیف ''مذہب اور تمدن'' سے ماخوذ ہے البتہ اس کی موجودہ ترتیب بڑی حد تک اپنی قایم کردہ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

انسان کے قلب و دماغ میں پیوست ہوں اور اس کی شاخیں انسانی زندگی کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہوں۔ مذہب ان ہی سوالات کا یقینی جواب دینے کا دعویٰ کرتا ہے؛ فلسفہ ان ہی مسائل سے بحث کرتا ہے، تمدن ان ہی بنیادوں پر اپنی عمارت قایم کرتا ہے۔ ان سوالات کا متعین جواب دیے بغیر نہ ہم زندگی کا کوئی حقیقی مسئلہ طے کرسکتے ہیں، نہ تمدن و اجتماع کا کوئی نقشہ بنا سکتے ہیں۔ ہر تمدن، خواہ کتنا ہی سطحی اور مادی ہو، ان سوالات کا کوئی نہ کوئی جواب ضرور رکھتا ہے جو اس کی عمارت کے نیچے بھی بنیاد کا کام دیتا ہے اور بنیاد کی اس گہرائی سے لے کر اس کی کاخ و ایوان کی بلندی تک یکساں اثر انداز ہوتا ہے۔ اس ذہنی سرچشمے سے اس کی زندگی کی ساری نہریں پھوٹتی ہیں اور ان کے رخ متعین ہوتے ہیں۔ معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین علم و فلسفہ، تہذیب و شائستگی، غرض اندرونی و بیرونی زندگی کے تمام مناظر و مظاہر اس بنیادی تصور کا عکس ہوتے ہیں۔

جہاں ان سوالات کا جواب دینا ارباب فلسفہ اور اہل دانش و بینش کا مشغلہ ہے وہاں ان کے حل سے متعلق کوئی نہ کوئی رائے قایم کرنا ہر خاص و عام کے لیے ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص شعوری یا غیر شعوری طور پر ان سوالات کے حل سے متعلق کوئی رائے قایم نہ کرے، اس کے لیے کوئی عمل ممکن نہیں۔ مثلاً آپ یہ سوچ کر دیکھیں کہ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ زندگی اور موت کے متعلق کوئی رائے قایم نہ کریں اور اس کے باوجود آپ کے افعال میں منطقی ربط اور عملی حکمت پوشیدہ ہو۔ آپ کا فعل اگر شعوری اور اختیاری ہے تو یقیناً اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ یہ مقصد یا تو فلاح اخروی ہوگا یا محض فلاح دنیوی۔ پہلی صورت میں ضروری ہے کہ زندگی بعد موت پر ایمان رکھیں اور دوسری صورت میں اس کو لغو اور وہم خیال کریں۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرے کا ہر فرد ان مسائل کا ایک واضح یا غیر واضح جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ یہی حال معاشرتی زندگی کے مختلف شعبہ جات کی بنیاد بنتا ہے۔ چناں چہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں معاشرے نے ان سوالات کا فلاں حل قبول کیا تو ہم اس معاشرے کے سیاسی، معاشی اور دیگر سماجی نقطہ نظر کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یا اگر ہمیں اس کے سیاسی، معاشی اور سماجی کارناموں کا علم ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس نے مسائل کے حل میں فلاں پہلو اختیار کیا ہوگا اور یہ سب کچھ اس لیے کہ کسی قوم کے

Marfat.com

لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ ان مسائل کے حل کے سلسلے میں ایک پہلو پر ایمان رکھے اور عملی طور پر وہ تمدن اختیار کرے جو بالکل متضاد بنیادوں اور اقدار کا حامل ہو۔

علم کے ذرائع

ہم کو اس موقع پر دیکھنا یہ ہے کہ ان مسائل کے حل کے لیے ہمارے پاس کیا ذرائع ہیں اور ان سوالات کو کس کس طرح حل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہم کو اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کا جائزہ لینا ہوگا جن سے بہ ظاہر ہم ان مسائل کے حل میں مدد لے سکتے ہیں۔

۱ــ حواس: حواس سے مراد وہ پانچ مشہور قوتیں ہیں جنہیں باصرہ سامعہ، لامسہ، شامہ اور ذائقہ کہا جاتا ہے۔ یہی حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ دنیا سے متعلق جس قدر محسوسات کا ہم کو علم ہے ان سب کی بنیاد یہی حواس ہیں۔ ان ہی کی بنا پر ہم تجربہ اور مشاہدہ کے بعد طبعی قوانین دریافت کرکے اپنے سائنسی علوم کو ترتیب دے سکتے ہیں۔ لیکن حواس اپنی اس وسعت کے باوجود محدود ہیں۔ یہ ہمیں صرف ان اشیا سے متعلق علم فراہم کرتے ہیں جن کا محسوس کیا جانا ممکن ہے۔ لیکن ہر موجود کے لیے ضروری نہیں کہ وہ محسوس بھی ہو[1]۔ مثلاً

۱۔ بہت سے علما حواس کو حصول علم کا ایک مشتبہ، نا قابل اعتماد اور کمزور ذریعہ مانتے ہیں۔ نکولاس میلیبرانش (Nicolas Malebranche) اپنی کتاب ''جستجوئے صداقت'' میں لکھتا ہے:

> ''غلطی کا ایک بڑا ماخذ یہ غلط یقین ہے کہ حواس جو حقیقت میں ہم کو محض عملی اغراض کے لیے عطا ہوئے ہیں ماہیت اشیا کو ہم پر منکشف کر سکتے ہیں''۔ مونٹین (Montaign) لکھتا ہے:
>
> ''انسان کا علم بہت ناقص ہے۔ اس کے حواس غیر یقینی اور خطا پذیر ہیں۔ ہم کبھی نہیں کہہ سکتے کہ انہوں نے حقیقت کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ حواس کو دنیا ایسی ہی معلوم ہوتی ہے جیسی ان کی فطرت و حالت ہے۔ ادراک حسی میں خارجی اشیا نہیں، بلکہ محض آلات حس کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے۔ حواس پر یقین کرنے کے لیے ہمارے پاس ایک آلہ ہونا چاہیے جو ان کی تصدیق و تکذیب کرسکے اور پھر اس آلے کی جانچ کے لئے ایک اور آلہ ہونا چاہیے۔ اس طرح یہ سلسلہ غیر متناہی ہوگا''۔ (حاشیہ از مصنف)

اس سلسلے میں مزید مطالعے کے لیے پروفیسر لی کامٹے دو نوائے (Le Comte Du Nuay) کی کتاب *Human Destiny* کا مطالعہ بڑا مفید ہوگا جس میں حواس سے حاصل شدہ علم کی مجبوریاں اور سائنس کے مطالعہ پر مفصل تنقید موجود ہے۔ اسی طرح پروفیسر رہائن (Rhine) کی کتاب *The Reach of Mind* کا مطالعہ بھی مفید ہوگا، جو ذہن کی غیر حسی رسائی کو علم و تجربے کی روشنی میں ثابت کرتا ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

زندگی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک محض حواس سے ممکن نہیں۔ ہم زندگی کے مظاہر کا مشاہدہ کرکے زندگی کا قیاس تو کرسکتے ہیں لیکن کسی دوسرے کی زندگی کو بلاواسطہ طور پر محسوس نہیں کر سکتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حواس سے صرف مادی اشیا کا علم ممکن ہے اور وہ بھی صرف ان اشیا کے آثار اور خواص کی حد تک۔ مگر جن مسائل سے ہم بحث کر رہے ہیں وہ سب مابعدالطبیعیاتی ہیں۔ مثلاً زندگی کا مبدا اور منتہا ایسی چیزیں ہیں جو نہ ہماری آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں اور نہ ہمارے کانوں سے سنی جا سکتی ہیں۔ اس لیے حواس کے ذریعے ہم ان مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتے۔

۲۔ **عقل:** عقل انسان کو جانوروں سے ممیز کرتی ہے۔ انسانی علوم میں ترتیب اور ربط اسی کی بنا پر ہے۔ لیکن جب ہم اس بات کا جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا محض عقل زندگی کے بنیادی مسائل کا حل بھی دریافت کرسکتی ہے تو نتیجہ نفی کی صورت میں نکلتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل حصول علم کے لیے تنہا کافی نہیں۔ اس کو اپنے علاوہ اپنے سے کمتر چیزوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ کسی ایسی چیز تک پہنچنے کے لیے جس کو وہ ابھی تک نہیں جانتی، ان معلومات سے کام لینا پڑتا ہے جو اُس کو پہلے سے حاصل ہوتی ہیں۔ یہ مقدمات محسوسات ہی ہوتے ہیں۔ تمام عقلی علوم کا تجزیہ کیجیے اور عقل کا دلچسپ و طویل سفر نامہ سنیے تو معلوم ہوگا کہ حقائق کی ان نئی نئی دنیاؤں تک پہنچنے اور لا علمی کے بڑے بڑے سمندروں کو عبور کرنے میں اس کا زاد سفر حقیر محسوسات اور ابتدائی معلومات تھے۔ پس جہاں حواس کام نہ کرتے ہوں وہاں عقل اسی طرح بے بس ہوتی ہے جیسے عام طیارہ بغیر ہوا کے نہیں اڑ سکتا۔ لیکن ہم دیکھ چکے ہیں کہ زیر بحث مسائل مابعدالطبیعیاتی ہیں اور اس لحاظ سے حواس کی گرفت سے باہر ہیں اور جب حواس کی گرفت سے باہر ہیں تو عقل کی رسائی سے بھی ماورا ہیں۔

نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے

لیکن عقل کی اس نارسائی کے باوجود انسان نے اپنے تجسس اور خود فریبی کی بنا پر ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایسی کاوش کے حاصل کا نام فلسفہ ہے۔ فلسفہ، خواہ مذہب کی مخالفت میں ہو یا موافقت میں، اپنی اصلیت اور

Marfat.com

اساس کے لحاظ سے ایک ہی ہے۔ خدا کی حقیقت، اس کی صفات، اخلاق قوانین کا مقام وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو ہمارے ادراک سے باہر ہیں اور اس لیے واحد فیصلہ جو عقل ان سے متعلق صادر کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی حقیقت مدرکہ اشیا سے مختلف ہے۔ لیکن یہ واقعہ دلچسپ ہے کہ ہر اس فلسفے کے نزدیک کہ جس نے ان مسائل کے حل کو تفصیلی انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی یہ اشیا عام مدرکہ اشیا ہی کی مانند ہیں۔ اور اس طرح یونانی فلسفہ اور علم کلام دونوں ہی تجسیمیت کا شکار ہوگئے۔

۳- وجدان: وجدان یا اشراق[۱] سے مراد وہ مفروضہ حق بینی ہے جو حواس اور عقل کی مدد کے بغیر عالم ثانی اور غیبی حقیقتوں کے علم کا ذریعہ ہے۔ وہ لوگ جو اس ذریعے کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں اُن کے نزدیک حسی مشاہدہ اور عقلی استدلال اس نور باطن کے حق میں زہر قاتل ہے۔ صداقت کے یقینی حصول کے لیے شرط ہے کہ تزکیہ نفس کیا جائے اور ان کی نگاہ میں تزکیہ نفس نام ہے ترک دنیا، نفس کشی، ریاضت اور مراقبہ کا۔

ہمارے نزدیک یہ بات تو صحیح ہوسکتی ہے کہ انسان کچھ ایسی مخفی قوتیں رکھتا ہے جن کو بیدار کرکے وہ کچھ ایسی معلومات حاصل کرلے جو حواس کے ذریعے ممکن نہیں، لیکن یہ قوتیں بہر حال انسانی قوتیں ہیں اور عقل و حواس کی طرح یہ بھی محدود اور خطا پذیر ہیں۔ یہ حقیقت اس واقعے سے ثابت ہوتی ہے کہ اہل اشراق عالم ثانی کی جو تصاویر کھینچتے ہیں ان میں سے ہر ایک مختلف ہے۔ اگر وجدان خطا پذیر نہ ہوتا تو یہ اختلاف بھی ممکن نہ تھا۔

در حقیقت انسان کی قوت عقلی ہو یا قوت روحانی کوئی بھی اس کے حواس اور خارجی موثرات کے اثر سے بالکلیہ آزاد نہیں۔ اس کے ماحول، اس کے افکار و عقائد اور ان مقدمات کا، جو اس کے یا اس کی جماعت اور قوم کے نزدیک مسلم ہیں، اس کی

۱- مصنف نے وجدان کا لفظ اشراق کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ یہ استعمال اس اصطلاحی مفہوم سے کچھ مختلف ہے جو علم کلام اور منطق میں اس اصطلاح کو حاصل ہے۔ علم کلام میں اس کا اصل مفہوم یہ ہے:

> انسانی علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک بلا واسطہ اور دوسرا بالواسطہ۔ بالواسطہ علم کی قسموں میں سے ایک قسم وجدان ہے۔ ہر شخص کو اپنی کیفیات و حالات کا جو حضوری علم بغیر کسی واسطے کے ہوتا ہے۔ وہ منطقی اصطلاح میں وجدان کہلاتا ہے۔ اور یہ علم انسان کو اس زندگی کے پہلے لمحے سے عطیہ ربانی کی حیثیت سے ملتا ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

تحقیقات اور مشاہدات پر ضرور اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشراقیوں کو اپنے کشف و مشاہدے میں کبھی یونانی و مصری اوہام کی تائید نظر آتی ہے اور کبھی فلسفۂ یونان کے بہت سے مفروضات حقیقت نظر آنے لگتے ہیں۔

پھر اگر حاسے کی صحت پورے طور پر تسلیم بھی کرلی جائے تو سوال یہ ہے کہ اس حاسے کے محسوسات کیا ہیں؟۔ اس سے کن چیزوں کا احساس ہوتا ہے؟ اہلِ کشف کہتے ہیں کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے، نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں، اور نہ ہی کائنات و انسان کا باہمی تعلق واضح ہوتا ہے۔ گویا بنیادی سوالات جوں کے توں رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل اشراق نہ تو ان مسائل کا کوئی واضح جواب دے سکے اور نہ کوئی مفصل اور مثبت نظام زندگی پیش کر سکے۔ خود اپنی زندگی گذارنے کے لیے بھی انہیں اپنے ہی زمانے کے نظام کی اقدار مستعار لینی پڑیں۔ چناں چہ پراکلس[1] اگر مصری رسوم دینی اور مذہبی تقریبات کا پابند تھا تو جولین[2] رومی بت پرستی کا۔ ویسے دونوں کا شمار اہلِ کشف میں کیا جاتا ہے۔

اس مختصر بحث کا حاصل یہ ہے کہ انسان کی تمام ظاہری اور باطنی قوتیں، اس کے حواس، اس کی عقل اور اس کا حاسۂ باطنی، اس کی زندگی کے اہم اور بنیادی سوالات کا صحیح جواب دینے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ ان سوالات کے جواب کی کوئی راہ ہی نہیں۔ ان سوالات کا حل پیش کرنے کا دعوے دار ایک ایسا گروہ بھی ہوتا ہے جو اپنے آپ کو رسول اور نبی کہتا ہے اور اپنا ذریعۂ علم وحی بتاتا ہے۔ چناں چہ آئیے، وحی اور رسول کی روایات کو بھی پرکھ کر دیکھیں کہ ان کا کیا مقام ہے۔

۴۔ وحی: وحی نام ہے اس علم کا جو خداوند تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں پر انسانوں کی ہدایت و معرفت کے لیے منکشف کرتا ہے۔ دوسرے تمام انسانوں تک یہ علم روایت اور نقل کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ چناں چہ وحی یا بہ الفاظ دیگر رسالتی علم سے متعلق تین باتیں خصوصی ہیں۔

(۱) اس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ عام طور پر ان اشیا سے متعلق ہوتا ہے جو ظاہری حواس سے مخفی ہیں۔

۱۔ Proclus   ۲۔ Jullian

Marfat.com

(ب) اس علم کا ذریعہ عام ذرائع علم سے مختلف ہوتا ہے۔ اس میں نہ ادارک حسی ہوتا ہے اور نہ استدلال منطقی، بلکہ ایک ناقابل بیان پیرایے میں نبی یک بیک نئے حقائق سے ہم کنار ہوجاتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ ان حقائق سے زیادہ واضح ہوتے ہیں جن کا ہم اپنے حواس سے ادارک کرتے ہیں۔

(ج) الہامی علوم اشراقی علوم کی طرح بے معنی اور معاشرتی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے بلکہ وہ زندگی ہی کی ہدایت اور شرح کے لیے ہوتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ایک عملی نظام حیات کی بنیاد بنتے ہیں۔

آیے اب ان تینوں باتوں کو ذہن میں رکھ کر یہ غور کریں کہ ان میں سے کون سی خلاف عقل اور منطقی ہے۔ کیا وحی کا مابعدالطبیعیاتی اشیا سے علم فراہم کرنا غیر معقول ہے؟ اگر مابعدالطبیعیاتی اشیا ہیں، جیسا کہ عقل عام اشارہ کرتی ہے کہ ہیں، تو پھر ان سے متعلق علم بھی یقینی ہوگا۔ کیا وحی کا ایک خاص طریقہ پر وارد ہونا غیر منطقی ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کائنات میں ہر جانب انسان کی ضرورتوں اور آسائشوں کی تکمیل کا سامان بکھرا ہوا ہے۔ اس کی چھوٹی سے چھوٹی خواہش اور حقیر سے حقیر حاجت بھی ایسی نہیں جو اس دنیا میں پوری نہ ہوسکے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مہربان آقا نے انسان کی تمام ضروریات اس کائنات میں مہیا کر رکھی ہیں۔ لیکن اس دنیا میں عام انسان کی سب سے اہم ضرورت — زندگی کے بنیادی مسائل کا حل — بہ ظاہر موجود نہیں۔ عقل اشارہ کرتی ہے اور فہم مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مہربان آقا جس نے ہر ضرورت کا سامان تکمیل بخشا، یہ نہیں کرسکتا کہ اس عظیم ضرورت کو تشنۂ تکمیل چھوڑ دے اور چوں کہ ضرورت عام طریقے سے پوری نہیں کی جا رہی ہے اس لیے یقیناً اس کے لیے کوئی خاص طریقہ مخصوص کیا گیا ہے۔ پھر کیا یہ بات خلاف عقل ہے کہ الہامی علوم نظام زندگی کی بنیاد ہیں؟ جب وحی متعلق ہی ان اشیا سے ہے جو عین حیات ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ وحی کا انکشاف کردہ علم بھی زندگی کی ہدایات و قیادت کے لیے ہوگا۔ چناں چہ تاریخ گواہ ہے کہ الہامی علوم عملی طور پر بعض معاشروں کے نظامات زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

وحی کی حقانیت: اب جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ وحی کسی طور پر بھی خلاف عقل و دانش نہیں تو ایک عاقل و دانش مند کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ الہامی علوم کی اسی طرح پرکھ کرے جیسے دیگر روایتی علوم کی کی جاتی ہے، اور اگر یہ علوم پرکھنے پر صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان لائے۔

171941

Marfat.com

جب کسی شخص کے قول کی تصدیق یا تکذیب کرنی مقصود ہوتی ہے تو ہمارے پیش نظر دو باتیں ہوتی ہیں۔ ایک قول نقل کرنے والے کی شخصیت اور دوسرے قول کے معنی۔ آئیے انہی کسوٹیوں پر ہم رسول کے دیے ہوئے علم کو بھی پرکھیں۔

کسی قول کی صحت کے لیے ضروری ہے کہ وہ انسانی تجربے اور مشاہدے کے خلاف نہ جاتا ہو۔ اگر کوئی شخص ہاتھی کو ہوا میں اڑتا اور چیل یا کبوتر کو پانی کی سطح کے نیچے تیرتا بتاتا ہے تو اس کا قول قابل اعتبار نہیں، اس لیے کہ عام انسانی مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ لیکن نبی جو چیزیں بتاتا ہے وہ یا تو مابعدالطبیعیاتی ہیں، اور اس لحاظ سے تجربے اور مشاہدے کی قلمرو سے باہر ہیں، یا عقل و حواس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی پوری تاریخ میں کسی نبی نے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں کہی جو خلاف عقل ہو۔ ہاں ماورائے عقل بہت سی باتیں کہی گئیں، لیکن کسی چیز کا عقل کی دسترس سے باہر ہونا اور بات ہے اور اس کا خلاف عقل ہونا بالکل دوسری شئے ہے۔

قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ ایک گروہ کے افراد جو ایک ہی قسم کی اشیا سے متعلق علم فراہم کرتے ہوں، ان کے اقوال آپس میں ٹکراتے نہ ہوں۔ انبیائے کرام کی تعلیمات اس بات کی شاہد ہیں کہ ان میں تضاد نہیں۔ تفصیلات میں اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اصول و مبادی ایک ہی ہیں۔

قول کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ اس کو عملی زندگی میں اپنانے سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے۔ اگر یہ نتائج خوشگوار اور انسانیت کے حق میں مفید ہیں تو گمان غالب ہے کہ قول صادق ہوگا اور بہ صورت دیگر باطل۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی بھی انبیا کی تعلیمات کو قبول حاصل ہوا یکایک انسانی معاشرہ کی بیشتر خرابیاں دور ہوگئیں اور وہ بہت جلد عدل و انصاف کی نعمتوں سے ہم کنار ہوگیا۔

قول کو جانچ لینے کے بعد قول نقل کرنے والے کی باری آتی ہے۔ ان دیکھی چیز سے متعلق قول کی تصدیق یا تکذیب کرنے کے لیے راوی کی شخصیت کی پرکھ اور بھی ضروری۔ قول کی صداقت پر دو صورتوں میں اثر پڑ سکتا ہے ایک شعوری اور دوسرے لا شعوری۔

قول کو مسخ اور غیر معتبر سمجھے جانے کی ایک صورت وہ ہے کہ جب راوی بد دیانت اور بد کردار ہو۔ ایسا شخص اپنے ذاتی منافع کے لیے یا تو اقوال

Marfat.com

گھڑ سکتا ہے یا ان کو مسخ شدہ صورت میں پیش کرسکتا ہے۔ لیکن انبیا کے بارے میں ان کے دشمنوں کو بھی اس بات کا اقرار ہوتا ہے کہ وہ بلند کردار اور راست گو ہیں۔

قول کا مسخ ہو جانا لاشعوری طور پر بھی ممکن ہے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ راوی کے حواس درست نہ ہوں۔ لیکن انبیا کے بارے میں یہ حقیقت بھی مسلم رہی ہے کہ وہ سلیم العقل، صحیح الدماغ اور صائب الرائے ہوتے ہیں۔

لاشعوری تنسیخ و تبدیلی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قول راوی کے زمانے کے تکنیکی علوم سے متاثر ہوتا لیکن ہر نبی اگرچہ تمام اشیا سے متعلق کماحقہ معلومات رکھتا ہے، لیکن وہ تکنیکی اور ادبی علوم سے نا واقف ہوتا ہے۔ یہ امر اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کی تعلیمات اس کے اپنے یا کسی دوسرے زمانے کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ حقیقتاً کسی غیر معمولی ذریعے سے اس پر منکشف ہوئیں اور بغیر کسی تبدیلی کے اس کی زبان سے جاری ہوگئیں۔

مذھب اور تمدن

اوپر کی بحث سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ زندگی کے بنیادی مسائل کے حل کی واحد صورت وحی اور رسالت ہے۔ یہ نہ تو دیگر علوم کی طرح مادی اشیا تک محدود ہیں اور نہ خطا پذیر ہیں۔ اب ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ وحی اور الہام کی بنا پر جو تمدن تعمیر ہوتا ہے وہ کس حد تک ان نظامہائے حیات اور تمدنوں سے مختلف ہوتا ہے جو حواس، عقل، اور اشراق کی بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ آئیے پہلے آخرالذکر تین کا مطالعہ کریں۔

۱۔ **حسی تمدن[۱]**: حسی تمدن انسانوں کا مقبول ترین تمدن ہے۔ اس سے زیادہ سہل اور اس سے زیادہ انسانی خواهشوں کی تکمیل کرنے والا کوئی اور نظام نہیں۔ حسی تمدن کی بنیاد حواس اور اس کے فیصلوں پر ہے۔ حواس سے چوں کہ صرف مادی اشیا کا ادراک کیا جا سکتا ہے اس لئے حسی تمدن کے نزدیک صرف وہ اشیا حقیقی ہیں جو قابل ادراک ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ وہم کا نتیجہ ہے۔ نہ کسی غیر مادی خدا کا کوئی وجود ہے اور نہ حیات بعد موت کی کوئی

۱۔ *Sensate Culture* کی اصطلاح امریکی ماہر عمرانیات پروفیسر سوروکن سے مستعار ہے اور مادہ پرستانہ تمدن کے لئے اس سے بہتر اصطلاح موجود نہیں۔ عرف عام میں ایسے تمدن کو مادی تمدن (*Materialistic Culture*) بھی کہا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

حقیقت۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کی بنا پر انسان اپنے اعمال میں کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہو جاتا ہے۔ وہ من مانی کاروائی کرتا ہے اور اس عمل کا مرتکب ہوتا ہے جو اُس کے اپنے نفع میں ہو۔ اسے اس بات کا خیال نہیں ہوتا کہ اخلاقی طور پر وہ عمل جائز ہے یا ناجائز۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کا معیار ہی ذاتی نفع اور لذت نفس قرار پاتے ہیں اور ہر وہ عمل جائز ٹھہرتا ہے جس سے جسمانی آرام اور مسرت حاصل ہو۔

حسی تمدن کی ایک دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ انسان حاضر کو غائب کے مقابلے میں ترجیح دیتا ہے۔ اس کا مقصد سطحی منافع کا جلد از جلد حصول قرار پاتا ہے۔ اس بنا پر حسی تمدن کا ہر شخص مضبوط کردار سے عاری ہوتا ہے۔ اس میں صبر اور اخلاقی جرأت کا مادہ نہایت کمزور ہو جاتا ہے اور اس کا ایمان یہ ہوتا ہے کہ

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

اسی نظریۂ اخلاق اور طرز فکر کی بنا پر معاشرہ مختلف بد اخلاقیوں اور ظلم و نا انصافی کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ حسی تمدن پر کار بند اقوام کبھی اہل مدین کی طرح کم تولنے اور بے ایمانی کو جزو زندگی بنا لیتی ہیں اور کبھی قوم لوط کی طرح حیوانی جذبے کی تسکین میں حد سے آگے بڑھ جاتی ہیں۔ آج بھی حسی تمدن اور مادی طرز فکر کے مظاہر ریس، کلب، ناچ گھر، شراب خانے اور قمارخانے ہیں۔ جو انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مضر اور رکیک جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی حیثیت معاشرے میں اب مستقل سماجی اداروں کی ہے۔

حسی تمدن جب کسی ایسی قوم کے درمیان پرورش پاتا ہے جسے اپنی اجتماعیت کا کچھ زیادہ احساس ہوتا ہے تو معیار اخلاق لذتیت کے بجائے افادیت قرار پاتا ہے۔ یعنی شخصی مسرت کے بجائے پوری قوم کی یا قوم کے زائد سے زائد افراد کی مسرت مقصود ہوتی ہے۔ اس صورت میں بھی حسی تمدن انسانیت کے حق میں تباہ کن اور ہلاکت خیز ثابت ہوتا ہے۔ پہلے اگر ایک ہی معاشرے کے افراد ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے تو اب قوم، قوم سے نبرد آزما ہوتی ہے۔ ہر قوم اپنے معاشی اور مادی مفاد کے لیے دوسری اقوام پر ظلم و زیادتی کرنا اپنا مسلک بنالیتی ہے۔ اس طرح قوم و ملک کی عظمت کے نام پر انسان، انسان کا خون بہاتا ہے۔ اگر دور جاہلیت میں عرب قبائل محض اس لیے ایک دوسرے سے مصروف پیکار رہتے تھے

Marfat.com

که اپنے قبیلے کا نام روشن کریں تو آج کے روشن دور میں بھی حسی تمدن کے علم بردار اپنی قوم کی سرخروئی اور عظمت کی خاطر دو عظیم جنگوں میں کروڑوں انسانوں کا خون بہا چکے ہیں اور ان دو جنگوں میں مرنے والوں کی تعداد انسانی تاریخ کی باقی تمام جنگوں میں مقتولین کی مجموعی تعداد سے زیادہ تھی !

۲۔ **عقلی تمدن:** خاص عقلی تمدن کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی ۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انسان اپنے افعال میں عاقل سے زیادہ غیر عاقل ہے۔ عقل سے بڑھ کر جذبات عمل کی بنیاد ہیں ۔ ایسے تمدن جو عقلی کہلاتے ہیں صرف جزوی یا سطحی طور پر عقلی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرت اور سماج تو دور کی چیزیں ہیں خود فلسفہ بعض اوقات عقلی نہیں رہتا ۔ افلاطون اور ارسطو جیسے فلاسفہ، جو عقل کی اہمیت و عظمت کے معترف تھے، بہت سے نظریات میں یونانی اوہام کے پیرو تھے۔ مزید یہ کہ عقل، بجائے جذباتی اور وہمی اجزائے تمدن کی تنقید کرنے کے ، خود ان کی موافقت میں دلائل تلاش کرتی ہے اور اس کو اپنے حسی تمدن کا آلہ ٔ کار بنا لیتی ہے۔ چناں چہ یونانی حکیموں نے اپنے زمانے کی ان تفریحات کے لیے، جن سے بڑھ کر خون آشامی اور شقاوت کا فعل نہیں ہو سکتا، کیا کیا تاویلات نہیں کیں اور اس کی معصومیت پر کیسے کیسے دلائل قایم نہیں کیے۔ جاہلیت عرب کی رسم دختر کشی اور ہندوستان کی ستی کی رسم سے متعلق اس زمانے کے عقلا نے کیا فلسفے نہ تراشے ہوں گے ۔

یورپ کے موجودہ تمدن کو عقلی اور علمی تمدن سمجھا جاتا ہے لیکن اس میں عقل کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ حسی تجربات پر صاد کرے اور حسی خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہو ۔

۳۔ **اشراقی تمدن :** اشراق حواس پرستی اور مادیت کی بالکل ضد ہے۔ حواس پرستی میں جس طرح روح اور اس کے متعلقات کا انکار کیا جاتا ہے یا ان کو نظر انداز کیا جاتا ہے ، اشراق میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ کی جاتی ہے۔ اس کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ انسان کا جسم ایک قفس ہے جس میں طائر روح مقید ہے ۔ وہ قفس اس کی ہر قسم کی ترقی اور پرواز میں حارج ہے۔ روح اپنے مرکز اصلی اور سرچشمہ ٔ حقیقی سے اس وقت تک اتصال پیدا نہیں کرسکتی جب تک کہ اس قفس سے آزاد نہ ہو۔ اس لیے یا تو قفس توڑ دیا جائے یا اس کی تیلیوں کو اس قدر کمزور کردیا جائے کہ طائر روح جب چاہے آزادانہ اپنے آشیانے کی طرف پرواز کرسکے ۔

Marfat.com

اس فلسفے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جسم اور اس کے متعلقات سے غفلت برتی جائے۔ مادیت کا ہر طرح ازالہ کیا جائے اور تجرد و رہبانیت کی زندگی اختیار کی جائے۔ چناں چہ جن مذاہب اور اخلاقیات پر اس اشراقی فلسفہ کا اثر پڑا ان کا تمدن اسی رنگ میں رنگ گیا۔ ایسے تمدن کی سب سے بڑی مثال دور وسطیٰ کا مسیحی یورپ ہے۔ مسیحیت بہت جلد مذہب عیسوی کے نمایندوں اور علم برداروں کی کج فہمی کی بنا پر اشراقیت سے زیادہ راہبانہ اور غیر فطری نظام بن گئی۔ خواتین کے وجود کو دنیا کے لیے لعنت اور دینی ترقی میں سب سے بڑا مانع سمجھا جانے لگا، شہروں کو اجاڑ کر صحراؤں میں زندگی بسر کرنا معراج انسانیت خیال کیا جانے لگا۔ جسم کشی، خود آزاری اور خلاف فطرت ریاضتوں کے جو لرزہ خیز واقعات لیکی نے تاریخ یورپ[1] میں نقل کیے ہیں، ان سے ان بے اعتدالیوں کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے جو مسخ شدہ مسیحیت نے انسانیت و تمدن کے حق میں کیں۔

اس آدم بے زار اور مردم آزار نظام روحانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسوی سلطنت اور مذہب کا جہاں جہاں اثر تھا وہاں تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔ ملک کی آبادی سرعت کے ساتھ گھٹنے لگی۔ امراض، اموات اور قحط سالیوں کی کثرت ہوئی۔ تعلیم فنا ہونے لگی۔ شہریت کے آثار مفقود ہونے لگے۔ وسائل حیات برائے نام رہ گئے۔ اور پوری مسیحی دنیا میں جہالت، وحشت اور تاریکی کا دور دورہ ہوگیا۔ یہاں تک کہ قرون وسطیٰ، قرون مظلمہ[2]، کا ہم معنی قرار پایا۔

زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام

آپ نے دیکھا کہ محض حواس، عقل یا اشراق ایک مکمل و متوازن معاشرہ قایم کرنے میں کس طرح ناکام رہے۔ آئیے اب ہم دریافت کریں کہ وحی و الہام کس طور پر ایک ایسا معاشرہ ترتیب دینے میں کامیاب ہوتے ہیں جو عدل و انصاف سے معمور ہو۔ الہامی معاشرے کی اساس وہ حل ہوتا ہے جو انبیائے کرام زندگی کے بنیادی مسائل سے متعلق پیش کرتے ہیں۔ چناں چہ الہامی تمدن کے مطالعے سے پیشتر ان تعلیمات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انبیائے کرام کی تعلیمات، جو قرآن پاک میں محفوظ ہیں، زندگی کے بنیادی مسائل کا مندرجۂ ذیل حل پیش کرتی ہیں۔

۱۔ حوالے کے لیے ملاحظہ ہو لیکی (Lecky) کی کتاب *History of Western Morals*
نیز پروفیسر برنس (Burnse) کی حالیہ کتاب *A History of Western Morals*

۲۔ Dark Ages

Marfat.com

(ا) انسان اور اس کی زندگی — انسان اور اس کی زندگی سے متعلق چار اہم نکات واضح کیے گئے ہیں:

اول، انسان خدا کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دوئم، وہ اشرف المخلوقات ہے، یعنی محض حیوان ناطق نہیں بلکہ دیگر مخلوقات پر اخلاقی برتری رکھتا ہے۔

سوئم، انسان کی زندگی خدا کی عبادت کے لیے ہے۔ یعنی انسان کی تخلیق کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی دی ہوئی ہدایتوں پر عمل پیرا ہو، خواہ یہ سجود و قیام سے متعلق ہوں خواہ تجارت و سیاست سے۔

فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَهٗ ؕ وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَهٗ ؕ

پس جس نے ذرہ برابر بھلائی کی وہ دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی وہ بھی دیکھ لے گا۔ (الزلزال، ۷-۸)

چہارم، انسان کی موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

(ب) کائنات کی حقیقت — کائنات سے متعلق تین نکات قرآن پاک میں واضح کیے گئے ہیں۔

اول، انسان کی طرح ہر شے خدا کی تخلیق کردہ ہے، دوئم اس کائنات کا نظام خدا کے تعین کردہ اصول (سنت اللہ یا فطرت) کے مطابق چل رہا ہے، سوئم، یہ دنیا انسان کے استعمال اور تصرف کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ اور اس طرح انسان کے لیے آزمایش کا سامان بھی بہم پہنچاتی ہے۔

(ج) خدا اور اس کی صفات — خدا اور اس کی صفات سے متعلق قرآن پاک کے صفحات بھرے ہوئے ہیں، جن کا احاطہ اس مختصر باب میں ممکن نہیں۔ صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اول، خدا وہ ہستی ہے جو اس کائنات کی واحد خالق، مدبر اور آقا ہے۔ خدا نہ جسم رکھتا ہے اور نہ جسمانی حاجات۔ چوں کہ اس کی مثالی موجود نہیں اور چوں کہ اس کی ذات کا ادراک حواس کے لیے ممکن نہیں، اس لیے خدا کا کوئی واضح تصور کوئی ذہن انسانی ترتیب نہیں دے سکتا۔

Marfat.com

خدا خالق و آقا ہونے کے ساتھ عادل و رحیم بھی ہے۔ اس کی صفات ربوبیت، عدل اور رحم ہی کی بنا پر کائنات میں تنوع کے ساتھ ساتھ توازن و اعتدال ہے۔ وہ جس طرح جسمانی زندگی کا رب ہے، اسی طرح اخلاقی روحانی زندگی کا بھی رب ہے، اس لیے اس کی صفت ربوبیت کا اور صفت عدل کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو راہ ہدایت دکھاتا، چناں چہ اس نے وحی کے ذریعے سے یہ راہ منکشف کی اور صفت عدل کی بنا پر یوم آخر میں اچھے اور برے کام کا بدلہ دے گا۔

اب ذرا اس الہامی تمدن کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کرکے دیکھیے کہ ان کا انسان کی عقلیت و نفسیت اور اس کے اخلاق و اجتماع پر کیا انقلاب انگیز اثر پڑتا ہے۔

سب سے پہلے اس عالم سے متعلق یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ نہ تو بے بادشاہ کی سلطنت ہے اور نہ چند بادشاہوں کی مشترک سلطنت بلکہ اس کا ایک ہی مالک ہے، جو اس کا خالق و صانع بھی ہے اور مدبر و حاکم بھی۔ اس کا سب سے پہلا اثر ذہن انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا کے بندے ہونے کی حیثیت سے قبائل اور اقوام کی تقسیم ظاہری اور سطحی معلوم ہونے لگتی ہے اور انسانیت کے ایک وحدت ہونے کا یقین راسخ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں زندگی کے با مقصد ہونے کا خیال اور آخرت کا احساس عمل کی اصلاح کا عظیم ذریعہ بنتے ہیں۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ عیش و تفریح میں وقت ضائع کرنا برا معلوم ہوتا ہے۔ ظلم و نا انصافی سے طبیعت گھبراتی ہے۔ احساس ذمہ داری بڑھ جاتا ہے۔ انسان کا قتل تو بہت بڑی چیز ہے معمولی ایذا رسانی بھی ضمیر پر بار گزرتی ہے۔

خلافت اور نیابت کا تصور حاکم کو من مانی کارروائی سے باز رکھتا ہے۔ وہ اپنے کو مخلوق خدا کا مالک اور آقا نہیں بلکہ خدا کا امین اور بندوں کا خادم سمجھتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اسی فکر میں رہتا ہے کہ کہیں اس کے ملک میں ظلم و زیادتی راہ نہ پاجائیں۔ عدل و انصاف کے نفاذ کے لیے وہ ہمہ تن اور ہمہ وقت مصروف رہتا ہے۔ خلافت اور آخرت کے تصور سے جو احساس ذمہ داری انسانی ذہن میں پیدا ہوتا ہے اس کی چند مثالیں الہامی تمدن کے دو ادوار سے پیش کی جاتی ہیں۔

ایک جلیل القدر خلیفہ، جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے حکمراں تھے، موٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو پوچھتے کہ کیا سب مسلمان یہ کھاتے ہیں یا کھا سکتے ہیں؟ جب جواب نفی میں ملتا تو کھانا واپس کردیتے۔

Marfat.com

کسی گھوڑ دوڑ میں ایک مصری نے کہا ''واللہ میرا گھوڑا آگے ہے''۔ قریب ہی گورنر مصر کا ایک بیٹا بھی گھوڑا دوڑا رہا تھا، اس نے مصری کے یہ کہنے پر ایک طمانچہ مارا اور کہا ''لو ایک شریف زادے کا یہ طمانچہ''۔ اس مصری نے مدینہ پہنچ کر خلیفہ سے شکایت کی۔ خلیفہ نے گورنر اور اس کے لڑکے کو مدینہ طلب کیا۔ جب وہ آگئے تو مصری کے ہاتھ میں میں کوڑا دیا اور کہا ''مار اس شریف زادے کو''۔ جب وہ لڑکے کو مار چکا تو کہا ''اب یہی کوڑا باپ کے سر پر کھیا، اس لیے کہ اس لڑکے نے تجھ کو جو طمانچہ مارا تھا وہ محض اپنے باپ کی حکومت کے گھمنڈ میں مارا تھا''۔ پھر، آپ نے گورنر سے کہا ''تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا حالاں کہ وہ اپنی ماؤں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے''۔

ایک اور خلیفہ کی احتیاط کا یہ حال تھا کہ سرکاری کام کے لیے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کردیلے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے۔

یہ ہے وہ مختصر سا خاکہ جس پر الہامی تمدن قایم ہوتا ہے۔ اس میں نہ حسی تمدن کی اغراض پسندی ہوتی ہے اور نہ اشراقی تمدن کا ترک دینا۔ نفع پرستی کے بجائے چند مستقل اخلاقی اصول ہیں جو وسیع تر انسانیت کے حق میں ہر طرح سے مفید ہیں۔ اور جن کی پابندی ہر صورت میں ضروری ہے، خواہ حالات سازگار ہوں یا نا سازگار۔

زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

ترک دنیا اسلام کی نظر میں ایسا ہی برا ہے جیسا دنیا کی مصروفیات میں غرق ہوجانا اور خدا کو بھول جانا۔ اسلام معاشرتی زندگی کی اصلاح چاہتا ہے، اس کی بیخ کنی نہیں۔ اس لیے اس نے صاف طور سے اعلان کیا کہ ''لارھبانیۃ فی الاسلام'' (اسلام میں رھبانیت نہیں)۔ چناں چہ اسلامی معاشرہ ان تمام برائیوں سے محفوظ رہتا ہے جو نفس کشی اور آدم بیزاری کا لازمی ثمر ہیں۔

اوپر کی پوری بحث سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ:

(۱) عقلی تنقید سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل صرف وحی اور رسالت کے ذریعے ممکن ہے؛

Marfat.com

اور (۲) ان مسائل کے مختلف جوابات پر تمدن کی جو عمارات تعمیر ہوتی ہیں ان میں سب سے مستحکم اور صحت مند اور لیاقت بخش وہ تمدن ہے جس کی بنیاد وحی و الہام پر ہے -

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید ابوالحسن، ندوی، مذہب و تمدن ادارہ، نشریات اسلام رحیم یار خان -

مولانا سید ابوالاعلیٰ، مودودی، اسلام اور جاهلیت- اسلامکہ پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاهور -

مولانا مناظر احسن، گیلانی، الدین القیم (باب اول و دوم)- نفیس اکیڈمی، کراچی -

مولانا سعید احمد اکبر آبادی وحی الہی (باب اول و دوم)- ندوۃالمصنفین، دهلی -

رشید رضا، الوحی المحمدی (ترجمہ مولانا رشید احمد ارشد)- نفیس اکیڈمی، کراچی -

---

Marfat.com

۳

دور حاضر اور مذہب*

مذہب کی ضرورت کا مسئلہ

مذہب ضروری ہے یا نہیں؟ بہ ظاہر یہ ایک سیدھا سا آسان سوال ہے۔ اس سوال کا جواب جب کوئی شخص اثبات میں دیتا ہے تو عام طور پر اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ مذہب ایک طرف تو انسان کی انفرادی فلاح کا ضامن ہے اور دوسری طرف انسانی سماج مذہب کو اپنائے بغیر بہبود نہیں پا سکتا۔ ان وجوہ کی بنا پر مذہب انسانی زندگی کے لیے لازمی ہے۔ یہ جواب ممکن ہے کچھ لوگوں کو صحیح معلوم ہو اور کچھ کو غلط۔ ممکن ہے یہ جواب دینے والوں کے پاس اس کے حق میں محکم دلائل ہوں اور اس کے انکاریوں کے پاس اس کے غلط ہونے کے۔ اس وقت ہمیں اس جواب کی صحت یا عدم صحت سے بحث نہیں بلکہ اس سوال کے ان معنی سے بحث ہے جو اس سے زیادہ بنیادی قسم کے جواب کے طالب ہیں۔ اس لیے کہ آج کا ذہن مذہب کے متعلق جس انداز سے سوچتا ہے اور اس کے بارے میں جو شکوک و شبہات رکھتا ہے وہ اس سوال کو کہ 'مذہب ضروری ہے یا نہیں؟'، ایک سیدھے سادے سوال کی سطح سے اٹھا کر ایک بنیادی قسم کا سوال بنا دیتا ہے۔ میری مراد اس سے یہ ہے کہ مذہب کی ضرورت کے سوال کے پس منظر میں موجودہ ذہن خود مذہب کے 'جواز' کا طالب ہے۔ اس کے لیے یہ امر کہ مذہب انسان کی انفرادی یا سماجی زندگی کے لیے 'مفید' ہے یا 'مضر' ایک ثانوی درجے کا سوال ہے۔

* یہ باب فلسفۂ مذہب پر ڈاکٹر منظور احمد کی ایک زیر ترتیب کتاب سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

بات در اصل یہ ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کی سائنسی ترقیات اور عام علمی فضا نے موجودہ ذہن پر اس طرح اثر ڈالا ہے کہ مذہب کے بارے میں وہ سوالات جو کسی زمانے میں صرف فلسفیانہ سوالات سمجھے جاتے تھے آج کل عام ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ یہ البتہ ضروری نہیں کہ آج کے سائل کے ذہن میں ان سوالوں کے پیچھے کوئی فلسفیانہ پس منظر بھی کار فرما ہو۔ لیکن، چوں کہ اس قسم کے سوالات اور شکوک و شبہات کی نوعیت فلسفیانہ ہے اس لیے مذہب کی ضرورت کا سوال ایک ایسے جواب کا متقاضی ہے جو فکری اور فلسفیانہ بنیادوں پر دیا گیا ہو۔ اسی لیے مذہب کی ضرورت کے مسئلے پر بات کرنے کے لیے کسی حد تک فلسفہ سے سروکار ناگزیر ہے۔

مذہب کی ضرورت کے خلاف آج کل جو بات سب سے عام ہے وہ یہ خیال ہے کہ ''آج کا دور سائنس کا دور ہے اور اس میں مذہب کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔ یہ جملہ چاہے کوئی کہے یا کسی کے دل میں یہ اَن کہا خیال ہی کھٹکے۔ اس کا منشا عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ مذہب ہم سے جن چیزوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے وہ سائنس نے غلط ثابت کر دی ہیں۔ یا مذہبی تصورات غیر سائنسی تصورات ہیں۔ وہ لوگ جو اس خیال کے حامی ہیں ان کے نزدیک سائنسی تحقیق نے مذہبی حقائق کے بارے میں کچھ ایسے انکشافات کیے ہیں جن کی روشنی میں مذہبی حقائق پر ایمان لانا عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ فی الحال ہماری بحث اس بنیادی مفروضے سے ہے جو ''سائنسی دور میں مذہب کی گنجائش نہیں ہے'' کے نعرے کے پیچھے کار فرما ہے اور جس کی بنا پر ہمارے ہوش مند سائنسداں اور فلسفی مذہب کو موجودہ دور میں باطل تصور کرتے ہیں۔ آگست کومت نے، جو انیسویں صدی کا ایک عظیم فرانسیسی مفکر سمجھا جاتا ہے، اس مفروضے کو نہایت جامع طریقے سے پیش کیا ہے اور گویا ان سارے مفکروں کے منہ میں زبان رکھ دی ہے جو سائنس کی عظمت اور مذہب کی رجعت کے قائل ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانی فکر تین ادوار میں منقسم کی جا سکتی ہے۔ مذہب اس فکر کا دور اولین ہے، دوسرا دور فلسفیانہ یا مابعدالطبیعیاتی ہے اور تیسرا سائنسی ہے۔ مذہبی تصورات کو کچھ تو دوسرے دور میں فلسفہ نے ختم کیا اور رہے سہے اس تیسرے دور میں سائنسی طریق فکر کی آمد کے ساتھ ختم ہو گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان جب شعور کی منزل میں قدم رکھتا

Marfat.com

ہے اور غور و فکر کی ابتدا کرتا ہے تو اس کے ذہن میں لازماً کچھ سوال ابھرتے ہیں - مثلاً یہ کہ وہ خود کیا ہے ؟ کہاں سے آیا ہے ؟ یہ کائنات کیا ہے ؟ یہ زمین و آسمان، یہ مہر و ماہ ، یہ ثوابت و سیارے کہاں سے آئے ؟ اس کا اور اس کائنات کا آپس میں کیا تعلق ہے ؟ یہ کارخانہ قدرت کس طرح چل رہا ہے ؟ وغیرہ - مفکرین کا عام خیال یہ ہے کہ مذہب ، فلسفہ اور سائنس ان ہی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوئے ہیں - ان کا کہنا ہے کہ ان جوابوں میں ایک تاریخی ربط پایا جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ ابتدائے آفرینش میں جب فکر انسانی عہد طفلی سے گذر رہی تھی تو انسان اس کائنات میں ہونے والے واقعات کی توجیہ غیر مرئی خدا ، یا خداؤں کے توسط سے کرتا تھا - مثلاً یونانی دیومالا کائنات کی ہر قوت کے پیچھے کسی دیوی یا دیوتا کا ہاتھ کار فرما دیکھتی ہے - دیوتاؤں کی یہ مجلس آسمان پر بیٹھ کر اس دنیا میں ہونے والے واقعات کا ، چاہے وہ قدرتی ہوں یا انسانوں کے پیدا کردہ ہوں (مثلاً کسی جنگ کا چھڑنا یا اس میں کسی کی فتح و شکست ہونا) فیصلہ کرتی ہے اور انسان ان آسمانی بازی گروں کے ہاتھوں کٹ پتلی کی طرح ناچتے رہتے ہیں - فکر انسانی کا یہ عہد طفلی جب ختم ہوا اور عنفوان شباب کا زمانہ آیا تو کائنات کے واقعات کی توجیہ میں دیوی دیوتاؤں کی جگہ قوت ، مادہ ، شعور وغیرہ قسم کے مابعدالطبیعیاتی تصورات نے لے لی - یہ زمانہ فلسفہ کا زمانہ تھا - اس زمانے میں ما بعد الطبیعیاتی نظاموں نے اس کائنات اور انسان کے بارے میں مربوط اور مکمل قسم کے نظام پیش کیے ، جن کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ کائنات کے مسئلے کا حل ان نظاموں میں پوشیدہ ہے اور ہر واقعے کی توجیہ ان نظاموں کی مدد سے ممکن ہے - یونانی عہد میں ارسطو اور افلاطون، یا زمانہ جدید میں ہیگل کے نظام اس قسم کی عقلی توجیہوں کی مثال کی حیثیت سے پیش کیے جا سکتے ہیں - لیکن یہ عہد بھی اقتضائے زمانے سے ختم ہوا - انسانی فکر کو جب بالیدگی اور پختگی نصیب ہوئی تو اس نے کائنات کو اس کے صحیح پس منظر میں دیکھنا شروع کیا - یہ دور ، دور جدید ہے اور اس میں واقعات کی توجیہ غیر مرئی تصورات یا نظاموں کی مدد سے کرنے کے بجائے ان حقائق کی معرفت کی جاتی ہے جن کو انسان بہ چشم دیکھتا ہے اور جن کی بنیاد پر وہ علت و علل جیسے سائنسی قوانین وضع کرتا ہے - سائنسی طریقے کے اس نئے تصور نے ایک طرف ما بعد الطبیعیاتی نظاموں کی بے وقعتی کا پول کھول دیا اور دوسری طرف مذہب کی ضرورت کو اس طرح باطل کر دیا کہ اب انسان کو ان

Marfat.com

بنیادی سوالوں کا، جن کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے، جواب دینے کے لیے کسی مافوق الفطرت ہستی کے اقرار کی حاجت نہیں ہے۔

ایک بنیادی خلط مبحث

اگر تاریخ فکر انسانی کے متعلق یہ مفروضہ صحیح ہے تو عصر حاضر کے انسان کو مذہب کی ضرورت کے تسلیم کرنے میں بجا طور پر تامل ہو سکتا ہے۔ لیکن، کیا یہ مفروضہ صحیح ہے؟ اولاً تو تاریخ فکر انسانی کا ایک سرسری مطالعہ ہی اس مفروضے کی صحت کے بارے میں شکوک پیدا کر دیتا ہے۔ انسانی فکر کا تاریخی ارتقا اس طرح لگے بندھے ادوار میں منقسم نہیں معلوم ہوتا جس طرح کومت کا یہ اصول دکھاتا ہے۔ فکر انسانی کے ارتقا کا عمل اس طرح یک رخا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک نہایت پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل میں مذہب، فلسفہ اور سائنس، تاریخی اسٹیج پر یکے بعد دیگرے اس طرح نہیں آتے کہ دوسرے کے آنے سے پہلا رخصت ہو جائے۔ مذہب، فلسفہ، اور سائنس تینوں اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے بہ یک وقت ارتقا پذیر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بنی ہوتے رہے ہیں۔ اثر اندازی کی صورت بعض اوقات تعاون کی شکل اختیار کرتی رہی ہے اور بعض اوقات پیکار کی۔ فلسفیانہ نظاموں کے دور میں، جس کو کومت تاریخ فکر انسانی کا دوسرا دور قرار دیتا ہے، فلسفے نے مذہب کے لیے عقلی بنیادوں پر دفاعی نظام تیار کیے۔ اس لیے نہیں کہ وہ مذہب کی جگہ لے لیں بلکہ اس لیے کہ مذہب قبول کرنے میں عقل حارج نہ ہو۔ یعنی لوگ غلط فہمی کی وجہ سے فلسفیانہ نظاموں کو مذہب کا بدل قرار دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفے نے وہی کام سر انجام دیا ہے جو اس سے قبل مذہب کا تھا اور ان ہی سوالوں کے جوابات فراہم کیے ہیں جن کے جواب اس سے قبل مذہب نے دیے تھے، یا آج کل سائنس وہی کام سر انجام دے رہی ہے جو کسی زمانے میں فلسفے نے کرنے کی کوشش کی۔ مذہب، فلسفہ اور سائنس کے متعلق یہ غلط فہمی، جس کا ایک نتیجہ کومت کا مندرجہ بالا مفروضہ ہے، ایک بنیادی قسم کے خلط مبحث سے پیدا ہوتی ہے جس کے دو پہلو ہیں۔ اول یہ کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے بنیادی سوالوں کے جواب میں پیدا ہوتے ہیں اور ثانیاً مذہب، فلسفہ اور سائنس تینوں ایک ہی قسم کے جواب فراہم کرتے ہیں۔

Marfat.com

مذہبی ، فلسفیانہ اور سائنسی سوالات کو ایک ہی قسم کے سوالات سمجھنے کا رجحان عام ہے اور کیا خاص اور کیا عام سب ہی اس غلط فہمی کا شکار ہیں ۔ علمائے مذہب، اور سائنسداں خاص طور پر اور فلسفی عام طور پر، سوائے معدودے چند ہستیوں کے، سائنسی، مذہبی اور فلسفیانہ سوالات کو ایک دوسرے میں ملا دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے ، اور مذہبی ، سائنسی اور فلسفیانہ جوابات کو یا تو محض پیرایۂ بیان کا اختلاف سمجھتے ہیں یا یہ سمجھتے ہیں کہ فلسفہ اور مذہب کُلّی جواب فراہم کرتے ہیں اور سائنس جُزئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دریافت کرے کہ "پانی کیسے بنا؟" اور اس کا جواب دیا جائے کہ "پانی خدا نے بنایا ہے" تو یہ جواب اس سوال کے ایک خاص معنی کا جواب ہے جو دوسرے معنوں سے ، جس کا جواب یہ ہے کہ "پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن کے امتزاج کا نام ہے ،" قطعاً ممیز ہے ۔ سوال کا ابہام، سوال کی نحوی ترکیب اور الفاظ کے ایک ہونے سے پیدا ہوتا ہے ، درآں حالے کہ سوال کے دونوں معنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ اس لیے یہ کہنا بجا نہیں ہے کہ سوال فی الاصل ایک ہی ہے، صرف اس کے جواب کے دو مختلف پیرائے ہیں فی الحقیقت یہ دو مختلف سوال ہیں جن کے دو مختلف جواب ہیں اور یہ دونوں جواب نہ ہو ایک دوسرے کا بدل ہو سکتے ہیں، نہ صرف پیرایہ بیان میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور نہ ہی ایک جواب جُزئی ہے اور دوسرا کُلّی۔ سوال کے دونوں معنوں کا منشا مختلف ہے اور دونوں جوابوں سے جو نتائج نکلتے ہیں اور زندگی پر جس طرح اثر انداز ہوتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں ۔

یہ بحث کہ سوال کے معنوں کا یہ اختلاف سوال کو دو علیحدہ علیحدہ سوال بنا دیا ہے ، یا یہ صرف جواب کے پیرایۂ بیان کا اختلاف ہے محض لفظی بحث نہیں بلکہ ایک بنیادی مسئلہ ہے ۔ اس کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ اسی ابہام کے نتیجے میں کومت نے مذہب کے جواز کو چیلنج کیا اور اسی کے نتیجے میں سائنسداں مذہب کی 'ضرورت' کے انکاری بن گئے ۔

دوسری غلطی ، یعنی مذہبی ، سائنسی اور فلسفیانہ جوابوں میں صرف پیرایۂ بیان کا مختلف ہونا یا ایک کا جزئی ہونا اور دوسرے کا کلی ہونا ، پہلی غلطی کا لازمی نتیجہ ہے ۔ آگست کومت کا مفروضہ اسی غلطی پر مبنی ہے وہ سمجھتا ہے کہ فلسفہ ، مذہب کا اور سائنس ، فلسفہ کا بدل ہو سکتی ہے اور وہ اس لیے کہ، مثلاً وجود خدا کے بارے میں مذہب، مابعدالطبیعیات اور سائنس

Marfat.com

جو کچھ کہتے ہیں وہ ایک ہی قسم کی باتیں ہیں جو مختلف انداز میں کہی گئی ہیں ۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے ۔ مثال کے طور پر فلسفہ کو لیجیے ۔ خدا کے وجود کے بارے میں فلسفہ میں دلیلوں کی کمی نہیں ، اور ایسے فلسفی بہت کم ہیں ، جو خدا کے وجود کے منکر ہوں ۔ مگر کس خدا کے ؟ آئنسٹائن سے کسی نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ کیا وہ خدا پر ایمان رکھتا ہے، اس نے جواب دیا کہ ہاں، لیکن اسپینوزا کے خدا پر۔ اور اسپینوزا کے متعلق یہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہودیوں نے اس کو دہریت کے الزام میں مرتد قرار دے دیا تھا ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مذہب ، فلسفہ اور سائنس جس خدا کے بارے میں لب کشائی کرتے ہیں اس میں صرف لفظ خدا ہی مشترک ہوتا ہے۔ وہ شئے جس کو یہ تینوں ایک ہی نام سے موسوم کرتے ہیں اپنی صفات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ اس کو وہی خدا سمجھنا جو مذہب کا خدا ہے ۔ محل نظر معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ فلسفہ اور سائنس نے خدا کے مذہبی تصور سے بحث کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ خدا کا تصور فی الاصل فلسفہ اور سائنس دونوں کے پاس مذہب کے راستے سے آیا ہے ۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں مضامین کے برتاؤ کی نوعیت مذہب سے اس درجہ مختلف ہے کہ نتیجتاً مذہبی تصورات ان کے ہاتھوں قلب ماہیت کرکے فلسفیانہ یا سائنسی تصورات بن جاتے ہیں ۔ اس قلب ماہیت کے مابعد یہ کہنا کہ خدا کا فلسفیانہ تصور وہی کام سر انجام دے سکتا ہے جو اس سے قبل مذہب دیتا تھا ، یا یہ کہنا کہ قانون علت العلل اب وہ منشا پورا کرسکتا ہے جو نظام فلسفیانہ کرتا تھا، مذہبی، فلسفیانہ اور سائنسی حقائق سے چشم پوشی کرنا ہے ۔

مثال کے طور پر جولین ہکسلے کے اس بیان کو لیجیے :

”نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے ، جو سیاروں کی گردش پر حکومت کرتا ہو ۔ لاپلاس نے اپنے مشہور نظریے سے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ فلکی نظام کو خدائی مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ڈارون اور پاسٹیور نے یہی کام حیاتیات کے میدان میں کیا ہے اور موجودہ صدی میں علم النفس کی ترقی اور تاریخی معلومات کے اضافے نے خدا کو اس مفروضہ مقام سے ہٹا دیا ہے کہ وہ انسانی زندگی اور تاریخ کو کنٹرول کرنے والا ہے ۔“[1]

۱۔ *Religion without Revelation*. New York, 1958, p. 58.

Marfat.com

ذرا اس عبارت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ جس خلط مبحث کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے وہ اس ادعا میں پوری طرح جلوہ گر ہے۔ پس منظر میں مذہبی اور سائنسی مسائل ایک دوسرے میں الجھے ہوئے ہیں۔ اس بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا سائنس کی ابتدا مذہب سے ہوتی ہے اور مذہبی تصورات، ابتدائی سائنسی تصورات ہیں جن کو نئے مشاہدوں اور تحقیقات نے اس طرح باطل ثابت کر دیا ہے جس طرح کوپرنیکس نے بطلیموس کی فلکیات کو یا آئنسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے نیوٹن کے قوانین حرکت کو۔ ھکسلے کے نزدیک گویا خدائی مفروضہ صرف فلکی نظام کو سمجھنے کے لیے اختراع کیا گیا تھا، یا اس کی حیثیت 'قوت' کے ایک تصور سے، جو سیاروں کی گردش کے پیچھے کار فرما ہو، زیادہ نہ تھی۔ بے شک اگر خدا قرون اولیٰ کا ایک سائنسی تصور تھا تو ھکسلے کا یہ کہنا بجا ہے کہ "نیوٹن نے دکھا دیا ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔" لیکن مذاہب جس خدا پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتے ہیں وہ محض کائناتی نظام کے پیچھے کار فرما 'قوت' کے تصور سے قطعاً مختلف ہے۔ کیا اس خدا کے متعلق بھی نیوٹن نے کوئی ایسی شہادت پیش کی ہے جو یہ 'دکھلا دے' کہ یہ خدا بھی نہیں ہے؟ یا خود سائنس اس خدا کے بارے میں کوئی حکم لگا سکتی ہے؟

سائنس کے حدود کار

سائنس کیا ہے اور اس کے حدود کار کیا ہیں؟ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ سائنس کے حدود کار ان سوالوں سے متعین ہوتے ہیں جن کے جواب دینے کا سائنس دعویٰ کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جب کوئی یہ دریافت کرتا ہے کہ پانی کیسے بنا، اور اس سوال سے اس کی منشا یہ ہوتی ہے کہ جواب دینے والا پانی بننے کے واقعے کا تجزیہ کرکے یہ بتلائے کہ جس مرکب کا نام پانی ہے اس کی ترکیب کن عناصر سے ہوتی ہے، اور ان عناصر کو باہم ملانے کا طریقہ کیا ہے، وغیرہ، تو سوال کا یہ منشا جواب کو واقعات، ان کے مشاہدے اور ان کے درمیان علت و علل کے رشتوں کی دریافت تک محدود کر دیتا ہے۔ سائنس کا کام فی الحقیقت یہی ہے۔ ان حدود سے آگے بڑھ کر جب کوئی سائنس داں ان مسائل کے بارے میں کلام کرتا ہے جو واقعات اور ان کی تحلیل و تجزیہ کے علاوہ ہیں تو ایک دوسرے میدان میں قدم رکھتا ہے، جو سائنس کا میدان نہیں ہے اس دوسری میدان میں اس کے ادعا کی صحت یا عدم صحت سائنسی

Marfat.com

واقعات سے متعین نہیں کی جا سکتی - دوسرے الفاظ میں سائنس جو کچھ ہے، اس کا تجزیہ و تحلیل کر سکتی ہے - اس کا مدار ان معلومات پر ہے جو انسان کے حواس اس کو فراہم کرتے ہیں اور ان اشیا سے متعلق ہے جو اس کے بالواسطہ یا بلا واسطہ مشاہدے میں آتی ہیں - مذہب کے بنیادی حقائق مثلاً خدا، آخرت، نبوت، سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہیں - اور سائنس خود اپنی شہادت کے زور پر ان کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتی - مثلاً محض اس علم کی بنیاد پر کہ ستاروں کی گردش ایک قانون کی پابند ہے، یا اس کائنات میں مختلف اشیا ایک خاص ارتقائی ترتیب میں پائی جاتی ہیں، یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ خدا کا وجود باطل ہے، یا حیات بعد موت ناممکن ہے - سائنس جو کچھ بتاتی ہے، یا بتا سکتی ہے، وہ حقائق کی کسی قانون کے تحت تشریح ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں -

سائنس اور مذہب کے تعلق کے بارے میں ایک اصولی بات تھی لیکن یہاں پر ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ مان لینے کے بعد کہ سائنس کا دائرہ کار مشاہدے اور حسی تجربے تک محدود ہے ہم ان باتوں کی کیا توجیہ کریں گے جو اسی حسی تجربے سے چند ایسے حقائق کے خلاف ثابت ہوتی ہیں (یا ہو سکتی ہیں) جن کا مذہب مدعی رہا ہے - یہ شبہ اس وجہ سے اور قوی ہو جاتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں بعض باتیں خود کائنات اور اس دنیا کے واقعات سے متعلق ملتی ہیں جن کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ سائنس کی رو سے خلاف واقعہ ہیں - چوں کہ یہ باتیں مشاہداتی حقائق سے متعلق ہیں اس لیے ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ سائنس کے دائرہ کار سے باہر ہیں قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا - مثال کے طور پر فرض کر لیجے کہ کسی مذہبی کتاب میں اس کائنات کے متعلق یہ بیان موجود ہے کہ 'زمین ساکن ہے اور اس نظام شمسی کے مرکز میں واقع ہے' لیکن سائنسی معلومات اس کے خلاف ہیں، تو بہ ظاہر اس مذہبی کتاب میں لکھا ہوا یہ ایک بیان تو باطل ہو گیا - اب اگر مذہبی کتابیں وحی الٰہی ہیں اور اس وحی میں سے ایک حصہ خلاف واقعہ ہے تو کتاب کے باقی حصوں کے متعلق انسان کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے یہ بھی غلط ہوں - مزید اس سے یہ وہم بھی پیدا ہوتا ہے کہ جس خدا کو عالم الغیب کہا جاتا ہے وہ واقعتاً ایسا نہیں ہے - دونوں صورتوں میں ایمان کی بنیاد ہل جاتی ہے؛ مذہب کے برحق ہونے کا تصور ماند پڑ جاتا ہے اور ان چند ہی باتوں کی وجہ سے انسان مذہب کو تسلیم کرنے سے انکار پر آمادہ ہو جاتا ہے -

Marfat.com

مذہب پر اس قسم کے اعتراضات کی ایک تاریخ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جن باتوں پر اب تک سائنس نے اعتراض کیا ہے وہ ہر مذہب میں مشترک ہوں۔ یہ ایک المیہ ہے کہ از منۂ وسطی میں یہودی اور عیسائی علما نے بطلیموس کی فلکیات اور ارسطو کی سائنس کو مذہب کا ایک لازمی جزو سمجھ لیا تھا۔ مغرب میں نشاۃ ثانیہ کے بعد سائنسی انقلاب کے ساتھ یہ پرانے سائنسی تصورات منہدم ہونے تو علمائے مذہب نے ان کو مذہب کے خلاف سائنس کا ایک حربہ متصور کیا اور یہ جانا کہ مذہبی عقائد سائنس کی تحقیقات کی گرمی سے موم کی طرح پگھل جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں اس زمانے میں مذہب اور سائنس ایک دوسرے سے برسر پیکار ہے۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کی ذمہ داری زیادہ تو ان علمائے مذہب پر ہے جنھوں نے مذہبی عقائد کی فہرست میں ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کو بھی شامل کر دیا اور ان کو خدا اور آخرت پر ایمان کی طرح ایمانیات کا ایک لازمی جزو بنا دیا۔ مسلمانوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ یہ دور مسلمانوں کے زوال اور مغرب کے عروج اور غلبے کی ابتدا کا زمانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے پانچویں اور چھٹی صدی میں یونانی تصورات کو جس تخلیقی قوت کے ساتھ قبول کیا تھا وہ اس دور میں سائنسی تصورات کے قبول کرنے میں ناپید تھی۔ مسلمانوں کی اس علمی اور تہذیبی مغلوبیت کا اثر یہ ہوا کہ سائنس اور مذہب کی جنگ کا یہ تصور بعینہ مسلمانوں میں بھی در آیا، دراں حالے کہ اسلام کو سائنس سے مقابلے میں وہ مسائل پیش نہیں آتے جو اس سے قبل دوسرے کتابی مذاہب کو پیش آئے ہیں۔

فی الوقت اس بحث سے ہمارا منشا دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی برتری ثابت کرنا نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا اظہار مقصود ہے کہ اسلام ہم سے کسی ایسے عقیدے پر ایمان لانے کا مطالبہ نہیں کرتا جو کسی سائنسی حقیقت کے خلاف ہو۔ ممکن ہے اسلامی تعلیمات میں کوئی شخص اس قسم کی بات لا نکالے جو بظاہر کسی سائنسی تحقیق کے خلاف معلوم ہوتی ہو۔ یہاں ہمیں صرف اس تضاد کی نوعیت سے بحث کرنا ہے جو کسی سائنسی مشاہدے اور اس مشاہدے سے متعلق کسی مذہبی قول کے مابین پایا جاتا ہے یا پایا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

سائنسی مسائل اسلامی فکر میں

فرض کیجیے کہ یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آسمانی صحیفے میں مذکور ہے کہ 'زمین ساکن ہے اور نظام شمسی کا مرکز ہے'[۱] یا کسی خلاف عادت واقعے یا معجزے کا ذکر ہے اور یہ کہ اس صحیفے کے وحی الٰہی ہونے میں بھی شبہے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کوپرنیکس کے سائنسی مشاہدے یا قانون علت و علل اور اس مذہبی بیان میں تطبیق کس طرح ممکن ہوگی؟ کیا ہم اس صورت میں مذہبی بیان کو خلاف واقعہ یا غلط کہہ سکتے ہیں؟ اس قسم کے سوالوں کے علمائے مذہب نے کئی طرح جواب دیے ہیں مثلاً:

(۱) سائنس انسانی علم ہونے کی وجہ سے غلطی کر سکتی ہے، اس لیے ہر سائنسی مشاہدے میں غلطی کا امکان ہے۔ اس کے برخلاف صحف آسمانی عالم الغیب کی دی ہوئی کتابیں ہیں اور علم الٰہی میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔

(۲) سائنس حسی تجربے اور مشاہدے پر مبنی ہے، اور حسی تجربے اور مشاہدے میں 'یقین' نہیں ہوتا۔ یہ انسان کو زیادہ سے زیادہ ظن و تخمین کی منزل تک لے جاتا ہے، اس لیے ہم کسی سائنسی حقیقت کے بارے میں یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ حتمی طور پر صحیح ہے۔

(۳) مذہب اور مذہبی عقائد کا معاملہ ایمان سے متعلق ہے اور ایمان انسان کی ایک داخلی کیفیت کا نام ہے۔ اس داخلی کیفیت کا مدار نہ کسی خارجی واقعے پر ہے اور نہ منطقی دلائل اور ثبوت پر۔ یہ دین خداوندی ہے، جس کو یہ دولت میسر آجائے اس کے لیے دلائل اور مشاہدات بے معنی ہو جاتے ہیں۔

(۴) مذہبی کتابوں کی زبان استعاراتی ہے۔ ان کتابوں میں خرق عادت واقعات یا معجزات، یا اسی قبیل کے مشاہدات، کے معنی لفظی نہیں ہوتے بلکہ ان سے چند ماورا حقیقتیں مراد ہوتیں ہیں۔ جن کو عوام نہیں سمجھ سکتے۔

اسی قسم کے جواب مختلف مسائل کے ضمن میں تاریخ فکر اسلامی میں موجود ہیں۔ یہ جواب اپنے زمانے اور سیاق کے اعتبار سے لوگوں کو مطمئن

۱۔ یہ مثال میں نے محض ایک مفروضے کے طور پر لی ہے اور اس کا مقصد ایک نمایاں قسم کے تضاد کو سامنے لانا ہے۔

Marfat.com

کرتے رہے ہیں اور ان میں کسی نہ کسی حد تک حق و صواب بھی موجود ہے۔ لیکن ہر زمانے کے عقلی تقاضے مختلف ہوتے ہیں اور یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی قسم کا علم کلام ہر زمانے کے لیے موزوں ہو۔ آج کل مذہب پر جس قسم کے اعتراض کیے جاتے ہیں ان کے لیے یہ جواب ناکافی اور غیر اطمینان بخش ہیں۔ موجودہ تعلیم یافتہ انسان محض 'اطمینانِ قلبی' کی خاطر مذہب کے بارے میں سوالات دریافت نہیں کرتا۔ اس کی ذہنی کیفیت 'براہیمی' نہیں ہے۔ یہ تو مادی اور مغربی تعلیم کا پیدا کردہ انسان ہے، جو مذہبی تشکیک کا شکار ہے اور جس کے ذہنی پس منظر میں مذہب اور سائنس کی چشمک کام کر رہی ہے۔ ایسے انسان کی عقل ان جوابات کو قبول کرنے کے لیے مستعد نہیں ہوتی، چاہے وہ بادل نا خواستہ اسلام کا معتقد ہی کیوں نہ ہو۔

اس وقت ان دلائل کے حسن و قبح کا تفصیلی جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ صرف ان وجوہ کی طرف اشارہ کرنا ہے جن کے باعث موجودہ ذہن پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہے۔ پہلی قسم کے جواب کو لیجیے۔ یہ صرف ان لوگوں کو مطمئن کر سکتا ہے جن کے لیے مذہب کی ضرورت اور جواز کا وہ مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا جس سے عام طور پر آج کا متشکک دوچار ہے۔ یہ جواب اپنی جگہ چاہے ایک حقیقت پر ہی کیوں نہ مبنی ہو، اس کی حیثیت ایک عقیدے کے ادعا سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ صرف ایسے ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہے جن کا اس عقیدے پر ایمان پختہ ہو۔ لیکن جب کسی سائنسی مشاہدے کی وجہ سے خود خدا کے وجود پر، یا اس کی صفات کے تصورات پر اعتراض کی ضرب پڑے تو اعتراض کرنے والے کا شک یہ کہہ کر رفع نہیں کیا جاسکتا کہ خدا کے علم میں غلطی کا امکان نہیں ہے۔ وہ تو خدا کے بارے ہی میں شکی ہو چکا ہے اور ساتھ ہی اس بات کو تسلیم کرنے سے انکاری ہے کہ اس موقع پر انسانی مشاہدہ غلطی کر رہا ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ اس باب میں وہ اپنے سائنسی مشاہدے کو چھوڑ کر ایک مذہبی مفروضے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ مثلاً اگر کسی کے پاس ایک طرف تو اس بات کی شہادتیں موجود ہوں کہ زمین اس نظام شمسی کا مرکز نہیں ہے اور متحرک ہے اور دوسری طرف کوئی مذہبی عقیدہ اس کو یہ باور کرا رہا ہو کہ اس کا یہ علم مبنی بر حقیقت نہیں ہے، بلکہ زمین ساکن ہے اور نظام شمسی کا مرکز ہے، تو ایسا شخص کھلے ذہن سے اس مذہبی عقیدہ کو تسلیم نہیں کر سکے گا۔

دوسرا جواب خالص فلسفیانہ ہے۔ ایک معنی میں یہ کہنا درست ہے کہ

Marfat.com

حسی تجربہ اور مشاہدہ انسان کو 'اغلبیات' سے روشناس کراتا ہے اور 'تیقنات' کا علم نہیں دیتا۔ لیکن ان معنوں میں 'اغلب' اور 'یقین' کے ایک خاص سائنسی یا فلسفیانہ معنی ہیں۔ 'اغلبیت' کا سائنسی تصور ایک ریاضیاتی تصور ہے۔ جس کی رو سے سائنسی علم کو 'اغلب' کہنے سے منشا یہ ہے کہ کسی سائنسی کلیے کی صحت کا انحصار ان عوامل کے علم پر ہوتا ہے جن کی بنیاد پر وہ کلیہ وضع کیا گیا ہے۔ چوں کہ ہم کو تمام عوامل کا علم کلی طور پر نہیں ہوتا، اس لیے اس کلیے کو (یا کسی مشاہدے کو) 'اغلب' کہنا زیادہ صحیح ہے۔ ان معنی میں 'اغلبیت' ایک اضافی قدر ہے۔ اس کی نسبت اولاً 'تیقن' کے اس مثالی تصور سے ہے جس کی رو سے ہمارا کل سائنسی علم 'اغلب' کہلاتا ہے اور ثانیاً خود کسی سائنسی علم کے داخلی نظام سے ہے۔ اس ثانوی نسبت کی وجہ سے ایک ہی سائنسی مفروضہ ایک نظام میں 'اغلب' اور دوسرے میں 'یقینی' ہو سکتا ہے۔ سائنسی علم کو 'اغلب' کہنے سے بعض اوقات اس کا مقابلہ استخراجی علم سے کرنا مقصود ہوتا ہے جہاں عقلی قوانین کے تحت چند دیے ہوئے قضیوں سے اخذ کیا ہوا ایک نتیجہ 'یقینی' کہلاتا ہے جب کہ خود وہ قضیات 'اغلب' ہو سکتے ہیں۔

یہ موقعہ اس بیان کی تفصیل کا نہیں ہے۔ جو بات اوپر بیان کی گئی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ سائنسی علم کا 'اغلب' ہونا ایک خاص معنی رکھتا ہے جس کی بنیاد پر یہ کہنا کہ سائنس ہم کو مذہب کے مقابلے میں صرف 'اغلب' سے روشناس کراتی ہے قیاس مع الفارق ہے۔ 'اغلبیت' کے اس تصور کا البتہ ایک دوسرا فلسفیانہ پہلو بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خود حسی مشاہدہ ناقابل بھروسہ اور لائق اعتبار نہیں ہے جو لوگ حسی مشاہدہ کے ناقابل بھروسہ ہونے کا تصور پیش کرتے ہیں وہ التباسات، خواب اور توہمات کی دنیا سے مثالیں دے کر یہ بتلاتے ہیں کہ خارجی اشیا ہم کو جس طرح سے وہ ہیں اسی طرح نظر نہیں آتیں۔ جھلملاتے ستارے، قوس قزح، پانی میں پڑی سیدھی لکڑی جو ٹیڑھی نظر آتی ہے اور اسی قبیل کے دوسرے مشاہدے ان لوگوں کی نظر میں اس بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں کہ حسی علم حقیقت کا غلط نمایندہ ہوتا ہے۔ سائنس جو صرف حسی مشاہدے کا علم عطا کرتی ہے، پھر کس طرح یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کا دیا ہوا علم یقینی اور حتمی طور پر صحیح ہے؟

یہ دلیل بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اگر ہمارے حسی مشاہدے میں

Marfat.com

بعض باتیں غلط ہوتی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ ہمارا حسی ادراک قابل اعتبار نہیں ہے۔ لیکن اس قسم کی دلیل، جو مدعیان مذہب کی طرف سے دی جاتی ہے، اگر صحیح بھی ہو تو ایک ایسی دو دھاری تلوار ہے جس کی کاٹ تمام علوم انسانی پر پڑتی ہے اور بالآخر کسی بھی علم کے بارے میں، چاہے وہ مذہبی علم ہی کیوں نہ ہو، ہمارے پاس یہ کہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا ہے کہ یہ علم یقینی اور حتمی ہے۔ اس باب میں امام غزالی کا ایک بیان نہایت معنی خیز ہے، اگرچہ عام طور پر یہ بیان برعکس معنوں میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ امام غزالی 'المنقذ من الضلال' میں لکھتے ہیں:

> "جب میں نے غور کرنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف محسوسات اور بدیہات کا حاصل ہے، لیکن جب کد و کاوش زیادہ بڑھی تو محسوسات میں بھی شک ہونے لگا۔ مثلاً سایہ بہ ظاہر ساکن نظر آتا ہے لیکن تجربے و مشاہدے سے ثابت ہوا کہ وہ ساکن نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔ محسوسات پر یقین نہ رہا تو بدیہات پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ مثلاً یہ بدیہی ہے کہ دس کا عدد تین کے عدد سے زائد ہے۔ لیکن جب محسوسات کے متعلق عقل نے فیصلہ کر دیا کہ وہ قابل اعتماد نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ عقل کے اوپر بھی ایک درجہ ہو جو فیصلہ کردے کہ بدیہیات بھی قابل یقین نہیں ہیں۔ مثلاً خواب میں انسان جن چیزوں کو دیکھتا ہے ان کو یقینی سمجھتا ہے، لیکن جب بیدار ہوتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کوئی اصلیت نہیں تھی۔ بعینہ وہ بیداری کی حالت میں جن محسوسات و معقولات کو یقینی سمجھتا ہے ممکن ہے اس کے بعد اس پر ایسی حالت طاری ہو جائے جس سے اس کو معلوم ہو جائے کہ اس کی بیداری بھی ایک خواب تھی جس میں اس نے جن چیزوں پر یقین کیا تھا وہ قابل اعتماد نہ تھیں۔"

آپ کو معلوم ہے کہ امام غزالی تشکک کے اس بحر ظلمات سے کس طرح نکلے؟ اس دلیل سے نہیں کہ چوں کہ ہمارا علم غیر یقینی ہے، خدا کا علم یقینی ہوگا۔ تشکیک کے اس مرحلے پر پہنچ کر دلائل اور عقل بے کار ہوجاتے ہیں۔ جس شخص نے اس طریق تشکیک کو دلیل کی حیثیت سے استعمال کیا گویا اس نے ہر قسم کی دلیل کی جڑ کاٹ دی۔ اور ایمان کے معاملے کو افہام و تفہیم کے دائرے سے نکال کر انسانی کیفیات کا تابع بنا دیا۔ اب اگر کسی کی شخصی کیفیت اس کو ایمان لانے پر مجبور کرے گی تو وہ مومن ہو جائے گا۔ ورنہ اس

Marfat.com

عام تشکیک کا نخچیر، جس کو نہ حسی مشاہدے پر بھروسہ ہو اور نہ عقل پر، وہ اس بات کو کیوں قبول کرنے لگا کہ کوئی شخص خدا کا نبی بھی ہو سکتا ہے۔ اس کو اس گمان سے کیوں کر نجات مل سکے گی کہ جس کلام کو کلام الٰہی سمجھ کر وہ سن رہا ہے اور جس شخص کو نبی کی ذات کی حیثیت سے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور جس کی صداقت پر اس کی عقل گواہی دے رہی ہے، ممکن ہے وہ سب امر واقعہ نہ ہو بلکہ خواب ہو اور حقیقت سے متغائر ہو۔"

امام غزالی کا یہ طرز فکر ہم کو تیسری قسم کے جواب سے روشناس کراتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مذہبی عقائد کا معاملہ ایمان سے متعلق ہے اور ایمان انسان کی ایک داخلی کیفیت یا وجدان کا نام ہے۔ چوں کہ یہ وجدان عقلی یا حسی معقولات کا متحمل نہیں ہوتا، اس لیے مذہبی حقائق کی تفہیم میں عقل اور حس دونوں بے کار ہیں۔ البتہ نفسیاتی طریقوں سے اکثر انسانوں میں یہ استعداد پیدا کی جاسکتی ہے کہ وہ اس وجدان کے حامل بن سکیں بہ شرطے کہ وہ پوری سپردگی کے ساتھ اس کیفیت کے حصول کے لیے آمادہ ہوں۔

ظاہر ہے کہ اس حقیقت سے تو کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اکثر انسانوں میں اس قسم کی کیفیت یا وجدان کا پیدا ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس وجدان کے پیدا ہونے سے پہلے اور اس کے پیدا ہونے کے بعد کا مسئلہ سراسر عقلی ہے اور افہام و تفہیم پر منحصر ہے۔ وجدان کے پیدا ہونے سے قبل اس طرح کہ جب تک مذہب اور مذہبی طرز فکر کی قدر و قیمت کا اندازہ انسان کو نہ ہو وہ اس سپردگی کے لیے تیار نہ ہوگا جس کا مطالبہ یہ طریق کار کرتا ہے۔ پھر اس وجدان کے حصول کے بعد تو معاملہ سراسر افہام و تفہیم کا ہی رہ جاتا ہے اس لیے کہ یہ وجدان فی نفسہ دوسرے تک منتقل نہیں ہوسکتا، البتہ اس وجدان کی معرفت جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی تبلیغ ممکن ہوسکتی ہے۔ اور اس علم کی تبلیغ حسی اور عقلی معقولات پر منحصر ہے۔ اگر وجدان ہی کافی ہوتا تو انبیائے کرام کو نہ تبلیغ کا حکم ملتا، اس لیے کہ تبلیغ وجدان کی نہیں کسی پیغام کی ہوتی ہے، اور نہ ہی خدا اپنے بندوں سے تعقل اور تفکر کا مطالبہ کرتا۔

اس طرز فکر میں کہ ایمان کا معاملہ وجدان سے متعلق ہے دراصل دو باتیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان لانے کا عمل عقل یا علم پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک وجدانی کیفیت کا نام ہے اور یہ وجدانی کیفیت

Marfat.com

علم کے باوجود ناپید ہو سکتی ہے ۔ دوسری یہ کہ مذہبی حقائق کا ادراک اور تفہیم عقل کے ذریعے ممکن نہیں ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ ایمان ایک کیفیت کا نام ہے جو علم کے باوجود مفقود ہو سکتی ہے لیکن محض کسی کیفیت کے موجود ہونے سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ کیفیت کس شئے سے متعلق ہے ۔ خدا پر ایمان کی کیفیت کا موجود ہونا اس بات کا متقاضی ہے کہ انسان کو علم ہو کہ یہ ایمانی کیفیت ایسی ذات سے متعلق ہے جو تمام صفات کمالیہ سے متصف ہے ۔ یہ علم محض 'کیفیت' عطا نہیں کر سکتی ۔ اس کے لیے 'کیفیت' سے آزاد ذرائع علم کا ہونا ضروری ہے ۔ اس وجہ سے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مذہبی حقائق کا معاملہ ایمان سے متعلق ہے ۔ اس لیے کہ ایمان ان حقائق کی نوعیت پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا ۔ البتہ ان کو انسانی زندگی میں جاری و ساری کرنے میں مدد ضرور دے سکتا ہے ۔

جہاں تک مذہبی حقائق کے ادراک اور تفہیم سے بالا ہونے اور عقل کا ان معاملات میں بے چارہ ہونے کا مسئلہ ہے تو یہ بات اس لیے درست نہیں ہو سکتی کہ اگر انسان کی سمجھ سے کوئی شے اس طرح ماورا ہے کہ اس کے متعلق انسان کوئی عقلی گفتگو نہیں کر سکتا تو اس پر ایمان لانے کا مطالبہ تکلیف مالایطاق ہے ۔ یہ بات اسلامی تعلیمات کے پس منظر میں اس لیے بھی درست نہیں ہو سکتی کہ اسلام اکثر آفاق و انفس کی شہادتوں کو دلیل کی حیثیت سے پیش کرتا ہے اور انسانی عقل سے مطالبہ کرتا ہے کہ ان دلائل کی بنا پر وہ مذہبی حقائق ، مثلاً وہ وجود باری اور یوم آخرت کا اقرار کرے ۔

مسئلے کا چوتھا حل یہ نقطہ' نظر پیش کرتا ہے کہ قرآن کی زبان استعاراتی ہے اور جہاں کہیں قرآن میں بہ ظاہر خلاف واقعہ یا خلاف عقل باتیں معلوم ہوتی ہیں وہاں پر ان الفاظ کے ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے ، بلکہ ان کے پس پردہ ایک دوسرے معنی ہوتے ہیں جن کو بہ نظر غائر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ ظاہری اور باطنی معنی کی اس ثنویت کی ایک لمبی تفصیل ہے جو مذہب کی نیچری تعبیرات سے لے کر مذہب کے متصوفانہ اسرار و رموز تک وسیع ہے ۔ مسئلے کے اس حل میں خرابی کی کئی صورتیں پوشیدہ ہیں ۔ اس طرح ایک طرف تو مذہب ایک چیستان بن جاتا ہے اور دوسری طرف تعبیرات کی ایسی کھلی چھٹی ملتی ہے کہ انسان کا طباع ذہن کسی آیت کا اپنے میلان کے مطابق جو

Marfat.com

چاہے مطلب حاصل کر سکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دینی کتابوں میں مبینہ خلاف واقعہ باتوں کی موجودگی سے عاجز ہو کر استعارات اور تعبیرات کی دنیا میں پناہ لینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ دنیا اتنی وسیع ہے کہ اس میں دین کی بنیادی حقیقتیں بھی بالآخر استعاراتی بن جاتی ہیں۔ ایسے موقعہ پر خدا، آخرت، وحی، غرض کون سی ایسی حقیقت ہے جو استعارات کا روپ نہیں دھار سکتی۔

میرا منشا یہ نہیں کہ قرآن میں کسی جگہ بھی استعاراتی انداز سے گفتگو نہیں کی گئی ہے، یا کسی جگہ بھی تعبیر کی گنجائش موجود نہیں ہے اور ہر جگہ الفاظ کے ظاہری معنی ہی اصل معنی ہیں۔ میرا منشا صرف اس قدر ہے کہ استعاراتی تصور فکر اسلامی کی تاریخ میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس آزاد روی سے استعمال ہوا ہے کہ اس سے تعبیرات کے اختلاف کا ایک ایسا دروازہ کھل سکتا ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہے۔ اور نتیجتاً ایسی بعید از قیاس تعبیرات پیدا ہو سکتی ہیں جو انسانی ذہن کی جدت طرازی پر تو دلالت کرتی ہوں لیکن جن کی وجہ سے قرآن کا منشا الفاظ کے گورکھ دھندوں میں گم ہو جائے۔ خاص طور پر تعبیرات کا یہ عمل جب کسی ایسی آیت کے متعلق ہو جس میں بہ ظاہر کسی امر واقعہ کے خلاف کوئی بات موجود ہو تو یہ زبان و بیان کے ساتھ کھلی زیادتی کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ گویا خدا اپنے منشا کے اظہار پر قادر نہیں ہے۔ ایک شک کو رفع کرنے کا یہ طریقہ اس طرح ایک دوسرے شک کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔

مسئلے کا حل

سوال یہ ہے کہ اگر آج کے سائنسی فکر سے متاثر ذہن کے لیے مسئلے کے حل کے یہ چاروں انداز غیر تسلی بخش ہیں تو پھر اس مسئلے کا تسلی بخش حل کیا ہو سکتا ہے؟ آپ کو یاد ہوگا کہ مسئلہ اس قسم کا تھا کہ فرض کر لیجے کہ کسی الہامی کتاب میں واضح طور پر بیان ہے کہ 'زمین ساکن ہے اور آفتاب اس کے گرد گردش کر رہا ہے'۔ اگر فہم انسانی ان چاروں روایتی طریقوں سے اس بیان کا کوئی جواز پیش نہیں کر سکتی تو پھر کیا اس کے انکار کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یا یہ کہ انسان کو عقل سلیم اور مذہب کے مابین تناقض کو تسلیم کر لینا چاہیے اور مسئلے کے حل کی کوشش سے ہاتھ اٹھا لینا چاہیے؟

Marfat.com

در اصل اس مسئلے کے حل کی متذکرہ بالا کوششوں میں وہی خلط مبحث موجود ہے جس کا ہم نے اوپر تذکرہ کیا ہے۔ ان میں ایک بنیادی قسم کی بات سے صرف نظر کیا گیا ہے اور نتیجتاً ایک غلط قسم کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ ایک پیش پا افتادہ سی بات ہے کہ الہامی کتابیں بنیادی طور پر انسانوں کی ہدایت کے لیے نازل کی گئی ہیں۔ لیکن یہ بات اپنے عواقب کے اعتبار سے بہت اہم اور معنی خیز ہے۔ مثلاً اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ ہدایت کے ضمن میں اگر کسی فطری واقعے کی طرف کوئی اشارہ کیا گیا ہے تو اس سے کسی سائنسی حقیقت کا اظہار مقصود نہیں بلکہ ایک معروف حسی مشاہدے کو ایک بالکل دوسری قسم کی حقیقت کے لیے دلیل کے طور پر پیش کرنا ہے۔ ایک لحاظ سے اس قسم کا استدلال صوری استدلال سے مشابہ ہے جہاں اشارات کی تبدیلی استدلال پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ رہے حسی مشاہدے تو الہام کا موضوع ان کی صحت یا عدم صحت سے بحث کرنا نہیں ہے اس لیے کہ ان کے استعمال کی نوعیت عموماً یہ ہوتی ہے کہ ان سے مخاطب میں انفس و آفاق کی آیات کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھنے کا شعور بیدار کرنا اور ایک خاص ذہنی کیفیت کا پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی سائنسی مفروضے کے حق میں یا اس کے خلاف الہامی کتابوں میں ثبوت کو تلاش کرنا ایک بنیادی قسم کی غلطی ہے۔ البتہ یہی حسی مشاہدے اگر کسی سائنسی کتاب میں موجود ہوں تو اس مشاہدے کی صحت یا عدم صحت ایک طرف تو ان نتائج، مقاصد یا دلائل پر اثر انداز ہو سکتی ہے جن کے لیے یہ مشاہدہ استعمال کیا گیا ہے اور دوسری طرف اس قسم کے مشاہدات کی عدم صحت کا ثبوت شاہد کی علمی غلطی کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شبہ یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ بالفرض آزاد علمی ذرائع سے الہامی کتابوں میں بیان کردہ کسی حسی واقعے کی خدا ناخواستہ غلطی بھی ثابت ہو جائے تو کیا اس سے خدا کے عالم الغیب ہونے کے تصور پر کوئی حرف آتا ہے؟۔ اس کا جواب یہ ہے کہ الہامی کتابیں صرف ان باتوں کو اپنے استدلال میں استعمال کرتی ہیں جو اس زمانے کے علم کے مطابق ہوں اور ایک معروف حقیقت کی حیثیت سے تسلیم شدہ ہوں۔ اگر ایسا نہ ہو تو مخاطب کا ذہن استدلال کے اصل منشا سے ہٹ کر ایک ایسی بات کی طرف متوجہ ہو جائے گا جس کی صحت یا عدم صحت اس استدلال سے غیر متعلق ہے۔ اگر نمرود کے دربار میں حضرت ابراہیم کا مطالبہ

Marfat.com

یہ ھوتا کہ " میرا خدا تو زمین کو سورج کے گرد گھماتا ہے، تو ذرا سورج کو زمین کے گرد گھما کر دکھا "، تو یہ خطاب آج کل بامعنی ھونے کے باوجود اس زمانے میں بے معنی ھوتا۔ آج کل بھی اس انداز گفتگو کی معنویت ان ھی لوگوں پر منکشف ھوگی جو سورج کے زمین کے گرد گھومنے اور سورج کے مشرق سے نکلنے کے سائنسی فرق سے باخبر ھوں۔ اور یہ کس کو معلوم نہیں کہ الہامی ھدایت کے مخاطب صرف وھی لوگ نہیں ھوتے جو ایک خاص علمی سطح تک ترقی کرچکے ھوں بلکہ خاص و عام سب ھوتے ھیں۔ اس کے برخلاف حضرت ابراھیم کا استدلال کہ " خدا تو سورج کو مشرق سے لاتا ہے، تو اس کو مغرب سے لے آ " جس طرح اس زمانے میں با معنی تھا اسی طرح سائنسی تحقیقات کے علی الرغم آج کل بھی با معنی ہے۔ موجودہ دور میں اگر کوئی یہ کہے کہ 'خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے' اور اس کا یہ جواب دیا جائے کہ 'مگر سورج تو کسی طرف سے نہیں نکلتا، صرف زمین اس کے گرد گھومتی ہے' تو یہ جواب اس بیان کے اس مفہوم سے جس کا اظہار قائل کرنا چاھتا ہے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ یہاں مسئلہ یہ نہیں ہے کہ زمین اور سورج میں کون ساکن ہے اور کون رواں بلکہ یہ ہے کہ آیا کارخانۂ قدرت کے پیچھے کوئی خدائی قوت کارفرما ہے یا نہیں اور اس مسئلے سے سورج اور زمین کی فی نفسہ حرکت غیر متعلق ہے۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا مناظر احسن گیلانی، **الدین القیم** (باب اول و دوم)۔ نفیس اکیڈمی، کراچی۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی، **دین حق**۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاھور۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودی، **تنقیحات**۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاھور۔

عبدالوحید خان، **علم جدید کا چیلنج**۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

امام غزالی، **سرگذشت غزالی**۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاھور۔

محمود علی، **دین و دانش**۔ امرتسر۔

A. K. Brohi, *Islam in the Modern World.* Chiragh-e-Rah Publications, Karachi.

Dr. M. Iqbal, *Reconstruction of Religious Thought in Islam.* (Ch. 7) Ashraf Publications, Lahore.

Marfat.com

۴

مذاہب عالم : ایک تقابلی مطالعہ*

مذہب کی تعریف

مذاہب عالم کی کثرت اور ان میں عقاید و اعمال کے تنوع کی وجہ سے مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ اس کی مختصر اور سادہ ترین تعریف ای - بی - ٹیلر نے کی ہے: "مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے"۔ اس تعریف کی رو سے ہم دنیا کے بے شمار مذاہب کا جوہر سمجھ سکتے ہیں۔ لیکن کئی مذاہب ایسے بھی ہیں (مثلاً ابتداً بدھ مت اور کنفیوشی مت) جن میں ایمان و عقاید کی چنداں اہمیت نہیں اور جن کو ہم زیادہ سے زیادہ ایک با اخلاق زندگی گذارنے کا ضابطہ کہہ سکتے ہیں۔ غالباً اسی کے پیش نظر میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو جذبات سے متاثر اخلاق یا جذباتی اخلاق کہا ہے۔ پروفیسر وائٹ ہیڈ لکھتے ہیں "مذہب اعتقاد کی اس قوت کا نام ہے جس سے انسان کی اندرونی پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ مذہب ان صداقتوں کے مجموعہ کا نام ہے جن میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ انسانی کردار میں انقلاب پیدا کردیں

---

* یہ مضمون جناب ظفر آفاق انصاری، مددگار لکچرار پشاور یونیورسٹی، نے اس کتاب کے لیے بطور خاص مرتب کیا ہے۔ اس کی ترتیب میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہیں: (۱) مذاہب عالم از جناب احمد عبداللہ المسدوسی؛ (۲) اسلام اور مذاہب عالم از مظہرالدین صدیقی؛ (۳) تفہیم القرآن از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی؛ (۴) ترجمان القرآن جلد اول از مولانا ابوالکلام آزاد؛ (۵) النبی الخاتم از مولانا مناظر احسن گیلانی؛
(۶) E. R. Pike, *Encyclopaedia of Religion and Religions*
(۷) E. A. Jurji, (Ed.). *Great Religions of the World*
(۸) Horace Shipp, *Religions that Moved the World*
(مرتب)

Marfat.com

بہ شرطے کہ انہیں خلوص کے ساتھ قبول کیا جائے اور بصیرت کے ساتھ سمجھا جائے''۔

مذہب کا ارتقا

مذہب کے آغاز کے بارے میں اس وقت دو تصورات پائے جاتے ہیں ۔ ایک ارتقائی تصور اور دوسرا وہ تصور جو خود مذاہب نے پیش کیا ہے ۔

مذہب کے ارتقائی تصورات کی رو سے انسان کی ابتدا گمراہی اور لا علمی سے ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ انسانوں نے مشرکانہ خدا پرستی اور توحید پرستی اختیار کرلی ۔ اس عمل کی تفصیلات میں کافی اختلافات ہیں ۔ مثلاً کچھ کا خیال ہے کہ اس کی ابتدا آباو اجداد کی محبت سے ہوئی اور کچھ دوسرے مذہب کی ابتدا مظاہر فطرت مثلاً رعد و برق کے خوف سے کرتے ہیں ۔ ان کا خیال ہے کہ انسان نے ابتدا میں اپنی جہالت کی وجہ سے مظاہر فطرت کی پرستش شروع کردی اس لیے کہ ابتدا میں اس کی زندگی و موت کا دارومدار بہت حد تک ان پر تھا ؛ مثلاً زلزلے ، طوفان ، سیلاب ، آتش فشانیاں وغیرہ ۔ لیکن جیسے جیسے اس کا علم بڑھتا گیا اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا کہ یہ خدائی قوتیں نہیں رکھتے ۔ ابتدا میں لوگوں نے ہر چیز کو دیوتا بنا لیا تھا لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ خداؤں کی تعداد کم ہونے لگی یہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا ۔

اس کے برخلاف مذہبی نقطہ' نظر یہ ہے کہ خدا نے جب انسان کو اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہی اس کی تمام جسمانی ضروریات کی طرح اس کی روحانی ضروریات (ہدایت) کا بھی سامان کیا ۔ پہلا شخص جسے خدا نے بھیجا ہدایت یافتہ بلکہ پیغمبر تھا ۔ اس کے بعد بھی لوگوں میں جب گمراہی پھیلی تو خدا نے پھر پیغمبر بھیجے جنہوں نے دنیا کو راہ ہدایت دکھائی ۔ اس اعتبار سے توحید قدیم ہے اور شرک جدید ۔ اس وقت دنیا میں جتنے بڑے بڑے مذاہب ہیں (عیسائیت ، یہودیت ، اسلام ، وغیرہ) ان کے داعی خدا کے پیغمبر ہی تھے ۔ اور اس بنا پر ابتداً ان کی تعلیمات، جزوی فرق کو چھوڑ کر، یکساں تھیں ۔ بعد میں (اسلام کو چھوڑ کر) ہر مذہب کے پیروؤں نے اپنے اپنے مذہب میں ترامیم کرلیں ۔ آگے چل کر ہم نے عیسائیت اور یہودیت کے جو عقاید بیان کیے ہیں وہ در حقیقت وہ عقاید نہیں ہیں جو ان مذاہب کے پیغمبروں (حضرت عیسیٰ

Marfat.com

علیہ السلام و حضرت موسیٰ علیہ السلام) نے پیش کیے تھے بلکہ وہ ہیں جو بعد میں تحریفات و ترمیمات کے بعد بن گئے ہیں۔[1]

علم الانسان کی جدید تحقیق کے بعد بہت سے مغربی ماہرین بھی اب ارتقائی نقطہ نظر کو چھوڑکر مذہبی نقطہ نظر کو ماننے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ پروفیسر شمٹ کے کہنے کے مطابق:

> ''علم شعوب و قبائل انسانی کے پورے میدان میں اب پرانا ارتقائی مذہب بالکل بے کار ہوگیا ہے۔ نشو و نما کی مرتب کڑیوں کا وہ خوش نما سلسلہ جو اس مذاہب نے پوری آمادگی کے ساتھ تیار کیا تھا اب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے اور نئے تاریخی رجحانوں نے آسے اٹھاکر پھینک دیا ہے۔''[2]

یہی مصنف ایک اور جگہ لکھتا ہے:

> '' اب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انسان کے ابتدائی تصور کی اعلیٰ ترین ہستی فی الحقیقت توحیدی اعتقاد کا خدائے واحد تھا اور انسان کا دینی عقیدہ جو اس سے ظہور پذیر ہوا وہ پوری طرح ایک توحیدی دین تھا۔'' (صفحہ ۲۶۲)

مذاہب کی تعداد کا تعین بڑا دشوار ہے۔ اس لیے کہ ابھی ہمیں پوری دنیا کے لوگوں کے صحیح حالات کا بھی پتہ نہیں لیکن کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت دنیا میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مذاہب کے پیرو موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ مذاہب کے پیروؤں کی تعداد کروڑوں تک پہنچتی ہے اور بعض مذاہب صرف سو دو سو افراد کے قبیلوں تک محدود ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب میں سے ہم صرف ہندومت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام پر اس باب میں گفتگو کریں گے۔

۱- مذہب کے آغاز کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر یہی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لےکر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سب انبیا نے ایک ہی دین کی تبلیغ کی اور وہ دین اسلام ہے۔ دوسری قوموں نے اصل دین کو بگاڑ دیا اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی بھیجے تاکہ اصل ہدایت دوبارہ انسانوں تک پہنچائیں۔ اور یہ دین اپنی آخری شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے اور اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے۔ (مرتب)

۲- Schmidt, P. W., *The Origin and Growth of Religion*

یہ اور اس کے بعد کا اقتباس مولانا ابوالکلام آزاد کی 'ام الکتاب' سے لیے گئے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے مولانا کی کتاب میں 'قرآن اور صفات الٰہی کا تصور' کا باب ملاحظہ کیجیے، بالخصوص اس کا ابتدائی حصہ۔ (مرتب)

Marfat.com

هندو مت

هندو مذہب کی تاریخ اور اس کے بنیادی عقائد کی نشاندھی نہ صرف غیر هندو اهل علم ، بلکه هندوؤں کے لیے بھی ایک مشکل مسئله رهی ہے ۔ اس لیے که اس مذهب کے پیروؤں میں ایک سے لے کر تیس کروڑ تک خداؤں کے ماننے والے پائے جاتے هیں جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف اور بسا اوقات متناقض عقاید رکھتے هیں ۔ اس تنوع سے هندوؤں نے بڑا فائده اٹھایا ہے اور بے شمار نئے نئے گروهوں کے عقاید کے لیے گنجائش پیدا کرکے انہیں هندوؤں میں شامل کرلیا ہے ۔

هندوؤں کا مذهب بهت هی قدیم ہے ، اس کی اولین شخصیات اور تاریخ پر گم نامی کے بڑے دبیز پردے پڑے هوئے هیں ، لیکن ایک عام خیال یه ہے که هندو مت کا آغاز اس وقت سے هوا جب آریاؤں نے هندوستان پر حمله کیا (تقریبا ۱۷۰۰ ق ـ م) ۔ آریاؤں کے حملے سے پہلے یہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے جن کی عظیم الشان تہذیبوں کے نشان اب بھی موئنجو دارو، هڑپا اور دیگر بے شمار مقامات پر ملتے هیں اگرچه ان کے مذهب کے بارے میں هماری معلومات بهت قطعی نہیں هیں ۔ آریاؤں کے حملے کے نتیجے کے طور پر یه لوگ بڑی تعداد میں مارے گئے یا محکوم بنا لیے گئے ۔

اسی زمانے میں ”ویدوں“ کی تصنیف عمل میں آئی ۔ ان کا زمانهٔ تصنیف ۱۵۰۰ ق۔م کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے ۔ ان کتب میں دنیا سے فرار اور دنیاوی لذات سے کناره کشی کی تعلیم ملتی ہے ۔ اس دور میں کسی ایک طبقے کی سیادت کے آثار نہیں ملتے لیکن رفته رفته هندوؤں میں ذات پات کا امتیاز پیدا هونا شروع هوا ۔ ان کے چار طبقے هوگئے جن میں سب سے بهتر برهمن ، اور سب سے کم تر شودر قرار پائے ۔ اس ذات پات کی بنیاد پیدائش ہے ۔ یعنی جو شخص برهمن پیدا هوا وه خواه کتنے هی خراب کام کرے برهمن هی رہے گا اس لیے که ” برهما “ (خالق کائنات) نے اسے اپنے سر سے پیدا کیا ہے ۔ دوسری مختلف ذاتوں کو اس نے اپنے دوسرے اعضائے جسم سے پیدا کیا ہے ۔ چھتریوں کو اپنے بازوؤں سے ، ویشوں کو اپنے شکم سے ، شودروں کو اپنے قدموں سے ۔ اسی اعتبار سے ان ذاتوں کے کام متعین هوئے: برهمنوں کا کام تحصیل علم، پوجا پاٹ اور تلقین و وعظ ہے ، چھتریوں کا جنگ اور حکومت ، ویشوں کا کھیتی باڑی اور تجارت اور شودروں کا کام چاکری ہے ۔ ان ذاتوں کی بندشیں اس قدر سخت هیں که آپس

Marfat.com

میں شادی بیاہ بھی ممکن نہیں۔ سب سے بُرا درجہ اچھوتوں کا ہے جن کے چھونے سے بلکہ جن کے محض سائے سے اونچی ذات کے لوگ ناپاک ہو جاتے ہیں۔ اچھوت اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے جس سے اونچی ذات کے لوگ پانی بھرتے ہیں، ان کے برتنوں میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ حتیٰ کہ اونچی ذات والوں کے مندروں میں جا بھی نہیں سکتے۔ بہت سے ہندو مصلحین نے اس شدت کے ختم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے اور ذات پات کی یہ تقسیم اب بھی ہندوستان میں برقرار ہے۔

ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کی مقدس کتابیں اپنشد ہیں جن کا زمانۂ تصنیف ۸۰۰ ق-م کے بعد کا ہے۔ ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام مظاہر کائنات میں ایک ہی روح کارفرما ہے جسے "برھما" کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں تناسخ کے عقیدے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے (اگرچہ یہ عقیدہ آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں موجود تھا)۔ عقیدۂ تناسخ کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان مرنے کے بعد فنا نہیں ہوتا بلکہ دوسرا جنم لیتا ہے۔ نئے جنم میں وہ جو شکل اختیار کرے گا وہ اس کے پچھلے اعمال پر منحصر ہے۔ اچھے اعمال کرکے وہ اعلیٰ ذات کے انسانوں میں بھی جنم لے سکتا ہے اور برے اعمال کرکے وہ کسی شودر کے گھر پیدا ہو سکتا ہے یا پھر کسی جانور کی صورت میں پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چور کی سزا یہ ہوگی کہ اگلے جنم میں وہ چوہا بن کر پیدا ہو اور قاتل شیر کی شکل میں پیدا ہوسکتا ہے۔

مندرجۂ بالا دو کتب کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتب میں سب سے اہم مہا بھارت اور رامائن ہیں جو قدیم رجزیہ مثنویاں ہیں۔ مہا بھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات ہیں اور ساتھ ہی ساتھ مختلف نصیحتیں ہیں جن میں خاص طور پر دنیا کی بے ثباتی اور ظواہر کی کم حقیقی پر زور دیا گیا ہے۔ رامائن میں رام کا واقعہ ہے جو ہندوؤں کے بڑے اوتار تھے۔ ہندو مذہب میں دنیا اور اس کے عیش و آرام کو ترک کرنا روحانی ترقی کے لیے بڑا ضروری ہے اس واسطے اکثر ہندو سادھو آبادیاں چھوڑ کر ویرانیوں میں نکل جاتے ہیں اور وہاں عبادت و ریاضت کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہیں۔ ریاضت کے لیے وہ نئے نئے طریقے ایجاد کرتے ہیں مثلاً ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا، کیلوں کے فرش پر لیٹنا، انگاروں پر چلنا وغیرہ۔

لیکن اس کے باوجود ہندو مت میں اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ

Marfat.com

انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار نہ بھی کرے اگرچہ ایسی صورت میں وہ بلند تر روحانی مدراج کا مستحق نہ ہوگا ۔ ایسے آدمی کی زندگی کے لیے چار ادوار مقرر کر دیے گئے ہیں ۔ پہلا طلبِ علم کے لیے، دوسرا گھر گرہستی کے لیے، تیسرا غور و فکر کے لیے اور چوتھا محض پوجا پاٹ کے لیے ۔

جیسا کہ اوپر بتایا گیا ، ہندوؤں کے دیوی دیوتاؤں کا کوئی شمار نہیں لیکن ان میں سے اہم تین ہیں ۔ برھما ، وشنو اور شیوا ۔ برھما اس کائنات کا خالق ہے لیکن اس سے آگے اس کے اختیارات نہیں ۔ وہ محض کائنات کے لیے نقطہ آغاز ہے اور اسی بنا پر ہندوؤں میں اس کی عبادت بہت شاذ ہی ہوتی ہے ۔ وشنو سلامتی اور بقا کا دیوتا ہے ۔ برھما تو انسانی زندگی سے اس سے زیادہ متعلق نہیں کہ اس نے انسان کو پیدا کیا لیکن وشنو کا تعلق زیادہ دائمی ہے ۔ بعض اوقات یہ انسانی شکل میں بھی نمودار ہوتا ہے ۔ ہندو اپنے بڑے رہنماؤں مثلاً رام اور کرشن کو وشنو ہی کا اوتار کہتے ہیں ۔ جس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ وشنو ان میں حلول کر گیا تھا ۔ وشنو تو سلامتی کا دیوتا تھا ۔ اس کے برعکس شیوا کا کام حیات کو ختم کرنا ہے ۔ اس طرح عملی زندگی میں راج کرنے والے شیوا اور وشنو ہی ہیں جن کے کام ایک دوسرے کے مخالف ہوتے ہیں ۔

اس وقت ہندوؤں کی تعداد (اچھوتوں کو ملا کر) ۲۷ کروڑ سے کچھ زیادہ ہے ۔ ان میں بیشتر ہندوستان میں آباد ہیں ۔ اس کے علاوہ پاکستان ، برما، سیام، ملایا، اور انڈونیشیا میں بھی تھوڑے بہت ہندو ہیں ۔

بدھ مت

بدھ مت کا آغاز چھٹی صدی قبل مسیح میں ہوا ۔ اس کے بانی گوتم بدھ ، جن کا اصل نام ساکھیا منی تھا ، نیپال کے جنوب میں کپل وستو کے مقام پر پیدا ہوئے ۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے اور ان کی ابتدائی زندگی شہزادوں کی طرح عیش و عشرت میں گذری ۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش پر ایک نجومی نے پیشن گوئی کی تھی کہ اگر انہوں نے دنیا کے مصائب کا مشاہدہ کر لیا تو تارک الدنیا ہو جائیں گے ورنہ ان کی قسمت میں دنیا کی بادشاہت ہے ۔ بدھ کے والد نے یہ سن کر اس بات کا بڑا اہتمام کیا کہ وہ مصائب و آلام سے آشنا بھی نہ ہو سکیں ۔ لیکن اس عیش و عشرت کی زندگی کے باوجود ان کی

Marfat.com

طبیعت میں غوروفکر کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ ساری احتیاطوں کے باوجود انہیں ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ساتھ باہر جانے کا اتفاق ہوا اور یک بارگی چند ایسے واقعات پیش آئے جنہوں نے ان کی زندگی یکسر بدل دی۔ انہیں ایک بوڑھا دکھائی دیا جس کی کمر ضعف پیری سے خم ہو رہی تھی۔ پھر ایک مریض پر نظر پڑی جو حالت مرض اور شدت تکلیف سے بے قرار تھا، پھر ایک لاش راستے میں نظر آئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایک تارک الدنیا فقیر کو دیکھا جس کا چہرہ سکون و طمانیت سے بھرپور تھا، ان واقعات نے ان پر بڑا اثر کیا۔ زندگی کیا ہے؟ اس میں اس درجہ مصائب و آلام کیوں ہیں؟ ان سے نجات کیسے حاصل کی جا سکتی ہے؟ یہ وہ سوالات تھے جن کے جواب کے لیے ان کا ذہن مضطرب تھا۔ محلوں کی عیش و عشرت اور ہماہمی سے بھرپور فضا ان مسائل پر غور و فکر کے لیے کسی طرح موزوں نہ تھی لہذا انہوں نے طے کیا کہ ویرانیوں کے سکون میں اس مسئلے پر غور کریں گے۔

تیس سال کی عمر میں گھر چھوڑ کر وہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ جو لوگ اس زمانے میں اہل علم سمجھے جاتے تھے ان سے استفادہ کیا، اگرچہ بہت کچھ سیکھا لیکن تسلی نہ ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ریاضتیں کرنی شروع کردیں۔ ہر آسائش ترک کردی حتیٰ کہ چند دانوں سے زیادہ غذا کا بھی استعمال چھوڑ دیا۔ اس کی انتہا یہ ہوئی کہ سات دن تک مسلسل ایک درخت کے نیچے مراقبے میں بیٹھے رہے جس کے بعد انہیں اچانک وہ کیفیت حاصل ہوئی جسے 'عرفان' کہتے ہیں۔ جس جگہ انہیں یہ عرفان حاصل ہوا تھا اسے 'بدھ گیا' کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی باقی زندگی تبلیغ و تلقین میں بسر کردی۔ ۴۸۰ ق۔م میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

گوتم بدھ نے اگرچہ صراحتاً خدا کا انکار کہیں نہیں کیا لیکن ان کی تعلیمات میں کسی مابعد الطبیعی وجود کا زیادہ نشان نہیں ملتا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اپنی زندگی کی بہتری کے لیے انسان کو کسی ماورائی طاقت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص عبادت و ریاضت کرکے اپنے نفس پر فتح پا سکتا ہے اور اس طرح وہ 'نروان' حاصل کرلے گا۔ نروان سے مراد ارتقائے نفس کا وہ درجہ ہے جہاں انسان تناسخ کے چکر سے نکل کر نفسانی خواہشات اور دنیاوی افکار و آلام سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ یہ گویا طمانیت، سکون اور ٹھہراو کی بہشت کا نام ہے۔

Marfat.com

گوتم بدھ کی تعلیمات میں 'ہشت پہلو راہ' کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ہشت پہلو سے مراد آٹھ چیزوں کی صحت ہے۔ صحیح ایمان، صحیح ارادہ، صحیح گفتگو، صحیح کردار، صحیح معاش، صحیح فکر، صحیح انکسار اور صحیح مراقبہ۔ ان آٹھ چیزوں کے علاوہ بھی بدھ متیوں پر پانچ چیزیں لازم قرار دی گئی ہیں۔ اول یہ کہ کسی ذی حیات شے کو زندگی سے محروم نہ کیا جائے۔ دوم، کوئی چیز زبردستی یا دھوکے سے حاصل نہ کی جائے۔ سوم، جھوٹ نہ بولا جائے۔ چہارم، منشیات سے پرہیز کیا جائے۔ پنجم، جسم کے گناہوں سے بچا جائے۔ ان کے علاوہ گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات میں راہ اعتدال اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اس دور میں یا تو ہندو یوگی تھے جنھوں نے آسائش و آرام کو اپنے اوپر حرام قرار دے رکھا تھا یا روسا تھے جو نعائم میں گھرے ہوئے تھے۔ گوتم بدھ نے کہا کہ ان دونوں کے درمیان کی راہ — راہ اعتدال — اختیار کی جائے لیکن اس کے باوجود روحانی تقدس حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیا کو ترک کرکے خانقاہی زندگی بسر کرے۔ اس مذہب کی تعلیمات کو حد سے حد ایک ضابطہ اخلاق کہا جا سکتا ہے۔ جس میں انفرادی مسائل اور روحانی تسکین کا سامان موجود ہے لیکن انسان کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے لیے کوئی ہدایت نہیں ملتی۔

شروع میں بدھ مت میں بت پرستی منع تھی اور ابتدائی تصویروں میں مہاتما بدھ کو کسی نشان کے ذریعے سے ظاہر کیا جاتا تھا، مثلاً کھڑاؤں یا خالی تخت سے ان کی موجودگی کا تصور پیدا کیا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہندو مت کے اثر سے بدھ مت میں بہت سے عقیدے اور رواج داخل ہوگئے جنھوں نے اس کی شکل بدل دی۔ اس نئی شکل کا نام 'مہایان' قرار پایا۔ مہایان کے معنی ہیں 'بڑا بار اٹھانے والا'۔ یہ نام اس لیے مناسب ہے کہ اس میں بہت سے عقیدوں اور رسوم کا بار اٹھانے کی صلاحیت تھی۔ پرانا طریقہ چوں کہ ان نئے عقائد اور رسوم کا حامل نہ تھا وہ اس لیے 'ہنایان'، یعنی کم بار اٹھانے والا، قرار پایا۔

مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو پھیلانے کے لیے ہر جگہ مبلغین مقرر کیے، عبادت گاہیں تعمیر کیں، کتبوں میں بدھ مت کی تعلیمات لکھوا کر نصب کرائیں، اور غیر ممالک میں سفیر بھیج کر اس ملک سے باہر بدھ مت کی اشاعت کی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ مذہب ہندوستان میں پیدا ہوا لیکن اب

Marfat.com

ہندوستان میں اس کے پیرو بہت کم ہیں۔ اس کے ماننے والے زیادہ تر دوسرے ممالک کے باشندے ہیں۔

گوتم بدھ کی تعلیم ہندوستان میں برہمنیت کے خلاف ایک رد عمل تھی اس میں ذات پات کی تفریق اور کسی مخصوص طبقے کی سیادت کی نفی کی گئی اور اسی وجہ سے یہ مذہب بڑی تیزی سے پھیلا تھا۔ لیکن یہ زیادہ عرصے تک اپنی پاکی برقرار نہ رکھ سکا اور خود برہمنی تصورات سے آلودہ ہو گیا۔ چناں چہ مہایانی فرقے میں برہمنیت کا عنصر غالب ہوتا گیا اور گوتم بدھ کی بیشتر اصلاحات خارج کردی گئیں۔ چناں چہ ان میں بت پرستی کا رواج بہت بڑھ گیا۔ در اصل لفظ بت خود 'بدھ' کی ایک شکل ہے اور اصنام پرستی کے داخل ہو جانے سے بعض مقامات پر مہایان اور ہندو مت کا اختلاف بہت کم ہو گیا۔

بدھ متیوں کی تعداد کے بارے میں بڑا اختلاف ہے۔ بعض نے ان کی تعداد پچاس کروڑ تک بتائی ہے لیکن در حقیقت اس وقت ان کی تعداد پانچ چھ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور یہ چین، برما، سیام، نیپال، بھوٹان، سیلون وغیرہ میں آباد ہیں۔[۱]

یہودیت

یہودیت کی بنیاد دو عقائد پر ہے۔ اول خدا کی وحدانیت اور دوم بنی اسرائیل کا خدا کی منتخب اور مخصوص امت ہونا۔

تمام الہامی مذاہب میں خدا کی وحدانیت کا تصور موجود ہے، اگرچہ اکثر جگہ بعد کے اضافوں اور ترمیموں کی وجہ سے یہ عقیدہ کمزور اور دھندلا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر عیسائیت میں (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے) ابتداً خدا کی وحدانیت کا تصور موجود تھا لیکن بعد میں تین خداؤں کا چرچا ہو گیا۔ موجودہ شکل میں توحید کی تعلیم اسلام کے علاوہ صرف یہودیت میں ملتی ہے، اگرچہ اس کے ساتھ ساتھ ایسے عقائد بھی ہیں جن کی وجہ سے یہودیت بھی توحید خالص سے محروم ہو گئی ہے۔

یہودی اپنی نسل کے اعتبار سے بنی اسرائیل ہیں۔ اسرائیل عبرانی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں 'خدا کا بندہ' اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا عبرانی زبان

۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو احمد عبداللہ المسدوسی، 'مذاہب عالم'۔

Marfat.com

میں نام تھا - اس طرح بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں - یہودیوں کا یہ دعویٰ کہ وہ خدا کے منتخب اور چہیتے بندے ہیں اور خدا سے ان کا تعلق خصوصی نوعیت رکھتا ہے، غلط سہی مگر بالکل بے بنیاد نہیں - خود قرآن نے کئی جگہ بنی اسرائیل کی فضیلت کا ذکر کیا ہے:

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ

اے بنی اسرائیل! ذرا میری نعمتوں کو یاد کرو جو
میں نے تمہیں دی تھیں اور (اس بات کو کہ) میں نے
تمہیں پوری دنیا پر فضیلت بخشی تھی -

لیکن جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہوں پر کہا گیا ہے، اس فضیلت کا سبب کوئی نسلی یا توراتی امتیاز نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ خدا نے بنی اسرائیل کو اسلام کی دعوت ساری دنیا تک پہنچانے کے فریضے پر مامور کیا تھا - پھر جب بنی اسرائیل نے اس فریضے سے روگردانی کی تو ان کو اس مسند فضیلت سے اتار دیا گیا -

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے ہی میں مصر آگئے تھے - یہاں ان کی نسل خوب پھلی پھولی - اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ ایک نسل قبطیوں کی تھی - آگے چل کر جب بنی اسرائیل اپنے فریضہ دعوت حق سے غافل ہوئے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنا لیا - اسی غلامانہ انحطاط کے دور میں حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث کیے گئے - آپ کا زمانہ بعثت حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً ۱۳ صدی قبل ہے - حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سرکردگی میں بنی اسرائیل نے بغاوت کی اور مصر سے ہجرت کرکے جزیرہ نمائے سینا کی طرف آئے - کوہ سینا ہی میں آپ پر توراۃ کے بیشتر احکام نازل ہوئے - ایک طویل عرصے تک خانہ بدوشانہ زندگی بسر کرنے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قایم کی - یہ حکومت گو قلیل رقبے میں تھی اور اس کی آبادی بھی بہت نہ تھی لیکن ہر حیثیت سے برتر اور بہت دولت مند تھی -

یہودیوں کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے - یہ عروج و زوال مادی بھی تھا اور روحانی بھی - جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی انہیں زوال ہوا، پھر ان میں پیغمبر مبعوث ہوئے اور انہوں نے ان کو قعر مذلت سے نکالا - ان میں داؤد اور سلیمان علیہم السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو سا تھ

Marfat.com

ہی ساتھ بادشاہ بھی تھے اور جن کے عہد میں بنی اسرائیل کی سلطنت اپنی شوکت کی معراج پر پہنچ گئی، لیکن بنی اسرائیل کی نافرمانیوں کی سزا کے طور پر خدا نے ایسے فاتحین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور انہیں وہاں سے نکال دیا ۔ اب موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے انہیں فلسطین میں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی ہے ۔

یہودیوں کے عقاید کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں ۔ ایک یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون نے ان عقائد کو ذرا تفصیلاً اس طرح بیان کیا ہے:

(۱) وجود خداوندی پر ایمان، (۲) اس کی وحدت پر ایمان، (۳) اس کے دائم ہونے پر ایمان، (۴) اس کے غیر مادی ہونے کا تصور، (۵) اس پر ایمان کہ عبادت صرف اسی کی کی جائے، (۶) پیغمبر پر ایمان، (۷) اس پر ایمان کہ حضرت موسیٰ سب سے بڑے پیغمبر تھے، (۸) اس پر ایمان کہ توراۃ (زبانی و تحریری دونوں) حضرت موسیٰ کو کوہ سینا پر عطا کی گئی، (۹) اس پر ایمان کہ وہ ناقابل تغیر ہے، (۱۰) اس پر ایمان کہ خدا علیم و خبیر ہے، (۱۱) یوم آخرت کی جزاء و سزا اور حیات بعد موت پر ایمان، (۱۲) مسیح کے آنے پر ایمان، اور (۱۳) مردوں کے جلائے جانے پر ایمان ۔

یہودیوں کے یہاں سبت کی تعطیل بڑی اہمیت رکھتی ہے ۔ سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہوکر سنیچر کے دن ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہوتا ہے ۔ اس دوران میں راسخ العقیدہ یہودی دنیاوی کاموں کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ عبادت اور مراقبے میں مشغول رہتے ہیں ۔

یہودیوں کی مقدس کتاب توراۃ ہے ۔ توراۃ کا اصل اطلاق تو ان پانچ کتابوں پر ہوتا ہے جو کوہ سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھیں، لیکن اکثر لفظ توراۃ کو زیادہ وسیع معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں یہودیت کا طرز معاشرت، اخلاق اور طریقۂ عبادت سب شامل ہو جاتے ہیں ۔ توراۃ آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے نازل ہوئی تھی ۔ اس وقت کتب کو ضبط تحریر میں لانے کا جو انتظام ممکن ہو سکتا تھا ظاہر ہے ۔ پھر بھی ان احکام کو تختیوں پر کندہ کرایا گیا، لیکن وہ بھی فاتحین کے حملوں کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکیں ۔ جس نے بھی یروشلم فتح کیا ان نسخوں کو آگ لگادی، اور اگرچہ یہودیوں نے اسے محفوظ رکھنے کی بڑی کوشش کی لیکن نہ کر سکے ۔ پھر اس سے بڑھ کر خرابی یہ ہوئی کہ یہودیوں کا اخلاق بگاڑ مذہبی طبقے میں

Marfat.com

بھی پھیل گیا اور چوں کہ نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے اور توراۃ صرف ان لوگوں کے پاس تھی لہذا انہوں نے اس میں من مانی تبدیلیاں کر ڈالیں۔

اپنی طویل تاریخ اور حکم رانی کے باوجود دنیا میں یہودیوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے اور ہمیشہ تھوڑی ہی رہی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں جو ان کی شان و شوکت اور عروج کا زمانہ تھا، ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ عددی اعتبار سے وہ سب سے زیادہ عروج پر جنگ عظیم دوم سے قبل تھے اور اس وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ تھی یہودیوں کے اپنے دعوے کے مطابق اب ان کی آبادی دو کروڑ ہے۔

عیسائیت

موجودہ دنیا کی تیس فیصد آبادی عیسائی مذہب کی پیرو ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ بہ لحاظ آبادی دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔

یہودیت کی طرح عیسائی مذہب بھی در حقیقت براہیمی مذاہب کی شاخوں میں سے ایک ہے۔ یہودیت سے بھی اس کا تعلق بہت ہی گہرا ہے یہاں تک کہ ابتداً عیسائیت کو [یہودی مذہب کی ایک شاخ ہی تصور کیا جاتا تھا، اس بنا پر عیسائیت کو] صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہودیت کی تاریخ اور اس کے پیروؤں کے حالات سے باخبر ہوں۔

جیسا کہ ہم سطور بالا میں دیکھ چکے ہیں، یہودیوں کو کچھ عرصے کے لیے فلسطین کی حکومت ملی لیکن ان کی گمراہیوں کی وجہ سے دوبارہ چھن گئی۔ اس طرح وہ روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے زوال کا شکار ہو گئے۔ یکے بعد دیگرے انبیا مبعوث ہوئے لیکن حالات بدستور خراب رہے۔ یہودی حسب سابق اپنی پستیوں کا شکار رہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ جن انبیا نے ان کی اصلاح کرنی چاہی ان کے ساتھ ان کا رویہ انتہائی شرمناک رہا۔ کچھ کو قتل کیا گیا، کچھ کو قید خانوں میں محبوس کر دیا گیا، کچھ کو سنگسار کر دیا گیا، کچھ کو وطن سے نکالا گیا اور کچھ کو آروں سے چیر ڈالا گیا۔[1] گویا معاشرے میں برائی اس درجہ پھیل چکی تھی کہ راہ حق کو اختیار کرنا تو در کنار، اس کے لیے کوئی آواز برداشت کرنا بھی اس قوم کے لیے ممکن نہ رہا۔ یاد رہے کہ یہ اس وقت کی حالت ہے جب یہودیوں سے فلسطین کی حکومت چھن چکی تھی اور وہ خود اپنے وطن میں رومیوں کے محکوم تھے۔ لیکن اس ساری

۱۔ یہ سب واقعات خود بائبل میں مرقوم ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے 'تفہیم القرآن' جلد اول از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، صفحات ۸۱-۸۲۔

Marfat.com

ذلت اور محکومی کے باوجود عام یہودی جہالت اور توہمات میں گرفتار تھے۔ ان کے فقیہ محض قانونی موشگافیوں اور علما چھوٹے چھوٹے مسائل پر جنگ کرنے میں مصروف تھے۔ دین موسوی کی روح غائب ہو چکی تھی۔ صرف ایک بے روح ڈھانچہ موجود تھا۔ جس میں علمائے یہود نے اپنے حسب منشا ترمیم و تنسیخ کرلی تھی۔

یہ وہ حالات تھے جن میں (آج سے تقریباً دو ہزار سال قبل) حضرت عیسیٰ علیہ السلام یروشلم کے قریب ایک مقام بیت اللحم میں کنواری مریم (علیہا السلام) کے بطن سے پیدا ہوئے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے آپ کی پیدائش اور وصال کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی[1] لیکن بالعموم خیال یہ ہے کہ آپ سنہ ۲۹ع میں اس دنیا سے تشریف لے گئے، اور اس وقت آپ کی عمر ساڑھے بتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی اسی طرح گمنامی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ تیس سال کی عمر میں آپ نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ اس مقصد کے لیے آپ نے جگہ جگہ وعظ کیے اور معجزوں کا مظاہرہ کیا۔ آپ کے معجزوں میں بیماروں کو اچھا کرنا، مردوں کو جلانا اور بے روح اشیا میں جان ڈالنا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں یہودیوں کی حالت جیسی کہ تھی بیان کی جاچکی ہے۔ آپ نے ان علمائے یہود کو خاص طور پر ہدف بنایا جنہوں نے دین موسوی میں اپنی من مانی خواہشات کے مطابق ترمیمات کرلی تھیں اور جن کا کام صرف ظواہر پرستی اور قانونی کھینچ تان رہ گیا تھا۔ آپ کی ان تعلیمات سے اس وقت بہت زیادہ لوگ متاثر نہ ہوئے۔ آپ کے ابتدائی متاثرین میں سے اکثر بظاہر معمولی حیثیت کے لوگ تھے مثلاً ماہی گیر وغیرہ اور مخالفت میں یہود کا بااثر اور ذی علم طبقہ تھا۔ ان لوگوں نے یہ سوچ کر کہ لوگ آپ کی تعلیمات سے متاثر نہ ہو جائیں رومی گورنر کو اکسا کر آپ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرا دیا اور صلیب کی سزا طے ہوئی۔ رومی گورنر آپ کی گرفتاری سے چنداں خوش نہ تھا اور غالباً اسے بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ بے گناہ ہیں۔ چنانچہ اس نے یہودیوں کے سامنے یہ انتخاب رکھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور برابا ڈاکو میں سے ایک قومی تہوار کے موقع پر چھوڑ دیا جائے۔ یہ برابا ڈاکو وقت کا مشہور قاتل تھا اور اسے بھی گرفتار کرکے مصلوب کرنے کا فیصلہ ہوا تھا لیکن

۱۔ ملاحظہ ہو ''انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ریلیجنز''، ای۔ رائسٹن پائیک، صفحہ ۲۰۹۔

Marfat.com

یہودیوں نے اکثریت سے فیصلہ کیا کہ برابا کو رہا کر دیا جائے اور حضرت مسیح علیہ السلام کو مصلوب کر دیا جائے۔ لیکن اس فیصلے کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا اور وہ مصلوب نہ ہو سکے[۱]۔

یہودیوں میں مسیح کا تصور موجود تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک با اختیار شخص پیدا ہوگا جو بنی اسرائیل کی رہنمائی کرے گا اور جس کے ذریعے سے یہودیوں کو دنیوی تفوق حاصل ہوگا۔ جب حضرت عیسیٰ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو یہودیوں نے مذاق اڑایا؛ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ "میری حکومت اس دنیا کی نہیں ہے۔" جب یہودیوں نے دیکھا کہ وہ رومیوں سے ٹکر لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو انہیں یقین ہو گیا کہ یہ مسیح نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ یہود دنیوی تفوق کے خواہاں تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیت نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ یہودیوں اور رومیوں دونوں کے مظالم اس مذہب کا کچھ نہ بگاڑ سکے اور چوتھی صدی عیسوی کی ابتدا میں روم، جہاں عیسائیوں پر بہت مظالم ہوئے تھے، عیسائیت کا مرکز بن گیا۔ اس کے بعد عیسائیوں کا اقتدار بڑھتا ہی گیا یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں ایک دور وہ بھی آگیا تھا کہ پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔

ایک طرف تو سیاسی قوت تھی اور دوسری طرف مذہبی اثر اور پھر دولت، ان چیزوں نے چرچ کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا لیکن عیسائی رہنماؤں نے اس قوت، دولت اور اثر کا زیادہ اچھا استعمال نہ کیا۔ وہ حضرت مسیح کی سادہ اور بے تکلف زندگی چھوڑ کر عیش و عشرت میں گھر گئے۔ دولت حاصل کرنے کے لیے برے سے برے ذرائع اختیار کیے گئے۔ یہاں تک کہ ایک دور وہ آیا

۱۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی اور تعلیمات کے بارے میں ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے بہت تھوڑا مواد موجود ہے لہذا اختلافات بہت ہیں۔ اوپر جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ قرآن سے ماخوذ ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ اس سے مختلف ہے۔ حواریوں کے عقیدے (Apostle's Creed) کی رو سے "وہ مقدس باپ خدا وند تعالیٰ کے اکلوتے بیٹے تھے، جن کا حمل روح مقدس سے ٹھہرا تھا اور جو کنواری مریم کے بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ پونٹیس پلیٹ (Pontius Pilate) رومی گورنر کے دور میں تکلیفیں اٹھائیں، صلیب پر چڑھایا گیا، اور انتقال کیا۔ دفن کے تیسرے دن بعد زندہ ہوئے آسمان پر چڑھے اور اب خدا وند صاحب قوت باپ کے دائیں طرف بیٹھے ہیں" حضرت مسیح کے بارے میں تاریخی مواد کی کمی کی انتہا یہ ہے کہ بہت سے جدید لکھنے والوں نے ان کے وجود تک سے انکار کر دیا ہے (ملاحظہ ہو انسائکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ ریلیجنز، 'Jesus: Myth Theory' صفحہ ۲۱۱)۔

Marfat.com

کہ پوپ نے "جنت کے سرٹیفکٹ" بیچنے شروع کر دیے - ان کی قوت کا استعمال صرف یہ رہ گیا کہ ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگائیں اور ان اختلافات میں اس درجہ بڑھ گئے کہ معمولی سا اختلاف رکھنے والوں کو موت کی سزا دے دی جاتی تھی - اس مقصد کے لیے خاص عدالتیں قایم کی گئیں جنہیں احتسابی عدالت کہتے ہیں - ایک اندازہ یہ ہے کہ ۱۴۸۱ع سے ۱۸۰۸ع تک ان عدالتوں نے تقریباً تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو مختلف سزائیں دیں؛ ان میں صرف ۳۲ ہزار وہ تھے جنہیں دھکتی آگ کی نذر کر دیا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گلیلو جیسے ماہرین سائنس شامل تھے، اٹلی کے مشہور سائنسدان برونو کو بھی اشاعت علم کے جرم میں آگ کی نذر کر دیا گیا؛ فلکیات پر کوپرنیکس کی کتاب مدتوں ممنوع رہی۔[1]

چرچ کے انہی مظالم کی بنا پر بہت سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کے مخالف ہیں اور اسی پس منظر کی بنا پر آج بھی بعض لوگ مذہب اور سائنس کو متضاد تصور کرتے ہیں حالاں کہ جس چیز میں تضاد و تصادم تھا وہ مذہب اور سائنس نہیں بلکہ عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل اور انیسویں صدی کا سائنسی فلسفہ تھا ۔

عیسائی مذہب کے عقائد میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ تثلیث (Trinity) کا عقیدہ ہے - اس خدائی تثلیث میں باپ، بیٹا اور روح القدس شامل ہیں - حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تثلیث کا دوسرا فرد تسلیم کیا جاتا ہے، وہ خدا کے بیٹے قرار پائے اور الوہیت میں اس کے شریک ہوئے - رومن کیتھولک چرچ کے نزدیک اس تثلیث میں مقدس مریم کا بھی اضافہ ہونا چاہیے -

تثلیث کا عقیدہ اگرچہ عیسائیت کے بنیادی عقائد میں سے ہے لیکن ہمارے پاس اس بات کے بڑے قوی دلائل ہیں کہ ابتدا میں یہ کوئی متفق علیہ عقیدہ نہ تھا - عیسائیت کی ابتدا میں ہمیں بے شمار ایسے فرقوں کا نشان ملتا ہے جو عقیدۂ تثلیث کے قائل نہ تھے بلکہ حضرت مسیح کو خدائے واحد کا بندہ تسلیم کرتے تھے - تیسری صدی عیسوی میں نائیہ کی کونسل میں جب اس عقیدے کو پیش کیا گیا تو وہاں بڑے شدید اختلاف ہوئے - اگرچہ اس عقیدے کو

۱- ان سب کے لیے ملاحظہ ہو، ابو سعید بزمی، "تاریخ انقلابات عالم" اور ایچ - جی - ویلز، *Outlines of World History* -

Marfat.com

منظور کر لیا گیا لیکن اختلاف کرنے والے اپنے اپنے اختلاف پر مصر رہے۔[1] ایک مشہور عیسائی عالم چارلس اینڈرسن اسکاٹ کے کہنے کے مطابق ”ابتدائی تین اناجیل میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی بنا پر یہ گمان ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے مسیح کو انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں؛ ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا، ایک ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوا تھا... اناجیل کی متعدد عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح اپنے آپ کو صرف نبی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے“[2] بلکہ ایک فرقہ اس وقت بھی موجود ہے جو اپنے آپ کو موحد کہتا ہے اور حضرت عیسیٰ کی الوہیت کا قائل نہیں ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی کتاب بائبل ہے جو عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ جدید میں چار اناجیل شامل ہیں متی، لوقا، مرقس اور یوحنا۔ ان کے علاوہ کچھ خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔ ان اناجیل کے علاوہ اور بھی اناجیل موجود ہیں لیکن ان کو غیر مستند قرار دیا جاتا ہے۔ ان چار اناجیل میں بھی باہمی اختلافات موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ کے نسب نامے میں بھی یکسانیت نہیں ہے۔ ان اناجیل کے متعلق عقیدہ ہے کہ وہ ان چار مصنفین کو فرداً فرداً علیحدہ القا ہوئی تھیں۔ القا ہونے کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے دور ہے اور قلم بند ہونے کا زمانہ القا ہونے کے زمانے سے مختلف۔ شرقِ اردن میں جو دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی فرقوں کے عقائد حضرت عیسیٰ کی تعلیم میں پیوست ہو گئے ہیں جس سے قرآن کے اس دعوے کی تائید ہوتی ہے کہ موجودہ مسیحیت حضرت عیسیٰ کی تعلیم نہیں بلکہ اس کی تحریف شدہ شکل ہے۔

عیسائیوں کی تعداد اس وقت ۸۰ کروڑ کے لگ بھگ ہے اور اس وقت وہ تین بڑے فرقوں میں منقسم ہیں۔ (۱) مشرقی تقلید پسند، (۲) رومن کیتھولک، اور (۳) پروٹسٹنٹ۔ ان میں سب سے بڑا فرقہ رومن کیتھولک ہے جس کا مرکز روم اور رہنما پاپائے روم ہے۔ مشرقی تقلید پسندی کا مرکز روس ہے، اور پروٹسٹنٹ یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ملاحظہ ہو، مولانا امین احسن اصلاحی، ”حقیقت شرک“۔

۲۔ ’انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا‘ (چودھواں ایڈیشن)، مضمون یسوع مسیح، مصنفہ چارلس اور ڈرسن اسکاٹ۔

Marfat.com

اسلام

اکثر لوگ اسلام کی ابتدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں لیکن یہ درست نہیں۔ اسلام وہی مذہب ہے جس کی تبلیغ و اشاعت حضرت آدم سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر پیغمبر نے کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سب در حقیقت مسلمان تھے اور اسلام کے داعی۔ لیکن بعد میں ان کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات مسخ کر ڈالیں۔ عیسائیت اور یہودیت درحقیقت اسلام ہی کی بگڑی ہوئیں شکلیں ہیں۔

"اسلام" کے لفظی معنیٰ ہیں اطاعت۔ اصطلاحاً یہ سمجھنا چاہیے کہ اسلام خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز چاند، سورج، ستارے درخت، خدا کے بنائے ہوئے قانون کے تابع اور مطیع ہیں، اس اعتبار سے وہ "مسلم" ہیں۔ انسان بھی اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں چار و ناچار خدا کا مطیع ہے۔ اس کا جسم، اس کا ذہن، اس کی خواہشات، یہ سب ان قوانین کے ماتحت ہیں جو خدا نے مقرر کردیے ہیں۔ لیکن انسانی زندگی کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو خدا نے انسان کے ارادے اور شعور پر چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ اپنی اس شعوری اور ارادی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہونے کا فیصلہ کریں انہیں "مسلم" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلام کسی خاندان یا ذات سے وابستہ نہیں، ایک عقیدے اور نظریۂ حیات کا نام ہے اور مسلم کا اطلاق بھی کسی مخصوص نسلی گروہ پر نہیں ہوتا بلکہ ان تمام افراد پر ہوتا ہے جو اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے قبول کریں خواہ اُن کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو، کسی بھی خطۂ زمین سے ہو، اور وہ کوئی سی بھی زبان بولیں۔

اسلام جن چیزوں کے ماننے کا مطالبہ ہر انسان سے کرتا ہے ان میں اہم ترین تین ہیں۔ توحید، رسالت اور آخرت۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان خدائے تعالیٰ کو تسلیم کرے اور یہ مانے کہ اس کے سوا کوئی عبادت و اطاعت کا حقدار نہیں ہے۔ رسالت پر ایمان سے مراد یہ ہے کہ ان انبیا یا پیغمبروں پر ایمان لائے جن کے ذریعے سے خدا نے اپنا پیغام ہم تک پہنچایا ہے۔ ان انبیا میں سے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور عقیدۂ آخرت کے معنی یہ

Marfat.com

ہیں کہ موجودہ زندگی کے خاتمے کے بعد لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کے اعمال کے اعتبار سے انہیں سزا یا جزا ملے گی -

ان عقیدوں کے علاوہ اسلام جن عملی چیزوں کا مطالبہ کرتا ہے ان میں پانچ وقت کی نماز ، سال میں ایک ماہ کے روزے ، عمر میں کم از کم ایک بار حج ، سالانہ زکواۃ اور فریضہ جہاد فی سبیل اللہ کی ادائیگی شامل ہیں -

چوں کہ اس پوری کتاب میں اسلام کے نظام زندگی کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے اس لیے اس باب میں اسلام کی تعلیمات کا انتہائی مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے -

اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی تعداد ۷۰ کروڑ کے قریب ہے - آبادی کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے - اور یہ وہ واحد مذہب ہے جس کے پیرو دنیا کے تمام براعظموں میں پائے جاتے ہیں - نیز اس وقت اقوام متحدہ کے ۱۲۶ ممبر ملکوں میں سے ۴۰ مسلمان ممالک ہیں - بیسویں صدی میں سامراج کے خلاف سب سے موثر جنگ مسلمانوں ہی نے کی ہے اور اسی جدوجہد کے نتیجے میں اب ان کے ۴۰ آزاد ملک موجود ہیں -

ایک تقابلی مطالعہ

اوپر ہم دنیا کے بڑے مذاہب کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کر چکے ہیں - ان سب کے مطالعے کے بعد فطری طور پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ موجودہ دور میں ان مذاہب کی حیثیت کیا ہے ؟ کیا یہ مذاہب اپنی اصلی شکل میں موجود ہیں ؟ کیا ان کی کتب جن پر ان کا بدار ہے پوری صحت کے ساتھ محفوظ ہیں؟ کیا یہ مذاہب موجودہ دور کی ترقیوں کا ساتھ دے سکتے ہیں ؟ اور آج کی دنیا میں کوئی موثر تعمیری کارنامہ انجام دے سکتے ہیں ؟ کیا یہ قابل عمل ہیں ؟ کیا یہ انسان کو ایک مکمل نظام حیات عطا کر سکتے ہیں ؟

کتب کی حفاظت کے معاملے کو لیجے - ہندوؤں کی مقدس کتاب ویدوں کا زمانہ ہی آج تک متعین نہیں ہو سکا - خود ہندو اس کی عدم صحت کے معترف ہیں اور اب ان میں سے اکثر پڑھے لکھے لوگ ان کو الہامی کتب کے بجائے انسانوں کی تصنیف خیال کرتے ہیں - بدھ مت کا معاملہ اس سے بھی آگے ہے - گوتم بدھ نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی ؛ صرف ان کی زبانی تعلیمات تھیں جو

Marfat.com

سینہ بہ سینہ چلتی رہیں اور سینکڑوں سال کے بعد جاکر مدون ہوئیں - یہودیوں کی کتاب مقدس توراۃ کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے بارے میں بے شمار تاریخی شہادتیں ملتی ہیں کہ یہ کتاب طویل طویل عرصوں کے لیے بالکل نیست و نابود ہوگئی تھی - مثال کے طور پر بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجاکر رکھ دی - توراۃ کا صرف ایک نسخہ تھا جو ہیکل میں تھا اور وہ تباہ و برباد کر دیا گیا - یہی نہیں بلکہ بخت نصر پوری یہودی قوم کو بابل پکڑ کر لے گیا جہاں انہیں اپنی مذہبی رسموں کے بجا لانے کی بالکل اجازت نہ تھی - ایران کے بادشاہ سائرس نے جب بابل فتح کرکے یہودیوں کو رہائی دی تو پھر انہوں نے نہ جانے کہاں سے توراۃ کا ایک نسخہ ڈھونڈ لیا - اس کے بعد بھی کم از کم تین مرتبہ توراۃ کا نسخہ دنیا سے بالکل تباہ کر دیا گیا اور پھر یہودیوں نے دوبارہ پیدا کر لیا - ظاہر ہے کہ اس عمل میں نہ جانے کتنی تبدیلیاں ہوگئیں - تحریفات کا ایک معمولی اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کتاب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجہیز و تکفین کے واقعات تک درج ہیں[1] -

یہی معاملہ انجیل کا ہے - حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی اور انہی کوششوں کا نتیجہ بائبل کی صورت میں نمودار ہوا - اس زمانے میں اس قسم کی اناجیل کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی - ایک روایت کی رو سے اس طرح کی ۳۰ اناجیل کا پتہ چلتا ہے - اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد حواریوں کے خطوط کی ہے - ۳۲۵ء میں نیقہ کی کونسل کے سامنے یہ سارا لٹریچر رکھا گیا - کافی جنگ و جدال کے بعد ان ساری انجیلوں کو اوپر تلے رکھ دیا گیا اور صبح آکر دیکھا گیا تو چار اناجیل اور کچھ خطوط کو چھوڑ کر باقی سب نیچے پڑی ہوئی تھیں - ان ہی چار اناجیل، متی، لوقا، مرقس اور یوحنا کو صحیح قرار دیا گیا[2] - ان کے ساتھ ساتھ کچھ خطوط بھی بچے تھے انہیں بھی درست قرار دیا گیا لیکن اس نیقہ کی انجیل کا آج بھی پتہ نہیں - آج کل قدیم ترین انجیل چوتھی پانچویں صدی کی ملتی ہے وہ بھی یونانی زبان میں جب کہ حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی زبان آرامی تھی -

۱ - مناظر احسن گیلانی، "النبی الخاتم" -
۲ - ایضاً - مزید ملاحظہ ہو، امین احسن اصلاحی، 'حقیقت شرک' -

Marfat.com

اس سب کے برخلاف ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن اپنی اصل زبان (عربی) میں آج تک اسی صورت سے محفوظ ہے جیسے وہ اترا تھا ۔ قرآن دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی زمانے میں مرتب ہوگیا تھا اس کے بعد صحابہؓ کرام نے اس کے مختلف نسخے کراکر مختلف جگہوں پر بھیجے - چناں چہ اس کے قدیم ترین اور جدید ترین نسخوں میں ایک شوشے کا فرق بھی نہیں ملتا ۔ اسلام کے کٹر مخالف بھی اس بات کے معترف ہیں کہ قرآن ہر قسم کی تحریف سے پاک اور منزہ ہے ۔[1]

اس کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ یہ مذاہب کس قسم کا نظام زندگی پیش کرتے ہیں ۔ اور وہ اس دنیا کے لیے قابل عمل ہیں یا نہیں ؟ اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو بعض مذاہب سرے سے نظام زندگی ہی نہیں دیتے - مثال کے طور پر بدھ مت یا عیسائیت مکمل نظام زندگی نہیں ۔ ان دونوں مذاہب کا موضوع محض اخلاق ہے لہذا یہ انسان کی زندگی میں وہ توافق اور ہم آہنگی نہیں پیدا کرسکتے جو کوئی جامع نظام حیات کر سکتا ہے ۔ ہندو مت اور یہودیت بلاشبہ اس اعتبار سے بہتر ہیں کہ وہ زندگی کے لیے ضابطہ اخلاق سے آگے بڑھ کر بھی تھوڑی بہت ہدایات دیتے ہیں ۔ لیکن ہندو مت میں ذات پات کی تقسیم اور حدود ہند تک محدودیت کی وجہ سے اس بات کی مطلق صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اس دور کو متاثر کرسکے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں منو سمرتی کے قوانین کے بجائے نئے قوانین بنائے جاتے ہیں ۔ اسی طرح یہودیت ایک نسل تک محدود ہے ۔ یہودی خود بھی تبلیغ نہیں کرتے اور نہ ہی یہ بات زیادہ پسند کرتے ہیں کہ کوئی ان کا مذہب اختیار کرے ۔ لیکن ہندو مت اور یہودیت بھی درحقیقت ایسا جامع و مانع نظام زندگی نہیں جو آج کے دور یا آئندہ کے ادوار میں انسانیت کی رہنمائی کر سکے ۔ اس کی وجہ ان کے قوانین کی سختی اور ان میں لچک کی کمی ہے ۔ بدھ مت اور عیسائیت تو انسان کی اجتماعی زندگی سے علاقہ ہی نہیں رکھتے لہذا لا محدود آزادی دے دیتے ہیں ۔ باقی ہندو مت اور یہودیت بے لچک ہونے کی وجہ سے ترقی پذیر نہیں ہیں ۔ اور اس بنا پر زمانے کے ارتقا کا ساتھ نہیں دے سکتے ۔ پھر ان میں سے کوئی مذہب بھی اپنے مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا ۔ ہندو مت اور بدھ مت کے سلسلے میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ رہی یہودیت اور عیسائیت تو ان کی

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو، باب ۱۵، شریعت اسلامی کے مآخذ ۔ (مرتب)

Marfat.com

مقدس کتب بھی شاھد ھیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک آنے والے کی خبر دی تھی جو دین کو مکمل کرے گا۔ توراۃ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی اس وحی کا ذکر ہے۔

''میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا ، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔'' (استثنا ۱۸-۱۹)

دوسرے الفاظ میں حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ ان کے بعد ایک اور نبی آئے گا جو صاحب شریعت ہوگا اور جس کے منہ میں اللہ تعالیٰ خود اپنا کلام ڈالے گا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''لیکن وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) پاکیزگی کی روح ہے، جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا ، وھی تمھیں سب چیزیں سکھائے گا ، اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ھیں تمھیں یاد دلائے گا۔'' (یوحنا ۱۴-۲۶)

نیز یہ کہ:

'' اور وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) آکر دنیا کو گناہ سے راستی اور عدالت سے قصور وار ٹھہرائے گا، گناہ اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے۔ میری اور بہت سی باتیں ھیں کہ میں تم سے کہوں ، پر اب تم ان کو برداشت نہیں کر سکتے ، لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمھیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی، اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی ، لیکن جو کچھ سنے گی، سو کہے گی میری بزرگی کرے گی۔'' (یوحنا ۱۶-۸)

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنے کلام کو نا تمام قرار دیا اور اس امر کا پتہ دیا کہ دین کو مکمل کرنے والا ابھی آئے گا۔

اس کے برعکس حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا وہ مکمل ہے اور انسانیت کے لیے خدا کا آخری پیغام ہے۔ وحی الٰہی نے آپ کی زبان مبارک سے پوری انسانیت کے لیے عام اعلان کرایا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے مکمل کردیا، اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند کیا۔

Marfat.com

اسلام کی تعلیمات نہایت ہمہ گیر اور جامع ہیں ۔ اسلام انفرادی زندگی کے لیے بھی ہدایات دیتا ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی ۔ اسلام میں جتنی اہمیت اخلاق نظام اور عبادت کی ہے اتنی ہی اہمیت سیاسی ، معاشرتی ، تمدنی اور اقتصادی نظام کی ہے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نہ انسان کو لا محدود آزادی دی گئی ہے اور نہ اسے بے انتہا جکڑ کر رکھا گیا ہے ۔ قرآن اور سنتؐ کے ذریعے زندگی کے بنیادی اصول متعین کردیے گئے ہیں ۔ ان اصول کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے تحت قوانین مدون کیے جا سکتے ہیں ۔ اس حکیمانہ نظام کی بنا پر اسلام میں ہر دور کا ساتھ دینے کی گنجائش رکھ دی گئی ہے ۔

مزید مطالعے کے لیے

مظہرالدین صدیقی ، اسلام اور مذاہب عالم ۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاهور ۔

احمد عبداللہ المسدوسی، مذاہب عالم ۔ کراچی ۔

رشید احمد رشید، مذاہب عالم ۔ پشاور ۔

Horace Shipp, *Faiths that Moved the World.*

J. Jurji (Ed.), *Great Religions of the World* Princeton University Press.

Trevor Ling, *A History of Religion East and West.* Macmillan, London.

M. M. Sharif, *A History of Muslim Philosophy.* Otto Harrassowitz, Wiesbaden, Vol. I, Chap. 1 and 3.

Marfat.com

۵

دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب

مغربی ممالک ہمیشہ سے اس قدر متمدن اور ترقی یافتہ نہ تھے جتنے کہ آج ہیں ۔ مغربی تہذیب اپنی موجودہ شکل میں صرف پانچ سو سال قدیم ہے ۔ یورپ میں اس سے پہلے کا زمانہ ''دور تاریک'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت نہ تو تہذیب و تمدن کا نور تھا اور نہ علوم و فنون کی روشنی ۔ اس باب میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ اس پس منظر سے جدید تہذیب کس طرح رونما ہوئی ؟ کن ماخذ سے اس نے اکتساب کیا ؟ کن بنیادوں پر وہ استوار ہوئی ؟ کن کن تحریکات کو اس نے جنم دیا ؟ اور بہ حیثیت مجموعی اس کے تسلط سے انسانیت نے کیا پایا اور کیا کھویا ؟

جدید تہذیب کا ارتقا[1]

کسی تہذیب کی روشنی یا ظلمت دراصل نتیجہ ہوتی ہے اس کے اصول و عقائد ، اخلاقی اقدار اور سماجی اداروں کا ۔ یہی وہ عناصر ترکیبی ہیں جن کے مجموعے کا نام تمدن ہے ۔ ان عناصر میں کچھ اثر قبول کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ اثر ڈالنے والے ۔ جو عناصر اثر ڈالنے والے ہوتے ہیں در اصل وہی کسی دور کی مخصوص تہذیب کا ڈھانچہ متعین کرتے ہیں ، اور اسی لحاظ سے ان عناصر کو عصری تحریکات کا نام دیا جاتا ہے ۔ جدید عصری تحریکوں میں پانچ عناصر تہذیب کو شامل کیا جاسکتا ہے ۔ فلسفہ مادیت، نظریہ الحاد،

۱۔ یہ باب پروفیسر عبدالحمید صدیقی کی کتاب ''انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام'' سے ماخوذ ہے چند مباحث کا اضافہ مرتب نے کیا ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

حاکمیتِ جمہور، جذبۂ قوم پرستی اور حیوانی ازدواج کا نظریہ ۔ یہی وہ قوائے خمسہ ہیں جو جدید تہذیب کی بلند و پرشکوہ عمارت کو سہارا دیے ہوئے ہیں اور یہی وہ برقی قمقمے ہیں جن سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکل رہی ہے۔

ان جدید عصری تحریکات کو بہ خوبی سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سرسری طور پر ان کے تاریخی ارتقا کا جائزہ لیا جائے ۔

عناصر تہذیب دو عوامل کے پیدا کردہ ہوتے ہیں ، ایک تو ماضی کے اثرات اور دوسرے اس دور کے مخصوص حالات و تصورات ۔ موجودہ تہذیب بھی انہی دو عوامل کے عمل اور رد عمل کا نتیجہ ہے ۔

جہاں تک یورپ کے ماضی کا تعلق ہے ، قرون وسطیٰ میں اہلِ یورپ فکر میں قدامت پسند اور مذہب میں گمراہ تھے ۔ مسیحیت بہت پہلے اپنی اصلی شکل کھو چکی تھی اور اس کی جگہ جس چیز کو آسمانی مذہب کا نام دیا جاتا تھا وہ چند غیر عقلی اوہام اور کچھ غیر فطری ریاضتوں کا مجموعہ تھا ۔ ان اوہام کے علاوہ ہر نئی فکر ارتداد اور ہر نیا خیال کفر سمجھا جاتا تھا ۔

سیاست اور معیشت پر جاگیردارانہ نظام حاوی تھا ۔ ہر ملک چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں منقسم تھا اور ہر جاگیردار اپنے علاقے میں خود مختار ۔ جاگیردار اپنے ''آدمیوں'' کے ارادہ و عمل پر کلی اختیار رکھتا تھا ۔ اس کے زیرِحکم افراد اگرچہ اصطلاحی معنوں میں اس کے غلام نہ تھے لیکن ان کی حیثیت غلاموں سے کسی طرح بہتر نہ تھی ۔ ایک نیم غلام کاشتکار[1] کو اپنی زمین چھوڑ کر جانے کا حق نہ تھا اور اسے کاشت پر مجبور کیا جا سکتا تھا ۔ وہ معاشی اور سماجی ہر لحاظ سے جاگیردار کے دست نگر تھے ۔ کاشت کاری واحد پیشہ تھا ، صنعت و حرفت برائے نام تھی اور چوں کہ کسی قسم کی منظم صنعت نہ تھی اس لیے تجارت بھی غیر موثر تھی ۔

معاشرے میں صرف دو طبقے تھے ۔ ایک امرا اور جاگیرداروں کا جس میں اصحاب جائداد اور مذہبی پیشوا شامل تھے اور دوسرے نیم غلام عوام ۔ ان دو طبقات کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک کی زندگی اگر مکمل ساز تھی تو دوسرے کی مکمل سوز، ایک مینا و جام سے دل بہلاتا تھا تو دوسرا نانِ شبینہ کا محتاج تھا ، ایک مخمل و کمخواب زیبِ تن کرتا تو دوسرا پھٹے چیتھڑوں کو ترستا تھا ۔

---

۱ - Serfs

Marfat.com

جنگ و جدال جاگیرداروں کا دن رات کا مشغلہ تھا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتے۔ اس زمانے میں چوں کہ مستاجر سپاہیوں کا دستور نہ تھا اس لیے معمولی کسان بھی اس بات پر مجبور تھے کہ اپنے آقا کی جانب سے اپنے خرچ پر جنگ میں شریک ہوں۔ کسان ایک تو ویسے ہی تنگ دست تھے پھر ہمہ وقتی جنگوں نے تو ان کی کمر بالکل ہی توڑ دی تھی۔

یہ سب کچھ تو تھا ہی لیکن ستم یہ کہ ان تمام نا انصافیوں اور زیادتیوں کو برحق ثابت کرنے کے لیے سہارا مذہب ہی کا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا مسخ شدہ مذہب ایک ایسا ملمع بنا ہوا تھا جس کو ہر قبیح اور بدنما چیز پر چڑھا کر خوش نما اور قابل قبول بنایا جا سکتا تھا۔ وہ برسرِ اقتدار طبقے کے ہاتھ میں حقیقتاً ایک ایسا ہتھکنڈہ تھا جس سے یہ طبقہ اپنی ہر جائز و ناجائز غرض پوری کرتا۔

یہ حالات تھے کہ جب مسلمانوں نے یورپ کے کچھ حصے کو فتح کیا اور باقی کچھ سے تجارتی تعلقات استوار کیے۔ اس دور کا مسلمان علم و ہنر کا دلدادہ اور صنعت و حرفت کا ماہر تھا۔ مسلمانوں سے تعلقات کی بنا پر یورپ کے عیسائیوں میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا، اور ان میں سے کچھ نے مسلم علما اور قدیم یونانی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا۔ اسی طرح تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں علوم و فنون کی تجدید ہوئی۔ تاریخ کی اصطلاح میں اس تجدید کو "نشاۃِ ثانیہ" کہا جاتا ہے۔ اس مطالعے کی بنا پر یورپ کے عیسائیوں میں روشن خیالی پیدا ہوئی۔ ان کی نظر میں غیر معقول نظریات کھٹکنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے جاہلانہ اوہام کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن عیسائیت کے مذہبی رہنماؤں نے ان سب پر ارتداد کا فتویٰ لگا کر نہایت سخت سزائیں دیں۔ ایک اندازے کے مطابق کلیسا کے سزا یافتہ افراد کی تعداد تین لاکھ سے کسی طرح کم نہیں۔ ان میں بتیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ انہی زندہ جلائے جانے والوں میں ہیئت اور طبیعیات کا مشہور عالم برونو بھی ہے جس کا سب سے بڑا جرم ارباب کلیسا کے نزدیک یہ تھا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ اسی طرح مشہور طبیعی عالم گلیلیو کو بھی اس بنا پر قید و بند کی سزا دی گئی کہ وہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

اہل کلیسا کے ان لرزہ خیز مظالم اور چیرہ دستیوں نے پورے یورپ

Marfat.com

میں ایک ہلچل مچادی ۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جن کے مفادات کلیسا سے وابستہ تھے ، سب کے سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے اور عداوت کے اس جوش میں بدقسمتی سے انہوں نے مذہب کے پورے نظام کو تہ و بالا کردینے کا تہیہ کر لیا ۔ چناں چہ وہ جنگ جو شروع شروع میں عیاش قسم کے اہل کلیسا کے خلاف لڑی جا رہی تھی ، وہ بعد میں عیسائی مذہب کے خلاف بھی شروع ہوگئی ، اور اس کے بعد ہر مذہب کے خلاف ۔ ان آزاد خیال اور تجدد پسند لوگوں میں اتنا صبر و ضبط ، غور و مطالعہ کی قوت اور تعقل و اجتہاد کی قابلیت نہ تھی کہ وہ اصل دین اور دین کی غلط نمایندگی کرنے والوں کے درمیان تمیز کرسکتے ۔ انہوں نے جذبات کی رو میں بہہ کر یہ سوچنا تک گوارہ نہ کیا کہ ان نفرت انگیز واقعات کا مذہب کہاں تک ذمہ دار ہے اور کہاں تک اس مذہب کے نام لیواؤں کی ذاتی حرص و جہالت ۔ چناں چہ غصہ میں آکر وہ ہدایت الٰہی ہی کے باغی ہوگئے ۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدیوں میں ایک ایسی جذباتی کشمکش شروع ہوئی جس میں چڑ اور ضد سے بہک کر ، تبدیلی کے جذبات خالص الحاد کے راستے پر پڑ گئے ۔ اس طویل کشمکش کے بعد مغرب میں تہذیب الحاد کا دور دورہ شروع ہوا ۔

علوم و فنون اور صنعت و حرفت بہ ہر حال پھلتے پھولتے رہے اور صنعت کی اسی روز افزوں ترقی کی بنا پر معاشرے میں ایک تیسرے طبقے نے جنم لیا ۔ اس طبقے میں کاریگر ، صنعت کار ، ساھوکار ، اور/ تاجر شامل تھے ۔ جیسے جیسے صنعت و تجارت میں اضافہ ہوتا گیا اس طبقے کے افراد بھی بڑھتے گئے ۔ ہر چند کہ مملکتیں ابھی تک جاگیروں میں منقسم تھیں لیکن صنعت کار اور تاجر کا مفاد اسی میں تھا کہ ان مصنوعی سرحدوں کا جس قدر جلد ممکن ہو خاتمہ ہو جائے ۔ چناں چہ اس طبقے نے جاگیردار کی عائد کردہ پابندیوں سے رفتہ رفتہ چھٹکارا حاصل کرنے کی مستقل کوشش کا آغاز کیا ۔ شہروں میں تجار کی انجمنوں کا قیام عمل میں آیا جن کا بڑا مقصد اسی کوشش کو منظم کرنا تھا ۔

جاگیردارانہ نظام کی مناسبت سے قرون وسطیٰ میں سیاسی اختیارات بادشاہ اور جاگیردار میں منقسم تھے[6] اور اسی بنا پر بادشاہ اور اس کے نوابوں میں اقتدار کی رسہ کشی رہتی تھی ۔ بادشاہ ملک کے انتظام میں زیادہ سے زیادہ دخل رکھنا چاہتا تھا اور جاگیردار اس کے اختیارات کو کم سے کم کرنے کی فکر

Marfat.com

میں رہتے تھے ۔ تاجر طبقے کو اپنا مفاد اسی میں نظر آیا کہ جاگیروں کی سرحدوں کا خاتمہ کرنے اور اپنی تجارت کو وسیع تر کرنے کے لیے وہ ہر طرح سے بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کریں ۔ چناں چہ یورپ کے تقریباً ہر ملک میں اس طبقے نے بادشاہ کا ساتھ دے کر کہیں قوت کے ذریعے سے اور ایک لخت اور کہیں بلا جبر اور تدریجی طور پر جاگیرداروں کو ان کے سیاسی حقوق سے بے دخل کردیا اور اس طرح قومی ریاست کی بنیاد پڑی ۔

قومی ریاست کے قیام سے قبل ہی یورپ کے ممالک میں جذبہ" قومیت کا آغاز ہو چکا تھا ۔ کلیسا کی بد انتظامی اور پوپ کی بد عملی کے خلاف احتجاج کرنے والے دو گروہوں سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایک وہ جنہوں نے اس بد انتظامی اور بد عملی کا ذمہ دار خود مذہب کے وجود کو ٹھہرایا ، اور دوسرے وہ جو مذہب کے خلاف تو نہ تھے لیکن ان کے نزدیک اصل سبب پورے یورپ کے لیے ایک مشترک چرچ اور ایک ہی پوپ کا وجود تھا ۔ انہوں نے پاپائے روم کی برتری اور اقتدار کا انکار کیا اور قومی چرچ کی کلی خود مختاری کی پرزور تائید کی ۔ تاریخ میں یہ تحریک ' اصلاح مذہب ' کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۔ چناں چہ اس لحاظ سے میکولی جیسا منکر مذہب ہو یا لوتھر جیسا مؤید مذہب، دونوں ہی نے جذبہ" قوم پرستی کی توسیع و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔

قومی ریاستوں کے قیام کے ساتھ دخانی انجن کی دریافت اور اس کے وسیع استعمال سے صنعتی پیداوار میں کثیر اضافہ ہوا اور اس صنعتی پیداوار کی فروخت کے لیے تجارتی منڈیوں کی ضرورت شدت سے محسوس کی جانے لگی ۔ چناں چہ یورپ کی بہت سی قومیں اسی مقصد کے حصول کے لیے اپنے گھروں سے نکل پڑیں ۔ اس تگ و دو میں مسابقت کے جذبے کا ابھرنا بالکل ایک فطری امر تھا ۔ مگر اسی مسابقت نے باہمی رقابت کی صورت اختیار کرلی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی ۔ اس آڑے وقت میں جس نظریے نے لوگوں کو سرگرم عمل کیا اور انہیں لڑنے مرنے پر ابھارا ، وہ قومیت کا نظریہ تھا ۔ مغربی انسان نے اس نئے بت کے تراشے جانے کے بعد کسی قدر اطمینان محسوس کیا ۔ ایک آن دیکھے خدا کی پرستش کی جگہ پیشانیاں اب اس " پیکر محسوس " کے سامنے جھکنے لگیں اور انسان اپنی زندگی میں بندگی کا جو خلا محسوس کر رہا تھا وہ ایک حد تک پُر ہوگیا ۔ فرد فرد میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے ۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

Marfat.com

غرض یہ کہ وہ لوگ جو مذہب کو کسی خاص شکل میں ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے زندہ رکھنا چاہتے تھے، بالواسطہ طور پر خود بھی اس کے خاتمے کا سبب بنے، اور اس طرح جذبۂ قوم پرستی کے راسخ ہو جانے کے بعد تہذیب مغربی بہت جلد اپنے مزاج کی دوئی سے پاک ہوگئی۔ فلسفہ، اخلاق، معیشت، سیاست، ہر جگہ سے مذہب کو بے دخل کر دیا گیا۔ مشاہدہ و تجربہ علم کا واحد ذریعہ بنے، ہر ان دیکھی چیز کا انکار روشن خیالی کا ثبوت قرار پایا، اخلاق کا معیار ذاتی منافع سمجھا گیا، زندگی بعد موت کا عقیدہ باطل گردانا گیا، قانون سازی کی راہ میں الہامی اور اخلاقی پابندیوں کو جہالت اور نادانی پر مبنی رکاوٹیں قرار دیا گیا اور اس طرح پوری زندگی کو غیر مذہبی اور مادی بنا دیا گیا۔

تہذیب جدید کے عناصر ترکیبی

اس عمل اور رد عمل سے جو تہذیب ظہور میں آئی اس کا جوہر یہی عناصر خمسہ ہیں جن کے تاریخی ارتقا کا مختصر جائزہ ہم نے اوپر لیا۔ مناسب ہوگا اگر ہم یہ بھی معلوم کریں کہ مغربی تہذیب میں ان کا صحیح مقام کیا ہے۔

(۱) فلسفۂ مادیت

فلسفۂ مادیت سے مراد دو چیزیں ہیں۔ اول ایک خاص ما بعد الطبیعیاتی[۱] (یا زیادہ صحیح معنوں میں طبیعیاتی) نظریہ جو عبارت ہے زندگی کے میکانکی تصور سے اور دوم مادیت کا اخلاقی نظریہ۔ پہلے نظریے کے مطابق دنیا میں مادے کے سوا کوئی چیز حقیقی نہیں حتیٰ کے انسان کا شعور و ارادہ بھی برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اور اس کائنات کو سمجھنے کے لیے طبیعی قوانین کے علاوہ کسی چیز کی طرف رجوع کی ضرورت نہیں۔ مادیت کے اخلاقی نظریے کے مطابق، جو حقیقتاً مادیت کے مابعدالطبیعیاتی نظریے ہی کا منطقی نتیجہ ہے، انسان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف جسمانی احتیاجات کی تسکین ہے۔ لہٰذا قابل غور شئے وہی ہے جو ان ضروریات کی

۱۔ یعنی کائنات اور دنیا کے ماورا اور انسانی زندگی کے بنیادی سوالات کی حقیقت کے بارے میں ایک نظریہ اور چونکہ یہ نظریہ خالص طبیعیاتی تھا اس لیے اس نے طبیعی دائرے سے باہر کی دنیا کو بھی اسی نگاہ سے دیکھا اور اسی انداز میں اس کی تعمیر کی۔

Marfat.com

تکمیل کرے۔ اس کے علاوہ کسی دوسری چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ انسانی کوششوں کا مقصود بھی صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر لذت و منفعت کا باعث ہو۔ یہ طرز فکر کس حد تک یورپ کی عملی زندگی میں دخل رکھتا ہے، اس کا اندازہ ایک مغربی مفکر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

> ''یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرتا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ہو، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے، اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے۔ اور اس کی غایت حیات صرف یہی ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ آسان پر راحت اور عام محاورے کے مطابق فطرت سے آزاد بنا سکے۔''

(ب) لادینیت

مادی طرز فکر کا لازمی نتیجہ لادینیت ہے۔ اگر مادہ سب کچھ ہے اور اگر یہ کائنات خود بخود پیدا ہوگئی ہے تو ظاہر ہے کہ کائنات کا نہ کوئی خالق ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ناظم۔ پھر جب نعوذ باللہ کوئی خالق و ناظم ہے ہی نہیں تو اعمال کا حساب اور ان کی جزا اور سزا کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چناں چہ میکانکی تصور حیات کے غلبے کے بعد مغربی ممالک کے نسبتاً کم لوگ صحیح معنوں میں خدا کے قائل ہیں۔ اپنے مذہب سے والہانہ محبت کے باوجود لادینی خیالات کے غلبے کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب سے تعصب و عناد کے علاوہ اور کسی طریقۂ فکر پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوتے اور زندگی کے عام دھارے کو موڑ نہیں سکے۔

(ج) حاکمیت جمہور

فلسفۂ مادیت کا دوسرا منطقی نتیجہ حاکمیتِ انسان ہے۔[1] اگر یہ دنیا بغیر کسی خالق کے پیدا ہوگئی اور اگر اس کا کوئی مالک و آقا بھی نہیں ہے تو کسی ایسی ہستی کا ذکر کرنا ہی بے سود ہے جس سے کسی قسم کی ہدایت اور رہبری کی امید کی جا سکے۔ لہٰذا انسان خود ہی اپنا مالک ہے۔ جس طرح وہ چاہے اصول وضع کرے اور جس اصول کو چاہے توڑے۔ لیکن

۱۔ یہ تصور محض سیاسی تصور نہیں ہے بلکہ ایک فلسفیانہ تصور ہے جس کی رو سے قانون اور اصول حیات اور خیر و شر کی اقدار کا اصل مآخذ انسانی فکر کو قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں اس تصور سے بحث کی جا رہی ہے۔

Marfat.com

اب سوال یہ تھا کہ مختلف انسانوں کے خیالات میں عظیم اختلاف ہوتا ہے، رائے مانی جائے تو کس کی؟ اقتدار تسلیم کیا جائے تو کس کا؟ اس کے جواب میں ایک خیالی شئے کی دریافت کی گئی جس کا نام روسو نے رائے عامہ[1] تجویز کیا۔ حاکمیتِ انسان کا تصور عملی طور پر حاکمیت جمہور کا تصور بن گیا۔ اس کا منشا یہ ہے کہ قوم کے عوام اپنی خواہشات اور آرام میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں، وہ جس چیز کو چاہیں اپنے لیے خود حلال یا حرام ٹھیرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چوں کہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیے۔ اس فلسفے کا سب سے بڑا اعجاز یہ ہے کہ اس نے حاکم اور محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے۔ اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔

بہ ظاہر یہ نظریہ نہایت ہی معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس کی رو سے عوام کو بادشاہوں کے ظلم و ستم سے نجات حاصل ہوئی۔ انہیں یہ حق نصیب ہوا کہ وہ اپنی بہتری کے لیے ہر قسم کی تدابیر اختیار کر سکیں۔ مگر حاکمیت کو عوام کے ہاتھوں میں اس طرح دے دینے کے بعد بھی انسانیت کی حقیقی مصائب ختم نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رائے عامہ محض ایک فریب ہے۔ انتخاب اور استصواب کے باوجود جو رائے حقیقتاً نافذ ہوتی ہے وہ یا تو کسی آمر کی ہوتی ہے یا چند برسر اقتدار افراد کی۔ الفرڈ کابن نے بالکل درست کہا ہے کہ عوام کو حاکمیت کا سونپ دیا جانا ان کو وہی حقوق عطا کرتا ہے جو حقوق ربانی کے نظریے کی رو سے ازمنۂ وسطیٰ میں بادشاہوں کو حاصل تھے اور اس طرح جن جن بے اعتدالیوں کے پرانے بادشاہ مرتکب ہوئے تھے انہی بے اعتدالیوں کا ارتکاب آج حاکمیتِ جمہور کے نام پر دنیا کا ہوشیار طبقہ کر رہا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جمہور کو دوسروں کے ظلم سے نجات حاصل ہونی چاہیے اور انہیں اس کا اختیار ہونا چاہیے کہ کوئی ان کے جائز مفاد و حقوق کو نقصان نہ پہونچا سکے۔ لیکن خود ان کی فلاح کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کے لیے شمع راہ ایسے اصول و احکام ہوں جو انصاف و فلاح کے حامل ہوں اور جن میں کسی کی خود غرضی یا کج روی کو دخل نہ ہو۔ یہ مرتبہ دینِ حق کو ہی حاصل ہو سکتا ہے اور اس کی

۱۔ General Will

Marfat.com

رہبری اور اس کے اصول کی پابندی اپنے اوپر عائد کرنے سے ہی جمہور فلاح پا سکتے ہیں۔

(د) جذبۂ قوم پرستی

قوم پرستی ایک ایسا جذبہ ہے جو مذہب کے خاتمے کے بعد اجتماعی نصب العین اور اتحادی عامل کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں مسیحیت یورپ کے مختلف ممالک کو جوڑنے والی قوت تھی۔ اس اشتراک کی بنا پر پورا یورپ باوجود سیاسی تقسیم کے ایک وحدت تصور کیا جاتا تھا۔ لیکن مذہب کے کامل استیصال کے بعد قوم ہی اصل وحدت قرار پائی۔ اس عقیدے کے مطابق قوم کو وہی درجہ حاصل ہے جو مذہب میں شارع کو دیا گیا ہے۔ قوم خطا و نسیان سے معصوم ہے۔ اس سے لغزش اور غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد اس کی ملک ہیں اور ان پر اس کی اطاعت فرض عین ہے۔ اس کو حق ہے کہ جس امر میں جو چاہے فیصلہ کرے۔ فرد کی پہلی اور آخری وفاداری صرف قوم کے لیے ہے اور اس میں کوتاہی کفر سے کم نہیں۔ اس طرز فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف قوموں اور ملکوں نے اپنے سیاسی تسلط اور استعمار کے جو چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچے تھے ان کی حدود سے نکل کر سوچنا ان کے لیے قریب قریب ناممکن ہو گیا۔ انہوں نے ہر اس چیز کو باطل خیال کیا جو ان کی خاک وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ یہ قوم پرستانہ ذہنیت تو یہاں تک بڑھ گئی کہ قوموں نے کسی غیر ملک سے آئی ہوئی ان اعلیٰ اقدار کو ماننے سے انکار کر دیا جن کو خدا کے پاک بندوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیا تھا اور جن میں کسی ایک قوم یا ملک کے مفاد کی حفاظت مقصود نہ تھی بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح مطلوب تھی۔ جرمنی کے ایک پروفیسر اِتٹرنے کے یہ الفاظ اس ذہنیت کی پوری غمازی کرتے ہیں۔

> ”ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں، انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔؟ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیے۔“

ان نظریوں سے جو بربادیاں واقع ہوئیں وہ تاریخ کے صفحات کو خونیں بنانے کا سبب بنیں اور ان کے نتیجہ میں انسانیت کے دکھوں میں اضافہ ہوا۔

Marfat.com

(ہ) حیوانی ازدواج کا نظریہ

اس خطرناک فلسفے کے معنی یہ ہیں کہ شرم و حیا اور عصمت و عفت، جن کو انسان اب تک قابل قدر صفات سمجھتا رہا ہے، وہ سب اضافی ہیں جو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ آج کے دور میں ان کی حیثیت ماضی کے افسانوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ درحقیقت یہ وہ زریں جال ہیں جو عورت کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ عورتوں کو چاہیے کہ وہ ان کی بوسیدہ رسّیوں کو توڑ کر آزاد ہو جائیں۔ عورتیں ہر لحاظ سے مرد کے برابر ہیں۔ انہیں زندگی کی دوڑ دھوپ میں برابر کا شریک ہونا چاہیے۔ خانہ داری کے فرائض میں مقید رہنا غیر فطری ہے۔ جنس ایک حیوانی جذبہ ہے جس کی تکمیل کے لیے نہ کسی خاص انتظام کی ضرورت ہے اور نہ اس سے زن و شوہر کے مختلف کردار کی دلیل فراہم ہوتی ہے۔ اس باطل فلسفے کا اثر یہ ہوا کہ پہلے تو نکاح کی گرفت ڈھیلی ہوئی، اس کے بعد نکاح سے عام بے زاری کا رجحان پرورش پانے لگا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوند خاک ہوگئی۔ اولاد کی خواہش بھی آہستہ آہستہ سرد پڑنے لگی اور تحریکِ ضبطِ ولادت نے اسے اور بھی کمزور کردیا۔ اولاد خاندان کے شیرازے کو مضبوطی سے باندھے رکھنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس میں کمی ہوئی تو خاندانی نظام اور بھی کمزور ہوا۔ اس کی تباہی نے انسانی معاشرے پر جو اثرات ڈالے ان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(ا) بچوں کی تربیت اور نگہداشت سے عام لاپروائی

(ب) صنفی انارکی۔

اس سلسلے میں مناسب یہ ہے کہ ہم اسی تہذیب کے چند سر برآوردہ داعیوں کی آرا پیش کر دیں تاکہ معلوم ہوسکے کہ وہ خود اس کے متعلق کس طرز پر سوچتے ہیں۔ چناں چہ عہدِ جدید کا ایک مفکر الیکسس کیریل لکھتا ہے:

> "موجودہ سماج نے سب سے فاش غلطی یہ کی ہے کہ اس نے تربیت کے لیے خاندان کے مقابلے میں مدرسوں پر اعتماد کیا۔ آج کی ماں اپنے بچے کو نرسری اسکول میں صرف اس غرض کے لیے چھوڑ آتی ہے کہ وہ اپنی معاش کے لیے، آزاد شہوت رانی کے لیے، فضول قسم کی آرٹ پرستی کے لیے، اور برج کھیلنے یا سنیما جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ

Marfat.com

وقت بچا سکے اور اس طرح ایک طرح کی مشغول بےکاری میں منہمک رہے۔ اس طرز زندگی نے خاندان کے نظام کو، جس کے زیر اثر رہ کر بچہ بہت کچھ سیکھتا ہے، بالکل درھم برھم کر دیا۔''[1]

حیوانی ازدواج کے اس فلسفے نے جہاں ایک طرف خاندانی نظام کو تباہ و برباد کیا ہے وھاں اس نے فطرت کی طرف رجعت کے رنگین پردے میں صنفی بےاصولی کا بیج بو دیا۔ اس نے لوگوں کو نہایت ھی دلچسپ انداز میں یہ درس دیا کہ آزاد محبت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ نکاح وغیرہ کی پابندیاں محض مصنوعی ھیں اور تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ھیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ کا ھر ھوٹل، ھر پارک، ھر محلہ بد اخلاقی کا مرکز بن گیا۔ یہ ایک ایسی کھلی حقیقت ہے جس کے لیے ثبوت کی ضرورت نہیں۔

روس بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ اشتراکیت نے وھاں اخلاقی سطح کو اور بھی پست کر دیا ہے۔ اشتراکی رھنماؤں نے زیادہ زور اسی بات پر دیا ہے کہ کوئی چیز بھی اشتراکی سوسائٹی کی راہ میں رکاوٹ نہ بننے پائے۔ جنسی عمل میں انسان کو اس کے مذاق اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اور آزاد جنسی تعلقات کی استواری کے کُلّی اختیارات اسے تفویض کر دیے گئے ھیں۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ ھوا کہ بڑے شہروں میں جہاں اشتراکی اخلاقیات اور صنفی انارکی کا براہ راست اثر پڑا وھاں اخلاقی اقدار بالکل مٹ گئی ھیں۔[2]

انہی حالات کی بنا پر علم طبیعیات کی مشہور ماھر مسز ھڈسن شا مغرب پر بہ حیثیت کُل تبصرہ کرتے ھوئے کہتی ھیں۔

''ھماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ھونے کو ھیں۔ اس کی بنیادوں میں ضُعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ھل رہے ھیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوندِ خاک ھوجائے۔ ھم گذشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ھیں کہ اب لوگ نظم وضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ھیں۔ اس کی بقا کی صرف ایک ھی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کردی جائے۔''[3]

۱۔ Alixes Carrel, *Man the Unknown*.

۲۔ ملاحظہ ھو پیٹ سیلون کی کتاب *Russia without Illusions* اور فلٹن جے۔ شین کی تصنیف *Communism and the Conscience of the West*.

۳۔ Shaw, Mrs. Hudson, *Sex and Commonsense*.

Marfat.com

معاشرتی ارتقا کا تصور اور اس کے نتائج

تہذیبِ الحاد کے ان سارے عناصر نے اچھے احساسات، پاکیزہ جذبات اور اخلاقی اقدار کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ھے اس سے بڑھ چڑھ کر کام معاشرتی ارتقا کے تصور نے کیا ھے ۔ یہ نظریہ مادیت پرستی کے بطن سے پیدا ہوا ، افادی طرز فکر نے اسے پروان چڑھایا اور زمان و مکان پر انسانیت کی فتح نے اسے قبولِ عام بخشا ۔ اس کے فروغ کے ساتھ ھی ظلم نے انصاف کا اور شیطنت نے شرافت کا روپ دھار لیا ۔ پھر خون‌ریزی ، سفاکی اور کمزور کشی اخلاقِ عالیہ قرار پائے ۔ یوں تو اس نظریے کی پرورش میں بےشمار اصحابِ فکر نے حصہ لیا ھے لیکن ھیگل ، مارکس اور ڈارون کے نام خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ ذیل میں ھم انہی مفکروں کے افکار کے مختصر مطالعے کے بعد اس نظریے کے معاشرتی نتائج کا جائزہ لیں گے ۔

(۱) **ھیگل** ۔ فلسفہ کی فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ھم یہ کہہ سکتے ھیں کہ ھیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقا دراصل اضداد کے ظہور ، تصادم اور امتزاج سے واقع ہوتا ھے ۔ تاریخ انسانی کا ھر دور ایک وحدت ھے ، ایک کُل ھے ۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے ایک خاص مرتبے پر ہوتے ھیں ، ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ھے اور یہ عناصر ایک عصری وحدت کے رخِ زیبا کا عکس ہوتے ھیں ۔ جب تاریخ انسانی کا قافلہ روحِ مطلق کے اشارے پر کچھ قدم آگے بڑھتا ھے تو خود اس کے اپنے قافلے میں سے کچھ حریفانہ افکار ، رجحانات اور نظریات علَمِ بغاوت بلند کرتے ہوئے میدان جنگ میں آ جاتے ھیں ۔ ان دونوں کے درمیان ایک زبردست لڑائی شروع ہوتی ھے ۔ مگر کچھ مدت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد ان میں آخرکار صلح ہو جاتی ھے اور دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ھیں ۔ اور اس کے بعد ایک ایسی وحدت کو جنم دیتے ھیں جو دونوں گروھوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہوتی ھے ۔ یہ وحدت ایک بالکل نئے نظام فکر و عمل کی حیثیت سے آگے بڑھتی ھے لیکن کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ھے اور انسانی تہذیب اس طرح ترقی کرتی چلی جاتی ھے ۔

Marfat.com

فکر و عمل کے نظاموں اور عناصر تہذیب کا یہ ٹکراو عملاً اقوام کے ٹکراو کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہیگل کے طرز فکر کے مطابق ہر قوم ایک خاص کلچر کا مظہر اور ایک خاص فکر کی حامل ہوتی ہے۔ لہذا افکار کا تصادم دراصل اقوام کا تصادم ہے۔ اور اسی بنا پر ہیگل اقوام کے مستقل پیکار کو انسانی ترقی کے لیے ایک لازمہ قرار دیتا ہے۔

(ب) مارکس۔ کارل مارکس نے اپنا فکری خاکہ ہیگل سے مستعار لیا مگر اس میں خود اپنے وجدان سے رنگ بھرا۔ اس نے روح کے تصور کو الگ کرتے ہوئے مادی اسباب، یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقا کی بنیاد قرار دیا۔ ہیگل کے نزدیک اگر موثر طاقت افکار کی ہے تو مارکس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کُن قوت صرف مادی ماحول ہے اور اس میں بھی حقیقی اھمیت ذرائع پیداوار اور روابط پیداوار کو حاصل ہے۔ مارکس کے نظریے کے مطابق پیدائش دولت کے مختلف طریقے ھی کسی دور کی ذھنی اور سیاسی زندگی کا ہیولیٰ تیار کرتے ھیں۔ انسانیت کے ارتقا کی اس کے نزدیک یہ صورت ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں ایک تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس سے زندگی کی ساری قدریں از خود بدل جاتی ھیں اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب دونوں نظاموں میں ہیگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے۔ بالآخر وہ صلح پر آمادہ ہو جاتے ھیں۔ اور اس کے بعد دونوں مل کر ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ھیں جس میں تمام صالح اجزا شامل ہوتے ھیں۔ اسی طریقے سے انسانیت کا ارتقا ہو رہا ہے۔

مارکس کی نگاہ میں متضاد اجزائے تمدن اور اقدار اخلاق کے ٹکراؤ کا مظہر تصادم اقوام نہیں بلکہ تصادم طبقات ہوتا ہے اور ہیگل کے برخلاف اس کے نزدیک اصل وحدت قوم نہیں، طبقہ ہے۔

قوم کا انحصار مصنوعی اور سطحی ہوتا ہے۔ چناں چہ اقوام کی باھمی جنگ اگر ہیگل کے نزدیک ارتقائے انسانی کے لیے ضروری ہے تو مارکس کے نزدیک طبقات کی باھمی کشمکش۔

(ج) ڈارون — تیسرا مفکر جس نے اپنے طرز فکر سے معاشرتی ارتقا کے نظریے کو ایک زبردست قوت فراھم کی وہ ڈارون ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور شکل و صورت میں تغیر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن انواع حیوانات

Marfat.com

کا ارتقا قدرت کے کسی تعمیری عمل کا رہینِ منت نہیں بلکہ تخریبی عمل کا نتیجہ ہے کیوں کہ وہ حیوانات کی باہمی جنگ، قحط اور موت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔

ڈارون کائنات کو ایک میدانِ کارزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے جس میں ہر آن ہر طرف زندگی اور بقا کے لیے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ لہذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر جسمانی طاقت کا مالک ہے وہی زندہ رہتا ہے۔ اور اصل میں وہی زندگی کی نعمت کا صحیح مستحق بھی ہے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔ الغرض زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی صرف طاقتور کے وجود کو برداشت کرتے ہیں۔ کمزوروں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں اور نہ ہونی چاہیے۔ لہذا انہیں چاہیے کہ کائنات کو اپنے ناتواں وجود سے جلد از جلد پاک کردیں۔ اس طرح حالات کی مجبوری سے ارتقا شروع ہوتا ہے، اور ایک مسلسل کشمکش کے ذریعے سے بلند تر حیوانات پیدا کرتا ہے۔ انسان بھی جدوجہد کی انہی پُر پیچ راہوں سے گذرتا ہوا انسانیت کی بلندی تک پہنچا ہے۔ جو کوئی بھی تنازع لِلبقا کی بھٹی میں سے کامیابی کے ساتھ گذر جاتا ہے وہ صالح ہے اور کائنات اپنی آغوش صرف اسی کے لیے کھولتی ہے۔

معاشرتی ارتقا کے بنیادی اصول اور ان کے نتائج

اب ان تینوں مفکرین کے افکار کو جمع کرنے سے معاشرتی ارتقا کا جو نظریہ وجود میں آتا ہے اس کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں:

۱۔ زندگی میں ارتقا صرف کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے۔

۲۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں انسانیت ترقی کرتی ہے۔

۳۔ اس کائنات میں جینے اور ترقی کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت کا مظاہرہ کرے۔

۴۔ یہاں اصل مقصد کامیابی ہے خواہ کسی ذریعے سے حاصل ہو۔

اس وقت ہمارے پیشِ نظر اس فلسفے کی فکری لغزشوں کی نشان دہی نہیں بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ اس طرزِ فکر نے انسان کو انسان بنانے کے بجائے درندہ بنا دیا ہے۔ اور دنیا کو جنت نشان بنانے کے بجائے جہنم زار بنا ڈالا ہے۔

Marfat.com

۱- اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا وہ یہ ھے کہ انسان کی مادی ترقی ھی انسانی زندگی کی معراج قرار پائی - چنانچہ انسانوں کے مختلف گروہ اور طبقات مادی اسباب کی فراھمی کے لیے دیوانہ وار جدوجہد کرنے لگے اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہ رھے کیوں کہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو خود موت کو دعوت دیتے - اس طرزِ فکر نے لوگوں کے اندر ایک مستقل خوف زدگی کی کیفیت پیدا کردی - فرد ھو یا قوم سب کے دل پر اسی خونخوار جذبے کا پورا تسلط دکھائی دیتا ھے اور سب لوگ ایک دوسرے سے لرزاں نظر آتے ھیں - اس مسلسل خوف نے انسانیت کے اندر نہایت ذلیل خصائص کو ابھار دیا ھے - مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بُخل، تنگ نظری، بد عہدی، خیانت اور ریاکاری - عہد حاضر کے ماھرین نفسیات نے اپنے انکشافات سے اس حقیقت کو ثابت کیا ھے کہ انسان کے وہ اعمال جن کی غایت اپنی قوت کا اظہار ھے ان کے پیچھے خوف کا جذبہ ھی کارفرما ھوتا ھے - لہٰذا یہ فوجی قوت کی بے جا نمائش، خسروانہ جدل اور غیر مسئول اقتدار کی ھوس سب اسی کے نتیجے ھیں -

۲- اس طرزِ خیال نے انسانیت کے مستقبل کو سراسر تاریک کر دیا - جو فلسفہ انسانی انا[1] کے عملِ تخلیق کی توجیہ زمان و مکان کے ذریعے سے کرے گا وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ھے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو کبھی نجات نہیں دلا سکتا - یہی وجہ ھے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ھوتا جا رھا ھے -

۳- چوں کہ یہ نظریہ باھمی کشمکش کو انسانیت کے ارتقا کا سبب سمجھتا ھے اس لیے انسان میں تعاون کے احساسات ابھرنے کے بجائے مخاصمت اور حسد کے جذبات بھڑکتے ھیں - یہ نظریہ انسان کو یہ تعلیم دیتا ھے کہ اگر تمہیں پھولنا پھلنا ھے تو تمہیں اپنا سب کچھ اس کشمکش میں جھونک دینا چاھیے - یہی وجہ ھے کہ موجودہ انسان بالکل بے رحم اور سنگدل بن گیا ھے - اس کی رو سے اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کرکے آگے بڑھتا ھے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو پورا کر رھا ھے اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رھا ھے کہ جینے کا حق صرف اسی کو ھے - اس کے برعکس اگر کوئی ظلم سہتا ھے اور طاقتوروں کے پاؤں تلے پامال ھوتا ھے تو اسی قابل ھے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے - اس نظریے نے نہ صرف انسانیت کو جابر اور ظالم بنا دیا ھے بلکہ ھر صاحبِ قوت کو برحق

۱- Ego

Marfat.com

ثابت کرکے سرمایہ داری اور استعماریت کے لیے عقلی زمین فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے شر سمجھ کر کیا جاتا تھا، اس فلسفے نے اسے سراسر خیر میں تبدیل کردیا ہے۔ پہلے لوگ ظلم کرنے والے کو ظالم سمجھتے تھے، اب اسے عادل سمجھا جاتا ہے چناں چہ ایک فرانسیسی مصنف[1] کہتا ہے:

> "انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ آج کوئی ظالموں کی بہیمیت کو ختم کرنے کی ہمت نہیں رکھتا اور واقعہ یہ ہے کہ درندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔"

۴۔ پھر اس تصور حیات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کردیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت اور کشمکش، بہ شرطے کہ وہ مادی اعتبار سے کامیاب ہو، انسانی ارتقا کی ضامن ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کے بجائے قوت اور طاقت کی پرستش شروع کی۔ اس نے اپنی ذہانت اور طباعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا جن سے اس کی طاقت اور قوت میں اضافہ ہو۔ جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ سامراج اسی تصور کے شاخسانے ہیں۔

۵۔ نیز اس طرز فکر نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کرنے کا درس دیا۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی بقا و استحکام اور حصول قوت و اقتدار کے لیے کوشاں رہیں، چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق کی پیروی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے۔ اگر کامیابی ان کو ترک کر دینے سے حاصل ہوتی ہو تو انہیں فی الفور نظر انداز کر دینا چاہیے۔ پچھلی چار صدیوں میں میکیاولی کی تعلیم کو جو قبول عام نصیب ہوا اس کی بڑی وجہ یہی نظریہ ہے۔ گوبلز کے مندرجہ ذیل الفاظ اس فکر کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں:

> "ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تحریک مذہب کی پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے۔"

یہ ہیں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات۔ خواہ یورپ کی لادینی جمہوریت ہو یا روس و چین کی اشتراکیت یا ہٹلر اور

۱۔ Oris Sourarine

Marfat.com

مسولینی کی فسطائیت، یہ سب اسی ایک تہذیب کے مختلف رخ ہیں - ان کی اساس اور بنیادی روح ایک ہی ہے اور یہ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد کی مانند ہیں - ان کے باہم اختلافات بجا، لیکن ان کا بنیادی مزاج ایک ہی ہے - ان کی جڑیں ایک ہی تہذیبی روایت میں پیوست ہیں -

لادینیت اور اس کے اثرات کا جائزہ مندرجہ بالا صفحات میں آگیا ہے - اب ہم آئندہ صفحات میں اختصار کے ساتھ اشتراکیت کا مطالعہ کریں گے -

اشتراکیت

اشتراکیت سرمایہ دارانہ جمہوریت کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے - اشتراکی ریاست کے قیام کا اصل مقصد یہی تھا کہ ان خرابیوں سے چھٹکارا حاصل کیا جائے جو دور جدید کے معاشرے کو لاحق ہیں، اور اگرچہ اشتراکیت کے علمبردار سرمایہ دارانہ تہذیب کی اقدار پر کڑی تنقید کرتے ہیں لیکن اشتراکیت کے بہ غور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ دین ِ مادیت کے خلاف رد عمل نہیں بلکہ اس کی تکمیل ہے - ان دونوں میں بہت حد تک مماثلت پائی جاتی ہے کیوں کہ دونوں کو ایک ہی سر چشمہ سے فکری غذا ملتی ہے - معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین اور علم و فلسفہ کی بنیادی قدریں دونوں میں مشترک ہیں - اگر ان میں کچھ فرق ہے تو صرف مظاہر کا ہے نوع کا نہیں - اشتراکیت مادیت ہی کی زیادہ موثر، وسیع اور ہمہ گیر تحریک ہے - اس نے زندگی کے سارے شعبوں کو مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کرکے نہ صرف انہیں ہم رنگ بلکہ ہم آہنگ بھی بنا دیا ہے - لہذا اس کے مطالعے کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ یہ محض غریبوں اور مفلسوں کے معاشی مسائل کا حل نہیں بلکہ فکر و نظر، فلسفہ و اخلاق، تمدن و تہذیب اور مابعدالطبیعیاتی تخیلات کا ایک مستقل نظام ہے اور اس لحاظ سے کوئی شخص اس پورے نظام کو قبول کیے بغیر محض اشتراکی معاشیات کو اختیار نہیں کرسکتا - اور اگر کوئی ایسی ناممکن اور خلاف ِ عقل بات کا دعویٰ کرتا ہے تو یا تو وہ کم علم ہے یا منافقت سے کام لیتا ہے - اس نظام ِ فکر میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ آپ اس کی ایک چیز لے لیں اور باقی چیزوں کو چھوڑ دیں - اس کے سارے پہلو ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور اپنی بقا کے لیے اپنے دوسرے اجزا سے غذا حاصل کرتے ہیں -[1]

۱- ملاحظہ ہو Crew Hunt, R N., *Theory and Practice of Communism*

Marfat.com

اشتراکی فلسفہٴ حیات

اشتراکیت کے حامی اور اس کے مخالف عام طور پر اپنی بحث کا آغاز تاریخ کی مادی تعبیر سے کرتے ہیں - یہی ان کے نزدیک اشتراکی فلسفے کی جان ہے - مگر ہم اس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر اس نقطہٴ نظر کا کھوج لگانا چاہتے ہیں جو اشتراکیت اس کائنات کے متعلق انسان کو عطا کرتی ہے - انسان خواہ کسی خیال کا حامی ہو، وہ اس امر پر غور کرنے کے لیے مجبور ہے کہ جس دنیا میں وہ زندگی گذار رہا ہے اس میں اس کی کیا حیثیت ہے؟ وہ اگر اس کو برتے تو کیا سمجھ کر برتے؟ اس کی زندگی کا مقصود و منتہا کیا ہے؟ یہ وہ اولین اور بنیادی سوالات[1] ہیں جن کو کوئی ایسا نظام نظر انداز نہیں کرسکتا جس کا تعلق زندگی کی گہرائیوں سے ہو - انہی سوالات کے حل پر کسی نظامِ فکر کی عمارت تعمیر ہوتی ہے -

مارکسی فکر کی اساس یہ ہے کہ اس کائنات کی اصل حقیقت مادہ ہے جو جواہر کے مجموعے سے عبارت ہے جن کی تشریح طبیعیات کے اصولِ موضوعہ کے ذریعے سے ہی کی جاسکتی ہے - عالم میں جو کچھ بھی موجود ہے وہ ان قوانین کا پابند ہے - اس طرز خیال کے حامیوں کے نزدیک کسی بالاتر ہستی کا وجود یا اس کی فرماں روائی پر یقین نہ صرف خلاف عقل و فطرت ہے بلکہ انسانیت کے لیے نہایت خطرناک اور مہلک بھی ہے - خدا خود کوئی قایم بالذات ہستی نہیں بلکہ اس کے وجود کا اقرار انسان کی عاجزی اور درماندگی کا اعتراف ہے - نوعِ انسانی جب کائنات کے اسباب و اثرات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم کو جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے سمجھنے سے عاجز آجاتی ہے تو وہ مجبور ہوکر ایک بالاتر ذات کو تسلیم کر لیتی ہے - مگر جب انسان طبیعی قوانین کی ان پیچیدگیوں کو حل کر لے گا تو پھر اس کے دل میں خود بخود کسی بلند و بالا ذات کا خوف باقی نہیں رہے گا - اس لحاظ سے خدا کا وجود دراصل قوانین طبیعی سے لاعلمی کا نتیجہ ہے -

وہ فلسفہ جو انسان کو یہ تعلیم دے کہ اس دنیا میں کوئی بالاتر ہستی موجود نہیں وہ قدرتی طور پر ذہن انسانی میں اس خیال کو بھی راسخ کردیتا ہے کہ اس کی اپنی حیثیت اس کارخانہٴ حیات میں ایک عارضی اور اتفاقی شے

---

[1] زندگی کے بنیادی سوالات پر مفصل بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب اول - مرتب

Marfat.com

کی سی ہے جو فطرت کی اندھی قوتوں کی نہ صرف تخلیق ہے بلکہ ان کے ہاتھ میں بے بس کھلونا بنی ہے۔

پھر جب ہم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس عالم کی ماہیت زمان و مکان کے علاوہ کچھ بھی نہیں تو ہمیں از خود اس بات کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ مادے کی یہ منظم دنیا صرف توانائی کی لہروں سے تعمیر ہوئی ہے۔ اور اس عالم کے علاوہ کوئی دوسرا عالم نہیں۔

اس میکانکی تصور حیات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے عمل میں غیر ذمہ دار اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں بجائے تعاون کے مسابقت و مخالفت کا جذبہ کار فرما ہوتا ہے۔ اور اس طرح معاشرہ میں چین و سکون کے بجائے فساد و اضطراب کا دور دورہ ہوتا ہے۔[1]

ان ابتدائی گذارشات کے بعد اب ہم اشتراکی فلسفے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

تاریخ کی مادی تعبیر

مارکسی فکر کا پہلا عنصر تاریخ کی مادی تعبیر ہے۔ مارکس کے اس نظریے کے مطابق کسی عہد کا معاشی نظام ہی تاریخ کے اس عہد میں معاشرتی زندگی کی اصل بنیاد ہے۔ مذہب، تہذیب، فلسفہ حیات، فنون لطیفہ سب اسی کا عکس ہیں۔ یہی نہیں بلکہ تمام انسانی تخیلات و جذبات اسی سے ماخوذ ہوتے ہیں۔ فکر معاش کی تگ و تاز ہی فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے۔ الغرض یہی معاشی نظام حیات انسانی کے سارے مشاہدات کا اصل خالق ہے۔ لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ کے تقاضوں کے علاوہ بھی کچھ اور تقاضے ہیں۔ مگر وہ سب غلط فہمی کا شکار ہیں۔ انسانی زندگی کا اصل محرک صرف معاشی ضروریات ہیں۔ مارکس نے اسی طرز فکر کو اپنے فلسفۂ تمدن اور تاریخ کا سنگ بنیاد قرار دیا ہے کیوں کہ اس کے نزدیک زندگی کی تمام قدریں اسی کے توسط سے تخلیق پاتی ہیں۔

معاشی نظام دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، ایک پیداواری قوتیں اور دوسرے معاشی تعلقات۔ معاشی تعلقات بذات خود پیداواری قوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

۱۔ میکانیکی تصور حیات کے نتائج کا تفصیلی مطالعہ ہم باب ۱ میں کر چکے ہیں۔ اشتراکیت کے فلسفۂ حیات کا مختصر اور جامع بیان اینجلز کی 'رد ڈوہرنگ' **(Anti-Duhring)** میں ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

رفتار زمانہ کے ساتھ جب طریق پیدائش کی نئی نئی گرہیں کھلتی ہیں تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہم آہنگی باقی نہیں رہتی اور معاشرتی تعلقات کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی وہ کوششیں ہیں جنہیں ہم تاریخ عالم میں انقلابات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ چوں کہ ایجادات و اکتشافات کا ایک لامتناہی سلسلہ طریقِ پیدائش میں ہر آن تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے اس لیے انسانیت کو بھی کسی منزل پر سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ جب ایک منزل پر اس کا قافلہ پہنچ جاتا ہے تو پھر پیداوار کے طریقوں میں ایک تغیر رونما ہوتا ہے جو انسانیت کو پھر بے چین کرکے اسے آگے بڑھنے کی دعوت دیتا ہے۔

اس نظریے سے نہ صرف انسانی ارتقا کی شاہراہ معلوم ہوتی ہے بلکہ اس سے اخلاقی اقدار کا ایک نیا تصور بھی سامنے آتا ہے۔ اس کے مطابق دنیا کی ساری صداقتیں اضافی اور غیر مستقل قرار پاتی ہیں۔ یہ حقیقت جس دور کے خارجی حالات سے وجود پذیر ہوتی ہے اس دور کے ختم ہو جانے پر ساقط الاعتبار ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی صداقت نہیں اور نہ ہو سکتی ہے جو ہر زمانے کے لیے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے۔ لہٰذا ہر دور کے جداگانہ معتقدات ہوتے ہیں۔ نیک و بد، محمود و مذموم اور حق و باطل کی تفریق سراسر فریب ہے۔ ایک چیز جو ایک دور میں حق ہے وہی دوسرے دور میں باطل ہوسکتی ہے۔ اسی طرح ایک عمل ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے تو ماحول تبدیل ہونے کے ساتھ ہی اس کے متعلق ہمارا نظریہ بھی بدل جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام انسانی تصورات و تخیلات اور اخلاقی اقدار خارجی احوال و واقعات کا اور خصوصاً معاشی نظام کا عکس ہوتے ہیں۔[1]

جہاں تک اس نظریے کی صحت کا تعلق ہے ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں کہ معاشی تقاضے انسانی زندگی میں بڑا اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہمیں اس امر میں جو کچھ اختلاف ہے وہ صرف اتنا ہے کہ تہذیب و تمدن کی ہر چیز

۱۔ مارکس کے اس استدلال میں ایک بڑا اہم منطقی مغالطہ کار فرما ہے۔ اگر ہم یہ مان لیں کہ ابدی صداقت کا کوئی وجود نہیں اور یہ کہ زمانے کی فکر اور اس کے تصورات و نظریات اس زمانے کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہوتے ہیں تو پھر کیوں نہ یہ بھی سمجھا جائے کہ خود مارکس کا یہ فلسفہ بھی انیسویں صدی کے مخصوص معاشی حالات کی پیداوار ہے۔ آخر اس فلسفے کو تاریخ کا اٹل اور ابدی قانون کیسے مان لیا جائے؟ مارکس کی اپنی منطق کا اگر اس کے افکار پر اطلاق کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا فلسفہ ایک خاص دور کی پیداوار تھا اور اس دور کے ختم ہونے پر وہ بھی باطل ہوگیا۔ فکر انسانی میں اس کی کوئی مستقل بنیاد موجود نہیں ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

ان تقاضوں کی کرشمہ سازی نہیں بلکہ اس کی تعمیر میں دوسرے عوامل بھی اسی طرح شامل ہیں جس طرح کہ معاشی ۔ انسان کو حیاتِ مستعار کی چند گھڑیاں گزارنے کے لیے کھانے کی ضرورت ہے ، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے لباس درکار ہے اور سر چھپانے کے لیے وہ مکان کا محتاج ہے مگر یہ ضروریات اور ان کی فراہمی کی مختلف تدابیر اس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کی تخلیق نہیں کرتیں ۔ ایک مصور تصویر بنانے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کبھی نہیں نکالا جا سکتا کہ مصور کے مختلف رنگ ہی اس کے آرٹ کے اصل خالق ہیں ۔

مارکس کے اس فلسفے کے مطابق وہ معاشرے جو ایک ہی سا معاشی نظام رکھتے ہیں لازمی طور پر ایک ہی جیسا تمدن اور ایک ہی قسم کی اقدار رکھتے ہوں گے ۔ مارکس نے تاریخ انسانی کو جن ادوار میں تقسیم کیا ہے اس کے مطابق رومی اور قرونِ اولیٰ کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے ۔ یعنی دونوں اقوام میں غلامی کا رواج تھا ۔ پیدائش دولت کے طریق بھی دونوں کے ہاں ایک جیسے تھے ۔ مارکس کے نظریے کے مطابق ان دونوں قوموں کے اخلاق کو ایک ہی سطح پر ہونا چاہیے تھا لیکن تاریخ کی شہادتیں اس کے برخلاف ہیں ۔ تاریخ کا ایک مبتدی بھی اس عظیم فرق کو بہ خوبی محسوس کرتا ہے جو ان دونوں قوموں کے تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے ۔ رومیوں کا اپنے غلاموں سے سلوک اس قدر سخت اور دہشت ناک تھا کہ اس کے تصور سے آج بھی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ اس کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقے کو ظلم و استبداد سے نجات دلائی ، اسے حیوانات کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا ۔

اس کے علاوہ بھی بہت سی اقوام ایسی گذری ہیں جن کا معاشی نظام ایک سا ہونے کے باوجود تمدن و اقدار ایک دوسرے سے مختلف تھے ۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اقوام و افراد کی زندگی کی تعمیر میں فیصلہ کن چیز معاشی قوت نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کی سعی و طلب کے لیے وہ زندہ ہیں ۔[1]

۱۔ معاشی وسائل انسانی زندگی کو قایم رکھنے کے لیے درکار ہیں لیکن انسان اپنے مقاصد کے حصول کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ وہ چیز زیادہ موثر اور اہم ہے جس سے زندگی کی ضرورتیں پوری ہو رہی ہیں یا وہ جن کی خاطر انسان زندہ رہتا اور جان دیتا ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

خامی دراصل مارکس کے مادی فلسفہ میں ہے جو انسانی شعور و ارادہ کو کلی طور پر معاشی ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیتا ہے - انسانی ارادہ و عمل معاشی عوامل سے متاثر تو ہو سکتا ہے لیکن وہ کلی طور پر ان کا پیدا کردہ نہیں بلکہ انسانی ارادہ و عمل کا محرک انسان کی خودی یا انا ہے جو قایم بالذات ہے -

مارکس کا مادی فلسفہ ایک اور طرح سے بھی اس کے نظریہ' تاریخ میں کجی پیدا کرتا ہے - اس کے مادی فلسفے کی رو سے مادے سے ماورا کوئی ذات نہیں جو حرکت و تغیر کا سبب بنے - مادے کی ایک حرکت ھی دوسری حرکت کا سبب بنتی ہے - گویا پانی کا ارتعاش ہے جس کا ہر دائرہ اپنے سے پہلے بننے والے دائرے کا نتیجہ ہے - چناں چہ اخلاق و قانون میں تبدیلی سیاسی نظام میں تبدیلی کا نتیجہ ہے، سیاسی نظام میں تبدیلی معاشی تعلقات میں تغیر کا سبب ہے، اور معاشی تعلقات میں تغیر پیداواری قوتوں کے تغیر کا مرہونِ منت ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ پیداواری قوتوں میں تبدیلی کس بنا پر واقع ہوتی ہے؟ اور کیوں ایسا ہوتا ہے کہ کسی دور میں ذرائع پیداوار میں اضافہ اور تغیر ہوتا ہے اور کسی دور میں جمود و سکوت رہتا ہے؟ - ذرائع پیداوار میں تغیر کا سبب مارکس 'قوتِ تاریخ' کو قرار دیتا ہے - لیکن اس 'قوتِ تاریخ' کی حقیقت کیا ہے، مارکس اس کی کوئی توجیہ نہ کر سکا - بہ ہر حال یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی تصور مادی تصور کائنات سے مطابقت نہیں رکھتا اور یہ کہ مارکس نے اس قسم کا تصور پیش کرکے خود اپنے اساسی نظریات کی نفی کی ہے -

پھر مارکس کے اسی نظریہ' تاریخ کی رو سے یہ بھی ضروری ہے کہ اخلاق و مذہب کی اقدار چوں کہ معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لیے اخلاق و مذہب کے بدلنے سے پہلے معاشی نظام کا بدلنا ضروری ہے - لیکن تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ اخلاق و مذہب کی تبدیلی کے بہت بعد ذرائع پیداوار اور معاشی تعلقات بدلے - خود مسلمانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا- رسول اکرم صلعم کے صحابہ میں اخلاق و مذہب کے اعتبار سے عظیم انقلاب واقع ہو چکا تھا - مدینہ میں ایک مکمل نظام سیاست وجود میں آ چکا تھا، کائنات وحیات کے بارے میں خیالات یک سر بدل چکے تھے، لیکن نظام معیشت جوں کا توں تھا - ان حقائق کی توجیہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ انقلاب و تغیر کا اصل سبب شعور و ارادہ ہے نہ کہ معاشی عوامل -

Marfat.com

طبقاتی نزاع

تاریخ کی مادی تعبیر سے ہی طبقاتی نزاع کے تصور کو اخذ کیا گیا ہے۔ مارکس کے نزدیک ہر معاشی نظام جب ترقی کرکے ایک خاص منزل پر پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض نئی پیداواری قوتیں نمودار ہو کر اپنے زمانے کے حالات پیداوار سے متصادم ہو جاتی ہیں۔ نئی قوتیں اس بات کی متقاضی ہوتی ہیں کہ مُروجہ نظام جس طبقاتی تقسیم پر مبنی ہے اسے بدل کر طبقوں کی تقسیم از سَرِ نو عمل میں لائی جائے اور وہ ملکیتی نظام بھی بدل دیا جائے جو افرادِ معاشرہ کے ملکیتی تعلقات متعین کرتا ہے۔ یہ مطالبہ ایک جانب تو اس طبقے پر سخت شاق گزرتا ہے جس نے نہایت عیاری سے مروجہ معاشی تنظیم اور طبقاتی تقسیم میں دوسرے طبقوں سے زیادہ قوت و اقتدار حاصل کر لیا ہے، اور دوسری جانب مظلوم طبقہ جب نئی پیداواری قوتوں کو آتے دیکھتا ہے تو ان کا نہایت ہی گرم جوشی سے استقبال کرتا ہے کیوں کہ ان کا معاشی مفاد آنے والے نظام سے وابستہ ہوتا ہے۔ اسی طرح غالب و مغلوب، ظالم و مظلوم میں ایک مسلسل کشمکش جاری رہتی ہے جسے عام طور پر 'طبقاتی نزاع' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ مارکس کے نزدیک ہر انقلاب اسی کشمکش کا نتیجہ تھا اور ہر اہم جنگ کے پس منظر میں یہی چیز کام کر رہی تھی۔

مارکس کے اس نظریے سے متعلق بھی ہمیں صرف اس قدر اتفاق ہے کہ بسا اوقات مظلوم جائز حقوق کے حصول کے لیے ظالموں کے مقابلے میں صف آرا ہوگئے۔ مگر یہ کہنا یقیناً غلط ہے کہ ساری تاریخ محض اس نزاع و کشمکش کی داستان ہے یا یہ کہ انسانی معاشرے کے تمام انقلابات کا سبب صرف یہی طبقاتی تقسیم اور کشمکش ہے۔ تاریخ کے اوراق سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ قومی لڑائیوں کے اثرات طبقہ واری لڑائیوں سے کسی طرح کم نہ تھے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ قومی لڑائیاں طبقہ واری لڑائیوں سے زیادہ کثیر الوقوع، زیادہ تُند و تیز، زیادہ خونریز اور انسانی مستقبل کے لیے زیادہ فیصلہ کن تھیں۔ خود ہمارے زمانے میں، جب کہ دنیا کے سارے انسان مارکسیوں کے بہ قول دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں، جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر و طاقتور ثابت ہوئے ہیں۔ کیا جرمنی کا مزدور طبقہ روس کے پرولتاری بھائیوں کے خلاف صف آرا نہ ہوا؟ اور کیا انگلستان کے

Marfat.com

سرمایہ دار طبقے نے جرمنی کے بورژوا طبقے سے کوئی رعایت کی؟[۱] پھر اسلام کا لایا ہوا ہمہ گیر انقلاب کس طبقاتی نزاع کا نتیجہ تھا؟ کیا مسلمانوں میں عثمان غنیؓ اور بلال حبشیؓ کا باہمی برتاؤ بھائیوں جیسا نہ تھا؟ کیا وہ اپنے ہی طبقے کے امرا اور غربا سے اسلام کی سر بلندی کی خاطر شانہ بشانہ نہیں لڑے؟ صحیح ہے کہ انقلاب فرانس میں کسی حد تک معاشی عامل کا ہاتھ تھا، یہ بھی درست ہے کہ یہ نزاع دو ایسے طبقات کے درمیان تھی جن میں سے ایک کا مفاد پرانی پیداواری قوتوں سے اور دوسرے کا نئے ذرائع پیداوار سے وابستہ تھا۔ لیکن تاریخ کے تمام انقلابات اسی نوعیت کے نہیں۔ پھر انقلاب فرانس میں بھی معاشی عامل دوسرے بہت سے عوامل میں سے صرف ایک تھا اگرچہ اس کا اثر دوسروں کی نسبت زیادہ تھا۔ اگر طبقات کی تقسیم ہی واحد سبب ہوتا تو انقلابِ فرانس سے زیادہ شدید انقلاب، فرانس سے قبل انگلستان میں آنا چاہیے تھا، اس لیے کہ وہاں زیادہ تیز صنعتی ترقی کی بنا پر طبقات کی نئی تقسیم زیادہ واضح تھی۔ لیکن انقلابِ انگلستان کو اس کے پُر امن اور غیر شدید ہونے کی بنا پر 'شاندار انقلاب' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

نظریۂ قدرِ زائد[۲]

اشتراکیت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ کسی شے کی اصل قدر محنت کی وہ مقدار ہے جو اسے پیدا کرنے میں صرف ہو۔ چناں چہ مارکس کے نزدیک اس شئے کی قیمت کا واحد حق دار صرف مزدور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ چوں کہ اس دور میں مزدور کو قیمتی آلاتِ پیدائش خریدنے کی ہمت نہیں ہوتی اس لیے وہ مجبور ہے کہ صرف اس پر قناعت کرے جو صنعت کار اس کو بخش دے۔ ایک شئے کی اصل قیمت مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جسے 'قدرِ زائد'

۱۔ یہ ایک دلچسپ تاریخی واقعہ ہے کہ پہلی جنگ عظیم سے قبل اشتراکیوں کی عالمی تحریک 'دوسری انٹرنیشنل' نے متفقہ طور پر یہ طے کیا تھا کہ جنگ کا موقع عالمی اشتراکی انقلاب کے لیے بے حد سازگار ہے اور اس موقع پر ہر ملک کے مزدور اور اشتراکی پارٹیاں اپنی حکومتوں کے خلاف بغاوت کریں۔ لیکن ہوا یہ کہ اس کانفرنس سے واپس آکر روس کو چھوڑ کر باقی تمام ممالک کے اشتراکی قائدین نے اپنی حکومتوں کی تائید کی اور کچھ تو 'وزیر جنگ' تک بن گئے۔ قومیت کا عنصر طبقاتی مفاد کے مقابلے میں کہیں زیادہ موثر رہا اور دوسری انٹرنیشنل قومیت کی اس چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی۔ لینن نے بڑا سر پیٹا لیکن قومیت کی رو کے آگے اس کی کچھ نہ چل سکی۔ (مرتب)

۲۔ Surplus value

Marfat.com

کہا جاتا ہے، حقیقتاً تو یہ مزدور کا حصہ ہے لیکن صنعت کار اسے 'قانونی ڈاکہ زنی' کے ذریعے سے ہڑپ کر جاتا ہے۔

ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے مارکس سے بڑھ کر اس بات کے حامی ہیں کہ مزدور کو اس کا حق ملنا چاہیے۔ رسول اکرم صلعم کی حدیث ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔ اس حدیث کے جہاں یہ معنی ہیں کہ اجرت کی ادائیگی میں عجلت ضروری ہے وہاں یہ معنی بھی پوشیدہ ہیں کہ اجرت ایسی ہو جو کام کی منصفانہ مزدوری کہلانے کی مستحق ہو۔ لیکن کوئی بھی سمجھ دار آدمی یہ ماننے کو تیار نہ ہوگا کہ شئے کی قیمت محض مزدور کی محنت کا نتیجہ ہے۔ کسی شئے کی تیاری میں موجد کی ذہنی صلاحیت، استعمال کی بنا پر مشین کی شکست و ریخت، صنعت کار کا حسن انتظام، کاریگر کی مہارت، اور مزدور کی محنت سب ہی کچھ شامل ہے۔ نا انصافی ہوگی اور اگر پورا نفع مزدور ہی کو لوٹا دیا جائے۔ چناں چہ جو چیز اصل اہمیت کی حامل ہے وہ ملکیت کا مزدور کو سونپا جانا نہیں بلکہ منافع کی منصفانہ تقسیم ہے۔

تصورِ ریاست

اشتراکیت کا چوتھا اصول ریاست سے متعلق ہے۔ اس کے مطابق ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جس کی غرض یہ جز اس کے کچھ نہیں کہ دولت مندوں اور برسرِ اقتدار طبقوں کے مخصوص مفادات کی پاسبانی کرے۔ ہر عمرانی ادارے کی طرح ہر سیاسی ادارہ بھی اس کے نزدیک مروجہ نظامِ معیشت کا خارجی قلب ہوتا ہے، جس کا مقصد انتظامیہ کی نگاہ میں بس یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے سے برسرِ اقتدار لوگوں کے ہاتھوں کو مضبوط کرے اور ان کی منفعت اور غریب طبقے کے استحصال کو قانونی شکل دے کر ان کے مفادات کو کچلتی رہے۔

یہ صحیح ہے کہ اکثر اوقات سرمایہ دار اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر سیاسی قوت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتے ہیں اور بسا اوقات وہ اس میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ ہم خود کہہ چکے ہیں کہ موجودہ سرمایہ دارانہ ریاست دولت مند طبقے کے ہاتھ میں کھلونا بنی ہوئی ہے۔ لیکن کسی چیز کے غلط استعمال سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ وہ شئے بہ ذات خود بری ہے۔ پھر تاریخ گواہ ہے کہ دنیا میں ایسی ریاستوں کا وجود بھی رہا ہے جن کو

Marfat.com

سرمایہ دار طبقہ اپنے مفاد کے لیے باوجود کوشش کے استعمال نہ کرسکا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ریاست کا اصل مقصد تو عدل و میزان کا قیام ہے، یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی خود غرضی کی بنا پر کبھی کبھی اسے ظلم و زیادتی کے لیے بھی استعمال کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ اسلامی ریاست کا وجود برسرِ اقتدار لوگوں کے مفادات کی حفاظت کے لیے نہ تھا بلکہ اس کی غایت سماج کے مختلف طبقوں میں مساوات قایم کرنا تھی۔ چناں‌چہ خلیفۂ اول اپنی حکومت کا بنیادی مقصد بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "اور تم میں جو بے اثر ہیں میرے نزدیک وہ با اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں (انشاء اللہ)۔ اور تم میں جو با اثر ہیں وہ میرے نزدیک بے اثر ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول نہ کرلوں (انشاء اللہ)۔"

اشتراکیت کے ان بنیادی تصورات پر اشتراکی تحریک کی جو عظیم الشان عمارت تعمیر کی گئی اس کے تحت لوگوں کو بتایا گیا کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہوسکتی ہیں۔ جو قوم بھی اسے قبول کرے گی اسے اس دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ خصوصاً:

۱- اس کے اندر طبقاتی تقسیم ناپید ہوگی۔
۲- کوئی طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم نہ کرسکے گا۔
۳- مساوات شکم کے اصول پر کاربند ہونے سے معاشرتی عدل قایم ہوگا۔
۴- ریاست، جو جبر کا سب سے بڑا اوزار ہے، خود بخود ختم ہوجائے گی۔

اشتراکیت جن ذرائع سے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:

۱- دولت کی شخصی ملکیت کا استحصال کر دیا جائے۔
۲- دولت اور وسائل دولت آفرینی پر تمام حقوق مالکانہ جماعت کو حاصل ہوں۔
۳- دولت آفرینی اور تقسیمِ دولت کا پورا انتظام جماعت کے ہاتھ میں ہو جس کی طرف سے حکومت اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس "مشترک ملکیت" کا حصول بہ ہر حال کوئی کھیل نہ تھا کہ بس

Marfat.com

ہنسی خوشی انجام پا جاتا۔ جہاں کہیں بھی اشتراکی برسرِ اقتدار آنے میں کامیاب ہوئے ہیں اول تو خود فریبی، دغا اور قتل و غارت گری کے بعد حصولِ حکومت میں کامیاب ہوئے۔ پھر برسوں تک مسلسل نہایت ہولناک ظلم و ستم کے بعد اجتماعی ملکیت کا نفاذ ہو سکا۔ صرف روس میں اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جس قدر ظلم و تشدد اور قتل و خون ہوا اس کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو سکےگا جو جان ڈین ہرڈ نے اپنے تیس سالہ قیام روس کے زمانے میں فراہم کیے اور جو ڈیلی گزٹ کراچی کی اشاعت مورخہ ۲۵ جون ۱۹۳۴ء میں شائع ہوئے۔

تعداد مقتولین

اساقیف	۳۱	امرا و روسا	۶۵،۸۹۰
اہل خدمات کلیسا	۱،۵۶۰	فوجی افسر	۵۶،۳۴۰
جج، وکلا، مجسٹریٹ	۳۴،۵۸۵	مزدور	۱،۹۶،۰۰۰
اساتذہ و طلبہ	۱۶،۳۶۷	سپاہی اور ملاح	۳۶،۰۰۰
سول حکام	۷۹،۹۰۰	کسان	۸،۹۰،۰۰۰

ان اعداد و شمار پر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے، کیا یونانیوں کی ستم ریزیاں، ایرانیوں کی لشکر انگیزیاں اور چنگیز و ہلاکو کی قتل و غارتگری اس فہرست کے مقابلے میں کوئی حیثیت رکھتی ہے؟

پھر یہ سارا ظلم و تشدد بھی گوارا کر لیا جاتا اگر اس سے وہ نتائج برآمد ہوتے جن کی اشتراکیت دعوے دار تھی۔ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دے دینا اصل مقصود نہ تھا بلکہ یہ اصل نصب العین کو حاصل کرنے کے لیے ذریعہ تھا۔ اصل مقصد طبقاتی تقسیم کا خاتمہ تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ خود ایک فرانسیسی اشتراکی یوان کا بیان ہے:

> "روس کے اندر طبقہ واریت پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ یہاں امرا بھی ہیں غربا بھی، غالب بھی مغلوب بھی۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ ریل کے ڈبوں، جہازوں اور رستورانوں میں مختلف درجوں کا پایا جانا طبقہ واریت کی کھلی اور بیّن دلیل ہے۔"

طبقہ واری تقسیم کا اندازہ تنخواہوں کے اس تفاوت سے بھی ہوتا ہے جو روس میں عام ہے۔ چناں چہ ایک عام مزدور کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۴۰۰ روبل

Marfat.com

ماھانہ ہے جب کہ منتظمین اور ماھرین ۳۰،۰۰۰ روبل ماھانہ پاتے دہیں۔ تنخواھوں میں اتنا عظیم فرق دوسرے جمہوری ممالک میں بھی نہیں ہے

اشتراکیت کے مؤیدین بڑے شد و مد سے روس کی قومی آمدنی میں اضافہ کے اعداد و شمار گناتے ھیں۔ لیکن ایسا کرتے وقت وہ بھول جاتے ھیں کہ اس اضافے میں کتنے بے گناھوں کا خون شامل ہے۔ روس کے اکثر بڑے منصوبے جبری محنت کا نتیجہ ھیں۔ مشہور عالم کتاب " میں نے آزادی کا انتخاب کیا " کا مصنف جو ایک سابق اشتراکی ہے اپنی تصنیف میں لکھتا ہے :

> " ھماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں ھر آن اضافہ ھوتا جارھا تھا۔ سرکاری حلقوں کا بیان ہے کہ یہ تعداد کروڑوں سے بھی زیادہ تھی ۔"

یہ وہ لوگ تھے جن پر غدار وطن اور اشتراکیت دشمن ھونے کا شبہ تھا۔ چناں چہ ایسے افراد کو پکڑ کر سائبیریا بھیج دیا جاتا جہاں ان سے صبح چار بجے سے شام کے سات بجے تک کام لیا جاتا ۔[1]

پھر اگر ان بیانات کو ھم 'روس کے خلاف سازش' قرار دے کر نظر انداز بھی کر دیں تو قومی آمدنی میں اضافہ تو منصوبہ بند معیشت کے ذریعے سے کہیں بھی ممکن ہے۔ اس کے لیے نہ اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے اور نہ جبر و تشدد کی۔ جاپان اور جرمنی نے ماضی قریب میں اشتراکیت کے بغیر جو اقتصادی ترقی کی ہے وہ اس دعوے کا عملی ثبوت ہے ۔[2]

مغربی تہذیب کا مستقبل

اوپر ھم نے جن عناصر تہذیب کا مطالعہ کیا ہے ان کے متعلق یہ کہنا انصاف و دیانت کے بالکل خلاف ھوگا کہ ان میں حق اور خیرو افادیت کا سرے سے کوئی پہلو ھی نہیں۔ نہیں ایسا نہیں ہے۔ دنیا میں خالص باطل اور خالص شر و مضرت کا ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رھنا محال ہے۔ دنیا میں جب کبھی بھی سلبی اقدار پروان چڑھتی ھیں تو وہ اس بات پر مجبور ھوتی ھیں کہ اپنے جلو میں چند ایجابی اقدار کو لے کر چلیں۔ اس کے بغیر ان کا قافلہ ایک قدم

۱۔ ملاحظہ ھو ڈیوڈ ڈالن کی کتاب ، *Forced Labour in Russia* ۔

۲۔ اس سلسلے میں تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ھو: خورشید احمد ، سوشلزم یا اسلام؟ مکتبۂ چراغ راہ ، کراچی۔

Marfat.com

بھی نہیں بڑھ سکتا ۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا ۔

یہی حال اس تہذیبِ مادیت کا ہے ۔ اس تمدن نے انسانیت کی بعض پہلوؤں سے بڑی خدمت انجام دی ہے ۔ انسانی عقل کو ایک زوال پذیر باطل مذہب کے بے حس بندھنوں سے نجات دلائی ، اسے سوچنے اور سمجھنے پر ابھارا ۔ لوگوں کے دلوں پر سے جہالت اور لاعلمی کے پردوں کو چاک کرکے انہیں اکتسابِ علم اور اجتہادِ فکر کے لیے تیار کیا اور اس طرح کلاسیکی سکون آفرینی کے نظریے کی جگہ حرکت اور حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنایا اور اس طرح قلب و نگاہ کی تبدیلی سے پوری زندگی کو متاثر کیا ۔ پھر اس دور میں انسان نے معاشی پیداوار، سائنسی انکشافات و اکتشافات ، تسخیرِ کائنات ، تزئینِ تمدن وغیرہ کے میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے ۔ اس نے بنجر زمینوں کو سبزہ زاروں میں تبدیل کردیا ہے ، بڑے بڑے شہر آباد کردیے ہیں ، فلک بوس عمارتیں تعمیر کر لی ہیں اور چاند تک پر وہ کمندیں ڈالنے لگا ہے ۔[1]

مگر اسے انسانیت کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب اہلِ یورپ نے ایک بار عقل سے مذہب کی گرفت کو ڈھیلا کیا تو اس کا سیلاب اس رخ پر بہہ نکلا جہاں انسانیت کو شدید قسم کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ دنیا میں آج کل جس قدر فکری اور عملی بے راہ روی پائی جاتی ہے وہ سب عقل کی اسی بے لگامی کا نتیجہ ہے اور جب عقل انسانی خالص مادیت کے دھارے پر بہتے ہوئے بہت دور نکل آئی تو آج وہ خود یہ بات سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ علم و فن کی ترقی کے باوجود اور مادی سروسامان کی فراوانی کے ہوتے ہوئے بھی انسان کو سکون اور خوشی حاصل نہیں ہے؟ زمین ہر سال اربوں ٹن غلہ اگلتی ہے مگر اس کے باوجود نوعِ انسانی بھوک کا شکار ہے؟ بحر و بر اور شمس و قمر مسخر ہیں لیکن پھر بھی انسان کو اطمینان قلب حاصل نہیں؟ انسان قتل و غارت گری سے نجات چاہتا ہے لیکن اس کے باوجود ہر چند سال بعد خود اپنی بنائی ہوئی مشینوں کے استعمال سے اور خود اپنے ہی ہاتھوں کروڑوں ابنائے جنس کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے؟ انسان خود اپنے کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کے درپے ہے ۔ خودکشی

---

۱ ۔ اس سلسلے میں تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ہو : خورشید احمد ، سوشلزم یا اسلام؟ مکتبۂ چراغ راہ ، کراچی ۔

Marfat.com

اور نسل کُشی میں برابر اضافہ ہورہا ہے۔ ذہنی امراض روز بروز بڑھ رہے ہیں۔ وہ عقل جو مادیت کی راہ پر کچھ عرصہ پہلے کشاں کشاں چلی جا رہی تھی آج یہ دیکھ کر حیران و پریشان ہے کہ اسے جن منازل تک پہنچنے کی امید تھی وہ باوجود طویل سفر کے اب پہلے سے بھی زیادہ دور نظر آتی ہیں۔ انسان آج بھی مظلوم ہے، آج بھی خوفزدہ ہے، معاشرتی عدل آج بھی مفقود ہے۔ آج بھی دھوکہ ہے، فریب ہے، مستقل قتل و غارت گری ہے، لوٹ مار ہے، ظلم ہے، نا انصافی ہے اور بعض پہلوؤں سے پہلے سے کہیں بڑھ کر ہے۔ ٹھیک ہے کہ آج کے انسان نے فطرت کی تسخیر کی، بحر و بر پر قابو حاصل کیا، مقامات کی دوری کو کم کیا، ذرات کا جگر چیر کر ان کی توانائی کو استعمال کیا۔ لیکن یہ سب باتیں بہ ذات خود مقصود زندگی نہیں بلکہ امن و سکون اور طمانیت قلب کے حصول کا ذریعہ ہیں، چین اور آرام کا وسیلہ ہیں۔ اور جب اس مقصد ہی کو پورا نہ کریں تو بے کار ہیں۔

مادی تہذیب کے پیدا کردہ خطرناک نتائج کو دیکھ کر خود اہلِ مغرب خوفزدہ ہیں۔ ہم یہاں صرف دو بڑے مفکرین کے چند اقوال نقل کرتے ہیں تاکہ آپ کو ان کے اضطراب کا معمولی سا اندازہ ہو سکے۔ مشہور ماہرِ عمرانیات پروفیسر ساروکن اپنی معروفِ عالم کتاب ''ہمارے زمانے کا بحران''[1] میں لکھتے ہیں:

> ''بدیہی شہادتوں کے پیش نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہوگیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ، ہماری تنظیم اور ہماری سوسائٹی، ایک زبردست بحران سے گذر رہی ہے۔ جسم کا کوئی حصہ، قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔''

تاریخ انسانی کے عظیم المرتبت عالم پروفیسر آرنلڈ۔ جے۔ ٹائن بی نے اپنے ایک مضمون ''تاریخ جدید انسان کو متنبہ کر رہی ہے''[2] میں بڑی صفائی اور تفصیل سے تہذیب جدید کی ناکامی کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤں بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس کا بنک اکاؤنٹ، اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔

۱۔ *The Crisis of Our Age*

۲۔ *History Warns the Modern Man*

Marfat.com

تعطل بڑا خطرناک ہے وہ سوچتا ہے کہ بازی مار لینی چاہیے لیکن اسے اپنے ہنر پر بھروسہ نہیں کہ جس کے بل پر اس کی کامیابی ہو۔"

ظاہر ہے یہ عدم اعتمادی ان پے در پے شکستوں کا نتیجہ ہے جو اسے ناقص ہنر کی بنا پر ماضی میں سہنا پڑیں۔

"پوری تاریخ سے مجھے ایک ہی سبق ملتا ہے، یہاں کوئی چیز دنیاوی کامیابی سے بڑھ کر ناکام نہیں، اکیس تمدنوں کے مطالعے کے بعد میرا اس بات پر پختہ یقین ہو گیا ہے کہ تمدن اسی وقت تک صحت مند رہتے ہیں جب تک ان میں تخلیق کی صلاحیت برسر عمل رہتی ہے۔ ہماری سائنسی ترقیات صنعتی دور کے چیلنج کا ایک تخلیقی جواب تھیں، اور ایک نہایت ہی عمدہ جواب۔ لیکن جو مسائل ہمیں در پیش ہیں وہ اس نوعیت کے نہیں کہ ان کا جواب تجربہ گاہوں سے دیا جائے۔ یہ اخلاقی مسائل ہیں اور سائنس اخلاق کے دائرے میں کوئی دخل نہیں رکھتی۔ اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی ہماری حالیہ مساعی بداھۃً ناکام ہو چکی ہیں اور ہمارے تمام بلند بانگ دعوے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آچکے ہیں۔"

چناں چہ وہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

"دور حاضر کی سب سے بڑی ضرورت ایک فوق الطبیعی ایمان کا احیاء ہے۔"

تہذیب الحاد کے بارے میں جو چند آرا پیش کی گئی ہیں وہ مغربی ادب کی سلوٹوں سے ڈھونڈ کر نہیں لائی گئیں بلکہ یہ وہ عام رجحان ہے جو یورپ میں بڑی سرعت سے پھیل رہا ہے۔ آپ کوئی کتاب اٹھا کر دیکھیں اس میں اس کا تذکرہ پائیں گے، کسی رسالے کے اوراق الٹیں اس میں یہی خیال جگمگاتا نظر آئے گا، یہ ٹھیک وہ لمحہ ہے جس میں انسان مذہب کی ضرورت کو نہایت شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

لیکن آج کے سائنٹفک انسان کے لیے صرف وہی مذہب قابل قبول ہو سکتا ہے جو عقل و خرد کے خلاف نہ ہو، جو توہم و تعصب کا نتیجہ نہ ہو، جو غیر فطری عبادات و اعمال کا طلب گار نہ ہو۔ ان معیارات پر پرکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو زمانۂ حاضر کی ضرورتوں

Marfat.com

کو عین خوبی سے پورا کرسکتا ہے۔ ہندو مت اور بدھ مت کے خیالی فلسفے انسان کو مسحور تو کر لیتے ہیں لیکن اس کی عملی زندگی میں رہنما نہیں بن سکتے۔ یہ مذاہب اصلاح باطن سے آگے نہیں بڑھتے؛ انہوں نے اخلاق مواعظ و نصائح کا مجموعہ تو بڑا دلاویز پیش کیا ہے مگر سیاست و معیشت کا کوئی خارجی نظام نہیں دیا جو ان مواعظ و نصائح کی پابندی کے لیے فضا سازگار کر سکے۔ عیسائیت نے تو خود مذہب و سیاست کی تفریق کو قبول کر لیا[1] لہذا موجودہ انسان کی بیماریاں دور ہو سکتی ہیں تو صرف اسلام سے اور انسانیت کی فوز و فلاح اگر ممکن ہے تو اسلامی نظام زندگی کو بحیثیت کل اپنانے سے۔ اسلام در حقیقت وقت کی پکار ہے، حالات کا مطالبہ ہے، زمانے کا تقاضا ہے، پریشان انسانیت کا مداوا ہے، حقیقی شادمانی کی ضمانت ہے۔

اب یہ فرض مسلمان کا ہے کہ وہ اس پکار پر سب سے پہلے لبیک کہے، خود اپنی زندگی کو اسلامی سانچے میں ڈھال کر دوسروں کے سامنے مثال پیش کرے۔ اور اس طرح دنیا کی امامت کا منصب حاصل کرے۔ کائنات کی ساری قوتیں اس کے اس نیک عمل میں تعاون کے لیے تیار ہیں اور خود یہ دعوت دے رہی ہیں کہ

اٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں
نفس سوختہ شام و سحر تازہ کریں

مزید مطالعے کے لیے

پروفیسر عبدالحمید صدیقی، انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

نعیم صدیقی، اسلامی تحریک دوسری تحریکوں کے مقابلے میں۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

سید ابوالحسن علی ندوی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر۔ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ۔

خورشید احمد، سوشلزم یا اسلام۔ مکتبۂ چراغ راہ، کراچی۔

Muhammad Asad (Leopold Weiss) *Islam at the Crossroads*

۱۔ تفصیل بحث کے لیے ملاحظہ ہو باب ۳، ''مذاہب عالم، ایک تقابلی مطالعہ''۔

Marfat.com

اسلام اور تبدیلیٔ زمانہ*

ہر دور کے کچھ مخصوص نعرے ہوتے ہیں جو رفتہ رفتہ ہر شخص کی زبان پر رواں ہوجاتے ہیں اور ہر کس و ناکس بلا ادنیٰ غور و فکر ان کو رٹنے اور دہرانے لگتا ہے ۔ ان نعروں کا رواج عام عقل و فہم کی موت کے مترادف ہے ۔ جب یہ ذہنوں پر چھا جاتے ہیں تو آزادیٔ فکر باقی نہیں رہتی ۔ عاسی اور عالم، ان پڑھ اور پڑھے لکھے، سب ان ہی کا سہارا لینے لگتے ہیں اور سمجھ بوجھ کی صلاحیتوں کو یہ آکاش بیل نیم مردہ کردیتی ہے ۔

ہمارے دور میں بھی کچھ نعرے ہیں جو رواجِ عام اختیار کرتے جارہے ہیں ۔ ان میں سب سے نمایاں نعرہ ہے '' با زمانہ بساز ''۔ آئے دن یہ بات بڑے زور شور سے دہرائی جارہی ہے کہ

> ' زمانہ بدل چکا ہے ۔ مذہب کو زمانے کی تبدیلیوں کا ساتھ دیتے ہوئے نئے حالات کے مطابق بدلنا چاہیے ۔ اگر مذہب دورِ حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ کیا گیا تو اس کے خلاف بغاوت ہوگی اور وہ زندگی سے بے دخل ہوجائے گا ۔ جمود کا نتیجہ موت ہے ۔ ہم کو زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلنا ہوگا ورنہ موت کے لیے تیار ہو جانا چاہیے ۔'

آج جسے دیکھیو وہ کسی نہ کسی عنوان سے یہی درس دیتا نظر آتا ہے ۔ ضرورت ہے کہ اس نعرے پر ' ایمان بالغیب ' لانے کے بجائے اس کے تمام پہلوؤں پر عقل و تجربے کی روشنی میں غور کیا جائے اور محض اس لیے کسی بات کو قبول کرنے کی غلطی نہ کی جائے کہ اس کا اظہار بہ تکرار ہو رہا ہے ۔

---

* یہ باب مرتب کے قلم سے ہے ۔

Marfat.com

جمود و تغیر

اس امر میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ زمانہ ہمیشہ رنگ بدلتا رہا ہے، بہت کچھ بدل چکا ہے اور مزید بدلے گا - یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جمود ایک مصیبت ہے جو قوم کی تخلیقی قوتوں کو یخ بستہ کر دیتی ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہر تبدیلی صحت مند ہے؟ کیا ہر تغیر باعث خیر ہے؟ کیا تاریخ کا ہر قدم عروج ہی کی طرف اٹھتا ہے؟ اور کیا ہر حرکت بلندی ہی کی سمت جاتی ہے؟

ان سوالات پر جب آپ تاریخ کی روشنی میں غور کریں گے تو لازماً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ان کا جواب نفی میں ہے - ہر حرکت ترقی کے مترادف نہیں- ایک نوع کی حرکت اگر آپ کو ثریا کی بلندیوں تک لے جا سکتی ہے تو ایک دوسری قسم کی حرکات تحت الثریٰ کی پستیوں تک لے اترتی ہے - مطلوبِ نفس حرکت نہیں بلکہ صحیح سمت میں حرکت ہے -

ترقی ایک اضافی اصطلاح ہے - ترقی اور تنزل کا فیصلہ منزل کے لحاظ ہی سے ہو سکتا ہے - ہم صرف اسی حرکت کو ترقی کہہ سکتے ہیں جو صحیح راستے سے ہمیں اپنی منزل کی طرف لے جا رہی ہو - جو حرکت منزل کے برعکس سمت میں لے جائے وہ ترقی نہیں بلکہ تنزل ہے -

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ حرکت سے پہلے سمتِ حرکت اور منزل مقصود کا تعین ہونا چاہیے ورنہ محض جمود کو توڑنے کے شوق میں کوئی حرکت کر کے آپ اپنی منزل سے اور دور بھی ہٹ سکتے ہیں - تمدنی اور تہذیبی زندگی میں اصل معیار وہ مقصد ہوتا ہے جو آپ حاصل کرنا چاہیں - اگر آپ کا مقصد اور آپ کی منزل اسلام ہے تو پھر وہ حرکت جو اس کی مخالف سمت میں لے جائے، خواہ وہ کتنی ہی سبک خرام کیوں نہ ہو، ترقیٔ معکوس ہوگی- بلکہ یہ حرکت جتنی تیز ہو، تنزل اتنا ہی تیز رفتار ہوگا -

اسی طرح اندھی تقلید اور کورانہ نقالی صرف ماضی ہی کی نہیں ہوتی، حال کے مروجہ طریقوں اور ضابطوں کی بھی ہو سکتی ہے، اور کسی فرد یا قوم کی خودی اور اس کے صحت مندانہ ارتقا کے لیے جتنی مہلک ماضی کے بتوں کی اندھی پرستش ہے اتنی ہی مہلک نئے بتوں کی پوجا بھی ہے - بلکہ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو نقالی دراصل جمود ہی کی ایک شکل ہے - اگرچہ ہے بڑی

Marfat.com

پُرفریب ! عقل و فکر کو دونوں ہی صورتوں میں معطل کردیا جاتا ہے ۔ جمود میں آپ ماضی کی پرستش کرتے ہیں اور لکیر کے فقیر بنے رہتے ہیں تو نقالی میں آپ ماضی کے بجائے کسی نئے سورج کی پرستش شروع کر دیتے ہیں ۔ آپ کی اپنی خودی کے لیے دونوں تباہ کن ہیں ۔

جو لوگ زمانے کے چلن کی پیروی کا بلاوا دیتے ہیں وہ بھول جاتے ہیں کہ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ دراصل دوسروں کی تقلید ہی کی دعوت دے رہے ہیں ، اور تقلید اگر ' جدید ' کی کی جائے تو وہ کوئی فخر کے قابل چیز نہیں بن جاتی ۔ اس کے نقصانات علی حالہ قایم رہتے ہیں جن کی بنا پر قوم کی اپنی تخلیقی صلاحیتیں کبھی ابھرنے نہیں پاتیں ۔ اس کی وجہ سے انسان کی روح میں جمود اور احساسِ کمتری پیوست ہو جاتا ہے ۔ پوری قوم زمانے کو بدلنے کے بجائے بس خود اپنے ہی آپ کو بدلنے میں لگی رہتی ہے اور دوسروں کی 'شاگردی' کے مقام سے آگے بڑھنا کبھی اسے نصیب نہیں ہوتا ۔

پھر زمانے کی تبدیلی کا ڈھنڈورا پیٹنے والے اس امر کو بھی ملحوظ نہیں رکھتے کہ زمانہ تو بدلنے ہی کے لیے بنا ہے ۔ آج وہ ایک خاص سمت میں تبدیل ہوتا ہے تو کل کسی دوسری سمت میں تبدیل ہو جاتا ہے ۔ چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے ہمیشہ اپنے ہی دور کی غالب تہذیب کو ترقی کا کمال سمجھتے رہے ہیں ۔ لیکن چشمِ تاریخ نے اس امر کا بارہا مشاہدہ کیا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقتور تہذیب بھی ایک دن زوال کی نذر ہوجاتی ہے ۔ یونانی تہذیب کے غلبے کے زمانے میں یونانیت زدہ لوگ اسی کو تہذیب انسانی کا حرفِ آخر سمجھتے تھے اور اس سے انحراف واختلاف کو دیوانگی ، پریشان خیالی اور کفر خیال کرتے تھے ۔ لیکن ایک دن اس تہذیب کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور اب اس کی حیثیت آثار قدیمہ کی سی ہے ۔ روم کے دورِ عروج میں یہی مقام رومی تہذیب کو حاصل ہوا ، لیکن بالاخر اس تہذیب کے بھی پرخچے اڑ گئے ، اور آج اس کے آثار بالائے زمین نہیں بلکہ زیرِ زمیں ڈھونڈے جارہے ہیں ! ایرانی تہذیب کی قسمت بھی اس سے مختلف نہ ہوئی اور یہی کچھ ان ۲۶ تہذیبوں کے ساتھ ہوا جو اپنے اپنے زمانے میں غالب اور ناقابل تسخیر سمجھی جاتی تھیں ۔ اگر ماضی کی تمام غالب تہذیبیں قابل تسخیر ثابت ہوئیں اور ایک دن کامیاب وہی لوگ ہوئے جو ان کی نقالی نہیں کرتے تھے ان کی جگہ ایک دوسرا نظام پیش کرتے تھے تو مستقبل کے متعلق یہ کیوں تصور کرلیا جائے کہ جدید مغربی

Marfat.com

تہذیب کو— باوجود اس کے موجودہ غلبے کے— مسخر نہیں کیا جا سکتا ؟

محض یہ چیزیں کہ آج ایک خاص تہذیب کو غلبہ حاصل ہے اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہی تہذیب مبنی برحق بھی ہے۔ نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسی کو ہمیشہ قایم رہنا ہے اور نوعِ انسانی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لے۔ طاقت اور غلبہ حق کے معیارات کو تبدیل نہیں کردیتا اور اقتدار کسی چیز کو محاسن کا پیکر نہیں بنا دیتا۔ نہ ہر رائج شدہ چیز نا قابل تغیر اور ناقابل تسخیر ہوتی ہے۔ یہ کمزوروں کی سنت ہے کہ وہ طاقت کی پوجا کرتے ہیں اور ہر چڑھتے سورج کے آگے جھک جاتے ہیں۔ یہ کم نظروں کا طریقہ ہے کہ وہ محض اس بنا پر کسی مسلک کو اختیار کرلیتے ہیں کہ اسے اقتدار اور غلبہ حاصل ہے اور یہ نہیں دیکھتے کہ وہ کہاں تک صحیح ہے اور کہاں تک غلط۔ حالاں کہ دیکھنے کی اصل چیز غلبہ اور طاقت نہیں بلکہ کسی چیز کا حق یا باطل ہونا ہے۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلا جاسکتا ہے۔ لیکن محض زمین و آسمان کی گردش اور ماہ و سال کی آمدورفت کی وجہ سے زندگی کے اصول، حق و باطل کے معیار، اور خیر و شر کے تعینات نہیں بدلے جا سکتے۔

ناگزیر ترقی کا نظریہ

جدید ذہن کی تعمیر جن عوامل نے کی ہے ان میں وہ فکر و فلسفہ بھی شامل ہے جو ہر نئی چیز کو خوب تر اور قابل احترام اور لائق اختیار سمجھتا ہے۔ مغرب کے ذہن کو 'ہیومنزم'[1] کے فلسفے نے بہت متاثر کیا ہے اور اس فلسفے کی اساس تاریخ میں 'ناگزیر ترقی کا اصول'[2] ہے۔ اس کی رُو سے ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے بہتر ہے۔ انسان کا ورثہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ حال ماضی سے اچھا ہے اور مستقبل حال سے بہتر ہوگا۔ ہمارے قدم لازماً ترقی اور عروج کی طرف اٹھ رہے ہیں اور اب پیچھے ہٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اس اصول کو ہیگل کے فلسفۂ تاریخ اور مارکس کی معاشی تعبیرِ تاریخ نے بڑی تقویت پہنچائی۔ یہ اسی انداز فکر کا نتیجہ ہے کہ ماضی کی ہر چیز کو کم مایہ اور حقیر اور حال کی ہر شئے کو قابل قدر سمجھا جا رہا ہے اور ترقی کا لازمی تقاضا یہ فرض کرلیا گیا ہے کہ تغیرِ زمانہ کے نام پر ہر قدیم چیز کو بدل ڈالا جائے۔

۱۔ Humanism

۲۔ Inevitability of progress

Marfat.com

یہ نظریہ بدیہی طور پر غلط ہے۔ ہمیں انسانی تاریخ میں ارتقا کی کوئی سیدھی لکیر نظر نہیں آتی۔ یہ تاریخ بڑی کج روا واقع ہوئی ہے۔ اس میں ترقی بھی ہے اور تنزل بھی، عروج بھی ہے اور زوال بھی، ارتقا بھی ہے اور انحطاط بھی، فراز بھی ہے اور نشیب بھی۔ ہر بعد کے دور کو پچھلے دور سے بہتر سمجھنا تاریخی لحاظ سے ایک بالکل غلط مفروضہ ہے جسے ھرگز صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جدید فلاسفۂ تاریخ میں سے کوئی ایک بھی ھیگل اور مارکس کی اس توجیہ کو صحیح نہیں سمجھتا اور تاریخی حقائق اس کی توثیق کرنے سے انکاری ھیں۔ مسلسل ارتقا کا نظریہ آج علمی حیثیت سے ایک متروک نظریہ ہے۔ لیکن اس کے بطن سے جس فاسد تصور نے جنم لیا ہے وہ عام پڑھے لکھے لوگوں کے دماغ پر مسلط ہے اور وہ اپنی ترقی پسندی کا ڈھول پیٹنے کے لیے محض فیشن کے طور پر ہر قدیم چیز پر ناک بھوں چڑھاتے اور ہر نئی چیز کی طرف بے سوچے سمجھے لپک پڑتے ھیں۔ حالاں کہ قدیم کو لازماً برا اور جدید کو لازماً اچھا سمجھنا اور تمام قدیم چیزوں کو تبدیلی کے خراد پر چڑھا دینا ایک غلط روش ہے جس کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں۔

پھر سوال یہ بھی ہے کہ زمانے کے تغیر کی نوعیت کیا ہے اور یہ تغیر زندگی کے کس دائرے میں واقع ہو رہا ہے؟

کائنات کا وہ دور جو زمین پر انسان کی آمد سے شروع ھوا ہے اب تک جاری ہے۔ ارتقائے کائنات کے نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو یہ امر صاف ظاھر ہے کہ یہ دور اپنی چند متعین خصوصیات رکھتا ہے جو انسانی تہذیب کے سارے ھی مرحلوں میں نمایاں نظر آتی ھیں۔ ان خصوصیات میں کوئی اساسی تبدیلی اسی وقت واقع ھوگی جب یہ دور ختم ھو جائے گا اور کوئی دوسرا دور شروع ھوگا (مثلاً دورِ آخرت)۔ اس پورے زمانے میں انسان کی فطرت، کائنات کے فطری قوانین، انسانی زندگی کے اساسی اصول، حیات و موت کے ضابطے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں، ھدایت و ضلالت کے قواعد، یہ تمام ایک ھی رہے ھیں اور ایک ھی رھیں گے۔ افراد پیدا ھوتے ھیں اور مرتے ھیں۔ تہذیبیں ابھرتی ھیں اور معدوم ھو جاتی ھیں۔ سلطنتیں بنتی ھیں اور بگڑتی ھیں۔ لیکن فطرت کے قوانین غیر متبدل ھیں۔ زندگی کی اصل غیر متغیر ہے، اور اجتماع و تمدن کے اساسی ضابطے ثابت و مستحکم ھیں۔ ایک ھی اصول ھیں جو کار فرما ھیں، ایک ھی حقیقت ہے جو جلوہ گر ہے۔ تغیر و تبدل صرف ظاھری اور سطحی چیزوں میں

Marfat.com

ہے ، بنیادی اور اساسی چیزوں میں نہیں ۔ اس لیے یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ زندگی کے موجودہ دور میں جو تغیرات بھی واقع ہو رہے ہیں وہ ایک محدود دائرے میں ہیں ، بنیادوں میں نہیں صرف فروع میں ہیں ، اور ان کی بنا پر قدیم و جدید کا جھگڑا بہ جز کوتاہ نظری کے اور کچھ نہیں ۔ بہ قول اقبال

زمانہ ایک ، حیات ایک ، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری ، قصۂ قدیم و جدید!

ہم تغیر کے وجود کے منکر نہیں ہیں ۔ یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن ہی نہیں ۔ لیکن جس چیز کا سمجھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس تغیر کی نوعیت کیا ہے ۔ اس لیے کہ اس کی نوعیت کو سمجھے بغیر کوئی صحت مند اجتماعی پالیسی اختیار نہیں کی جا سکتی ۔

انسان کی اجتماعی زندگی میں جو تبدیلی بھی آرہی ہے وہ ذرائع اور وسائل کی دنیا میں ہے ۔ مقاصد اور اصول و اخلاق کی دنیا میں نہیں ۔ فنی ایجادات اور تکنیکی انکشافات انسان کے وسائل اور فطری قوتوں پر اس کے اختیار کو برابر بڑھا رہے ہیں ۔ زماں و مکاں کی رکاوٹیں دور ہو رہی ہیں ، اور انسان کا اقتدار بڑھ رہا ہے ۔ لیکن یہ ساری تبدیلی ذرائع و وسائل ہی کی حد تک ہو رہی ہے ۔ اس تبدیلی کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ مقاصدِ زندگی، اصولِ اخلاق اور اقدارِ حیات کو بھی تبدیل کردیا جائے ۔ اگر ہوائی جہاز ، جیٹ اور راکٹ کے استعمال سے زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں تو اس کے یہ معنی کب ہیں کہ زنا جو کل تک حرام تھی آج حلال ہو جائے ؟ اگر برقی قوت کے ذریعے سے انسان کے پاس وہ طاقتیں آگئی ہیں جو پہلے صرف جنوں اور فرشتوں کو حاصل تھیں تو خیر و شر کے اصولوں کی صداقت پر اس کا آخر کیا اثر پڑتا ہے ؟ میزائل اور اسپتنک کے استعمال کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ جھوٹ ، سود ، سٹہ ، شراب اور دوسرے منکرات کو جائز قرار دے دیا جائے ؟ صنعتی ترقی کا آخر یہ تقاضا کب ہے کہ اصولِ انصاف کو بھی بدل دیا جائے ؟

جو حضرات سطحی نظر رکھتے ہیں وہی اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ یہ تغیرات اصولوں میں رد و بدل کے مقتضی ہیں ۔ در حقیقت تمام ایجادات و اکتشافات انسان کے لیے ہیں ، انسان ان کے لیے نہیں ۔ تمام مادی ترقیات اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب وہ انسان کی بھلائی کے لیے استعمال ہوں، خود بھلائی

Marfat.com

اور برائی کے اصول ان کی خاطر نہ بدل جائیں - یہ قوتیں جو انسان کو حاصل ہوئی ہیں اسی وقت نافع ہیں جب وہ اعلیٰ مقاصدِ حیات کی تابع ہوں ، اپنے ریلے میں انہیں بہا کر نہ لے جائیں - مقاصد و اصول کو ان کے مطابق نہیں بلکہ ان کو مقاصد و اصول کے مطابق بدلنا چاہیے- مقاصد اور اصولوں کی حیثیت تو ان معیارات کی ہے جن سے تکنیکی ترقیات کے حسن و قبح کو ناپا جائے گا - اگر ان ترقیات کے باوجود انسان ہی پریشان و مضطرب رہتا ہے تو پھر ساری مادی ترقی بے کار ہے -

نہ کلی ہے وجہ نظر کشی ، نہ کنول کے پھول میں تازگی
فقط ایک دل کی شگفتگی سببِ نشاط بہار ہے

ثبات اور تغیر

انسانی زندگی میں تغیر کا منہاج کچھ ایسا ہے کہ تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثبات اور دوام کا بھی ایک پہلو موجود ہے - تبدیلی ہر لحظہ آتی ہے لیکن بنیادی حقیقت کو متاثر کیے بغیر اپنا ظہور کرتی رہتی ہے - مثلاً انسان کے جسم اور اس کی ذات کو لیجیے - سائنس کے مشاھدات ھمیں بتاتے ھیں کہ انسان کے نظام جسمانی میں ہر لمحہ تغیرات ہو رہے ہیں - ایک بچے کے جسم کا ایک ایک ریشہ جوان ہونے تک بدل جاتا ہے - اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہتا ہے حتیٰ کہ ایک خاص مدت میں ہر مرتبہ انسان کا جسم اپنے کو بالکل تبدیل کر کے ایک نیا جسم بن جاتا ہے - لیکن اس تبدیلی میں بنیادی نظام وہی رہتا ہے اور ہر شخص کی اساسی شخصیت، اس کی " آنا " غیر متبدل رہتی ہے - اسی کیفیت کو نکولائی بردائیف[1] ان الفاظ سے تعبیر کرتا ہے کہ " انسانی ذات ، تغیرات کے جلو میں عدم تغیر کا نام ہے -" اور برگساں نے اس بات کو یوں ادا کیا ہے کہ " ہم میں تغیر تو آتا ہے لیکن ھماری بنیادی حقیقت معدوم نہیں ہوتی -"

اسی طرح درختوں کو دیکھیے - ایک درخت ایک خاص مدت میں اپنے پھول پتے بالکل تبدیل کر لیتا ہے - اس کی زندگی میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں - لیکن یہ تبدیلی اس کی اصل کو نہیں بدلتی بلکہ اس سے ہم آہنگ رہتی

---

۱ - Nicoli Berdyve

Marfat.com

ہے۔ ایک بنیادی رنگ ہے جو بہ ہر صورت غالب رہتا ہے اور یہی اس کی انفرادیت ہے۔

صبح بہار آئی ہے لے کر، رُت بھی نئی، شاخیں بھی نئی
غنچہ و گل کے رخ پر لیکن رنگ قدامت آج بھی ہے

یہ فطرت کا قانون ہے جو ہر شعبۂ زندگی میں جاری و ساری ہے۔ انسان کی اجتماعی اور تہذیبی زندگی میں بھی ہمیں یہی جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اسی بنیاد پر علامہ اقبال نے کہا تھا کہ

"ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں، اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے... لہذا اس ہر لحظہ آگے ہی آگے بڑھنے والی حرکت میں انسان اپنے ماضی کو نظر انداز نہیں کرسکتا.... اسی بات کو ہم دوسرے لفظوں میں یوں ادا کریں گے کہ زندگی چوں کہ ماضی کا بوجھ اٹھائے آگے بڑھتی ہے اس لیے ہمیں چاہیے کہ جماعت میں تغیر و تبدل کا جو نقشہ بھی ہم نے قایم کیا ہو اس میں قدامت پسندانہ قوتوں کی قدر و قیمت اور وظائف کو فراموش نہ کریں۔"

(خطبات صفحہ ۲۵۷- ترجمۂ نذیر نیازی)

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ

(۱) ہر تبدیلی موجب خیر ہی نہیں ہوتی ہے۔ جو چیز مطلوب ہے وہ محض تبدیلی نہیں بلکہ صحیح سمت میں تبدیلی ہے۔

(۲) محض زمانے کے چلن کی اتباع کسی فرد یا قوم کے لیے فلاح کا باعث نہیں ہوسکتی۔

(۳) کسی چیز کے غالب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ لازماً، اچھی اور صحیح بھی ہے، یا یہ کہ وہ ناقابل تسخیر ہے۔

(۴) ناگزیر ترقی کا اصول ایک فاسد اصول ہے جس کی تائید تاریخ سے نہیں ہوتی۔

(۵) زمانے کے تغیر کی نوعیت بڑی غور طلب ہے۔ تبدیلی کا دائرہ بڑا محدود ہے۔ تبدیلی بنیادوں میں نہیں، صرف فروع اور ظواہر میں ہوتی ہے۔ انسانی فطرت، کائنات کے بنیادی قوانین اور ہدایت و ضلالت کے ضابطہ میں کسی تغیر کا سوال نہیں۔

(۶) زندگی صرف تغیر کا نام نہیں بلکہ وہ تغیر اور ثبات دونوں کے

Marfat.com

توازن سے قایم ہے اور صحت مند نظام وہی ہوسکتا ہے جو دونوں پہلوؤں میں کامل توازن قایم کرے۔

ان امور کے متحقق ہو جانے کے بعد اب مسئلے کی مزید تنقیح ہمارے لیے بہت آسان ہو جاتی ہے۔

اسلام اور تغیر

اسلام خدا کی اس ہدایت کا نام ہے جو اس نے اپنے برگزیدہ نبیوں کے ذریعے سے انسان کی رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً بھیجی ہے اور جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں ہم کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے پہنچی ہے۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو عین فطرت کے اصولوں پر قایم ہے اور انسان اس کے ذریعہ سے دنیاوی اور آخروی دونوں کامیابیاں حاصل کرسکتا ہے۔ یہ زندگی کا مکمل قانون ہے۔ اس قانون کو انسان نے نہیں خدا نے بنایا ہے۔ یہ ابد الآباد تک کے لیے ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی۔

لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ

خدا کی باتیں (یعنی اس کے احکام و فرامین)
بدلی نہیں جا سکتیں۔ (یونس - ۶۴)

وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (الانعام - ۳۴)

اور خدا کی باتوں کو بدل دینے والا کوئی نہیں۔
(الانعام - ۳۴)

لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم - ۳۰)

خدا کی بنائی ہوئی ساخت میں تغیر و تبدل نہیں
ہوسکتا۔ یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ
جانتے نہیں۔ (الروم - ۳۰)

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا (فاطر - ۴۳)

پس تم خدا کے طریقے میں تبدیلی نہ پاؤگے۔ (فاطر - ۴۳)

قرآن پاک کی یہ آیات بالکل صاف اور واضح ہیں اور اس امر کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ خدا کا دین، اس کے احکام اور قوانین ہمیشہ ہمیشہ کے لیے

Marfat.com

ہیں اور بعض زمانے کی تبدیلی کی وجہ سے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ تبدیلی زمانے میں کرنی ہوگی، خدا کے قانون میں نہیں۔ مردود وہ ہیں جو

خود بدلتے نہیں، قرآن کو بدل دیتے ہیں

یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا میں، بدعت شروع کرنے والے اور بدعتی کی تعریف کرنے والے پر خدا کی لعنت ہو۔

اگر اس مسئلے پر عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کیا جائے تو فکر و نظر کا ہر گوشہ اس بات پر گواہی دیتا ہے کہ خدا کے قانون میں کسی تبدیلی کی نہ ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ اور اس کی وجہ بھی بہت واضح ہے۔ زمانے کی تبدیلی کا اثر اس قانون پر پڑتا ہے جسے انسان نے بنایا ہو۔ انسانی فکر زمان و مکان کی حدود میں مقید ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے تمام حقائق سے واقف نہیں۔ وہ ایک محدود بصیرت کے ساتھ آج ایک چیز کو صحیح سمجھ کر پیش کرتی ہے مگر کل جب وہ حالات سامنے آتے ہیں جن کا کوئی تصور پہلے موجود نہ تھا، تو وہ غلط ثابت ہو جاتی ہے۔ لیکن خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کا علم ہر شئے پر محیط ہے۔ زمان و مکاں کی قیود اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ جو قانون ایسے خدا کی طرف سے ہو اس کا کسی ایک مخصوص زمانے کے ساتھ محدود ہو جانا کیسے ممکن ہے۔ خدا کے علم اور خدا کے دیے ہوئے قانون کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ کبھی ازکار رفتہ ہو جائے۔ وہ تو ہمیشہ اتنا ہی تازہ رہے گا جتنی صبحِ نو!

ثانیاً، خدا کا یہ قانون بنیادی طور پر ہدایت و ضلالت کی حقیقت کو واضح کرتا ہے اور ان اصولوں اور ان اقدار کو بیان کرتا ہے جن پر وقت کے تغیرات، تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمد و رفت کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ فطرت کے اصولوں کو بیان کرتا ہے اور فطرت کا قانون قایم و مستحکم ہے۔

ثالثاً، قرآن و سنت اصولی رہنمائی دیتے ہیں، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قایم کرتے ہیں جنہیں ہر زمانے میں قایم رہنا چاہیے۔ ان چیزوں پر زمان و مکاں کے تغیر کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ اصول غیر متبدل ہیں اور ان میں تبدیلی فطرت کے قانون کے خلاف ہوگی۔

Marfat.com

ان وجوہ کی بنا پر زمانے کی تبدیلی کے مطابق اسلام کے تبدیل کیے جانے کا قطعاً کوئی امکان نہیں۔

یہی چیز ہے جو انبیا و صلحا کی سنت کے مطالعے سے معلوم ہوتی ہے۔ ہر نبی ایسے حالات میں مبعوث ہوا جب زمانے کا بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ گیا اور زندگی کا دریا بالکل غلط رخ پر رواں دواں تھا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بھی نبی نے زمانے کے چلن کے مطابق اسلام کو تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ زمانے کے رنگ سے متاثر نہ ہوئے بلکہ زمانے کو اپنے رنگ میں رنگنے کی سعی میں مصروف ہوگئے اور بالاخر اس پر صبغۃ اللہ کو غالب کردیا۔ قرآن میں اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے

هُوَ الَّذِىٓ أَرْسَلَ رَسُولَهُۥ بِٱلْهُدَىٰ وَدِينِ ٱلْحَقِّ لِيُظْهِرَهُۥ عَلَى ٱلدِّينِ كُلِّهِۦ وَلَوْ كَرِهَ ٱلْمُشْرِكُونَ ۝

وہی (پاک ذات) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے۔ (الصف۔ ۹)

ہدایت اور دین حق ہیں ہی اس لیے کہ انبیا ان کو دنیا کے باقی تمام نظاموں اور طریقوں پر غالب کریں۔ خدا کا دین اس لیے نہیں ہے کہ اسے زمانے کے چلن کے مطابق بدلا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ زمانے کو اس کے مطابق بدلا جائے اور اس کو غلبہ و اختیار کا مقام حاصل ہو۔ مشرکوں، کافروں اور منافقوں کی تو دلی تمنا ہی یہ ہوتی ہے کہ دین کو ان کے منشا کے مطابق بدلا جائے، لیکن خدا اس بات کو صاف کردیتا ہے کہ ان کی ناخوشی کا ہرگز کوئی خیال نہیں کیا جاسکتا۔ سربلندی دین کو حاصل ہونی چاہیے اور زمانے پر اُس کی حکمرانی قائم ہونی چاہیے۔

انبیا کی سیرت اسی حقیقت پر شاہد ہے۔ حضرت نوحؑ علیہ السلام کی قوم بغاوت پر تلی رہی۔ آپ نے ساڑھے نو سو سال تک دینِ حق کی دعوت دی لیکن ایک دن کے لیے بھی وہ وقت کے تقاضوں کے مطابق دین کو تبدیل کرنے پر راضی نہ ہوئے۔ ان کی دعوت وہی رہی کہ

يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ (اعراف۔ ۵۹)

اے میری قوم! خدا کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔

Marfat.com

ابوالانبیا حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اپنے زمانے کی تہذیب کے کئی بڑے مراکز پر دعوتِ حق دی لیکن کہیں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق دین کو نہیں ڈھالا - انہوں نے آگ اور جلاوطنی کے مصائب کو برداشت کیا لیکن دین پر حرف نہ آنے دیا - حضرت لوط علیہ السلام کی قوم شدید قسم کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا تھی مگر آپ نے زمانے کے چلن کو دیکھ کر دین میں ترمیم نہیں کی بلکہ زمانے کے خلاف بغاوت کی - حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم کے طور طریقوں کو اختیار کرنے کے بجائے اسے خدا کے غیر متبدل قانون کی پیروی کے لیے پکارا - حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کی سرکشی کے لیے کوئی رعایت نہ دی اور انہیں خوش کرنے کے لیے دین میں کسی کمی بیشی کو گوارا نہ کیا - حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم کی معاشی ترقی کی خاطر ان کے ظالمانہ معاشی نظام کو قبول کرکے دین میں ترمیمات نہ کیں بلکہ ان کو کامل اطاعت کی دعوت دی - تمام انبیا کی سنت یہی رھی ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مشرق سے مغرب تک جو نظام چل رہا تھا اسے قبول کرنے اور اس کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے دین کو بدلنے کے بجائے آپ نے اسے ایک فاسد نظام قرار دیا -

ظھرالفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا ہے)

لیکن خدا کے نبی نے زمانے کے تقاضوں سے سمجھوتہ اور اس کے ساتھ مصالحت کرنے کے بجائے اس کی ہر ہر خرابی کے خلاف جنگ لڑی - زمانے کے آگے جھکنے کا مشورہ دینے والوں کو آپ کا صاف جواب یہ تھا:

واللہ لو وضعوالشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھذا الامر ماترکتہ حتیٰ یظھرہ اللہ او اھلک فیہ -

خدا کی قسم اگر یہ میرے دائیں ھاتھ پر سورج اور بائیں ھاتھ پر چاند رکھ کر کہیں کہ مہر و ماہ کے عوض میں اس دعوت کو ترک کردوں تو میں ھرگز اسے ترک نہ کروں گا، یہاں تک کہ یا تو اللہ اس دعوت کو کامیاب فرما دے یا میں اس راہ میں جان دے دوں -

انبیا کا طریقہ یہ نہیں رہا کہ وہ زمانے کے آگے جھکیں اور لوگوں کو راضی کرنے کے لیے خدا کے دین کو بدلیں - وہ حق کے پیغامبر ہوتے ھیں اور زمانے کی رو کے خلاف اپنی دعوت پیش کرکے اسے تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتے ھیں - اگر وھی زمانے سے مطابقت اختیار کرلیں تو پھر انسانیت کی فلاح و اصلاح کا کوئی امکان باقی نہ رہے -

Marfat.com

اس اسوۂ انبیا کی اتباع کی بہترین مثال ہمیں آپ صلعم کے تربیت یافتہ صحابہ کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ حضور اکرم صلعم کی وفات کے بعد یکایک عرب کا نقشہ پلٹ گیا۔ ہر طرف سے بغاوتوں نے سر اٹھا لیا۔ نئے نئے نبی اٹھ کھڑے ہوئے۔ بہت سے قبائل نے زکواۃ ادا کرنے سے انکار کردیا۔ چند صحابہؓ کبار تک اس صورت حال پر پریشان ہوگئے اور لوگ یہ رائے پیش کرنے لگے کہ مصلحت وقت کی خاطر قبائل کے ساتھ نرمی برتی جائے اور وقت کے تقاضوں کا لحاظ کیا جائے۔ مگر جو مزاج شناسِ سنت انبیا تھا اس کا جواب یہ تھا کہ

> " واللہ مجھ پر یہ فرض ہے کہ جو کام میں رسول اللہ کو کرتے دیکھ چکا ہوں خود بھی وہی کروں اور اس سے سرِمو انحراف نہ کروں۔ اگر جنگل کے کتے اور بھیڑیے مدینے میں داخل ہوکر مجھے اٹھالے جائیں تو بھی میں وہ کام کرنے سے باز نہ آؤں گا جسے رسول اللہ نے کرنے کا حکم دیا ہے۔"

> " واللہ اگر مانعین زکواۃ اونٹ باندھنے کی ایک رسی دینے سے بھی انکار کریں گے جسے وہ رسول اللہ کے زمانے میں ادا کرتے تھے، تو بھی میں ان سے جنگ کروں گا! خدا کی قسم میں زکواۃ اور صلواۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔"

اسلام عبارت ہی نبی کی سنت کی پیروی سے ہے۔ اگر زمانے کی سنت نبی کی سنت سے متعارض ہے تو وہ شخص اپنے دعوۂ ایمان میں جھوٹا ہے جو نبی کی سنت کو چھوڑ کر زمانے کی سنت کا اتباع کرے۔

تجدید اور تجدد

یہ ایک حقیقت ہے کہ خدا کا دین ثابت و محکم ہے اور محض زمانے کے انداز دیکھ کر اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ لیکن یہ خیال کرنا بھی غلط ہوگا کہ زمانے کے تغیرات کو دین اسلام کلی طور پر نظرانداز کرتا ہے۔ اسلام کا طریقِ کار یہ ہے کہ وہ ہدایت و ضلالت کے بنیادی اصول بتا دیتا ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے وہ حدود واضح کردیتا ہے جو انسان کو صراط مستقیم پر قایم رکھنے کے لیے درکار ہیں۔ رہے جزوی اور وقتی امور تو ان کو شریعت کے دیے ہوئے بنیادی اصولوں کی روشنی میں اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر ہر وقت اور ہر زمانے میں طے کرنے کی اجازت ہے۔ یہ کام اجتہاد

Marfat.com

کے ذریعے سے انجام پاتا ہے اور اسی کے ذریعے سے نظام دین میں حرکت و ارتقا کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے ۔

زمانے کے تغیرات پر دو قسم کے رد عمل اسلامی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ایک کا نام ' تجدید ' ہے اور دوسرے کا ' تجدّد ' ۔

' تجدید ' یہ ہے کہ زمانے کے تغیرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل دین کو بلا کم و کاست پیش کیا جائے اور اپنے دور اور اپنے زمانے کی زبان میں محکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے ۔ نیز تدبر و اجتہاد کے ذریعے سے دین کو اپنے دور کے حالات پر نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے ۔ اُن تمام ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے جو قدرت نے انسان کو فراہم کیے ہیں اور اسلامی بصیرت کے ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا جائے ۔ تجدید کے ذریعے سے ہر زمانے میں دین کی تعلیمات اور زندگی کے بہاو کے درمیان تعلق اور رابطہ گہرا ہوتا جاتا ہے اور زندگی کا دریا اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے نہیں پاتا ۔ یہاں مخلصانہ اجتہاد کے ذریعے سے نئے مسائل اور نئی مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور دین اپنے رنگ پر قایم رہتا ہے ۔

' تجدّد ' اس کے مقابلے میں وہ کوشش ہے جو زمانے کے تقاضوں کے نام پر خود دین کو بدل ڈالنے کے لیے کی جاتی ہے ۔ زندگی اور زمانے کے درمیان ربط اس طریقے سے بھی قایم ہو جاتا ہے لیکن یہ ربط اسلام کی سر زمین پر نہیں غیر اسلام کی سر زمین پر قایم ہوتا ہے ۔ اس میں اسلام کو اصل قرار دے کر حالات کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے زمانے کی چلتی ہوئی تہذیب کو اصل مان کر اس کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اسلام کو ڈھال دیا جاتا ہے ۔ اس طریقِ کار کو اگر مسلمان ہر زمانے میں اختیار کرتے چلے جائیں تو اسلام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتی ، بلکہ اسلام سرے سے کسی متعین مذہب و مسلک اور نظریے و نظام کا نام ہی نہیں رہتا ۔

اسلام میں تجدید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں اور پوری تاریخ میں اسلام کے سچے خادم یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ لیکن تجدد کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سر اٹھایا ہے مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور ہر ایسی تخریبی کوشش ملت کی رائے عامہ سے ٹکرا کر آخر کار ختم ہوگئی ہے ۔

Marfat.com

آج بھی بنیادی کشمکش تجدید اور تجدد ہی کے درمیان ہے ۔ اور ہماری پوری تاریخ اس بات پر گواہ ہے کہ دین کو متجددین کی خاطر نہ کبھی ماضی میں بدلا گیا ہے اور نہ آج بدلا جاسکتا ہے ۔ کسی صاحب اثر شخصیت کی یہ طاقت نہیں ہے کہ زمانے کے تقاضوں کا نام لے کر اسلام کو بدل سکے۔ اس معاملے میں جو انجام اکبر بادشاہ کی کوششوں کا ہوچکا ہے وہی انجام ان نئے متجددین کے لیے بھی مقدر ہے ۔ دین میں مسخ و تحریف کی کوئی تدبیر اگر طاقت کے بل پر زبردستی نافذ کر بھی دی جائے تو آئے مسلمانوں کے اجتماعی ضمیر نے نہ ماضی میں کبھی قبول کیا ہے اور نہ آج قبول کرسکتا ہے ۔ اس دین کی حفاظت کی ذمہ داری خدا نے لی ہے اور اس نے ایسے ذرائع بھی پیدا کردیے ہیں کہ اس کی حفاظت ہوتی رہے ۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۝ (الحجر - ۹)

ہم نے ہی اس ذکر کو نازل کیا ہے اور ہم ہی
اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ۔

آخر میں ایک بات کی طرف ہم اور اشارہ کرنا چاہتے ہیں ۔ پوری انسانی تاریخ اس امر پر گواہ ہے کہ ہمیشہ عظیم کارنامے ان ہی لوگوں نے انجام دیے ہیں جو حالات کی رو پر بہنے کے بجائے ان کا مقابلہ کرنے اٹھے ہیں۔ زندگی پر انمٹ نقوش انہوں نے نہیں چھوڑے جو مرغ بادنما کی طرح ہوا کے رخ پر مڑتے اور دوسروں کی نقالی کرتے رہے بلکہ ان لوگوں نے چھوڑے ہیں جو ہوا کے رخ سے لڑے ہیں اور زندگی کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا ہے ۔ قابل تقلید وہ نہیں ہے جو گرگٹ کی طرح صبح و شام رنگ بدلتا ہے بلکہ وہ ہے جو خود اپنا کوئی رنگ رکھتا ہے اور دنیا کو اپنے رنگ میں رنگ دیتا ہے ۔ مسلمان دنیا میں زمانے کے پیچھے چلنے کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں ۔ وہ تو پوری انسانیت کی طرف اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ جسے خدا نیکی کہتا ہے اس کا حکم دیں، جسے خدا بدی کہتا ہے اسے مٹائیں اور دنیا میں خدا کی اطاعت کی روش کو عام کردیں۔ وہ دوسروں کے رنگ میں رنگے جانے کے لیے نہیں ہیں ۔ دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے ہیں:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ
(آل عمران - ۱۱۰)

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کیے گئے ہو تاکہ نیکی کا حکم دو، برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ ۔ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

Marfat.com

یہ ہے مسلمانوں کا اصل مقام — مگر انہیں ڈالا کس راہ پر جا رہا ہے ؟ بقول اقبال

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ، اپنے زمانے کے ہیں پیرو

در حقیقت مسلمان کے لیے اس سے بڑی ذلت کوئی نہیں ہوسکتی کہ وہ خدا کے پیغام کا امین ہونے کے باوجود زمانے کو اپنے دین کے مطابق بدلنے کے بجائے خود زمانے کی رو پر بہنے لگے اور اس کے ساتھ اپنے دین کو بھی مسخ کرنے کی کوشش کرے۔ یہ بزدلوں اور کم نظر لوگوں کا طریقہ ہے۔ یہ ان لوگوں کا طریقہ ہے جنہیں ہوائیں خس و خاشاک کی طرح آڑائے لیے پھرتی ہیں، جن کی اپنی جڑ نہیں ہے کہ وہ اس پر مضبوطی کے ساتھ قایم ہو سکیں۔ یہ مسلمان کا شیوہ نہیں۔ مسلمان کا شیوہ تو یہ ہے کہ

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

Marfat.com

Marfat.com

حصہ دوم

اسلامی فلسفۂ حیات

Marfat.com

Marfat.com

کتاب کے پہلے حصے میں ہم علمی، عقلی اور تاریخی نقطہ ہائے نظر سے یہ دیکھ چکے ہیں کہ انسان کی سب سے بنیادی ضرورت مذہب ہے۔ اس کے بغیر انفرادی زندگی پراگندہ اور اجتماعی زندگی فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ مختلف مذاہب اور اجتماعی تحریکات کا جائزہ لے کر ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ آج کے مسائل کو صرف اسلام ہی حل کر سکتا ہے۔ اب ہم اسلام کے فلسفۂ زندگی کو اس کے دلائل کے ساتھ پیش کریں گے۔ آگے کی بحث کو سمجھنے کے لیے چند باتیں ذہن میں رہنی چاہییں:

۱۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نظم و ترتیب اُس وقت رونما ہوتی ہے جب اس کی ایک مستقل اور متعین سیرت بن جائے۔ ایک مستقل سیرت کے بغیر انسان کی زندگی پر انتشار اور پراگندگی کا غلبہ رہتا ہے اور وہ اپنا کوئی مستقل رنگ پیدا نہیں کر پاتا بلکہ مرغ باد نما کی طرح ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ اپنا رخ بھی بدل لیتا ہے۔

۲۔ جس طرح فرد واحد کی زندگی کو پراگندگی سے بچانے اور اس میں ضبط اور نظم پیدا کرنے کے لیے ایک مستقل سیرت کی ضرورت ہے اسی طرح بہت سے اشخاص اور ایک معاشرے کو انتشار اور تفرقے سے بچانے اور اسے ایک منظم اور متحد جمعیت بنا دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی اساس مشترک اقدار پر ہو، اس پر ایک ہی رنگ غالب ہو اور ایک ہی رشتۂ اتحاد میں سب جڑے ہوئے ہوں۔

۳۔ انفرادی اور اجتماعی سیرت کی بنیاد ان تصورات پر قایم ہوتی ہے جو ذہن میں پوری قوت کے ساتھ راسخ ہو جائیں۔ اور اتنا غلبہ حاصل کر لیں کہ انسان کی ساری عملی قوتیں انہی کے زیر اثر رہ کر کام کریں۔ اسی رسوخ کا اصطلاحی نام 'ایمان' ہے اور اس طرح راسخ ہو جانے والے تصورات کو 'ایمانیات' یا 'عقائد' کے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں انسانی سیرت کی ذہنی بنیاد کا نام 'ایمان' ہے۔ ایمان کا لفظ 'امن' سے نکلا

Marfat.com

ہے 'امن' کے اصلی معنی نفس کے مطمئن اور بے خوف ہو جانے کے ہیں۔
اسی سے 'امانت' ہے جو 'خیانت' کی ضد ہے، یعنی امانت وہ ہے جس میں خیانت کا خوف نہ ہو۔ امین کو امین اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی نیک معاملگی پر دل کو اطمینان اور وثوق ہوتا ہے کہ وہ بد معاملگی نہیں کرے گا۔ جو اونٹنی غریب اور مطیع ہوتی ہے اس کو امون کہتے ہیں کیوں کہ اس سے سرکشی اور شرارت کا خوف نہیں ہوتا۔ اس مادّے کا باب افعال 'ایمان' ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نفس میں کوئی بات بر بنائے تصدیق و یقین اس طرح جمالی جائے کہ اب اس کے خلاف کسی بات کے راہ پانے اور داخل ہو جانے کا خوف ہی باقی نہ رہے۔ ایمان کمزور ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ نفس اس بات پر پوری طرح مطمئن نہیں ہوا، قلب کو پوری طرح سکون نہیں ہوا، اس کے خلاف باتوں کو بھی ذہن میں داخل ہو جانے کا موقع مل گیا۔ اسی سے سیرت کمزور ہوتی ہے اور اسی سے عملی زندگی میں بے نظمی پیدا ہوتی ہے۔ ایمان کا قوی اور مضبوط ہونا اس کا برعکس ہے۔ مضبوط ایمان کے معنی یہ ہیں کہ سیرت بالکل ٹھوس اور یقینی بنیادوں پر قایم ہوگئی، اب اعتماد کیا جا سکتا ہے کہ اعمال ٹھیک ٹھیک اس تخیل کے مطابق و مناسب صادر ہوں گے جو دل میں جم گیا ہے اور جس سے سیرت کا سانچہ تیار ہوا ہے۔

۴۔ اگر مختلف افراد مختلف قسم کے عقائد و افکار پر ایمان رکھتے ہوں اور ان کی سیرتیں مختلف اور متضاد بنیادوں پر قایم ہو جائیں تو کوئی اجتماعی ہیئت نہیں بن سکتی۔ ان کی مثال ایسی ہوگی جیسے ایک میدان میں بہت سے پتھر بکھرے پڑے ہوں۔ ہر پتھر بلا شبہ اپنی جگہ مضبوط ہے، مگر ان کے درمیان کوئی ربط نہیں ہے۔ بخلاف اس کے اگر ایک ہی مشترک تخیّل بہت سے افراد کے دلوں میں ایمان بن کر جم جائے تو اشتراک ایمانی کا رابطہ ان کو ایک قوم بنا دے گا۔ گویا وہی پتھر جو بکھرے پڑے تھے چونے سے جوڑ دیے گئے اور ایک مضبوط دیوار قایم ہوگئی۔ اب ان کے درمیان تعامل اور تعاون شروع ہو جائے گا، جس سے ترقی کی رفتار تیز اور تیز تر ہوتی چلی جائے گی۔ ایک قسم کا ایمان ان کی سیرتوں میں ہم آہنگی اور ان کے اعمال میں یک رنگی پیدا کر دے گا۔ اس سے ایک خاص تمدن پیدا ہوگا، ایک خاص شان کی تہذیب ظاہر ہوگی، ایک نئی قوم، نئی سیرت، نئی ذہنیت،

Marfat.com

نئے خیالات اور نئے طریق عمل کے ساتھ اٹھے گی اور تہذیب کا قصر ایک نئے انداز پر تعمیر کرے گی -

۵- جس قوم کے ایمانیات روحانی امور پر مشتمل ہوتے ہیں اس کا مذہب اور اس کی تہذیب دونوں ایک ہوتے ہیں- اور جس کے ایمانیات محض دنیوی امور پر مشتمل ہوں اس کی تہذیب اس کے مذہب سے جدا ہوتی ہے - اس دوسری صورت میں شخصی اور قومی زندگی پر مذہب کا کوئی خاص اثر باقی نہیں رہتا -

۶- تہذیب کا مذہب سے آزاد ہو جانا آخرکار اخلاقی انحطاط اور تباہی کا موجب ہوتا ہے - لیکن تہذیب کا مذہب کے زیر اثر رہنا منحصر ہے اس پر کہ مذہب کے ایمانیات ایسے روحانی امور پر مشتمل ہوں جو ادنیٰ مدارج سے لے کر بلند ترین مدارج تک انسان کے ارتقائے عقل کا ساتھ دے سکیں، اور جن سے انسانی سیرت کی تشکیل اس طرح پر ہو کہ وہ بیک وقت اعلیٰ درجے کا دیندار بھی ہو اور دنیا دار بھی، بلکہ اس کی دنیا داری میں دینداری ہو اور دین داری میں دنیا داری -

۷- جس قوم کا مذہب اور تہذیب ایک ہوں اس کا ایمان محض مذہبی ایمان نہیں ہوتا بلکہ بعینہ دنیوی ایمان بھی ہوتا ہے - اس کے ایمان کا متزلزل ہونا اس کے مذہب اور اس کی تہذیب دونوں کے لیے غارت گر ہے اور اس کی دنیا اور اس کے دین دونوں کے لیے تباہ کن ہے - امت مسلمہ ایسی ہی ایک امت ہے - اس کی تہذیب اس کے مذہب سے ماخوذ ہے اور اس وجہ سے دین و تمدن دونوں کا انحصار ایمان ہی پر ہے -

یہ چند کلی اصول[۱] ہیں جن سے تہذیب انسانی کا ہر طالب علم اتفاق کرے گا - آئندہ صفحات میں ہم ان ایمانیات پر تفصیلی بحث کریں گے جو اسلام پیش کرتا ہے اور جن پر وہ اپنے پورے نظام زندگی کی عمارت کھڑی کرتا ہے -

اس حصے میں آٹھ ابواب ہیں جن میں اسلام کے تصور حیات، اسلامی نظریۂ حیات کی بنیادی خصوصیات اور اسلام کے بنیادی عقائد کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے - توحید، رسالت اور آخرت پر مفصل بحث کی گئی ہے اور زندگی پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

۱- اس بحث کا بیشتر حصہ ماخوذ ہے - (مرتب)

Marfat.com

کے اسوۂ حسنہ کی تاریخی اور تہذیبی اہمیت کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے چند نقش و نگار پیش کیے گئے ہیں اور اسلام کے تصور عبادت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حصہ تقریباً پانچ چھ ہزار صفحات پر پھیلے ہوئے مباحث کا عطر ہے۔ تقریباً تمام مضامین میں ایک نئی ترتیب قایم کی گئی ہے اور مباحث میں منطقی اور معنوی ربط قایم کرنے کے لیے جگہ جگہ مرتب کو خلا پُر کرنے پڑے ہیں۔ تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کی زبان سے استفادہ کیا گیا ہے لیکن اس کی پابندی نہیں کی گئی۔ نیز مشکل الفاظ اور فقروں کو تبدیل کیا گیا ہے تاکہ طلبہ اور عام قاری زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس طرح اپنی موجودہ شکل میں یہ تمام مضامین ایک حد تک بالکل نئی چیز بن گئے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ اس حصے کے مطالعے سے اسلام کے فلسفۂ زندگی کا ایک مکمل خاکہ قارئین کے سامنے آجائے گا۔

مرتب

Marfat.com

۷

اسلام کا تصور زندگی

کائنات و انسان*

کائنات سے متعلق انسان کے نظریات میں عظیم تضاد رہا ہے۔ کسی کے نزدیک یہ محض ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ اس میں جو تنظیم یا ترتیب نظر آتی ہے وہ بھی اتفاقی ہے۔ ورنہ بہ‌حیثیت کل نہ اس کا کوئی مقصد ہے اور نہ اس میں ہمہ گیر نظم پایا جاتا ہے۔ انسان خود بھی ایسے ہی ایک اتفاقی حادثے کا نتیجہ ہے، اس کا بھی کوئی مقصد نہیں، اس کی زندگی میں بھی ترتیب اور اخلاقی نظم کی حاجت نہیں۔ لہذا وہ تعلق جو کائنات اور انسان کے مابین قایم ہوتا ہے یہ ہے کہ انسان چند طبعی خواہشات رکھتا ہے اور کائنات ان خواہشات کی تکمیل کا سامان بہم پہنچاتی ہے، اور اس طرح حیات طبعی کے قیام میں مدد دیتی ہے۔ پھر چوں کہ کائنات مکمل نظم و انتظام سے عاری ہے اس لیے کبھی زندگی کے قیام کے بجائے زندگی کے اختتام کا سبب بنتی ہے۔ چناں چہ کبھی وہ طوفانوں کے ذریعے انسانی بستیوں کو تباہ کرتی ہے، کبھی زلزلوں کے ذریعہ زندگی کو نیست و نابود کرتی ہے اور کبھی آتش فشانی کے ذریعے انسانی آبادیوں کو خاکستر کرتی ہے۔

کسی کے نزدیک یہ کائنات محض ایک وجود کی مظہر ہے۔ درخت، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، اور خود انسان اسی ایک واحد الوجود کے جلوہ نما

---

* یہ باب مولانا سید ابولاعلیٰ مودودی کی کتاب ”اسلام اور جاہلیت“ اور ” اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی “ سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

ھیں - ان کا اپنا نہ کوئی وجود ہے اور نہ کوئی حیثیت - ان کا عمل خدا کا عمل ، ان کی حرکت خدا کی حرکت اور ان کا ارادہ خدا کا ارادہ ہے - چوں کہ حقیقتاً یہ سب ایک ہی وجود کے مظاھر ھیں اس لیے کسی ترتیب یا نظم کے ھونے یا نہ ھونے کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ، کہ ترتیب ایک سے زائد اشیا ھی میں ھوسکتی ہے - پھر چوں کہ انسان بہ ذات خود کوئی ارادہ نہیں رکھتا اس لیے جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار وہ خود نہیں - اور چوں کہ اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں اس لیے اس کے اور کائنات کے درمیان کسی مستقل رشتے کا تعین ممکن نہیں - انسان کائنات میں اپنی منفعت کی خاطر تصرف کرتا ہے تو ، اس کو خواہ مخواہ تباہ کرتا ہے تو ، اس سے بلا وجہ اجتناب کرتا ہے تو ، یا خود اس کا شکار ھوتا ہے تو ، سب ٹھیک ہے اس لیے کہ جس وقت جو کچھ بھی ھوا ، اسی واحد الوجود کے ارادے اور رضا سے ھوا -

کسی اور کے نزدیک کائنات کی ہر وہ شے ایک آلہ ہے جو کسی قوت کی حامل یا کسی منفعت کا سبب ہے - چناں چہ دریا اگر بہا لے جانے کی قوت رکھتا ہے تو معبود ہے ، آگ اگر جلا سکتی ہے تو پرستش کے قابل ہے ، سانپ اگر ڈس لیتا ہے تو لائق تعظیم و معبودیت ہے - غرض کائنات کی ہر شے مخدوم اور انسان ان کا خادم ہے -

ان کے علاوہ بھی کائنات اور انسان سے متعلق کچھ نظریات ھیں لیکن انتہا پسندی اور کجروی ان سب کا خاصہ ہے - اسلام ھی ایک ایسا نظام فکر و عمل ہے جو کائنات و انسان سے متعلق ایک متوازن و معقول نظریہ دیتا ہے -

اسلام کا تصور کائنات

اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ سارا عالم ھست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ھوا ہے کوئی اتفاقی ھنگامہ نہیں ، بلکہ منظم ، باضابطہ سلطنت ہے - اللہ نے اس کو بنایا ، وھی اس کا مالک اور وھی اس کا حکم ہے - یہ ایک نظام کلی ہے جس میں تمام اختیارات مرکزی اقتدار کے ھاتھ میں ھیں - اس مقتدر اعلیٰ کے سوا یہاں کسی اور کا حکم نہیں چلتا - تمام قوتیں جو نظام عالم میں کام کر رھی ھیں اسی کے زیر حکم ھیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کرسکے - اس ھمہ گیر نظام میں

Marfat.com

کسی کی خود مختاری اور غیر ذمہ داری کے لیے کوئی جگہ نہیں ، اور نہ فطرتاً ہو سکتی ہے -

بہ ظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلطنتِ عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان نظر آتا ہے اور نہ اس کے کار پرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ایک طرح کی خود مختاری انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے کہ جس طرح چاہے کام کرے ، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتا ہے اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتا ہے ، ہر صورت میں اس کو رزق ملتا ہے ، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی ہے - یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان کی صلاحیتیں بروئے کار آئیں اور وہ مادی ، اخلاقی اور روحانی ترقی کے مدارج طے کر سکے ، اس نے اس کو سمجھ بوجھ ، انتخاب کی آزادی اور ایک طرح کی خود مختاری عطا کرکے چھوڑ دیا ہے -

یہ عالم جس میں ہم اس وقت ہیں در اصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی - جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں - اس لیے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مرتب نہیں ہو سکتے ، اور اگر وہ مرتب ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک جس حد تک قوانین طبیعی ان کو مرتب ہونے کا موقع دیں ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کے لیے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے - مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کردے تو اس فعل کا اخلاقی نتیجہ مرتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اس کا سراغ لگنے اور اس پر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں - اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مرتب ہی نہ ہوگا اور اگر وہ سازگاری کر بھی لیں تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مرتب نہ ہو سکیں گے - کیوں کہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کردیا جانا اس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا ارتکاب اس نے کیا تھا - اس لیے یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے - چناں چہ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عمل نیک کا انعام ہی ہو - وہ اس بات کی علامت نہیں کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو

Marfat.com

وہ درست ہے - بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے - مال ، دولت ، اولاد خدام ، حکومت ، اسباب زندگی ، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کرکے دکھاؤ اور اپنی اچھی بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں ، نقصانات ، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی لازماً کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں ' بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قایم کرکے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لا محالہ چوٹ لگتی ہے - بہ ہر حال یہ دنیا دارالجزاء نہیں بلکہ دارالامتحان ہے -

اسلام کا تصور انسان

انسان کو ابتدا سے ہی کائنات کی طرح اپنے متعلق بھی بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے - کبھی وہ افراط پر آترتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند ہستی سمجھ لیتا ہے ، غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے ، کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا اپنے مد مقابل بھی نہیں سمجھتا ، اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبر و قہر کا دیوتا، ظلم و جور اور شر و فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے - کبھی تفریط کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے - درخت ، پتھر ، دریا ، پہاڑ ، ہوا ، آگ ، بادل ، بجلی ، چاند ، سورج ، تارے ، غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت یا منفعت نظر آتی ہے - اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا ، معبود اور حاکم مطلق مان لینے میں تامل نہیں کرتا -

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کرکے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے -

يَٰٓأَيُّهَا ٱلْإِنسَٰنُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ ٱلْكَرِيمِ ۝ ٱلَّذِى خَلَقَكَ فَسَوَّىٰكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِىٓ أَىِّ صُورَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝
(الانفطار - ۶-۸)

اے انسان! کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کردیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا اور تیرے اعضا درست کیے اور قوتوں میں اعتدال کیا۔ جس صورت میں چاہا (تیرے عناصر کو) ترکیب دی - (الانفطار - ۶-۸)

Marfat.com

اس اور اسی قسم کی دوسری آیات میں انسان کے غرور و تکبر کے بتوں کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ! خدا تجھے کن اجزا سے پیدا کرتا ہے۔ پہلے رحم مادر میں ایک گوشت کا لوتھڑا بنایا ہے، پھر اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا ہے، اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلّح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس کو اپنی کوئی حاجت پوری کرنے کی قدرت حاصل نہیں ہوتی خدا ہی نے اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے، تو بڑھتا ہے، جوان ہوتا ہے، طاقت ور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں، تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں، تیرا علم نسیاً منسیاً ہو جاتا ہے۔ اور آخرکار تیری شمع حیات بجھ جاتی ہے۔ مال املاک، عزیز، دوست، اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصۂ حیات میں تو ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں۔ تجھ سے بالاتر ایک اور قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے، قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا، یہ پانی، یہ روشنی، یہ حرارت، یہ زمین کی پیداوار، یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے، ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادۂ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو، اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کر لے، اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سامان مہیا کر لے، قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

Marfat.com

اس بل بوتے پر اکڑتا ہے، پھولا نہیں سماتا، کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نمرودیت کا دم بھرتا ہے۔ جبّار و قہّار بنتا ہے، ظالم و سرکش بنتا ہے، خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

اس تکبر شکنی کے بعد اسلام وہ اعلیٰ مقام بھی متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے وہ کہتا ہے:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝

ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔ (بنی اسرائیل - ۷)

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ

اے انسان! کیا تو دیکھتا نہیں
کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو
زمین میں ہیں تیرے لیے مطیع
بنا دیا ہے۔ (الحج - ۹)

ان آیات میں اور ایسی ہی بہت سی دوسری آیات میں انسان کو یہ بتایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تمہارے فائدے اور خدمت کے لیے مسخّر کر دی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت، یہ دریا، یہ سمندر، یہ پہاڑ، یہ جانور، یہ رات اور دن، یہ تاریکی اور یہ روشنی، یہ چاند، یہ سورج، یہ تارے۔ غرض یہ سب چیزیں جن کو تم دیکھ رہے ہو تمہاری خادم ہیں اور در اصل تمہاری منفعت کے لیے ہیں۔ تمہارے لیے انہیں کار آمد بنایا گیا ہے۔ تم ان سب پر فضیلت رکھتے ہو۔ تم کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے تم کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تم اپنے خادموں کے آگے سر جھکاتے ہو؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتے ہو؟ ان سے اپنی مدد کی التجا کرتے ہو؟ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہو؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتے ہو؟ اس طرح تو تم اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو، آپ اپنا مرتبہ گراتے ہو، خادموں کے خادم، غلاموں کے غلام خود بنتے ہو۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بہ زعم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے ؟

خلیفۃ اللہ فی الارض

اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے ۔

> ''اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا ، کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خوں ریزیاں کرے گا، حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں ، اللہ نے فرمایا 'میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ۔' اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے ، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا 'اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ ۔' انہوں نے کہا 'پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے ۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک ۔' خدا نے کہا 'اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ پس جب آدم نے ان اشیا کے نام بتائے تو خدا نے کہا 'کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں ۔' اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا بہ جز ابلیس کے کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا ۔ اور ہم نے آدم سے کہا کہ 'اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو بہ فراغت کھاؤ ۔ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ۔' مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے ان کو وہاں سے نکلوا دیا ۔'' (البقرہ ۔ رکوع ۔ ۴)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا ،

Marfat.com

اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا، اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی، فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھک سکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اس کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اس کے آگے جھک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لیے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چناں چہ شیطان نے انسان کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا، اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہوگا۔

منصب نیابت کی حقیقت

اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔

اولاً یہ کہ انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ماتحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی خادم ہیں اور اس لیے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقے پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لیے ذلت ہے۔ اگر جھکے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا اور گویا نیابت الٰہی کے منصب سے خود دست بردار ہوگا۔

دوسرے یہ کہ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ اسے اس بات کا اختیار نہیں کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں کو خود اپنی رعیت، اپنا نوکر اور اپنا خادم بنا لے کہ ایسا کرے گا تو باغی قرار پائے گا۔ اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں اپنے آقا کی املاک کو استعمال کر سکتا ہے، اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے،

Marfat.com

اس سے خدمت لے سکتا ہے، ان کی نگرانی کر سکتا ہے، مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نمایندہ ہے، اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

اس امانت میں نہ صرف دنیا کی ہر چیز شامل ہے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لہذا جس طرح بقیہ اشیا کا وہی تصرف مناسب ہے جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اسی طرح خود انسان کا جسم اور اس کی جان بھی خدا کی ہدایات کے مطابق استعمال ہونی چاہیں۔ خدا نے اپنی مرضی وحی و الہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی اور خدا کا مربوط اور مفصل قانون کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھ کر اپنے اعمال و افعال خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالے۔

تیسرے یہ کہ نہ صرف انسان کا عمل خدا کے دیے ہوئے قانون کے مطابق ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مطابقت اتفاق نہ ہو۔ نائب کا کام یہی نہیں کہ وہ ایسے افعال انجام دے جو آقا کی نظر میں پسندیدہ ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ نائب یہ افعال آقا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرکے اس کی رضا کی خاطر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا، نہ اپنے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہوگا، نہ اپنے ذمہ دار اور جواب دہ ہونے کا احساس کر سکے گا، اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہوگا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے تخیل کے تحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تحت وہ اختیار کرے گا۔ اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیوں کہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کرکے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کی اتباع میں اچھے عمل کیے بھی تو اس کا اجر اسی سے طلب کرے جس کی اس نے اتباع کی ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار اور بے وزن ہیں۔

Marfat.com

چوتھے اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ نائب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا وہ حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لیے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ رعیّت کی خبر گیری، شفقت، مہربانی حفاظت، عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے۔ اور بادشاہ ی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت، تدبر، دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ پس انسان کو بھی نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہی روش اختیار کرنی چاہیے جو خود خدا کی روش ہے۔ مخلوق کی ویسی ہی خبر گیری، وہی رحمانی و رحیمی، وہی عدل، وہی رحم و کرم، ویسا ہی قہر و جبر جو خود خدا کے اخلاق میں شامل ہے، انسان کو چاہیے کہ اپنے کردار میں بھی راسخ کرے۔ یہی مفہوم ہے جو ”تخلقوا باخلاق اللہ“ کے حکیمانہ جملے میں ادا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے میں یہ صفات اس حد تک پیدا نہیں کر سکتا جس حد تک خدا کی ہیں، کہ درجۂ نیابت درجۂ خدا وندی کے آگے ہیچ ہے، لیکن اپنی حد تک ان صفات میں زیادہ سے زیادہ ملکہ پیدا کرنا ہی صحیح اسلامی زندگی ہے۔

پانچویں یہ کہ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جسم انسانی) اور خدا کی پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانۂ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیے۔ اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیے۔ اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں ان کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ اس نے کس طرح انجام دیں۔ اگر اس نے غبن، خیانت، نا فرمانی بغاوت اور فرض ناشناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیے اور اگر ایمان داری، فرض شناسی اور اطاعت کوشی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے۔

چھٹے یہ کہ ہر انسان نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے اچھے برے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں

Marfat.com

اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا، نہ اس توقع کی کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطے سے ہم اپنے جرائم کے نتائج اور ان کی سزا سے بچ جائیں گے۔ اور نہ اس کا کوئی خطرہ باقی رکھا گیا ہے کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہوگا۔ یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نامقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ لہذا دنیا برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کرکے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

اسلامی نظریہ کا علمی مقام

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو اسلام نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اس کے تمام اجزا میں منطقی ربط ہے۔ کوئی جز دوسرے جز سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثار کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز مشاہدے یا تجربے میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریے سے نہ کی جا سکتی ہو۔ لہذا یہ ایک علمی نظریہ ہے۔ 'علمی نظریہ'[۱] کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے یہ نظریہ ٹوٹ جاتا ہو لہذا یہ اپنی جگہ پر قایم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اس کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔[۲]

پھر نظام عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس سے اس نظریے کی صداقت اور برتری پر روشنی پڑتی ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرین عقل ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے بہ نسبت اس کے کہ کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح اس تنظیم کو دیکھ کر یہ نتیجہ

۱۔ Scientific Theory

۲۔ کسی زمانے کے کچھ علمی نظریات کا بہ ظاہر اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ ایک علمی نظریے کو صرف حقائق توڑ سکتے ہیں نہ کہ نظریات لہذا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ انبیا کے پیش کیے ہوئے اس تصور کائنات و انسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس کو ٹوٹے ہوئے نظریات میں شمار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ دعویٰ ہے۔

Marfat.com

نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختار کل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اس کے کہ یہ لا مرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قایم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور با مقصد نظام ہے، بہ نسبت اس کے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظام کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جز ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ‌داری کے لیے کوئی جگہ نہ ہونی چاہیے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہیے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابل عمل نظریہ ہے۔ زندگی کا پورا نظام اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریے پر بنتا ہے۔ فلسفے اور اخلاق کے لیے، علوم و فنون کے لیے، ادب اور ہنر کے لیے، سیاست اور انتظام مملکت کے لیے، صلح و جنگ اور بین‌الاقوامی تعلقات کے لیے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ضرورت کے لیے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لیے اس نظریے سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

انفرادی و اجتماعی زندگی پر نظریۂ اسلامی کے اثرات

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس نظریے سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریے پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اس کی طاقتوں کو اور دنیا اور اس کی کسی چیز کو بھی اپنی ملکیت سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملکیت سمجھ کر صرف اس کے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اُسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی

Marfat.com

اس کو دینا ہے جس کی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ دل میں چھپا ہوا کوئی ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطے کا پابند ہوگا، وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم اور خائن نہیں ہو سکتا۔ اس کی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطے کی پابندی کے لیے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ان مواقع پر بھی راستی اور حق پر قایم رکھتا ہے جہاں اسے کسی دنیوی طاقت کی باز پرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر معاشرے کو قابل اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آ سکتا۔

مزید براں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی و جہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اس کی سعی و جہد کو خود غرضی، نفس پرستی یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بے کار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لیے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لیے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کام کے لیے ہے جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑا نہ جاؤں گا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائے گا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ رکھنے والے افراد کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو پر غور کیجیے۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریے کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لیے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقے، کسی قوم، کسی نسل کے لیے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، اشراقیت، برہمنیت و پاپائیت اور آمریت سے پیدا ہوتی ہیں۔

Marfat.com

پھر یہ چیز قبیلے، قوم، نسل، وطن اور رنگ کے ان تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جن کی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خوں ریزیاں ہوتی ہیں۔ اس نظریے کی رو سے تمام روئے زمین خدا کی ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریے میں کایتا تبدیل کر دی گئی ہے۔ انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بِنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں۔ کیوں کہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اس کے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بِنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی پر رکھتا ہے۔ جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کرلیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل غور ہے کیوں کہ ہر وقت ایک شخص کے لیے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔ اس طرح اگر دنیا میں کوئی عالم گیر بین الاقوامی برادری بننی ممکن ہے تو وہ اسی نظریے پر بن سکتی ہے۔ دوسرے تمام نظریات انسانیت کو پھاڑنے والے ہیں، جمع کرنے والے نہیں ہیں۔

ان تمام اصلاحات کے بعد جو معاشرہ اس نظریے پر بنتا ہے اس کی ذہنیت، روح اور اجتماعی تعمیر بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں ریاست انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر بنتی ہے۔[1] حکومت خدا کی ہوتی ہے۔

۱۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو، سید ابو الاعلیٰ مودودی، 'اسلامی ریاست' (مرتبہ خورشید احمد) اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور اور محمد اسد، 'اسلامی دستور سازی' بیورو آف نیشنل ریکنسٹرکشن، حکومت مغربی پاکستان، لاہور۔

Marfat.com

قانون خدا کا ہوتا ہے۔ انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو ان ساری خرابیوں کو دور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریے پر ریاست بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ ریاست کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی روح پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب و الشہادۃ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر ٹیکس دیتا ہے کہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایک سپاہی سے لے کر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندۂ حکومت اپنے فرائض اسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے۔ دونوں کام اس کے لیے عبادت ہیں اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کے لیے چنتے ہیں ان میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوف خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ ابھر آتے ہیں اور اختیارات اُن کے ہاتھوں میں دیے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ تقویٰ اور طہارت اخلاق کی یہی روح پھیلا دیتا ہے۔ اس میں 'نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے'۔ ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے۔ یہ قانون چوں کہ اُس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لیے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اس کی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریۂ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ ہو۔ بلکہ تاریخ میں اس نظریے پر ایک اجتماعی نظام اور ایک ریاست بنا کر دکھائی جا چکی ہے۔ اور تاریخ شاہد

Marfat.com

ہے کہ جیسے افراد اس نظریے پر تیار کیے گئے تھے نہ اس سے بہتر افراد روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اس ریاست سے بڑھ کر کوئی ریاست انسان کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے لیے اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو، اور بغیر کسی مچلکہ و ضمانت کے اسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیے جانے کی درخواست کرتی ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ بچے کو دودھ پلا اور جب دودھ پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو۔ پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہو جانے کے بعد وہ پھر آکر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چناں چہ اسے سنگسار کیا جاتا ہے اور جب وہ مر جاتی ہے تو اس کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے۔ اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ ”خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا۔“ یہ تو اس معاشرے کے افراد کا حال تھا اور اس ریاست کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے بھرے ہوئے تھے اس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار لیتا تھا، اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈنے سے بھی بہ مشکل کوئی ایسا ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربے کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیا نے نظامِ کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان کے لیے کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہ راست عینی مشاہدہ تو اسے بہر حال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربے سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع

Marfat.com

نظام میں کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے تو مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے، اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانے پر جاکر بیٹھتی ہے اس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ نظام میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اس کے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریے سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریے ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے، فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور فی الواقع اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامہ حیات دنیوی کا حساب دینا ہے۔

انسان کا نصب العین

نصب العین کا سوال در حقیقت تصور حیات کے سوال سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ ہم دنیوی زندگی کے متعلق جو تصور رکھتے ہیں اور دنیا میں اپنی حیثیت اور اپنے لیے دنیا کی حیثیت کا جو نظریہ ہمارے ذہن میں ہوتا ہے وہی فطری طور پر زندگی کا نصب العین متعین کر دیتا ہے اور ہم اپنی تمام قوتیں اسی نصب العین کے حصول کی راہ میں صرف کرنے لگتے ہیں۔ اگر دنیا کو ہم اپنے لیے ایک چراگاہ تصور کرتے ہیں اور ہمارے ذہن میں زندگی عبارت ہے ایک مہلت سے جو ہم کو کھانے پینے اور باقی لذتوں سے متمتع ہونے کے لیے ملی ہوئی ہے تو بلا شبہ یہ حیوانی تصور ہمارے نفس میں زندگی کا ایک حیوانی نصب العین راسخ کر دے گا اور ہم تمام عمر اپنے لیے جنسی لذتوں کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ بہ خلاف اس کے اگر ہم اپنے آپ کو پیدائشی مجرم اور فطری گنہگار سمجھتے ہیں اور دنیا کے متعلق ہمارا تصور یہ ہے کہ یہ کوئی سزا گھر ہے جہاں ہم اپنے پیدائشی جرم کی سزا بھگتنے کے لیے پھینک دیے گئے ہیں تو قدرتی طور پر یہ تصور ہمارے نفس میں اس عذاب سے رہائی حاصل کرنے کی خواہش پیدا کرے گا اور اس بنیاد پر ہم نجات کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں گے۔ لیکن اگر دنیا کے متعلق ہمارا تصور چراگاہ اور دارالعذاب دونوں سے برتر ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے ہم اپنے آپ کو حیوان اور مجرم دونوں سے ارفع و اعلیٰ سمجھتے ہوں تو ہمارے نفس کو مادی لذات کی طلب اور نجات کے حصول دونوں

Marfat.com

سے زیادہ بلند نصب العین کی تلاش ہوگی اور کسی پست اور ادنیٰ مطمح نظر پر ہماری نگاہ نہ ٹھیرے گی۔

اس قاعدے کو پیش نظر رکھ کر جب آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین پر اس کا نائب قرار دیا ہے تو اس تصور حیات سے جو نصب العین فطری طور پر پیدا ہوسکتا ہے اور ہونا چاہیے اس تک آپ کی عقل خود بہ خود پہنچ جائے گی۔ ایک نائب کا بہ حیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظر میں ایک اچھا، وفادار اور فرض شناس نائب قرار پائے؟ پس اسلام کے مطابق انسان کا نصب العین صرف رضائے الہٰی کا حصول ہے۔ یہ وہ نصب العین ہے جو اس تصور حیات سے خود عقل اور فطرت پیدا کرتی ہے۔ قرآن مجید کے ارشادات کا مطالعہ کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ طرح طرح سے اسی ایک مقصد کو ذہن نشین کرانے اور قلب و روح میں بٹھا دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور اس کے سوا دوسرے ہر مطمح نظر کو پورے زور کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ فرمایا کہ

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْکَ لَہٗ ۚ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

اے پیغمبر کہ دو! کہ میری نماز اور میری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اس کے آگے سر جھکانے والا ہوں۔ (الانعام - ۲۰)

سورۂ فتح میں مسلمانوں کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دوستی اور دشمنی اور جن کا رکوع و سجود سب کچھ اللہ کے لیے ہے۔

سورۂ محمد (صلعم) میں کافروں کے اعمال ضائع ہونے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ خدا کے لیے کچھ نہیں کرتے بلکہ دوسری اغراض کے لیے عمل کرکے خدا کی ناخوشی مول لیتے ہیں۔ سورۂ حج میں ایسی عبادت کو جو دنیوی فوائد کی خاطر ہو قطعاً بےکار اور موجب نامرادی قرار دیا گیا ہے۔ جناں چہ ارشاد ہوا:

'اور لوگوں میں سے ایک وہ ہے جو اللہ کی عبادت اکھڑے دل سے کرتا ہے۔ اگر اس کو کوئی فائدہ پہنچ گیا تو اس سے مطمئن ہوگیا اور اگر آزمائش کا وقت آگیا تو الٹا پھر گیا۔ ایسا

Marfat.com

شخص دنیا اور آخرت دونوں میں نامراد ہوا - اور یہی صریح
گھاٹا ہے -' (الحج، رکوع - ۲)

اس تمام تعلیم کو رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حکیمانہ جملے میں یوں ادا کیا ہے کہ '' اللہ صرف وہی عمل قبول کرتا ہے جو خالصتاً اس کے لیے کیا جائے اور جس سے محض اسی کی رضا جوئی مقصود ہو -'' یہیں سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ انسان کی زندگی کا اصل نصب العین رضائے الٰہی کا حصول ہے -

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلامی نصب العین میں وہ کون سی خصوصیات ہیں جو اسے بہترین نصب العین بناتی ہیں -

اسلامی نصب العین کی خصوصیات

اولاً: رضائے الٰہی کا حصول ایک ایسا نصب العین ہے جو طبیعی اور عقلی مقاصد کو ہم آہنگ کرتا ہے - اسلامی نظریے کائنات کے مطابق کائنات کی ہر شے طوعاً و کرہاً خدا ہی کی تابع فرمان ہے اور اسی کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق حرکت کرتی ہے - اس عالم گیر، ناقابل تغیر اور ناآشنائے استثنا قانون میں تمام کائنات کی طرح خود انسان بھی جکڑا ہوا ہے - اس کی طبیعت و فطرت بھی اسی خدا کی مطیع و فرمانبردار ہے - اب انسان کے لیے بہ حیثیت ایک عقلی وجود کے صرف اتنی کسر رہ جاتی ہے کہ وہ اپنے اس طبیعی نصب العین کا شعور بھی حاصل کرلے اور عقل و فکر کے ساتھ اس کو سمجھ کر اپنے ارادوں اور اپنی نیتوں اور اپنی سعی و عمل کا رخ بھی اسی طرف پھیر دے - اس صورت میں اس کا عقلی نصب العین اس کے اور تمام موجودات کے طبیعی نصب العین سے ہم آہنگ ہو جائے گا اور جہان ہستی کے سارے لشکر اور نظام وجود کے سب کل پرزے اس مقصد تک پہنچنے میں اس کا ساتھ دیں گے - وہ عقلی مرتبہ کے لحاظ سے اس عظیم الشان قافلے کا سالار ہوگا -

دوسرے، جب انسان کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول قرار پاتا ہے تو ہر عمل اسی کی خاطر انجام دیا جاتا ہے اور اس طرح پوری زندگی میں مرکزیت اور یک رنگی پیدا ہوتی ہے - پھر چوں کہ ہر فرد کا نصب العین اسی ایک خدا کی خوشنودی ہے، اس لیے معاشرتی زندگی میں بھی مرکزیت اور یکسوئی پیدا ہوتی

Marfat.com

ہے۔ چناں چہ اسلامی نظام زندگی میں جو کچھ بھی ہے، خواہ وہ نیت واعتقاد کے کے قبیل سے ہو یا پرستش و عبادت کے قبیل سے، یا دنیوی معاملات میں سے، بہ ہر کیف اس کا رخ اسی مرکز کی جانب پھرا ہوا ہے۔ گویا ایک مکمل ومتوازن نظام شمسی ہے جس میں کسی قسم کا تضاد یا بے ترتیبی نہیں۔

تیسرے، جس طرح یہ نصب العین ایک فرد کا نصب العین بن سکتا ہے اسی طرح ایک جماعت، ایک قوم، بلکہ نوع بشری کا نصب العین بھی بن سکتا ہے۔ اس میں سرے سے نفسانیت اور انفرادی یا اجتماعی خود غرضی کا وہ عنصر ہی موجود نہیں ہے جس کی طبیعی خاصیت یہ ہے کہ انسانیت کو نسلوں اور قوموں میں اور پھر افراد و اشخاص میں تقسیم کرتا ہے اور ان کے اندر ایک دوسرے کے خلاف مقابلے و مزاحمت اور بغض و حسد کے جذبات ابھارتا ہے۔ برعکس اس کے یہ نصب العین انسان کو اس ہستی کی طرف متوجہ کرتا ہے جس کے ساتھ تمام نوع بشری، بلکہ تمام کائنات کا تعلق یکساں ہے اور جس کی طرف متوجہ ہو جانے کے بعد ہر جہت اور ہر حیثیت سے انسانی مقاصد میں ایسا اتحاد و اشتراک پیدا ہو جاتا ہے کہ لوگوں میں مقابلہ مسابقت تو درکنار تعاون اور موالات، اخوت اور بھائی چارہ کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

چوتھے، اس نصب العین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے انسان کے جتنے مقاصد ہو سکتے ہیں وہ سب اس کے حصول کے ساتھ ساتھ حاصل ہو جاتے ہیں، بغیر اس کے کہ انسان انہیں بالذات مقصود بنائے۔ قرآن مجید ایک ایک کرکے ان سب چیزوں کو گناتا ہے جو رضائے الٰہی کے حصول کے ساتھ لازماً حاصل ہوتی ہیں۔

دنیوی زندگی میں انسان سب سے زیادہ جس چیز کا خواہش مند ہوتا ہے وہ امن و سکون، راحت اور اطمینان قلب ہے۔ قرآن کہتا ہے 'خدا کی طرف رجوع کرو اور اس کی خوشنودی کے طالب ہو جاؤ، یہ چیز تم کو آپ سے آپ مل جائے گی۔' سورۂ رعد میں ہے کہ "آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔"

دوسری چیز جو انسان دنیا میں حاصل کرنا چاہتا ہے وہ خوشحالی ہے یعنی ایسی زندگی جو پریشانی اور پراگندہ خاطری سے خالی ہو۔ قرآن کہتا ہے

Marfat.com

خدا پر ایمان لانے اور اس کے غضب سے بچنے اور اس کی خاطر پرہیز گاری اور نیکو کاری اختیار کرنے سے یہ چیز بھی باحسن وجوہ حاصل ہوتی ہے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل ہوں یا دور اول کے مسلمان یا کوئی اور قوم، جب کبھی انہوں نے ایمان کے ساتھ نیک اعمال کیے دنیوی نعمتوں کے دروازے ان پر بند نہ رہے ۔

تیسری چیز حکومت و فرماں روائی اور غلبہ و سربلندی ہے جو انسان کو بڑی مطلوب و مرغوب ہے ۔ قرآن کہتا ہے تم خدا کے ہو جاؤ یہ متاع خود تمہارے قدموں میں آ رہے گی ۔

> "جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور ایمان لانے والوں کا دوست ہو گیا (وہ اللہ کی جماعت میں شامل ہو گیا) اور اللہ کی جماعت ہی غالب ہونے والی ہے ۔" (المائدۃ ۔ ۸)

تاریخ گواہ ہے کہ دنیوی نعمتوں کے ساتھ ساتھ سیاسی غلبہ اور سربلندی بھی ان قوموں کو یقیناً عطا کی گئی جو ایمان کے ساتھ عمل صالح کرکے حزب اللہ میں شامل ہو گئیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں نے جتنی چیزیں مقصود سمجھیں اسلام نے ان کی طرف توجہ بھی نہیں دی ۔ بلکہ اس چیز کو مطلوب و مقصود قرار دیا جس کے حصول سے یہ سب چیزیں خود بخود حاصل ہو جاتی ہیں اور ہوئیں ۔ دوسرے جن چیزوں کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں مسلمان کی نگاہ میں وہ اس قابل ہی نہیں کہ وہ ان کی طلب میں اپنے قلب کو ایک لمحے کے لیے بھی الجھنے دے ۔ اس کے پیش نظر تو ایک ایسا نصب العین ہے جو ان سب سے اور جہان ہستی کی ہر چیز سے اعلیٰ و ارفع ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ جب اس بلند ترین مقصود کو پہنچ جائے گا تو اس کے تحت جتنی چیزیں ہیں وہ اس کو آپ سے آپ حاصل ہو جائیں گی ۔ بالکل اسی طرح جس طرح عمارت کی سب سے اونچی منزل پر پہنچنے والا بیچ کی تمام منازل کو اپنے قدموں کے نیچے پاتا ہے ۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا ابوالحسن علی ندوی، **مذہب اور تمدن** ۔ ادارہ نشریات اسلام، رحیم یار خان ۔
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** ۔ اسلامک پبلیکیشنز، لاہور ۔
مظہرالدین صدیقی، **مذہب کا انقلابی تصور** ۔ لاہور ۔

Marfat.com

۸

اسلامی نظریہ حیات کی بنیادی خصوصیات*

نظریۂ حیات سے مراد ایک ایسا مکمل ضابطہ ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں فکر و عمل کی رہنمائی کا کام کر سکے۔ مذاہب عالم کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر مذاہب (اپنی موجودہ شکل میں) انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی نہیں ہیں۔ ان میں سے اکثر صرف انفرادی زندگی کے معاملات میں کوئی ضابطہ فراہم کرتے ہیں اور یا تو اجتماعی زندگی سے علیحدگی اور بے تعلقی پر ابھارتے ہیں (مثلاً بدھ مت) یا پھر انسان کو صرف اخلاقی ہدایات دے کر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ اجتماعی زندگی میں جہاں سے چاہے ہدایت حاصل کرے یا محض اپنے نفس کا پیرو ہو کر رہ جائے۔

عملاً دیکھیے تو پہلی صورت ناممکن العمل ہے۔ تھوڑے بہت لوگ تو ہر زمانے میں مردم بےزاری اور گوشہ نشینی پر آمادہ ہو کر جنگلوں اور پہاڑوں میں تپسیا کے لیے نکل سکتے ہیں، لیکن آج تک انسانی تاریخ میں یہ کبھی نہیں ہوا کہ سب لوگ آبادیاں چھوڑ کر جنگل آباد کرلیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا کرنا مناسب بھی نہ ہوگا۔ اگر آج سارے انسان جنگلوں میں ریاضت کرتے ہوتے تو شاید انسان اور حیوان کا فرق ہی مٹ جاتا۔ انسانی تہذیب و تمدن، ایجادات، مصنوعات اور مسلسل تسخیرِ کائنات، یہ سب انسان کی اجتماعی زندگی کا نتیجہ ہیں۔

دوسری صورت اس سے بھی زیادہ خطرناک نتائج کی حامل ہے۔ اگر انسان کو محض شخصی زندگی کے لیے ضابطۂ حیات دیا جائے تو اسے اجتماعی زندگی

---

* یہ باب مرتب نے اس کتاب کے لیے خاص طور سے لکھا ہے۔

Marfat.com

کے لیے ضابطہ حیات کہیں اور سے حاصل کرنا ہوگا یا اپنی قوت فکر پر بھروسا کرنا پڑے گا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہدایت و رہنمائی کے ایک نہیں دو سرچشمے قرار پائیں گے۔ اور یہ عین ممکن ہے کہ دونوں دو مختلف سمتوں میں رہنمائی کرتے ہوں۔ بلکہ حقیقت یہی ہے کہ جب بھی انسان نے دو یا زیادہ مآخذ سے ہدایت حاصل کی ہے زندگی تناقضانہ تضاد کا شکار ہوگئی ہے اور اجتماعی فساد اور بگاڑ رونما ہوا ہے۔

در حقیقت انفرادی اور اجتماعی زندگی کی یہ تقسیم جو متعدد مذاہب میں ملتی ہے نہ صرف غلط ہے بلکہ انسانی نفسیات سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ انسانی زندگی ایک اکائی اور ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ دو مختلف مآخذ سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی انسان بہ یک وقت دو کشتیوں میں سوار ہوکر سفر کرنے کی کوشش کرے۔

یہ بات محض فرضی یا نظری نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں یہ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ بہ ظاہر اس کے پاس کوئی جامع نظریہ حیات موجود نہیں ہے۔ یہ مسئلہ یوں تو پوری دنیا کا ہے لیکن سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مغربی ممالک میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ عیسائیت افراد کی شخصی زندگی کے دائرے سے باہر کوئی رہنمائی فراہم نہیں کرتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معیشت، سیاست اور تمدن کے مسائل میں عیسائی ممالک کے باشندوں کو اپنی رہنمائی کے لیے دوسرے ذرائع کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مغرب کے بیشتر ممالک نے اپنی معاشی زندگی میں سرمایہ داری کے مسلک کو اپنا لیا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرے اور اس طرح سماج میں عزت حاصل کرلے۔ اس کے برخلاف عیسائی مذہب یہ کہتا ہے کہ "دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا۔"

صرف مغرب ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں انسانی سماج میں کم و بیش اسی قسم کے تضاد موجود ہیں۔ یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ اس تضاد کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا۔ جدید ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ مغربی دنیا میں جنون اور دوسرے ذہنی امراض کی کثرت کا سب سے بڑا سبب وہ تضاد ہے جو مغربی معاشرے میں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اب اگر کوئی جامع اور

Marfat.com

مکمل نظریۂ حیات موجود ہو تو وہ زندگی کے تمام شعبوں کو اپنے تحت لے کر اور ان کے تضاد رفع کرکے ان میں ہم آہنگی پیدا کرسکتا ہے ۔

اشتراکیت کو پہلی نظر میں ایک حد تک جامع نظام حیات کہا جا سکتا ہے ، لیکن نہ وہ انسانیت کو روحانی تسکین دے سکتی ہے اور نہ دنیوی نقطۂ نظر ہی سے انسانی زندگی میں سکون و مسرت کی ضامن بن سکتی ہے۔ زمانے کے تقاضوں کا جواب بس اسلام دے سکتا ہے ۔

ہم اس باب میں اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کریں گے ۔

اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیات

۱ ۔ الہامی نظام حیات

اسلامی نظریۂ حیات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا نظام حیات پیش کرتا ہے جو محض عقلِ انسانی کی کوششوں کا نتیجہ نہیں بلکہ ربّانی ہدایت پر مبنی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کمیونزم ، نازی ازم وغیرہ سے مختلف ہے ، کیوں کہ یہ سارے نظام ہائے زندگی انسانی فکر کے نتائج ہیں۔ ان میں سے بعض انسانی مسائل کے حل کرنے کی یقیناً بڑی مخلصانہ کوششیں ہیں، لیکن انسانی ذہن اس درجہ احوال و ظروف کی قیود میں گرفتار ہے کہ ماضی یا مستقبل کے لیے اپنے ماحول سے بلند تر ہوکر سوچ ہی نہیں سکتا۔ انسانی ذہن کی اسی کمزوری کی وجہ سے یہ سارے نظام ہائے حیات جزوی اور وقتی مساعی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے ۔ ان کے برخلاف اسلام کسی انسان کے ذہن کی تخلیق نہیں بلکہ اسی خالق کی طرف سے آیا ہوا نظامِ حیات ہے جس نے زمین و آسمان اور خود انسان کو پیدا کیا ہے اور جو ماضی ، حال اور مستقبل سے بہ خوبی واقف ہے ۔

یہ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ اس کا ایک خالق ہے جس نے انسان کو یہاں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے ۔ اس نے جہاں انسان کی مادی اور جسمانی ضروریات کی تکمیل کا سامان کیا ہے وہیں اس کی روحانی ، اخلاقی اور تمدنی ضروریات کی تکمیل کا بھی پورا خیال رکھا ہے ۔ اسی مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے بار بار انبیا و رُسل بھیجے کہ وہ الہامی ہدایت کی روشنی میں انسانوں کو صحیح راستہ دکھائیں۔ قرآن میں اس کو اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان

Marfat.com

کہا گیا ہے :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

اللہ تعالیٰ نے مومنین پر احسان کیا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیا جو انہیں آیات پڑھ کر سناتا ہے ، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۔ (آل عمران ۔ ۱۶۴)

پیغمبر کا کام ایک طرف تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب لوگوں تک پہنچائیں اور دوسری طرف یہ کہ وہ خود ان تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپنا کر لوگوں کے سامنے اس کا نمونہ پیش کریں ۔ اسی لیے اسلامی نظام حیات کے اولین ماخذ دو ہیں ایک قرآن ، اور دوسرا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ قرآن ہمارے پاس کتاب کی شکل میں موجود ہے اور سنت کو ہم قرآن ، تواتر[1] ، احادیث ، اور عمل ِ صحابہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہیں ۔

اسلامی نظریہ حیات کی یہی خصوصیت اسے باقی تمام نظریات سے مختلف اور ممتاز کر دیتی ہے ۔ اس نظام میں کسی کے لیے اپنی طرف سے کسی بات کے بڑھانے گھٹانے کی گنجائش نہیں ۔ اس کے تمام بنیادی اصول غیر متبدل ہیں ، اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی ان اصولوں میں کوئی تغیر کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے ۔ لہذا اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اسلام وہ کچھ ہے جو مسلمان کرتے ہیں ، تو یہ بالکل غلط بات ہے ۔ اگر ساری دنیا کے مسلمان مل کر بھی کوئی ایسا کام کریں جس کا جواز قرآن یا سنت سے نہ ملتا ہو ، تو وہ عمل ، اسلامی نہ ہوگا ۔

الہامی ہدایت کا دعویٰ تو تمام مذاہب کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں اسلام کے سوا کسی الہامی مذہب کی تعلیمات محفوظ نہیں ، کچھ تو اس وجہ سے کہ وہ مذاہب اس زمانے کے ہیں جب تحریر کے ذریعے چیزیں محفوظ نہ ہوسکتی

۱۔ تواتر سے مراد یہ ہے کہ ہر زمانے میں اور ہر جگہ اتنے زیادہ لوگ کسی بات کو بیان کریں جن کے متعلق عقلاً اور عادتاً یہ گمان کرنا ممکن نہ ہو کہ انہوں نے جھوٹ پر اتفاق کر لیے ہوگا اور وہ بات ان کی آنکھوں دیکھی یا کانوں سنی ہو ۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی امت کا وہ عمل متواتر ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوا اور آج تک مسلمان اس پر عامل ہیں ، گویا وہ سنت جسے امت نے اپنے مسلسل اور غیر منقطع عمل میں محفوظ کرلیا ۔ اسلامی نظام زندگی کا ایک معتدبہ حصہ تواتر ہی کے ذریعے سے ہم تک پہنچا ہے ۔ اور اس ذریعے سے ملنے والی ہدایت ہر پہلو سے معتبر ہے ۔

Marfat.com

نہیں ، اور کچھ اس وجہ سے کہ بعد میں ان مذاہب کے پیروؤں نے ان میں بے شمار تبدیلیاں کر دیں اور اپنی من مانی چیزیں داخل کردیں ۔ ان میں سے کوئی مذہب اپنی اصل شکل میں محفوظ نہیں ، اس بنا پر در حقیقت اسلام موجودہ دنیا کا واحد الہامی مذہب ہے ۔

۲۔ ایک مکمل ضابطہ٫ زندگی

اس سے پہلے ہم اس بات پر اچھی طرح بحث کر چکے ہیں کہ اسلام کے علاوہ اکثر نظام ہائے زندگی انتہائی نا مکمل اور تشنہ ہیں اور پوری انسانی زندگی کا احاطہ نہیں کرتے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انہیں نظام ہائے زندگی یا نظریہ ہائے حیات کہنا درست نہیں ۔ ' نظریہ٫ حیات ' اور ' نظامِ زندگی ' کے نام کا مستحق صرف اسلام ہے ، لیکن بہ ہر حال کسی دوسرے بہتر لفظ کی عدم موجودگی میں ہم انہیں نظریہ ہائے حیات ہی کے نام سے پکارتے ہیں ۔

ان سارے نظریہ ہائے حیات کے مقابلے میں اسلام کی سب سے نمایاں اور امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زندگی کا نہایت منظم ضابطہ ہے ۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ، قومی ہو یا بین الاقوامی، معاشی ہو یا سیاسی ، معاشرتی ہو یا قانونی ، اسلام کی ہدایات سے محروم نہیں رہا ۔ اکثر اوقات یہ غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ مذہب انسان کا شخصی اور انفرادی معاملہ ہے ۔ دوسرے مذاہب کے بارے میں تو یہ بات صحیح ہوسکتی ہے لیکن اسلام ان معنوں میں مذہب نہیں ۔ قرآن میں اس کے لیے ' دین ' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے جس کے معنی ہیں مکمل ضابطہ٫ ہدایت اور اس اعتبار سے اسلام کو محض نماز روزہ تک محدود کر دینا صحیح نہیں ۔ اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھنے کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بہت سے اچھے بھلے لوگ جو نماز روزہ کے پابند ہیں اپنی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلام کے نفاذ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ قرآن نے کہا ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ

اے اہل ایمان ، اسلام میں پوری طرح داخل ہو جاؤ
اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو (البقرہ ۔ ۲۰۸)

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک مسلمان کی زندگی کا ہر رخ خدا کی مرضی کے مطابق متعین ہوتا ہے اور وہ اپنی زندگی کے ہر دائرے میں ، اپنے سارے افعال و اعمال

Marfat.com

میں اور اپنے کل معاملات و تعلقات میں خدا کی ہدایت کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی کو شیطان کی پیروی قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ شیطان ابتداً خدا کا پرستار تھا لیکن جب اسے ایک ایسا حکم دیا گیا جو اس کے نفس پر گراں گذرا (یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا) تو اس نے انکار کر دیا اور گمراہی کا شکار ہوا۔

۳۔ ایمان اور نفس کی اصلاح

اسلامی نظریۂ حیات کی تیسری خصوصیت ایمان ہے، ایمان خدا پر، اس کے رسولوں پر اور زندگی بعد موت پر۔ یہی ایمان اس کی فکری اور فلسفیانا بنیاد ہے۔

در حقیقت انسان اپنے شعور ہی کی بنا پر جمادات و نباتات اور حیوانات سے ممیز ہے، درختوں کے نشو و ارتقا کا ایک راستہ متعین ہے اور وہ اس سے سرمو بھی نہیں ہٹ سکتے، دریاؤں کے بہنے کا ایک قانون متعین ہے اور وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ حیوانات اپنی جبلتوں کے تابع ہیں، لیکن ان سب کے برخلاف انسان کو شعور اور ارادہ کی دولت سے نوازا گیا ہے۔

اسلامی نظریۂ حیات انسان کے اس شعور اور آزادی کے اعتراف پر مبنی ہے۔ اس لیے اس کا نقطۂ آغاز ایمان ہے۔ ایمان سے مراد فکر و نظر اور دل و دماغ کی تبدیلی ہے تاکہ انسان کا زاویہ نگاہ اور سوچنے کا انداز بدل جائے اور وہ اپنی پوری زندگی کو خدا کی اطاعت کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے سرگرم ہو جائے۔

خدا کی ہدایت سے ہٹ کر جتنے بھی فلسفے وضع کیے گئے ہیں ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی میں محض خارج کی تبدیلی سے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور انسان کے اندرون سے تعرض نہیں کرتے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے فساد خون کا تو علاج نہ کیا جائے اور پھوڑے پھنسیوں پر پھائے لگا کر مرض دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کے برخلاف اسلام بنیاد کی تعمیر پر زیادہ زور دیتا ہے۔ وہ دل و دماغ سے غیر اللہ کی عقیدت و محبت ختم کر کے ایمان کو خدا کے لیے خالص کر لیتا ہے اور پھر جب ایمان پیدا ہوجاتا ہے اور سوچنے کا انداز اور فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں تو انسان کی پوری شخصیت بدل جاتی ہے۔

جان چو دیگر شد جہاں دیگر شود

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ تاریخِ عالم میں سب سے بڑا انقلاب وہ تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ایمان کی بنیاد پر برپا ہوا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانوں کو ایک نیا ایمان دیا تھا اور پھر یہ ایمان ہی کی انقلابی قوت تھی جس نے زندگی کے ہر شعبے کی ماہیت بدل کر رکھ دی۔ کسی جبر و استبداد کی ضرورت باقی نہ رہی، ہر انسان خود اپنا نگراں بن گیا۔ خلوت ہو یا جلوت، دن ہو یا رات، ہر انسان خود اپنا محاسب ہوگیا۔ اسی ایمان کا کرشمہ تھا کہ ہمیں ایک انسان ایسا بھی نظر آتا ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں خود آتا ہے اور کہتا ہے "یا رسول اللہ، میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں۔ مجھ پر حد جاری کیجیے۔" یہ اسی ایمان کا ثمرہ تھا کہ ایک شخص کو کسریٰ کا تاج ملتا ہے اور وہ اسے گدڑی میں چھپا کر لاتا ہے اور بیت المال میں جمع کرا دیتا ہے۔ اور یہ بھی اسی ایمان ہی کا معجزہ تھا کہ جب امتناع شراب کا حکم کانوں میں پہنچتا ہے تو اسی عرب قوم کے افراد جن کی گھٹی میں شراب پڑی ہوئی تھی، فوراً شراب پھینک دیتے ہیں اور مدینے کی نالیوں میں شراب اس طرح بہنے لگتی ہے جیسے پانی۔ جو جام ہاتھوں میں اٹھے تھے نیچے گر جاتے ہیں اور جو قطرے ہونٹوں پر تھے وہ بھی حلق سے نیچے نہیں اترتے۔ یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ محض خارجی ماحول اور تہذیب و تمدن کے نظام ہی کو نہیں بدلتا بلکہ دلوں میں خدا، رسول اور آخرت پر ایمان جا گزیں کرکے دل کو بدلتا ہے تاکہ انسان کی پوری زندگی بدل جائے اور خود اپنے اندر کے تقاضے کے تحت انسان ایک نئی دنیا تعمیر کرے۔

۴۔ دین و دنیا کی وحدت

اسلامی نظریۂ حیات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس نے دین و دنیا کی اس مصنوعی علیحدگی کو ختم کر دیا جو مختلف مذاہب میں رائج ہے۔ اکثر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدائی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دنیوی علائق سے کنارہ کشی اختیار کرے۔ اکثر مذاہب میں ترکِ دنیا کی تعلیم ملتی ہے۔ لیکن اسلام میں ترک دنیا کی بڑی شدت سے مخالفت کی گئی ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے:

لا رھبانیة فی الاسلام — اسلام میں ترک دنیا کا کوئی مقام نہیں۔

Marfat.com

نہ صرف یہ کہ اسلام میں ترک دنیا کی ممانعت ہے بلکہ ان اعمال کو جنہیں عام طور پر دنیاوی اور مادی سمجھا جاتا ہے ، مثلاً اکتساب رزق اور فکر عیال ، اسلام نے باعث اجر و ثواب بتایا ہے ، ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ ''جو شخص والدین کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو اهل و عیال کے لیے محنت کرتا ہے وہ بھی اللہ کے لیے کام کرتا ہے اور جو اپنی ذات کو فقر و فاقہ سے بچانے کے لیے کام کرتا ہے وہ بھی اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے۔'' جو کام اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی راہ میں کیا جائے ' عبادت ' ہے لہذا طلب رزق اور پرورش عیال بھی اپنے وسیع مفہوم میں عبادت ہیں ، ان میں مصروف ہونا باعث اجر اور ان سے غفلت برتنا باعث عذاب ہے۔

اپنی دنیاوی بہتری سے غفلت برتنا اور یہ سمجھنا کہ اس طرح انسان اپنی آخرت سنوار رہا ہے ، غلط ہے۔ جن مذاهب نے یہ تعلیم دی ہے ان کے بارے میں صحیح کہا گیا ہے کہ وہ مذاهب عوام کی افیون ہیں۔ اسلام نے اس کے برخلاف حکم دیا ہے کہ

وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

اور دنیا سے اپنا حصہ لینا نظر
انداز نہ کرو (نہ بھولو)
(القصص۔ ۷۷)

اسلام یہ بتاتا ہے کہ دنیوی زندگی اور اخروی زندگی دونوں کی اصلاح ضروری ہے ، ان میں سے کسی کو بھی ترک نہیں کیا جا سکتا اور ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو جو دعا سکھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور
آخرت میں بھی بہترین اجر دے اور ہمیں آگ کے
عذاب سے بچا۔ (البقرہ۔ ۲۰۱)

اسلام نے جو ہمہ گیر نظام زندگی پیش کیا ہے وہ انسان کی دنیاوی فلاح کا بھی اتنا ہی ضامن ہے جتنا آخروی فلاح کا۔ اگر انسان اس دنیاوی زندگی کو

Marfat.com

الہامی ہدایت کے تحت گذارے تو دنیاوی زندگی کا یہ سنوار آخروی زندگی کے سنوار کا راستہ ثابت ہوگا ۔

۵ ۔ انفرادیت یا اجتماعیت

اسلام کی ایک اور اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان بڑا توازن قایم رکھتا ہے ۔ وہ ہر انسان کو فرداً فرداً ذمہ دار ٹھیرا کر خدا کے سامنے مسئول بناتا ہے ، ان کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے ، ان کی شخصیت کے نشو و نما کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اس خیال کی شدت سے مخالفت کرتا ہے کہ افراد کی شخصیت ، اجتماعیت یا ریاست میں گم ہو جانی چاہیے ۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

اور جس نے ذرہ برابر بھی نیکی کی تو وہ اسے اپنی نگاھوں کے سامنے پائے گا اور جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی تو وہ اسے بھی دیکھے گا ۔ (سورہ الزلزال)

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اس کے لیے (فائدہ مند) وہ ہے جو
اس نے کمایا ہے اور وہ (اسی گناہ
کا بوجھ) برداشت کرے گا جس کا
خود اکتساب کیا ہوگا (البقرہ۔ ۲۸۶)

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اسلام ، افراد میں اجتماعی ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے ، افراد کو ریاست اور سماج کی شکل میں منظم کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے کہ وہ معاشرے کی بھلائی کے لیے کام کریں ۔ رھبانیت یا معاشرے سے الگ تھلگ رہنے کو اسلام نے پسند نہیں کیا ۔ نماز کے لیے حکم دیا گیا ہے کہ با جماعت ہو تاکہ مسلمانوں میں سماجی تنظیم (ڈسپلن) پیدا ہو سکے ۔ مالداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ زکواۃ ادا کریں اور قرآن میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کی دولت میں فقراء اور مساکین کا بھی حصہ ہوتا ہے (۱۹ : ۶۱) ۔ مسلمانوں پر فریضۂ جہاد عائد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر افراد سے اسلام اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے جان کی قربانی بھی طلب کی جا سکتی ہے ۔

Marfat.com

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ
تم میں سے ہر ایک چرواہے (کی مانند ہے) اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی۔

ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا کہ "مل جل کر رہو، ایک دوسرے سے مت کٹو، دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات پیدا نہ کرو۔" ایک اور حدیث میں تہدید کی گئی کہ "وہ مسلمان نہیں جو اپنا تو پیٹ بھرلے، لیکن اس کا پڑوسی بھوکا رہ جائے۔"

مختصراً اسلام نہ تو فرد کو نظرانداز کرتا ہے اور نہ سماج کو، وہ ان دونوں میں توازن اور تناسب قایم کرکے ہر ایک کو اس کا حق دلواتا ہے۔

۶۔ مکمل توازن

اوپر کے صفحات میں اسلامی نظریہ حیات کی جن خصوصیات کا ہم نے تذکرہ کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس نظریے کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ اس میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کے درمیان ایک حسین توازن پایا جاتا ہے۔ تاریخ کے طالب علم اس بات سے واقف ہیں کہ دنیا میں مفکر، فلسفی اور مصلح تو ہزاروں لاکھوں ہوئے ہیں لیکن ان کی تعلیمات میں یک رخا پن ہے۔ کسی نے روحانی پہلو پر زور دیا ہے تو مادی پہلو کو نظر انداز کر دیا اور کسی نے مادی پہلو پر توجہ صرف کی ہے تو اخلاقی پہلو کو چھوڑ دیا۔ کسی نے معاشیات کو زندگی کی اساس قرار دیا ہے اور کسی نے نفسیات اور جنس کو۔ کسی نے دنیا کے ترک کی تعلیم دی ہے اور کسی نے دنیا میں کھو جانے کی۔ غرض انسان جس چیز میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے وہ حقیقی توازن کا قیام ہے۔

نظری حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو توازن کا مسئلہ ہے بھی بڑا نازک اور پیچیدہ۔ انسان میں اتنی جبلتیں اور محرکات کارفرما ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اس طرح متصادم اور متناقض ہیں کہ وہ ان کے درمیان حقیقی توازن قایم نہیں کرسکتا۔ وحی کی ضرورت خصوصیت سے اس لیے ہے کہ اس کے ذریعہ وہ حدود معلوم ہو جاتی ہیں جن کی بنا پر زندگی کے تمام شعبوں اور اس کے متضاد مطالبوں کے درمیان توازن اور توافق قایم ہوسکتا ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے۔ اور ان کے ساتھ کتاب (قانون حیات) اور میزان (عدل) نازل کیا تاکہ لوگ انصاف پر قایم رہیں۔ (الحدید - ۲۵)

"قسط" دراصل انصاف اور توازن کو کہتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں عدل و توازن صرف الہامی ہدایت ہی کے ذریعے سے قایم ہوسکتا ہے۔ اسلام نے دین اور دنیا کے درمیان توازن قایم کیا ہے اور کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "میں تو سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، عائلی زندگی بھی گزارتا ہوں، پس اللہ سے ڈرو۔ تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، تمہاری آنکھوں کا تم پر حق ہے، تمہارے اہل و عیال کا تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ ہر حق اس کے حق دار کو ادا کرو (میری ہدایت یہ ہے کہ) روزہ بھی رکھو، افطار بھی کرو، نماز بھی پڑھا کرو اور سویا بھی کرو۔"

اس طرح اسلام نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے درمیان حسین ترین توازن قایم کیا اور ایک طرف فرد کی شخصیت کے نشو و ارتقا کا پورا سامان کیا تو دوسری طرف اسے اجتماعی ذمہ داری کے ایک نظام میں منظم کر دیا، زندگی کے سارے شعبوں کے متعلق مفصل ہدایات دے کر ان تمام شعبوں اور گوشوں کے درمیان اعتدال اور توازن قایم کر دیا۔ اسلام نے وسائل کے استعمال میں کنجوسی اور اسراف دونوں کی ممانعت کر کے معاشی زندگی میں اعتدال کی روش کی تلقین کی۔ اور پوری زندگی کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی کہ

خیر الامور اوسطها — ہر ایک کام میں اوسط اور درمیانہ درجہ بہت ہی اچھا ہے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مزید فرمایا کہ اعتدال نبوت کا ایک حصہ ہے۔ یہ امتیاز صرف اسلامی نظریے کو حاصل ہے کہ اس نے زندگی کے تقاضوں کو پورا کیا اور ان میں اعتدال اور توازن قایم کیا تاکہ انسانی زندگی اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ ترقی کر سکے اور کہیں بھی اس میں یک رخاپن اور بے اعتدالی نہ پیدا ہو۔

Marfat.com

۷۔ سادہ اور عقلی مذہب

اسلام ان مذاہب میں سے ہے جن میں صنمیات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اس کی تعلیمات سادہ اور قابل عمل ہیں۔ توحید، رسالت اور زندگی بعد موت اس کے بنیادی عقائد ہیں اور عقل و وجدان دونوں ان کی تائید میں ہیں۔ اسلام میں پیشہ ور پادریوں کا کوئی گروہ نہیں ہے، اس کی رسوم و عبادات اس درجہ سادہ اور قابل فہم ہیں کہ انہیں ہر شخص سر انجام دے سکتا ہے۔ خدا اور اس کے بندے کے درمیان کسی واسطے کی ضرورت نہیں، ہر شخص خدا کی کتاب سے براہ راست استفادہ کرکے یہ جان سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کن باتوں کا مطالبہ کیا ہے۔

اسلام اندھی بہری اطاعت کا مطالبہ نہیں کرتا۔ قرآن میں لوگوں کو بار بار اس بات پر ابھارا گیا ہے کہ وہ تفکر اور تعقل کی قوتوں کو استعمال کریں۔ مسلمانوں سے کہا گیا ہے کہ خدا سے دعا کریں "رب زدنی علماً" (اے اللہ، میرا علم وسیع کر)۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ "وہ لوگ جو عقل سے کام نہیں لیتے جانوروں سے بدتر ہیں" (۹:۳۴)۔ آنحضرت صلعم نے حصول علم کی بڑی تاکید کی ہے۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ "ہر مسلمان پر حصول علم فرض ہے" اور یہ کہ "جو شخص حصول علم کی خاطر گھر سے نکلتا ہے خدا کی راہ میں چلتا ہے۔" انہی تعلیمات کا نتیجہ تھا کہ عرب جو حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل جاہل اور وحشی تھے، دیکھتے ہی دیکھتے علم اور تہذیب کے علم بردار بن گئے۔ ان علوم میں بے شمار وہ ہیں جو محض کتاب اللہ کے رہین منت ہیں، مثال کے طور پر قرآن کی تفسیر کے ساتھ ساتھ علم لغت اور بلاغت اور اعجاز القرآن پیدا ہوا۔ قرآن میں جن مقامات کا ذکر ہوا ہے ان کی تفتیش کے سلسلے میں علم جغرافیہ کو ترقی ہوئی۔ قرآن میں بے شمار تاریخی واقعات کا ذکر ہے، جن کی تحقیق کی وجہ سے علم تاریخ کا چرچا ہوا۔ اسی طرح منطق، بلاغت، فقہ وغیرہ کے علوم کو بڑی ترقی ہوئی۔ غرض، دیکھتے ہی دیکھتے مسلمانوں نے قرآن سے فیض حاصل کرتے ہوئے علوم و فنون کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا اور سب سے بڑھ کر دنیا کو استقرائی طریقے سے روشناس کیا، یہی وجہ ہے کہ اس دور میں جسے یورپ کی تاریخ میں تاریک دور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے علم و تہذیب

Marfat.com

کی شمعیں صرف مسلمانوں کی وجہ سے روشن رہیں ۔[1]

۸ ۔ ثبات اور تغیر

اسلام کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ثبات اور تغیر کے درمیان کامل توازن قایم کیا گیا ہے ۔ انسانوں نے آج تک بے شمار فلسفے وضع کیے ہیں لیکن کوئی فلسفہ بھی ایسا نظام فکر و عمل پیش نہ کر سکا جو ایسے اصول معاشرت پیش کرے جو دائمی اور ابدی ہوں اور دوسری طرف انسانی معاشرے کی بدلتی ہوئی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہوں ۔ انسان کے لیے محض اپنی فکر اور تجربے کی بنا پر ایسے اصول پیش کرنا ممکن بھی نہیں ؛ زمان و مکان کی جو مجبوریاں انسان کو لاحق ہیں ان کی بنا پر وہ اس کے لیے نا اہل ہے ۔ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی خصوصیت ہے کہ جہاں وہ ایک طرف زندگی کے ابدی اصول پیش کرتا ہے وہیں انسانی معاشرے میں جو فطری تغیرات آتے رہتے ہیں ان سے پیش آمدہ مسائل کا حل بھی فراہم کر دیتا ہے ۔

قرآن اور سنت کے دیے ہوئے اصول ابدی ہیں ، پوری انسانیت بھی متفقہ طور پر ان میں کوئی تبدیلی کرنا چاہے تو نہیں کر سکتی اس لیے کہ یہ ہدایت خالق کی طرف سے ہے :

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ

اللہ کی باتوں میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔ (یونس : ۶۴)

وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا

(الاحزاب ۶۲)

تم خدا کی سنت میں تبدیلی نہ پاؤ گے ۔ (الاحزاب : ۶۲)

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریۂ حیات ابدی صداقت کا حامل ہے اور اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات کا کیسے ساتھ دے ؟ اس کا جواب مختصراً یہ ہے :

(ا) اسلام نے وہ بنیادی اور اساسی اصول دیے ہیں جو ہر زمانے کے لیے ہیں اور چوں کہ وہ اصول انسانی فطرت کے مطابق ہیں لہذا جب تک خود انسانی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی ان اصولوں میں تبدیلی کا کوئی سوال نہیں ۔ اس دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ ضوابط کے ماتحت ہے اور

---

۱ ۔ ملاحظہ ہو ، رابرٹ بریفالٹ کی کتاب *The Making of Humanity* ۔ اس کتاب کا ترجمہ مجلس ترقی ادب لاہور نے " تشکیل انسانیت " کے نام سے شائع کیا ہے ۔

Marfat.com

تہذیبوں کے عروج و زوال اور ماہ و سال کی آمدورفت کے باوجود حیات انسانی کی بنیادی حقیقتیں ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو رہی ہے اور چوں کہ اسلام انہی بنیادی اصولوں کے مطابق ہے لہذا اس کے قوانین میں کسی تبدیلی کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ب) لیکن یہ اصول صرف انفرادی اور اجتماعی زندگی کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں اور ان اساسی اداروں کو قایم کرتے ہیں جن پر زمان و مکان کے تغیرات کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ رہیں وہ چیزیں جن کا تعلق وقت، موسم اور مقامی حالات وغیرہ سے ہے ان سے یہ تعرض نہیں کرتے، اور ہر زمانے کے لوگوں کو شریعت کی مجموعی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلات طے کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلام نے لباس میں ستر کا تعین کر دیا ہے، کفار کے لباس سے کھلی مشابہت کی ممانعت کر دی ہے، اسراف سے منع کیا ہے اور چند دیگر حدود مقرر کردی ہیں۔ اب ان حدود کی روشنی میں ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگ حسب پسند لباس اختیار کر سکتے ہیں۔ اسی طرح معاشرت، معیشت اور سیاست میں بھی بنیادی اصول اور اساسی ادارے قایم کرنے کے بعد شریعت مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے کہ پیش آنے والے مسائل کو اسلام کی مجموعی ہدایت کی روشنی میں اپنے اجتہاد سے طے کریں۔

(ج) اسلامی نظریہ حیات کی اصل دلچسپی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے ہے۔ قرآن انسان کی ہدایت کے لیے آیا ہے، طبیعیات و کیمیا کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں آیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظریہ حیات علوم طبیعی کے مسائل سے تعرض نہیں کرتا اور انہیں انسان کے تجربے اور مشاہدے پر چھوڑ دیتا ہے۔ جہاں کہیں اس قسم کا کوئی ذکر ہوا ہے وہ تذکیر اور موعظت کے لیے ہے نہ کہ کسی طبیعی اصول کو فی نفسہ بیان کرنے کے لیے۔ اسلامی نظریہ حیات کے اس طرز فکر نے مذہب اور سائنس کے درمیان اس قسم کے تصادم کے امکانات ہمیشہ کے لیے ختم کر دیے ہیں جو یورپ میں رونما ہوا تھا۔

مندرجہ بالا بحث سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں ثبات اور تغیر کے تقاضوں کو کس مناسبت اور خوبی سے پورا کیا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہ نظریہ حیات مرور ایام سے بالاتر ہے۔

Marfat.com

۹۔ اصلاحی اور انقلابی تحریک

اسلامی نظریۂ حیات محض ایک نظری اور فلسفیانہ نظام نہیں ہے جو اسلام قبول کرنے والوں کے صرف ذہنوں میں رہے بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تحریک بھی ہے جس کا مطالبہ یہ ہے کہ اسے دنیا میں رائج کیا جائے اور غلبہ اور اقتدار خدا کے دین کو حاصل ہو :

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ كُلِّهٖ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُوۡنَ

وہی (پاک ذات) ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام دیگر ادیان پر غلبہ عطا کرے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار کیوں نہ گذرے ۔ (الصف ۔ ۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے محض ایک پیغام پیش کردینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نظام کو قایم کرنے کے لیے، جس کے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) داعی تھے، مسلمانوں کو ایک اجتماعی زندگی میں منظم کیا، خود ان کی زندگیوں میں یہ دین قایم کیا اور ان پر یہ فریضہ عاید کیا کہ پوری دنیا میں اس دین کو قایم کریں ۔ امت مسلمہ کا یہی فریضہ ہے جسے قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا) کے نام سے موسوم کیا ہے :

كُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّةٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَتَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ ....

تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو ۔ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی نظریۂ حیات اپنے قیام کے لیے ایک نظام بھی ترتیب دیتا ہے اور اس طرح ایک ایسی اجتماعی ہیئت قایم کرتا ہے جو ایک طرف اس کے سماجی پروگرام کی تنفید کرے اور دوسری طرف پوری انسانیت کے سامنے اس کی دعوت کو پیش کرے ۔ اسلامی تحریک ایک تبلیغی اور تعلیمی ادارہ ہے اور جو ریاست اور نظم یہ قایم کرتا ہے وہ بھی اصلاً معلم اور داعی الی الحق کے فرائض انجام دیتا ہے ۔

اس طرح اسلام محض ایک مذہب نہیں بلکہ ایک اصلاحی اور انقلابی تحریک ہے جو نیکیوں کو قایم کرنے اور بدی کو روکنے کی جدوجہد کرتی ہے اور خدا کی زمین پر سے ظلم، ناجائز انتفاع، جبر و تشدد اور فحاشی و گمراہی کو

Marfat.com

مٹا کر گلشن حیات کو اچھائیوں سے بھر دیتی ہے اور ایک ایسا نظام قایم کرتی ہے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الفاظ میں ، زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی برکتیں برسانے لگتا ہے -

مزید مطالعے کے لیے

علامہ محمد اقبال، **حرف اقبال** - لاہور -

مولانا سید سلیمان ندوی ، **خطبات مدراس** - دارالمصنفین، اعظم گڈھ -

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، **انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر** - مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ -

خورشید احمد (مرتب)، **چراغ راہ** ، "نظریہ پاکستان نمبر" (حصہ اول) - مکتبہ چراغ راہ، یوسف منزل، ہرمزجی روڈ، کراچی -

Muhammad Asad, *Islam at the Crossroad*, Chapters I and II.

Marfat.com

۹

اسلام کے بنیادی عقائد

* انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں۔ یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہ عام خیالات درحقیقت اس کے چند پختہ غیر متزلزل اور غیر مشکوک اصولی خیالات پر مبنی ہوتے ہیں۔ انہی اصولی خیالات کو 'عقائد' کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہوتا ہے۔ ہمارے تمام افعال اور حرکات ہمارے ارادے کے تابع ہیں۔ ہمارے ارادے کے محرک ہمارے خیالات اور جذبات ہیں، اور ہمارے خیالات اور جذبات پر ہمارے اندرونی عقائد حکومت کرتے ہیں۔ عام بول چال میں انہی چیزوں کی تعبیر ہم "دل" یا "قلب" کے الفاظ سے کرتے ہیں۔ اسلام کے معلم نے بتایا کہ انسان کے تمام اعضا میں اس کا دل ہی نیکی اور بدی کا گھر ہے۔ فرمایا:

الاوان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا وھی القلب (بخاری)	انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا۔ ہاں! وہ ٹکڑا دل ہے۔

ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے اسی لیے

* یہ حصہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی کتاب "سیرت النبی"، جلد چہارم، سے ماخوذ ہے (مرتب)

Marfat.com

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انما الاعمال بالنیات (بخاری) تمام کاموں کا مدار نیت پر ہے۔

اسی بات کو دوسرے الفاظ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس طرح فرمایا:

ہر شخص کے کام کا ثمر وہی ہے جس کی وہ نیت کرے، تو جس کی ہجرت کی غرض دنیا کا حصول یا کسی عورت سے نکاح کرنا ہے تو اس کی ہجرت اسی کے لیے ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی (یعنی اس سے ثواب حاصل نہ ہوگا)۔ (بخاری)

آج کل علم نفسیات نے اس مسئلے کو بداہتاً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اور دماغی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادے پر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصولِ موضوعہ اور اصولِ متعارفہ کے مانے بغیر نہیں بن سکتی، اور نہ ثابت ہو سکتی ہے، اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح اور درست نہیں ہو سکتا جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے سے تسلیم نہ کرلیں۔

بہ ظاہر عقل ہمارے ہر کام کی رہنما نظر آتی ہے۔ لیکن ہماری عقل بھی آزاد نہیں، وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس لیے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعے ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پاسکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے ایمان کا ذکر ہمیشہ 'عملِ صالح' کے ذکر سے پہلے لازمی طور پر کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کیوں کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔

قرآن پاک نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا

Marfat.com

دوئی وجود نہیں رہتا ۔ اس طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہے ، بے بنیاد اور بے اصل ہیں:

مَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِرَبِّهِمْ أَعْمَالُهُمْ كَرَمَادٍ اشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيحُ فِي يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُونَ مِمَّا كَسَبُوا عَلَىٰ شَيْءٍ ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ

جنھوں نے اپنے پروردگار کا انکار کیا ان کے کاموں کی مثال راکھ کی ہے جس پر آندھی والے دن زور کی ہوا چلی ۔ وہ اپنے کاموں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہی سب سے بڑی گمراہی ہے ۔ (ابراہیم - ۱۸)

الغرض ایمان کے بغیر عمل کی بنیاد کسی بلند اور صحیح تخیل پر قایم نہیں ہو سکتی ۔ اسی لیے ریا ، نمائش اور خود غرضی کے کاموں کو کوئی عزت نہیں دی جا سکتی ۔ وہ کام جو گو بہ ظاہر نیک ہوں لیکن نیکی کرنے والے کا ان سے اصلی مقصد نام و نمود پیدا کرنا ہو تو اخلاقی نقطۂ نظر سے تمام دنیا ان کو بے وقعت اور ہیچ سمجھتی ہے ۔

اسلام میں عقیدہ کا مقام

پس ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے ، جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے اور ہماری سیرابی کا اصل سر چشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیوں کہ وہ دیکھنے میں تو کام کے معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں ۔ خدا کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی کا حصول ، ہمارے اعمال کی غرض و غایات ہیں ۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں ۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے ۔ وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک ہو جائے اور ہمارے تمام کاموں کی بنیاد ریا، نمائش، جاہ پسندی، خود غرضی اور شہرت طلبی وغیرہ کے دلی جذبات اور پست محرکات کے سوا کچھ اور نہ رہ جائے ۔

تورات میں عقیدوں کا ذکر ہے ۔ مگر ایمان کی حقیقت اور اس کی اہمیت کی تعلیم سے وہ خالی ہے ۔ انجیل میں ایمان کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے ۔ مگر اخلاق کی سچائی ، اعمال کی راستی اور دل کے اخلاص کے لیے نہیں ، بلکہ معجزوں اور کرامتوں کے ظاہر کرنے کے لیے اور خوارق عادت پر قدرت اور اختیار پانے کے لیے۔ اس کے برخلاف فلسفۂ یونان کے بہت سے پیرووں اور ہندوستان کے بہت سے

Marfat.com

مذہبوں نے محض ذہنی جولانی، مراقبہ، تصور، دھیان اور علم کو انسان کی نجات کا ذریعہ قرار دیا اور اخلاق و عمل سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ عیسائیوں، زرتشتیوں اور برہمنوں نے عقائد کو وسعت دی اور ان کی ایسی تفصیل کی کہ وہ سرتاپا خیالی فلسفہ بن گئے جس سے تصور عملیت پر غالب آگیا اور انسانوں کے قوائے عملی سرد ہو گئے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے علم و عمل، تصور و فعل، عقلیت اور عملیت کو ایک دوسرے کا نتیجہ اور باہم ناگزیر قرار دیا۔ مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر دیا۔ اور عقائد کے اتنے ہی حصے کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا، چند سیدھے سادے اصول، جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں، ان کا نام عقیدہ، اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان رکھا۔

اسلامی عقائد

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں عقائد کے پانچ اصول تلقین کیے۔ خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا اور سزا کے دن پر ایمان۔ یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے اقرار کرنا ضروری ہے۔ ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا۔

(۱) اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق و مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ اور مقصود قرار پا سکے اور اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو اور ہم جلوت ہی میں نہیں، خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں، اور نیکی کو اس لیے اختیار کریں اور برائی سے اس لیے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم ہے اور یہی اس کی مرضی ہے؛ اس طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے پاک و صاف ہو کر خالص ہو سکیں اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں، ہمارا دل بھی ناپاک

Marfat.com

خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو، اور اس کے احکام اور اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات اور ہماری گمراہ خواہشات بھی اس یقین میں شک اور تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

(۲) خدا کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے۔ اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکام الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے گی اور انسانوں کے سامنے نیکی اور معصومیت کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہ رہے گا جو انسانوں کے قوائے عملی کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا، جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے، کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہیں ہوگی۔

(۳) خدا کے فرشتوں پر بھی ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں، مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانون الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں، اور ہمارے اعمال و افعال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ نقل کرتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو اچھا یا برا بدلہ مل سکے

(۴) خدا کے احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعے انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں یا لفظ و آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں۔ اس لیے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسولوں کے اور خدا کے احکام اور ہدایتوں کو جاننے کا کوئی ذریعہ نہ رہے اور ہمارے لیے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، بادشاہ اور رعایا سب متفق ہوسکیں۔

(۵) اعمال کی بازپرس جواب دہی کا خطرہ نہ ہو، اور اس کے مطابق جزا و سزا کا خیال نہ ہو تو دنیاوی قوانین کے باوجود دنیا میں انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت و خلوت میں

Marfat.com

ان کی ذمہ داری محسوس کراتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ روز جزا اور یوم آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے - اسی لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس پر بے حد زور دیا ہے - بلکہ مکی وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تلقین اور تبلیغ پر مشتمل ہے -

یہی پانچ باتیں اسلام کے ایمانیات کے اصلی عناصر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ پر، اس کے تمام رسولوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے فرشتوں پر اور روز جزا پر ایمان لانا -

بنیادی ایمانیات ـــ عقل کی کسوٹی پر*

اوپر کے صفحات میں جن پانچ بنیادی عقائد کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب امور غیب کی قبیل سے ہیں اور عالم آب و گل سے ماورا - اس لیے یہ مذہبی و روحانی ایمانیات ہیں - لیکن ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اسلام نے ان پر اپنے روحانی نظام ہی کی نہیں بلکہ اخلاقی و سیاسی اور تمدنی نظام کی بنیاد بھی رکھی ہے - اس نے دین و دنیا دونوں کو ملا کر ایک ایسا نظام وضع کیا ہے جس کے تحت انسانی زندگی کے تمام شعبے حرکت کرتے ہیں - اس نظام کو اپنے قیام و بقا اور اپنے تصرفات کے لیے جتنی طاقت کی ضرورت ہے وہ سب انہی پانچوں ایمانیات سے حاصل ہوتی ہے - یہ اس کے لیے قوت کا ایک لامتناہی سرچشمہ ہیں جس کی رسد کبھی بند نہیں ہوتی -

اب ہم کو دیکھنا چاہیے کہ جن ایمانیات سے اتنا بڑا کام لیا گیا ہے وہ عقلی حیثیت سے کیا پایہ رکھتے ہیں؟ اور ان میں ایک ہمہ گیر اور ترقی پذیر نظام کے لیے اساس اور منبع قوت بننے کی صلاحیت کہاں تک موجود ہے؟

اس سوال کی تحقیق میں قدم آگے بڑھانے سے پہلے ہم کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھنا چاہتا ہے جو صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہو - یعنی اس کا تعلق کسی خاص ملک یا نسل کے لوگوں سے نہ ہو، نہ کوئی مخصوص رنگ رکھنے والی یا مخصوص زبان بولنے والی قوم اس کے ساتھ اختصاص رکھتی ہو، بلکہ تمام نوع انسانی کی فلاح اس کا

* یہ حصہ مولانا مودودی کی کتاب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" سے ماخوذ ہے - (مرتب)

Marfat.com

مقصود ہو ، اور اس کے زیر اثر ایک ایسا نظام اجتماعی قایم ہو سکے جس میں ہر اس چیز کو پروان چڑھایا جائے جو انسان کے لیے-بہ حیثیت انسان ہونے کے خیر و صلاح ہے اور ہر اس چیز کو مٹایا جائے جو اس کے لیے شر اور فساد ہے۔ ایک ایسی خالص انسانی تہذیب کی بنیاد ان ایمانیات پر نہیں رکھی جا سکتی جو محض عالم آب و گل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اس لیے کہ مادیات اور محسوسات دو حال سے خالی نہیں ہیں ۔ یا تو وہ ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں ہے، مثلاً سورج ، چاند ، زمین ، ہوا ، روشنی وغیرہ ، یا ایسے ہیں جن کے ساتھ تمام انسانوں کا تعلق یکساں نہیں ہے ، مثلاً وطن ، نسل ، رنگ ، زبان وغیرہ۔ پہلی قسم کی چیزوں میں تو ' ایمانیات ' بننے کی صلاحیت ہی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نفس وجود پر ایمان لانا تو محض بے معنی ہے اور ان پر اس حیثیت سے ایمان لانا کہ وہ انسان کی صلاح میں کوئی اختیاری تاثیر رکھتے ہیں از روئے علم و عقل غلط ہے ۔ علاوہ بریں ان پر کسی حیثیت سے بھی ایمان لانے کا کوئی نفع انسان کی روحانی ، اخلاق اور عملی زندگی میں مترتب نہیں ہوتا ۔ رہیں دوسری قسم کی چیزیں تو ظاہر ہے کہ مشترک انسانی تہذیب کے لیے اساس نہیں بن سکتیں کیوں کہ وہ بنائے تفریق و تقسیم ہیں نہ کہ بنائے جمع و تالیف ۔ لہٰذا یہ قطعاً ناگزیر ہے کہ اس قسم کی تہذیب کی بنیاد ایسے ایمانیات پر رکھی جائے جو مادیت و محسوسات سے ماوراء ہوں ۔

لیکن ان کا محض مادیات و محسوسات سے ماوراء ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ضرورت ہے کہ ان میں چند اور خصوصیات بھی پائی جائیں:

(۱) وہ خرافات اور اوہام نہ ہوں بلکہ ایسے امور ہوں جن کی تصدیق پر عقل سلیم مائل ہو سکتی ہو ۔

(۲) وہ دور از کار باتیں نہ ہوں بلکہ ہماری زندگی سے ان کا گہرا تعلق ہو ۔

(۳) ان میں ایسی معنوی قوت ہو جس سے تہذیب کا نظام انسان کے قوائے فکر و عمل پر تسلط قایم کرنے میں پوری طرح مدد حاصل کرسکے۔

اس لحاظ سے جب ہم اسلام کے ایمانیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں آزمائشوں میں پورے اترتے ہیں ۔

اولاً ، اسلام نے خدا ، ملائکہ ، وحی ، رسالت ، اور یوم آخر کا جو تصور پیش کیا ہے اس میں کوئی استحالۂ عقلی نہیں ہے جس کا صحیح ہونا غیر ممکن

Marfat.com

ہو، نہ کوئی ایسی بات ہے جس کو ماننے سے عقل سلیم انکار کرتی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ محض عقل ان کا احاطہ نہیں کر سکتی لیکن ہمارے اہل علم و حکمت نے اب تک جتنے مجردات و مفارقات کی تصدیق کی ہے ان سب کا یہی حال ہے۔ توانائی حیات، جذب و کشش، نشو و ارتقا ایسے ہی دوسرے امور کی تصدیق ہم نے اس بنا پر نہیں کی ہے کہ ہم ان حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ چکے ہیں، بلکہ اس بنا پر کی ہے کہ ہم نے جن مختلف قسم کے مخصوص آثار کا مشاہدہ کیا ہے ان کی توجیہ و تعلیل کے لیے ہمارے نزدیک ان امور کا موجود ہونا ضروری ہے اور ظواہر اشیا کے باطنی نظام کے متعلق جو نظریات ہم نے قایم کیے ہیں وہ ان امور کے موجود ہونے کا اقتضا کرتے ہیں۔ پس اسلام جن مجردات پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے ان کی تصدیق کے لیے بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہماری عقل ان کی حقیقتوں کو پوری طرح سمجھ لے اور ان کا احاطہ کرلے بلکہ اس کے لیے عقلی طور پر صرف اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ کائنات اور انسان کے متعلق جو نظریہ اسلام نے پیش کیا ہے، وہ خلاف عقل نہیں ہے، اس کا صحیح ہونا اغلب ہے اور وہ ان پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے جو اسلام نے ایمانیات کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ (۱) کائنات کا نظم ایک قادر مطلق ہستی کا قایم کیا ہوا ہے اور وہی اس کو چلا رہی ہے۔ (۲) اس قادر مطلق ہستی کے ماتحت بے شمار دوسری ہستیاں ہیں جو اس وسیع کائنات کی تدبیر میں اس کے احکام کو نافذ کر رہی ہیں۔ (۳) انسان کے وجود میں اس کے خالق نے خیر و شر دونوں کے میلانات رکھے ہیں۔ دانائی اور نادانی، علم و جہل دونوں کا اس کے اندر اجتماع ہے۔ غلط اور صحیح دونوں طرح کے راستوں پر وہ چل سکتا ہے۔ ان متضاد قوتوں اور متخالف میلانات میں سے جس کا غلبہ ہوتا ہے، اس کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ (۴) اس تنازع خیر و شر میں خیر کی قوتوں کو مدد پہنچانے اور انسان کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اس کے خالق نے خود بنی نوع انسان ہی میں سے چند بہتر آدمیوں کا انتخاب کیا ہے اور ان کو علم صحیح عطا کرکے لوگوں کی ہدایت پر مامور کیا۔ (۵) انسان کوئی غیر ذمہ دار اور غیر مسئول ہستی نہیں ہے۔ وہ اپنے تمام اختیاری اعمال کے لیے اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ ایک دن اس کو ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا۔ اور اپنے اعمال کے اچھے یا برے نتائج دیکھنے ہوں گے۔

Marfat.com

یہ نظریہ خدا، ملائکہ، وحی، رسالت، یوم آخر، پانچوں امور کے وجود کا مقتضی ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو عقلاً محال ہو۔ نہ اس کی کسی چیز کو وہمیات و خرافات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ہم اس پر جس قدر زیادہ غور کرتے ہیں اسی قدر اس کی تصدیق کی جانب ہمارا میلان بڑھتا جاتا ہے۔

خدا کی حقیقت خواہ ہماری سمجھ میں نہ آئے مگر اس کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر کائنات کا معمہ کسی طرح حل نہیں ہوتا۔

ملائکہ کے وجود کی کیفیت ہم متعین نہیں کرسکتے مگر ان کے نفس وجود میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ تمام اہل علم و حکمت نے ان کی ہستی کو کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کو اس نام سے یاد نہیں کرتے جس سے قرآن انہیں موسوم کرتا ہے۔

قیامت کا آنا اور ایک نہ ایک دن دنیا کے نظام کا درہم برہم ہو جانا عقلی قیاسات کی رو سے اغلب بلکہ قریب بہ یقین ہے۔

انسان کا اپنے خدا کے آگے جواب دہ ہونا اور اس کا اپنے اعمال کے لیے مستوجب جزا و سزا ہونا خواہ کسی قطعی دلیل سے ثابت نہ کیا جا سکے، مگر عقل سلیم اس حد تک تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ انسان کی موت اور موت کے بعد کی حالت کے متعلق جتنے نظریے قایم کیے گئے ہیں ان میں سب سے بہتر، نتیجہ خیز اور اقرب الی القیاس نظریہ وہی ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔

رہا وحی اور رسالت کا مسئلہ تو یہ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی مادی ثبوت نہیں پیش کیا جاسکتا۔ مگر جن کتابوں کو وحی الٰہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ان کے معانی، اور جن لوگوں کو خدا کا رسول کہا گیا ہے ان کی سیرتوں پر غور کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ نوع انسانی کے افکار و اعمال پر ان کے برابر گہرے، وسیع، پائدار اور مفید اثرات کسی اور نے نہیں ڈالے۔ یہ بات اس امر کا یقین کرنے کے لیے کافی ہے کہ ان میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی جو نہ انسانی تصنیفات کو نصیب ہے اور نہ عام انسانی لیڈروں کو۔

Marfat.com

اس بیان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے ایمانیات عقل کے خلاف نہیں ہیں۔ عقل کے پاس ان کی تکذیب کے لیے کسی قسم کا مواد نہیں ہے۔ ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ علمی اور عقلی ارتقاء کے کسی مرتبے پر پہنچ کر انسان ان کو رد کر دینے پر مجبور ہو جائے بلکہ اس کے برعکس عقل ان کی اغلبیت کا حکم لگاتی ہے۔

ثانیاً، غیبیات میں سے بیشتر امور ایسے ہیں جن کی حیثیت محض علمی ہے، یعنی ان سے ہماری عملی زندگی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً ایثر[1]، ہیولیٰ، صورت مطلقہ، مادہ، نطرت اور قانون علت و معلول، اور ایسے ہی بیسیوں علمی مسلمات یا مفروضات ہیں کہ ان کے ماننے یا نہ ماننے کا ہماری زندگی کے معاملات پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لیکن اسلام نے جن امور غیب پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے وہ ایسے نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت محض علمی ہی نہیں ہے بلکہ ہماری اخلاق اور عملی زندگی سے ان کا گہرا تعلق بھی ہے۔ ان کی تصدیق کو اصل الاصول قرار دینے کی وجہ یہی ہے کہ وہ محض علمی صداقتیں نہیں ہیں بلکہ ان کا صحیح علم اور ان پر کامل ایمان ہمارے نفسانی اوصاف و خصائل پر، ہمارے شخصی اعمال پر اور ہمارے اجتماعی معاملات پر شدت کے ساتھ اثر انداز ہوتا ہے۔

ثالثاً، اسلام کے نظام تہذیب کو مختلف عقلی اور علمی مراتب رکھنے والی وسیع انسانی آبادیوں پر ان کی زندگی کے مخفی اور جزئی سے جزئی شعبوں تک میں اپنی حکومت قایم کرنے اور اپنی گرفت مضبوط رکھنے کے لیے جس قوت کی ضرورت ہے وہ صرف ان ہی ایمانیات سے حاصل ہو سکتی ہے جن کی تصدیق کا اسلام نے مطالبہ کیا ہے۔ یہ یقین کہ ایک سمیع و بصیر، قادر و غالب اور رؤف و رحیم خدا ہمارے اوپر حکمران ہے، اس کے بے شمار لشکر ہر جگہ ہر آن موجود ہیں، پیغمبر اسی کا بھیجا ہوا ہے، جو احکام اس نے ہم کو دیے ہیں وہ اس نے خود نہیں گھڑے ہیں بلکہ سب کے سب خدا کی طرف سے ہیں اور اپنی اطاعت یا سرکشی کا اچھا یا برا نتیجہ ہم کو ضرور دیکھنا پڑے گا، اپنے اندر وہ زبردست اور ہمہ گیر طاقت رکھتا ہے جو اس کے سوا کسی اور ذریعے سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ مادی طاقتیں صرف جسم کو جکڑ سکتی ہیں، تربیت اور تعلیم کے اخلاقی اثرات انسانی معاشرے کے صرف اعلیٰ طبقوں تک پہنچ سکتے ہیں، قانون صرف وہاں

---

[1] Ether

کام کرسکتا ہے جہاں اس کے کارندوں کی پہنچ ہو۔ مگر یہ وہ قوت ہے جو دل اور روح پر قبضہ کرتی ہے، عوام اور خواص، جاہل اور عالم، دانش مند اور بے دانش سبھی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ جنگل کی تنہائیوں اور رات کی تاریکیوں تک میں اپنا کام کرتی ہے۔ جہاں گناہ سے روکنے والا، اس پر ملامت کرنے والا حتیٰ کہ اس کو دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہوتا، وہاں خدا کے حاضر و ناظر ہونے کا یقین، پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم کے برحق ہونے کا یقین، قیامت کی باز پرس کا یقین، وہ کام کرتا ہے جو نہ کوئی پولیس کا سپاہی کر سکتا ہے، نہ عدالت کا حاکم، نہ پروفیسر کی تعلیم۔ پھر جس طرح اس یقین نے معمورۂ ارضی پر پھیلے ہوئے بے شمار مختلف و متضاد انسانی عناصر کو جمع کیا، ان کو ملا کر ایک قوم بنایا، ان کے تخیلات، اعمال اور اطوار میں غایت درجہ کی یک جہتی پیدا کی، ان کے اندر اختلاف ظروف و احوال کے باوجود ایک تہذیب پھیلائی اور ان میں ایک اعلیٰ مقصد کے لیے فدا کاری کی والہانہ روح پھونکی، اس کی مثال کہیں ڈھونڈے نہیں مل سکتی۔

یہاں تک جو کچھ ثابت کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں ایمان سے مراد اللہ، ملائکہ، کتب، رسل اور یوم آخر پر ایمان لانا ہے، پھر عقلی تنقید کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام جس قسم کی تہذیب قایم کرنا چاہتا ہے اس کے لیے صرف یہی امور ایمانیات بن سکتے ہیں اور ان ہی ایمانیات کی اس کو ضرورت ہے۔ نیز یہ کہ ان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو عقلی و علمی ترقی کا ساتھ نہ دے سکتی ہو۔

اب تک کی بحث سے جو چند امور غیر مشتبہ طور پر ثابت ہوئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ایمان، نظام اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اسی پر اس نظام کی عمارت قایم کی گئی ہے۔ اور کفر و اسلام کا امتیاز صرف ایمان و عدم ایمان کے بنیادی فرق پر مبنی ہے۔

(۲) انسان سے اسلام کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ وہ ایمان لائے۔ اس مطالبے کو قبول کرنے والا دائرۂ اسلام میں داخل ہے، اور تمام اخلاقی احکام اور مدنی قوانین اسی کے لیے ہیں۔ اور جو اس مطالبہ کو رد کرے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اس سے نہ کوئی اخلاقی حکم متعلق ہوتا ہے اور نہ کوئی مدنی قانون۔

Marfat.com

(۳) اسلام کے نزدیک ایمان ہی عمل کی جڑ ہے ۔ صرف وہی عمل اس کی نگاہ میں قدر و قیمت اور وزن رکھتا ہے جو ایمان کی بنیاد پر ہو اور جہاں سرے سے یہ بنیاد ہی موجود نہ ہو وہاں تمام اعمال بے اصل اور بے وزن ہیں ۔

اسلامی تہذیب کے قیام میں 'ایمانیات' کا حصہ*

اسلامی تہذیب کا سنگِ بنیادِ حیاتِ دنیا کا یہ تصور ہے کہ انسان کی حیثیت اس کرۂ خاکی میں عام موجودات کی سی نہیں ہے، بلکہ وہ خداوند عالم کی طرف سے یہاں خلیفہ بنا کر اتارا گیا ہے ۔ اس تصور سے بہ طور ایک عقلی نتیجے کے انسان کی زندگی کا یہ نصب العین قرار پایا کہ وہ اپنے خالق اور اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرے۔ اور اس نصب العین کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہو گیا کہ

اولاً، وہ خدا کی صحیح معرفت حاصل کرے ۔

ثانیاً، وہ صرف خدا کو آمر اور ناہی، حاکم اور مطاع سمجھے اور اپنے اختیار کو احکام خداوندی کے تابع کردے ۔

ثالثاً، وہ ان طریقوں کو معلوم کرے جن سے خدا کی خوشنودی حاصل ہو سکتی ہے، اور جب وہ طریقے معلوم ہو جائیں تو انہی کے مطابق زندگی بسر کرے ۔

رابعاً، وہ خدا کی خوشنودی کے ثمرات اور اس کی ناخوشی کے نتائج سے واقف ہو، تاکہ حیات دنیا کے نامکمل نتائج سے دھوکا نہ کھائے ۔

وہ پانچ عقیدے جن کی تفصیل آپ کو اوپر معلوم ہو چکی ہے، اسی ضرورت کو پورا کرتے ہیں ۔

خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ قرآن میں بیان کیا گیا ہے وہ سب اس لیے ہے کہ انسان کو اس ہستی کی صحیح معرفت حاصل ہو جس کی طرف سے وہ خلیفہ بنا کر زمین پر بھیجا گیا ہے اور جس کی خوشنودی حاصل کرنا اس کی زندگی کا نصب العین ہے ۔ ملائکہ کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس لیے کہ انسان کائنات کی کارکن طاقتوں میں سے کسی کو کارفرما نہ سمجھ

* یہ حصہ بھی " اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی " ہی سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

بیٹھے، اور کارفرمائی میں خدا کے سوا کسی کو شریک نہ قرار دے - اس علم صحیح کے بعد خدا پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح تمام کائنات پر اور خود انسانی زندگی کے غیر اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت ہے، اسی طرح انسان اپنی زندگی کے اختیاری شعبے میں بھی خدا کی حکومت تسلیم کرے، ہر معاملے میں خدا کو قانون عطا فرمانے والا اور اپنے آپ کو صرف متبع قانون سمجھے اور اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر محدود کردے جو خدا نے مقرر کیے ہیں - یہی ایمان اپنے اندر وہ قوت رکھتا ہے جو انسان کو خدا کی فرماں روائی کے آگے بہ رضا و رغبت سر تسلیم خم کر دینے کے لیے آمادہ کرتی ہے - اس سے مرد مومن کے اندر ایک خاص نوعیت کا ضمیر پیدا ہوتا ہے - اور ایک خاص قسم کی سیرت بنتی ہے جو قانون اور حدود کا مجبوراً نہیں بلکہ رضاکارانہ اتباع کرنے کے لیے ضروری ہے -

رسالت اور کتاب کا عقیدہ تیسری ضرورت کو پورا کرتا ہے - انہی دونوں کے ذریعے سے انسان کو ان قوانین اور ان طریقوں کا تفصیلی علم ہوتا ہے جن کو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے اور ان حدود کی شناخت میسر ہوتی ہے جن سے خدا نے انسان کے اختیارات کو محدود فرمایا ہے - رسول کی تعلیم کو خدا کی تعلیم اور اس کی پیش کی ہوئی کتاب کو خدا کی کتاب سمجھنا ہی ایمان بالرسالت اور ایمان بالکتاب ہے، اور اس ایمان ہی سے انسان میں یہ قابلیت پیدا ہوتی ہے کہ یقین و اذعان کے ساتھ ان قوانین اور طریقوں اور حدود کی پابندی کرے جو خدا نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنی کتاب کے واسطے سے اس کو بتائے ہیں -

آخری ضرورت کو پورا کرنے کے لیے معاد کا علم ہے - اس سے انسان کی نظر اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ ظاہر حیات دنیا کے پیچھے ایک دوسرے عالم کو دیکھنے لگتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا کی خوش حالی و بد حالی، اور منفعت و مضرت، خدا کی خوشنودی و ناخوشی کا معیار نہیں ہے اور خدا کی جانب سے اعمال کی جزا و سزا اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی، بلکہ آخری فیصلہ ایک دوسرے عالم میں ہونے والا ہے - یہی فیصلہ معتبر ہے - اور اس فیصلے میں کامیابی کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ اس دنیا میں خدا کے قانون کی صحیح پیروی اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پوری پابندی کی جائے - اسی

Marfat.com

عقیدے پر جزم و یقین کا نام ایمان بالیوم الآخر ہے اور ایمان باللہ کے بعد یہ دوسری زبردست قوت ہے جو انسان کو قوانین اسلامی کے اتباع پر ابھارتی ہے تہذیب اسلامی کے لیے انسان کو ذہنی اعتبار سے مستعد کرنے میں اس اعتقاد کا بڑا حصہ ہے۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ اساسی اعتقادات انہی خطوط پر تہذیب کی تاسیس و تشکیل کرتے ہیں جو حیات دنیا کے اس مخصوص تصور اور اس نصب العین نے کھینچ دیے تھے۔ ایسی تہذیب کے لیے عقلاً جس اساسی عقیدے کی ضرورت ہے وہ انہی پانچ امور پر مشتمل ہوسکتا ہے۔ ان کے سوا کسی دوسرے اعتقاد میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس مخصوص طرز کی تہذیب کے لیے اساس بن سکے۔ کوئی دوسرا عقیدہ اس خاص تصورِ حیات اور نصب العین کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتا۔

اسلامی تہذیب کی خصوصیات

ایمانیات کی جو تفصیلات اوپر بیان ہوئی ہیں ان پر نظر ڈالنے سے اس تہذیب کا پورا خاکہ ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی تاسیس ان کے ذریعے سے کی گئی ہے۔ اس خاکے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں:

(۱) اس تہذیب کا نظام ایک سلطنت کا سا نظام ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت عام مذہبی تصور کے لحاظ سے محض ایک 'معبود' کی سی نہیں ہے بلکہ دنیوی تصور کے لحاظ سے وہی حاکم مطلق بھی ہے، وہ دراصل اس سلطنت کا شہنشاہ ہے، رسول اس کا نائندہ ہے، قرآن اس کی کتاب آئین ہے؛ اور ہر وہ شخص جو اس کی شہنشاہی کو تسلیم کرکے اس کے نمایندے کی اطاعت اور اس کی کتاب آئین کا اتباع کرنا قبول کرے اس سلطنت کی رعیت ہے، مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس شہنشاہ نے نمایندے اور اپنی کتاب کے ذریعے سے جو قوانین مقرر کردیے ان کو بے چون و چرا تسلیم کیا جائے، خواہ ان کی علت و مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ جو شخص خدا کا یہ اختیار مطلق اور اس کے قانون کا شخصی و اجتماعی آرا سے بالاتر ہونا تسلیم نہیں کرتا اور اس کے فرمان کو ماننے یا نہ ماننے کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے، اس کے لیے سلطنت میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔

Marfat.com

(۲) چوں کہ اس تہذیب کا اصل مقصد انسان کو آخری کامیابی (یعنی آخرت کے فیصلے میں خداوند عالم کی خوشنودی سے سرفراز ہونے) کے لیے تیار کرنا ہے اور اس کامیابی کا حصول اس کے نزدیک موجودہ زندگی میں انسان کے صحیح عمل پر موقوف ہے اس لیے یہ تہذیب انسان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اپنی زندگی کے تمام معاملات میں خدا کے بتائے ہوئے طریقوں کی پیروی کرے اور اپنی آزادی عمل کو شریعت الٰہی کی قیود سے مقید کردے۔ اس طرح یہ تہذیب دین اور دنیا دونوں کی جامع ہے۔ یہ ایک ایسا وسیع نظام ہے جو انسان کے افکار و خیالات، اس کے شخصی کردار و اخلاق ، اس کے انفرادی عمل، اس کے خانگی معاملات، اس کی معاشرت اس کے تمدن ، اس کی سیاست سب پر حاوی ہے ۔

(۳) یہ تہذیب کوئی قومی یا نسلی تہذیب نہیں ہے ، بلکہ صحیح معنوں میں انسانی تہذیب ہے ۔ یہ انسان کو بہ حیثیت انسان خطاب کرتی ہے اور ہر اس شخص کو اپنے دائرے میں لے لیتی ہے جو توحید ، رسالت ، کتاب اور یوم آخر پر ایمان لائے ۔ اس طرح اس تہذیب نے ایک ایسی قومیت بنائی ہے جس میں بلا امتیاز رنگ و نسل و زبان ہر انسان داخل ہوسکتا ہے، جس کے اندر تمام روئے زمین پر پھیل جانے کی استعداد موجود ہے اور جو تمام بنی آدم کو ایک نظم ملت میں پیوستہ کردینے اور ان سب کو ایک تہذیب کا متبع بنا دینے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔

(۴) ہمہ گیری اور آفاقیت کے ساتھ اس تہذیب کی نمایاں خصوصیت اس کا زبردست نفوذ اور اس کا وہ طاقت ور اثر ہے جس سے وہ اپنے متبعین کو شخصی و اجتماعی حیثیت سے اپنے آئین کا پابند بناتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ قوانین بنانے اور حدود مقرر کرنے سے پہلے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی کرانے کا بندوبست کرتی ہے ۔ حکم دینے سے پہلے وہ اس کا انتظام کرتی ہے کہ اس کا حکم نافذ ہو ۔ سب سے پہلے وہ انسان سے خدا کی فرمان روائی تسلیم کراتی ہے ۔ پھر اس کو یقین دلاتی ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعے سے جو احکام دیے گئے ہیں وہ خدا کے احکام ہیں اور ان کی اطاعت عین خدا کی اطاعت ہے ۔ پھر وہ اس کے نفس میں ایک ایسی پولیس مقرر کردیتی ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں اس کو احکام کی اطاعت کے لیے ابھارتی ہے ۔ خلاف ورزی پر سرزنش کرتی ہے اور عذاب یوم عظیم کا خوف دلاتی رہتی ہے ۔ اس طرح جب وہ اس قوت نافذہ کو

Marfat.com

ہر شخص کے نفس و ضمیر میں متمکن کر کے اپنے پیروؤں میں یہ صلاحیت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ خود اپنی دلی رغبت سے قوانین کا اتباع اور حدود کی پابندی اور اخلاق حسنہ سے متخلق ہونے کے لیے آمادہ ہوں، تب وہ ان کے سامنے اپنے قوانین پیش کرتی ہے ان کے لیے زندگی بسر کرنے کے طریقے وضع کرتی ہے اور اپنے مصالح کے لیے ان سے سخت سے سخت قربانیوں کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ ایسا طریقہ ہے کہ اس سے زیادہ حکیمانہ طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ اس طریقے سے اسلامی تہذیب کو جو زبردست نفوذ و اثر حاصل ہوا ہے وہ کسی دوسری تہذیب کو نصیب نہیں ہوا۔

(۵) دنیوی نقطۂ نظر سے یہ تہذیب ایک صحیح اجتماعی نظام قایم کرنا اور ایک صالح اور پاکیزہ سوسائٹی کو وجود میں لانا چاہتی ہے مگر ایسی سوسائٹی کا وجود میں آنا ممکن نہیں ہے جب تک کہ اس کے افراد اخلاق فاضلہ و صفات حسنہ سے متصف نہ ہوں۔ اس غرض کے لیے ضروری ہے کہ افراد کے نفوس کا تزکیہ کیا جائے تاکہ وہ مخرب اور منتشر افکار کی آماجگاہ نہ رہیں۔ صحیح اور پاکیزہ ذہنیت ان کے اندر راسخ کی جائے تاکہ ان میں ایک ایسی مضبوط سیرت پیدا ہو سکے جس سے اعمال صالحہ کا صدور بالطبع ہونے لگے۔ اسلام نے اپنی تہذیب میں اس قاعدے کی پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ افراد کی تربیت کے لیے وہ سب سے پہلے ان میں ایمان کو راسخ کرتا ہے جو ایک اعلیٰ درجے کی مضبوط سیرت پیدا کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی ایمان ہے جس کے ذریعے سے وہ افراد میں صداقت، ہمت، نیک نفسی، احتساب، حق پسندی، ضبط نفس، تنظیم، فیاضی، وسعت نظر، خود داری، انکسار و فروتنی، فراخ حوصلگی، بلند ہمتی، ایثار و قربانی، فرض شناسی، صبر و استقامت، شجاعت و بسالت، قناعت و استغنا، اطاعت امر اور اتباع قانون کے عمدہ اوصاف پیدا کرتا ہے، اور ان کو اس قابل بناتا ہے کہ ان کے اجتماع سے ایک بہترین سوسائٹی وجود میں آئے۔

(۶) اس تہذیب کے ایمانیات میں ایک طرف وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو انسان کے اندر اخلاق حسنہ و ملکات فاضلہ پیدا کرنے والی اور ان کی پرورش اور حفاظت کرنے والی ہیں۔ دوسری طرف انہی ایمانیات میں یہ قوت بھی ہے کہ وہ انسان کو دنیوی ترقی کے لیے ابھارتے ہیں اور اس کو اس قابل بناتے ہیں کہ دنیا کے اسباب و وسائل کو بہترین طریقے پر برتے اور ان تمام قوتوں کو اعتدال

Marfat.com

کے ساتھ استعمال کرے جو خدا نے اسے عطا کی ھیں - پھر یہی ایمانیات اس میں وہ عمدہ اوصاف بھی پیدا کرتے ھیں جو دنیا میں حقیقی ترقی کے لیے ضروری ھیں - اُن میں انسان کی عملی قوتوں کو منظم کرنے اور تنظیم کے ساتھ حرکت دینے کی زبردست طاقت موجود ھے اور اس کے ساتھ اُن میں یہ طاقت بھی ھے کہ اس حرکت کو حد سے تجاوز نہ کرنے دے اور ان راستوں سے منحرف نہ ھونے دے جن سے ھٹ جانا تباھی کا موجب ھوتا ھے - اس طرح یہ ایمانیات اپنے اندر وہ خوبیاں مع شئی زاید رکھتے ھیں جو دوسرے مذھبی اور دینوی ایمانیات میں جدا جدا پائی جاتی ھیں اور ان تمام خرابیوں سے پاک ھیں جو مختلف مذھبی اور دینوی ایمانیات میں موجود ھیں -

یہ اس تہذیب کا ایک مجمل خاکہ ھے جو اسلام قایم کرتا ھے - اگر ھم تشبیہ کے پیرائے میں اس کو ایک عمارت تسلیم کرلیں تو یہ ایک ایسی عمارت ھے جس کو مستحکم کرنے کے لیے نہایت گہری نیو کھودی گئی ، پھر چھانٹ چھانٹ کر پختہ سے پختہ اینٹیں مہیا کی گئیں اور ان کو پگھلائے ھوئے سیسے سے پیوستہ کردیا گیا ھے ، پھر عمارت اس شان کے ساتھ بنائی گئی کہ بلندی میں آسمان تک اُٹھتی چلی جائے اور وسعت میں آفاق پر پھیلتی جائے ، مگر اس وسعت و رفعت کے باوجود اس کے ارکان میں ذرا تزلزل واقع نہ ھو اور اس کی دیواریں اور اس کے ستون چٹان کی سی مضبوطی کے ساتھ قایم رھیں - اس عمارت کے دروازے اور روشن دان اس طرز کے اور اس خوبی سے بنائے گئے ھیں کہ باھر کی روشنی اور صاف ھوا کو بہ خوبی داخل ھونے دیتے ھیں مگر گرد و غبار اور خس و خاشاک اور باد و باران کو داخل ھونے سے روک دیتے ھیں - یہ تمام خوبیاں جو اس عمارت میں پیدا ھوئی ھیں ایک ھی چیز کی بدولت ھیں اور وہ ایمان ھے - وھی اس کی بنیادیں استوار کرتا ھے وھی ردی اور ناکارہ مواد کو چھانٹ کر عمدہ مواد اخذ کرتا ھے - وھی مواد خام کو پکا کر پختہ اینٹیں تیار کرتا ھے - وھی ان اینٹوں کو پیوستہ کرکے ایک بُنیان مرصوص بناتا ھے - اسی پر عمارت کی وسعت و رفعت اور استحکام کا انحصار ھے ، وھی اس کو پھیلاتا بھی ھے ، بلند بھی کرتا ھے ، مضبوط بھی کرتا ھے ، بیرونی مفسدات سے اس کی حفاظت بھی کرتا ھے اور پاکیزہ چیزوں کو اس میں داخل ھونے کا موقع بھی دیتا ھے - پس ایمان اس عمارت کی جان ھے - اگر یہ نہ ھو تو اس کا قایم رھنا کیسا وجود میں آنا ھی محال ھے - اور اگر یہ ضعیف ھو تو اس کے معنی یہ ھیں کہ عمارت کی بنیادیں کمزور ، اس کی اینٹیں بودی

Marfat.com

اس کا چرنا خراب ، اس کے ارکان متزلزل ھیں ، اس کے اجزا میں پیوستگی نہیں ، اس میں پھیلنے اور بلند ہونے کی صلاحیت نہیں ، اس میں بیرونی مفسدات کو روکنے اور اپنی پاکیزگی و لطافت کو محفوظ رکھنے کی قوت نہیں ۔

غرض، ایمان کا عدم، اسلام کا عدم ہے، ایمان کا ضعف، اس کا ضعف ہے، اور ایمان کی قوت اس کی قوت۔ پھر چوں کہ اسلام محض ایک مذہب ھی نہیں بلکہ اخلاق، تہذیب، معاشرت، تمدن، سیاست سب کچھ ہے اس لیے ایمان کی حیثیت اس نظام میں صرف مذھبی عقیدے کی نہیں ہے۔ بلکہ اسی پر افراد کے اخلاق اور ان کی سیرت کا بھی انحصار ہے۔ وہی ان کے معاملات کی درستی کا ذمہ دار ہے۔ وھی ان کو جوڑ کر ایک قوم بھی بناتا ہے۔ وھی ان کی قومیت اور ان کی تہذیب کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ وہی ان کے تمدن، ان کی معاشرت اور ان کی سیاست کا مایۂ خمیر بھی ہے۔ اور اس کے بغیر اسلام نہ صرف ایک 'مذھب' کی حیثیت سے قایم نہیں ھوسکتا، بلکہ بہ حیثیت ایک تہذیب و تمدن اور نظام سیاسی کے بھی قایم نہیں ھوسکتا۔ ایمان ضعیف ھو تو یہ محض مذھبی عقیدے کا ضعف نہیں ہے بلکہ اس کے معنی یہ ھیں کہ مسلمانوں کے اخلاق خراب ھوجائیں، ان کی سیرتیں کمزور ھو جائیں، ان کے معاملات بگڑ جائیں، ان کی معاشرت اور ان کے تمدن کا نظام درھم برھم ھوجائے، ان کے درمیان قومیت کا رشتہ ٹوٹ جائے، اور وہ ایک آزاد اور با عزت اور طاقتور قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ایمان ہی پر اسلام و کفر کا مدار رکھا گیا ہے۔ وھی نظام اسلامی میں داخل ھونے کی اولین شرط ہے۔ سب سے پہلے انسان کے سامنے ایمان ھی پیش کیا جاتا ہے۔ اگر اس نے ایمان کو قبول کرلیا تو امت مسلمہ میں داخل ھوگیا، مسلمانوں کی معاشرت، تمدن، سیاست سب میں برابر کا شریک ھوگیا، اور تمام احکام، حدود اور قوانین اس سے متعلق ھوگئے۔ لیکن، اگر اس نے ایمان کو قبول نہیں کیا تو وہ دائرہ اسلامی میں کسی حیثیت سے داخل نہیں ھوسکتا، اسلام کا کوئی حکم اور قانون اس پر نافذ نہ ھوگا، اور مسلمانوں کی جماعت میں وہ کسی طرح شریک نہ ھوسکے گا، کیوں کہ اس نظام میں اس کی کھپت قطعاً محال ہے اس کے قوانین و حدود کی پابندی وہ کر ھی نہیں سکتا۔

Marfat.com

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی، **سیرت النبی** (جلد چہارم) ۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

مولانا مودودی، **رسالۂ دینیات**، (باب چہارم) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

مولانا مودودی، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** (باب سوم) ۔
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

مولانا منظور احمد نعمانی، **دین و شریعت** - مکتبۂ الفرقان، لکھنؤ ۔

مولانا منظور احمد نعمانی، **قرآن کیا کہتا ہے؟** مکتبۂ الفرقان، لکھنؤ ۔

سید قطب شہید، **جادہ و منزل** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور ۔

Marfat.com

۱۰

توحید

جو شخص بھی دنیا کے مختلف الہامی مذاہب اور بالخصوص اسلام کا مطالعہ کرے گا اسے اس بات کا اندازہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی کہ ان مذاہب نے اپنی تعلیمات میں سب سے زیادہ اہمیت جس چیز کو دی ہے وہ اللہ پر ایمان لانا ہے۔ جو شخص کفر کی حالت کو چھوڑکر مسلمان ہونا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے کلمۂ شہادت ادا کرنا پڑتا ہے، اور اسی کلمے کی بنا پر وہ شخص ملت کفر سے کٹ کر ملت اسلام میں داخل ہوجاتا ہے۔ اگر یہ شخص اللہ پر ایمان کے تقاضے پورا کرے گا تو آخرت کے اعتبار سے اجر و ثواب کا مستحق اور بہ صورت دیگر عذاب کا مستوجب ہوگا۔ اسلام کے نزدیک محض اس اقرار یا ایمان سے انسان کی دنیوی اور آخری زندگی یک سر بدل جاتی ہے۔

بہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض ایک مابعدالطبیعی ہستی کے وجود یا عدم وجود کے اقرار سے انسانوں میں اتنا بڑا فرق نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن، اگر ہم بہ نگاہ غائر اس مسئلے کا مطالعہ کریں — جیسا کہ ہم اس باب میں کریں گے — تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس اقرار و انکار کے بڑے اہم نتائج نکلتے ہیں۔ یہ نتائج فکری بھی ہیں اور عملی بھی، انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ اس لیے وجود باری تعالیٰ اور توحید کے مسئلے کو محض ایک علمی اور کلامی مسئلہ سمجھنا، جس کا تعلق محض فلاسفہ اور متکلمین کی موشگافیوں سے ہو، درست نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان و کائنات کے باہمی تعلق کے بارے میں ہر شخص کو ایک نقطۂ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ نقطۂ نظر سوچ سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہو، بلکہ (جیسا کہ اکثریت کا قاعدہ ہے)

Marfat.com

بلا سوچے سمجھے بھی ایک نقطۂ نظر رکھا جا سکتا ہے اور یہ انسان اور معاشرے دونوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اسلام چوں کہ افراد کی اصلاح کا آغاز بالکل بنیاد سے کرتا ہے اس لیے وہ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے کہ عمل صالح سے پہلے ایمان پر زور دیا جائے۔ بنیاد اگر صحیح نہ ہو تو دیوار ٹیڑھی اور کمزور رہے گی اور ''تا ثریا می رود دیوار کج'' کا نقشہ ہوگا۔ ایسی دیوار میں اگر کچھ ظاہری حسن ہے بھی تو وہ بے کار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نیک اعمال اگر صحیح عقاید اور صحیح نیت کے ساتھ نہ ہوں تو خدا کے یہاں بے معنی ہیں۔

* اسلام کے پورے اعتقادی اور عملی نظام میں پہلی اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے۔ باقی جتنے اعتقادات و ایمانیات ہیں سب اسی ایک اصل کے تکمیلی فروع ہیں اور جتنے اخلاق احکام اور تمدنی قوانین ہیں سب اسی مرکز سے قوت حاصل کرتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کا مصدر اور مرجع خدا کی ذات ہے۔ ملائکہ پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے ملائکہ ہیں۔ کتابوں پر اس لیے ایمان ہے کہ خدا کی نازل کی ہوئی ہیں۔ رسولوں پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں۔ یوم آخر پر اس لیے ایمان ہے کہ وہ خدا کے انصاف کا دن ہے۔ فرائض اس لیے فرائض ہیں کہ خدا نے ان کو مقرر کیا ہے۔ حقوق اس لیے حقوق ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر مبنی ہیں۔ اوامر کی فرماں برداری اور نواہی سے اجتناب اس لیے ضروری ہے کہ وہ خدا کی جانب سے ہیں۔ غرض، ہر چیز جو اسلام میں ہے خواہ عقیدہ ہو یا عمل، اس کی بنا صرف ایمان باللہ پر قایم ہے۔ اس ایک چیز کو الگ کردیجے، پھر نہ ملائکہ کوئی چیز ہیں نہ یوم آخر، نہ رسول اتباع کے مستحق ٹھہرتے ہیں، نہ ان کی لائی ہوئی کتابیں، نہ فرائض و طاعات میں کوئی معنویت باقی رہ جاتی ہے نہ حقوق و فرائض میں، نہ اوامر و نواہی کسی قوت و نفاذ کے حامل رہتے ہیں اور نہ ضوابط و قوانین۔ اس ایک مرکز کے ہٹتے ہی یہ سارا کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ سرے سے اسلام ہی کسی چیز کا نام نہیں رہتا۔

یہ عقیدہ جو اس عظیم الشان فکری و عملی نظام میں مرکز اور منبع قوت کا کام دے رہا ہے، محض اسی قدر نہیں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ موجود ہے'' بلکہ وہ اپنے اندر اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک مکمل اور صحیح تصور (جس حد تک انسان

* اس حصے کا بیشتر مواد 'اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی' سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

کے لیے ان کا تصور ممکن ہے) رکھتا ہے، اور ان ہی صفات کے تصور سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جو انسان کی تمام فکری اور عملی قوتوں پر محیط اور حکمران ہو جاتی ہے۔ محض ہستیٔ باری کا اثبات وہ چیز نہیں ہے جسے اسلام کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکتا ہو۔ دوسری ملتوں نے بھی کسی نہ کسی طور سے باری تعالیٰ کے وجود کا اثبات کیا ہے۔ البتہ جس چیز نے اسلام کو تمام مذاہب و ادیان سے ممتاز کر دیا ہے وہ یہی ہے کہ اس نے صفات باری کا صحیح علم بخشا ہے، اور پھر اسی علم کو ایمان بلکہ اصل ایمان بنا کر اس سے تزکیۂ نفس، اصلاح اخلاق تنظیم اعمال، نشر خیر و منع شر، اور بناء تمدن کا اتنا بڑا کام لیا ہے جو دنیا کے کسی مذہب و ملت نے نہیں لیا۔

ایمان باللہ کی مجمل صورت، جس کے اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کو دخول اسلام کی پہلی اور لازمی شرط قرار دیا گیا ہے، کلمۂ لا الہ الا اللہ ہے، یعنی دل سے اس امر کی تصدیق اور زبان سے اس امر کا اعتراف کہ 'الہ' بہ جز اس ایک ہستی کے اور کوئی نہیں ہے جس کا نام اللہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ 'الوہیت' کو عالم وجود کی جملہ اشیا سے سلب کرکے صرف ایک ذات کے لیے ثابت کیا جائے اور ان تمام جذبات، تخیلات، اعتقادات اور عبادات و طاعات کو جو 'الوہیت' کے لیے مخصوص ہیں، اسی ایک ذات سے متعلق کر دیا جائے۔ اس مجمل کلمے کے اجزائے ترکیبی تین ہیں:

ایک، الوہیت کا تصور۔
دوسرے، تمام اشیا سے اس کی نفی۔
تیسرے، صرف اللہ کے لیے اس کا اثبات۔

قرآن مجید میں خدا کی ذات و صفات کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے، وہ سب انہی تینوں امور کی تفصیل ہے۔

اولاً، اس نے 'الوہیت' کا ایک ایسا مکمل اور صحیح تصور پیش کیا ہے جو دنیا کی کسی کتاب اور کسی مذہب میں ہم کو نہیں ملتا۔ اس میں شک نہیں کہ تمام قوموں اور ملتوں میں یہ تصور کسی نہ کسی طور پر موجود ہے، لیکن ہر جگہ غلط یا نامکمل ہے۔ کہیں 'الوہیت' نام ہے محض اولیت اور واجبیت کا، کہیں اس سے مبدئیت مراد لی گئی ہے، کہیں اس

Marfat.com

کو قوت اور طاقت کا ہم معنی سمجھا گیا ہے ، کہیں وہ محض خوف اور ہیبت کی چیز ہے ، کہیں وہ صرف محبت کا مرجع ہے ، کہیں اس کا مفہوم محض رفع حاجات اور اجابت دعوات ہے ، پھر کہیں وہ قابل تجزیہ و تقسیم ہے ، کہیں اس کو تجسیم[1] اور تشبیہ[2] اور تناسل[3] سے آلودہ کیا گیا ہے ۔ کہیں وہ آسمانوں پر متمکن ہے اور کہیں وہ انسانی بھیس بدل کر زمین پر اتر آئی ہے ، ان تمام غلط یا ناقص تصورات کی تصحیح اور تکمیل جس کتاب نے کی ہے وہ صرف قرآن ہے ۔ اسی کتاب نے آلوھیت[4] کی تقدیس و تمجید کی ہے ۔ اسی نے بتایا ہے کہ الہٰ صرف وہی ہوسکتا ہے جو بے نیاز، صمد[5] اور قیوم[6] ہو ، جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے ۔ جو قادر مطلق اور حاکم علی الاطلاق ہو ۔ جس کا علم سب پر محیط ، جس کی رحمت سب پر وسیع ، جس کی طاقت سب پر غالب ہو ، جس کی حکمت میں کوئی نقص نہ ہو ، جس کے عدل میں ظلم کا شائبہ تک نہ ہو ، جو زندگی بخشنے اور وسائل حیات مہیا کرنے والا ہو ، جو نفع و ضرر کی ساری قوتوں کا مالک ہو ، اس کی بخشش اور نگہبانی کے سب محتاج ہوں ، اسی کی طرف تمام مخلوقات کی بازگشت ہو ، وہی سب کا حساب لینے والا ہو اور اسی کو جزا اور سزا کا اختیار ہو ۔ پھر یہ آلوھیت کی صفات نہ تجزیہ و تقسیم کے قابل ہیں کہ ایک وقت میں بہت سے ' الہ ' ہوں اور وہ ان صفات یا ان کے ایک ایک حصہ سے متصف ہوں ، نہ یہ وقتی اور زمانی ہیں کہ ایک ' الہ ' کبھی تو ان سے متصف ہو اور کبھی نہ ہو ، نہ یہ قابل انتقال ہیں کہ آج ایک ' الہ ' میں پائی جائیں اور کل دوسرے میں ۔

آلوھیت کا یہ کامل اور صحیح تصور پیش کرنے کے بعد قرآن اپنے انتہائی زور بیان کے ساتھ ثابت کرتا ہے کہ کائنات کی جتنی اشیا' اور جتنی قوتیں ہیں ان میں سے کسی پر بھی یہ مفہوم راست نہیں آتا ۔ تمام موجودات عالم محتاج ہیں ، مسخر ہیں، مخلوق ہیں، نافع و ضار ہونا تو درکنار خود اپنی ذات سے ضرر کو دفع کرنے پر قادر نہیں ہیں ۔ ان کے افعال اور ان کی تاثیرات کا سرچشمہ ان کی اپنی ذات میں

---

۱ یعنی یہ سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ بھی ہماری (۔۔۔دی اشیا کی) طرح ایک جسم رکھتا ہے ۔
۲ یعنی اللہ تعالیٰ کو کسی مادی شے سے تشبیہ دی جائے ۔
۳ یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان و حیوان کی طرح صاحب نسل اور صاحب اولاد ہے ۔
۴ ذات باری تعالیٰ ۔ تصور الہ ہونا ۔
۵ بے نیاز؛ بے پرواہ؛ بلند مرتبہ؛ (وہ جس کی طرف مہتم بالشان کاموں میں رجوع کیا جائے) بہت بڑا قایم رہنے والا ۔ بے مثال تھامنے والا ۔

Marfat.com

نہیں ہے بلکہ وہ سب کی سب کہیں اور سے قوت وجود، قوت فعل، اور قوت تاثیر حاصل کرتی ہیں۔ لہذا کائنات کی کوئی شے ایسی نہیں جو 'آلوہیت' کا شائبہ بھی اپنے اندر رکھتی ہو اور جس کو ہماری نیاز مندیوں میں سے کسی ایک حصہ کا بھی حق پہنچتا ہو۔

اس نفی کے بعد وہ ایک ذات کے لیے 'آلوہیت' ثابت کرتا ہے جس کا نام 'اللہ' ہے اور انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو چھوڑ کر اسی پر ایمان لاؤ، اسی کے آگے جھکو، اسی کی تعظیم کرو، اسی سے محبت کرو، اسی سے خوف کرو، اسی سے امید رکھو، جو کچھ مانگو اسی سے مانگو، ہر حال میں اسی پر توکل کرو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ ایک دن اس کے پاس جانا ہے، اس کو حساب دینا ہے، اور تمہارا اچھا یا برا انجام اسی کے فیصلہ پر منحصر ہے۔

آئندہ صفحات میں توحید کی حقیقت اور اس کے انقلابی پیغام کے بارے میں علمی اور عقلی بحث کی جائے گی اور اس سلسلے میں اسلام جو فطری طرز استدلال اختیار کرتا ہے اسے پیش کیا جائے گا۔ اس موضوع کی اچھی طرح تنقیح کے لیے مندرجہ ذیل چیزوں کو سمجھنا ہوگا:

۱ کائنات کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی خالق اور حاکم ہے۔

۲ یہ خالق اور حاکم ایک اور صرف ایک ہے اور اسی کی حکمرانی اس کائنات میں ہر طرف کار فرما ہے۔

۳ توحید کے نظریے کے تحت خدا کا ایک مکمل تصور واضح ہوتا ہے اور اسلام کے پورے نظام فکر و عمل کی بنیاد اسی توحید کے تصور پر ہے۔

۴ توحید کے اثرات انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کیا مرتب ہوتے ہیں اور اس نظریے کے تحت کیسا انسان اور کیسا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی مباحث سے بحث کی گئی ہے۔

Marfat.com

وجود باری تعالیٰ *

سب سے پہلا سوال جس سے ہمیں سابقہ در پیش ہے وجود باری تعالیٰ کا ہے۔ فلاسفہ اور اہل سائنس نے اس پر بہت کچھ لکھا ہے اور خصوصیت سے پچھلے دو تین سو سال میں تو موافق اور مخالف دلائل کا ایک طومار لگ گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اہل فلسفہ کی ساری موشگافیاں انسان کی کوئی واضح رہنمائی کرنے میں قطعاً ناکام رہی ہیں۔ بقول اکبر

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سِرا ملتا نہیں

اس بحث میں اہل سائنس نے کچھ اور بھی تیکھے انداز سے شرکت کی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے مادیت پرست سائنسدان اس دعوے کے ساتھ میدان میں اترے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ لاپلاس نے نظام شمسی پر اپنی کتاب میں خدا کا نام تک نہ لیا اور جب نپولین نے اس سے تعجب سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ میں تمہاری کتاب میں خدا کا ذکر نہیں پاتا ہوں، تو اس نے شاہ فرانس سے کہا ”حضور والا ہمیں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ یہ لے کچھ اور بڑھتی گئی اور بالآخر انیسویں صدی میں یہ کہا جانے لگا کہ سائنس نے خدا کے تصور کو ختم کردیا ہے اور کائنات کی ایک ایسی توجیہ کردی ہے جس میں کسی مدبر اعلیٰ اور خالق کل کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ لیکن یہ ایک خام خیالی تھی اور حالات نے جلد ہی بتا دیا کہ انسان بہت سی آرا قایم کرنے میں بڑا جلد باز ہے!

وجود باری تعالیٰ کے موضوع پر کسی بحث سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ خدا کا وجود حسی اور مادی نہیں ہے بلکہ مابعد الطبیعی ہے۔ عام طور پر کسی چیز کے وجود کو جاننے کے لیے ہمارے پاس جو ذرائع و وسائل ہیں وہ حواس ہیں۔ سائنس اپنا علم انہی حواس کے ذریعہ حاصل کرتی ہے لیکن حواس سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ محض مادی اور حسی دنیا تک محدود ہے۔ جو چیزیں ان سے ماورا ہیں، یعنی طبیعی کے بجائے مابعد الطبیعی ہیں، ان کو جاننے کے لیے حواس ناکافی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حواس مجبور اور لاچار

---

* یہ حصہ مرتب کے قلم سے ہے اور اس کتاب کے لیے خاص طور پر لکھا گیا ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

ہیں اور اس کے حقائق کو جاننے کے لیے حواس ہمارے معین و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے معاملے میں اس طرح کے دلائل طلب کرنا جو حسی دنیا سے متعلق ہوں یا جو اس کے معیار کے مطابق ہوں ایک غیر عقلی اور غیر سائنٹیفک مطالبہ ہے۔

مادیت پرست سائنسدان جس غلطی کا شکار ہوئے وہ یہ تھی کہ انہوں نے خود سائنس کی حدود کو نہ سمجھا اور اس زعم میں مبتلا ہوگئے کہ سائنس زندگی کے ہر عقدے کو حل کرسکتی ہے۔ جس طرح خشکی کی سواری پانی پر بے کار ہو جاتی ہے اسی طرح طبیعی دنیا کا مطالعہ کرنے والی سائنس مابعدالطبیعی حقائق کا ادراک نہیں کرسکتی۔ سائنس اپنے مخصوص دائرے میں بڑی مفید خدمت انجام دے رہی ہے لیکن اس کے نام پر کسی ایسی دنیا کی بات پیش کرنا جو اس کے دائرے سے باہر ہے اور جس کے متعلق وہ کوئی علم نہیں رکھتی ایک غیر سائنٹیفک بات ہے۔ اور ایسے دعوے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔ سائنس کی صورت یہ ہے کہ

۱۔ اس کا دائرۂ کار حسی اور طبیعی دنیا تک محدود ہے۔ اس سے باہر کے بارے میں وہ خاموش ہے اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔

۲۔ طبیعی دنیا میں بھی سائنس کا مطالعہ جزوی ہے کُلی نہیں۔ وہ ایک خاص پہلو یا جزو کا مطالعہ کرتی ہے پوری حقیقت کا ادراک نہیں کرسکتی۔

۳۔ اس کا طریق مطالعہ، مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے اور ایک خاص طریق عمل کے ذریعے سے اس کی حاصل شدہ معلومات سے قوانین، نظریات اور طبیعی نظام کے بارے میں تصورات قایم کیے جاتے ہیں۔ یہ ساری معلومات ظنی ہوتی ہیں، انہیں درجۂ یقین حاصل نہیں ہوتا۔ ابتدائی درجے میں نسبتاً یقین کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے اور جوں جوں نظریات اور تعبیرات کا حصہ بڑھتا جاتا ہے ظن و تخمین کا عنصر بھی بڑھتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایک دور کے سائنسی تصورات دوسرے دور کے سائنسی تصورات کی تکذیب کر دیتے ہیں اور سر جیمس جینز کے بہ قول سائنس کا دریا الٹے رخ پر بہنے لگتا ہے۔[1]

۱۔ ملاحظہ ہو سر جیمس جینز *The Mysterious Universe*۔

Marfat.com

۴ سائنس کے مختلف شعبوں کے حاصل کردہ نتائج ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں ، اکثر ایسا ہوا ہے کہ فزکس اگر ایک سمت میں رہنمائی کرتی ہے تو بیالوجی ایک دوسری سمت میں اور سائیکالوجی ایک تیسری سمت میں۔ اس لیے کسی ایک کو سائنس کہنا اور دوسرے کو نظرانداز کر دینا غیر حقیقت پسندانہ رویہ ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر یہ کہنا کہ سائنس خدا کے وجود کی نفی کرتی ہے ، ایک بے سر و پا اور غیر عقلی دعویٰ ہے۔ یہ سوال ہی سائنس کے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ وہ اس کے بارے میں بہ جز خاموشی کے اور کوئی موقف اختیار نہیں کر سکتی۔ فرانسیسی سائنس دان پروفیسر لیتر نے سچ کہا ہے کہ

"کائنات کے آغاز و انجام تک مشاہدے کی رسائی نہیں ہے۔ اس لیے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی ازلی یا ابدی وجود کا انکار کریں۔ جس طرح ہمارا کام یہ بھی نہیں ہے کہ ہم اس کو ثابت کریں۔ ہمارا کام نفی و اثبات دونوں سے الگ ہے۔"

یہ تو ہے فطری صورت ، لیکن اگر خود سائنسی فکر کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیسویں صدی میں پرانی سائنسی مادیت کے خلاف ایک شدید رد عمل رونما ہوا ہے اور سائنس کا نیا رجحان مذہب اور خدا کے وجود کے خلاف ہونے کے بجائے اسی سمت میں اشارہ کر رہا ہے۔ عکس ریز کی دریافت سے سائنس میں جو نیا فلسفیانہ رجحان شروع ہوا ہے اور نظریۂ اضافیت اور نظریۂ کوانٹم کے زیر سایہ جس نے پرورش پائی ہے ، وہ سائنس کو مذہب کے حقائق سے دور لے جانے کے بجائے ان سے قریب تر لے آیا ہے۔ عام فضا کی یہ تبدیلی بڑی فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر لی کاستے ڈونوائے نے تو اپنی کتاب تقدیر انسانیت اس دعوے کے ساتھ پیش کی ہے کہ

"اگر ہم سائنس کے جمع شدہ سرمایہ کا تنقیدی مطالعہ کریں اور اس سے منطقی اور عقلی نتائج مستنبط کریں تو یہ نتائج لازمی طور پر ہمیں خدا تک لے آتے ہیں۔"

پروفیسر سولیون نے چوٹی کے سائنس دانوں کے انکار کا جو نچوڑ پیش کیا ہے وہ یہ ہے:

Marfat.com

> ”ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئی دنیائے سائنس میں مذہبی نقطۂ نظر بھی اتنی ہی حجت و صداقت کا حامل ہے جتنا سائنسی نقطۂ نظر۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس نئی سائنسی دنیا کے سب سے بڑے خلاق (یعنی البرٹ آئنسٹائن) کی نظر میں تو مذہبی فکر ہی سائنسی نقطۂ نظر کا ماخذ اور رہبر ہے۔“[1]

اور پروفیسر جوڈ یہاں تک کہہ گیا ہے کہ

> ”سر جیمس جینز اور سر ارتھر اینڈ نکسن کی کتب ہمیں بتاتی ہیں کہ بیسویں صدی کی فزکس نے طبعی دنیا کے بارے میں انیسویں صدی کے تصورات میں انقلاب برپا کردیا ہے اور یہ انقلاب مذہب سے مصالحت اور دوست داری کی سمت میں ہے۔ آج سائنس اور مذہب کائنات کی حقیقت کے بارے میں ایک ہی طرح کی بات کہہ رہے ہیں۔ گو اپنے نتائج تک پہنچنے کے لیے دونوں کے طریقہائے تحقیق و مطالعہ جدا جدا ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ آج سائنس نے خدا کے تصور کا اثبات کردیا ہے۔“[2]

جدید سائنسی فکر کے یہ رجحانات صحت مند ہیں اور ہوا کے نئے رخ کا پتہ دیتے ہیں۔ جہاں تک خالص سائنٹیفک طریقہ کا سوال ہے وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے حقائق کی اس نئی دنیا کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا جس کا تعلق مابعدالطبیعیات سے ہے۔ کیوں کہ خدا کے وجود کا ادراک حواس کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کے باوجود عقل سلیم کی رہنمائی کے لیے انفس و آفاق میں بے شمار شواہد موجود ہیں اور خود سائنس کی فراہم کردہ معلومات میں لا تعداد نشانیاں موجود ہیں جو ایک مدبر اور صاحب امر ہستی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو دیکھنے والی آنکھ اور سوچنے والا دماغ رکھتا ہو اس کائنات کے حقائق کو دیکھ کر بے اختیار پکار اٹھتا ہے کہ یہ کارخانۂ رنگ و بو ایک حکیم اور دانا خالق اور فرماں روا کے بغیر نہ وجود میں آسکتا تھا اور نہ قایم رہ سکتا ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک ساری کائنات ایک مکمل نظام ہے اور یہ پورا نظام ایک زبردست قانون کے تحت چل رہا ہے جس میں ہر طرف ایک ہمہ گیر اقتدار، ایک بے عیب حکمت، ایک بے خطا علم کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہ آثار اس بات پر دلالت

۱۔ ملاحظہ ہو لندن کا اخبار، دی آبزرور (The Observer)، ۱۳ اپریل ۱۹۳۰۔
۲۔ ملاحظہ ہو جوڈ کی کتاب (God and Evil)، صفحہ ۱۲۰۔

Marfat.com

کرتے ہیں کہ اس نظام کا ایک فرماں روا ہے۔ نظم کا تصور ایک ناظم کے بغیر، قانون کا تصور ایک حکمران کے بغیر، حکمت کا تصور ایک حکیم کے بغیر، علم کا تصور ایک عالم کے بغیر، اور سب سے بڑھ کر خلق کا تصور ایک خالق کے بغیر آخر کس طرح آ سکتا ہے۔ یہ کائنات ایک منصوبے کے تحت کام کر رہی ہے۔ کیا یہ منصوبہ ایک منصوبہ کار کے بغیر ہی جاری و ساری ہو گیا ہے؟ اس کائنات میں کمال درجے کا حسن و توازن ہے۔ یہ حسن و توازن ایک منتظم کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ اس میں ایک ہمہ گیر اخلاقی قانون کارفرما ہے جو خیر کو قایم رکھتا اور شر کو ختم کرتا ہے۔ یہ اخلاقی انتخاب ایک صاحب ارادہ ہستی کے بغیر کیسے ممکن ہے؟ یہ کائنات ایک مسلسل، مربوط اور معنی خیز کتاب کے مانند ہے۔ کیا اس کتاب کا کوئی مصنف نہیں؟ مسٹر آرتھر کیتھ نے سچ کہا ہے:

> ''انسانی دماغ ان عظیم سوالات کو حل کرنے کے لیے ایک حقیر سا آلہ ہے۔ ہمیں اس کی مجبوریوں کا اعتراف کر لینا چاہیے۔ لیکن پھر بھی یہ ہمہ وقت اس امر کا ادراک کر رہا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کس قدر منظم اور مربوط ہے اور فطرت کی نت نئی ایجادات کیسی حیران کن ہیں۔ ہر سمت میں ایک مقصد کار فرما ہے۔ خواہ ہم عامی ہوں یا سائنسدان، ہمیں کائنات کے لیے ایک حاکم اعلیٰ کو ماننا پڑے گا۔ جو نام چاہے اس کو دے دو اور جو شکل چاہے اس کی تجویز کر دو مگر اس کو ماننے سے مفر نہیں۔''[1]

اسی طرح اگر ہم اس کائنات کے آغاز پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ اس کے لیے کسی خالق کی موجودگی ضروری ہے۔ علت و معلول کا سلسلہ جہاں تک بھی چلا جائے۔ ایک نقطۂ آغاز یقیناً ماننا پڑے گا۔ اس سلسلے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کو نہ ماننے والے کہتے ہیں، یعنی یہ کہ آغاز مادے سے ہوا؛ دوسرا وہ جو خدا کے ماننے والے کہتے ہیں۔ یعنی یہ کہ آغاز ایک ذی شعور اور صاحب ارادہ ہستی سے ہوا۔ ان دونوں کے دلائل کا کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں مفروضے ہیں، کوئی تجرباتی یا مشاہداتی دلیل کسی ایک کے حق میں نہیں پیش کی جاتی۔ البتہ جو بات خدا کے وجود کے حق میں کہی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان ذی شعور ہستی ہے

۱۔ سر آرتھر کیتھ، ''*I believe*''، صفحہ ۱۵۵۔

Marfat.com

اور مادہ شعور سے محروم ہے۔ سوال یہ ہے کہ شعور سے ایک محروم چیز — یعنی مادہ — ایک صاحبِ شعور کو کیسے جنم دے سکتا ہے؟ اس لیے کہ شعور مجرد مادے سے بہت بلند ہے۔ لیکن، اگر خدا کو، جو خود صاحب شعور ہے، تسلیم کر لیا جائے تو یہ مشکل رفع ہو جائے۔ اسی طرح مادے کو نقطہ آغاز مان کر کائنات کے تمام حقائق کی توجیہ نہیں کی جاسکتی لیکن ایک با اختیار و صاحب ارادہ ہستی کو مبدا ماننے کے بعد کوئی الجھن باقی نہیں رہتی اور تمام مسائل آپ سے آپ حل ہو جاتے ہیں۔

مزید براں، اگر ہم خدا کے وجود کو تسلیم نہ کریں اور کائنات کا مبدا مادے کو قرار دیں تو انسانی اور حیوانی وجود کی تشریح بڑی مشکل نظر آتی ہے۔ سرسری طور پر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ مختلف اجزا ایک تناسب سے ملے اور پودے وجود میں آگئے، یا دوسرے اجزا کسی اور تناسب سے ملے اور حیوان یا انسان وجود میں آگئے، لیکن جدید سائنسی ترقیوں کی بنا پر ایسے 'اتفاقات' کو ماننا بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر فرینک ایلن کا کہنا ہے:

"پروٹین جو تمام ذی حیات خلیوں کے اجزائے لازم کی حیثیت رکھتے ہیں، پانچ عناصر — کاربن، ہائڈروجن، نائٹروجن، آکسیجن، اور گندھک — پر مشتمل ہیں۔ ایک پروٹینی سالمہ ان عناصر کے چالیس ہزار جوہروں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ کائنات میں ۹۲ کیمیائی عناصر بالکل منتشر اور بے ترتیب بکھرے ہوئے ہیں۔ اب اس امر کا امکان کس حد تک ہے کہ ان ۹۲ عناصر کے بے ترتیب ڈھیر میں سے نکل کر یہ پانچوں عناصر اس طرح باھم ملیں کہ ایک پروٹینی سالمہ آپ سے آپ وجود میں آجائے؟ مادے کی وہ مقدار جسے مسلسل ہلانے سے اتفاقاً یہ نتیجہ حاصل ہوسکتا ہے اور وہ مدت جس کے اندر اس کام کی تکمیل ممکن ہو، حساب لگا کر معلوم کی جاسکتی ہے۔

"سوئزرلینڈ کے ایک حساب دان چارلس ایوجین گائی نے اس کا حساب لگایا ہے اور اس کی تحقیق یہ ہے کہ اس طرح کے کسی اتفاقی واقعہ کا امکان ۱۶۰۱۰ کے مقابلے میں صرف ایک درجہ ہوسکتا ہے[۱] صرف ایک پروٹینی سالمے کو اتفاقاً وجود میں آنے کے لیے اس

۱- ۱۶۰۱۰ کا مطلب یہ ہے کہ ۱۰ کو ۱۰ ہی سے ۱۶۰ مرتبہ ضرب دیا جائے، گویا اس کے سامنے ۱۶۰ صفر رکھ کر دیکھ لیجیے، اس کے مقابلے میں ایک امکان اس بات کا ہو کہ ایک پروٹینی سالمہ خود بہ خود وجود میں آجائے۔

Marfat.com

پوری کائنات کے موجودہ مادے سے کروڑوں گنا زیادہ مادہ مطلوب ہوگا جسے یکجا کرکے ہلایا جائے اور اس عمل سے کوئی نتیجہ برآمد ہونے کا امکان ۲۴۳ ۱۰ سال کے بعد پیدا ہوگا۔

' پروٹین ' امینوترشوں کے لمبے سلسلوں سے وجود میں آتے ہیں اس میں سب سے زیادہ اہمیت اس طریقے کی ہے جس سے یہ سلسلے ملیں۔ اگر یہ غلط شکل میں یکجا ہو جائیں تو زندگی کی بقا کا ذریعہ بننے کے بجائے مہلک زہر بن جاتے ہیں۔ پروفیسر بی لیڈز نے حساب لگایا ہے کہ ایک مادہ سے پروٹین کے سلسلے کو ۴۸ ۱۰ طریقوں سے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ یہ کسی طرح عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک پروٹینی سالمے کو وجود میں لانے کے لیے اتنے بہت سے بعید از امکان اتفاقات بہ یک وقت صادر ہو جائیں۔"[۱]

در حقیقت یہ اکیلی مثال نہیں، بلکہ نباتات و حیوانات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں اس قسم کی بے شمار مثالوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم ارتقائی حیاتیات سے متعلق ایک مثال پر اکتفا کریں گے۔

نظریۂ ارتقا کی رو سے حیات کی زیادہ ترقی یافتہ شکلیں در حقیقت کم ترقی یافتہ شکلوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ چارلس ڈارون کے نظریے کے مطابق یہ ارتقا محض میکانیکی قوتوں کی بنا پر ہوا ہے۔ لیکن بعد کے ماہرین حیاتیات نے محسوس کیا کہ محض میکانیکی قوتیں ارتقا کی تشریح نہیں کر سکتیں۔ مثال کے طور پر آنکھ کے ارتقا کا مسئلہ لیجیے۔[۲] اگر آنکھ کے عدسے کی ایک سطح میں اتفاقاً کوئی معمولی سی تبدیلی بھی ہو جائے (جس کے بغیر آنکھ کا ارتقا ممکن نہیں ہے) تو اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری سطح میں بھی بہ یک وقت ایک مخصوص تبدیلی ہونی چاہیے۔ اس دوسری سطح میں تبدیلی لکھوکہا شکلوں میں ہو سکتی ہے جس میں سے صرف ایک مخصوص تبدیلی کی ضرورت ہے ورنہ بینائی میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا؛ ان دونوں سطحوں میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ قرینہ کی شکل یا عدسے کے مرکز کے فاصلے میں تبدیلی ہونی چاہیے۔ اور یہ سب تبدیلیاں بہ یک وقت ہونی چاہیں ورنہ بینائی بہتر نہ ہوگی۔

حیاتیات کا مطالعہ کرنے والے کو اس قسم کی بے شمار مثالوں سے سابقہ

۱۔ J. C. Monsing. *The Evidence of God in an Expanding Universe,* PP.27-36 ترجمہ از عبدالحمید صدیقی۔

۲۔ یہ مثال آرنلڈ لن (Arnold Lunn) کی مقدمہ کتاب *Is Evolution Proved ?* سے لی گئی ہے۔

پڑتا ہے جہاں محسوس ہوتا ہے کہ سب کچھ اندھے اتفاقات سے نہیں بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے پیش نظر ہوا ہے ۔

نظریہ ارتقا ابتداً دو سائنسدانوں نے پیش کیا تھا ۔ ایک چارلس ڈارون اور دوسرا الفرڈ رسل ولاس ۔ لیکن بعد میں الفرڈ رسل ولاس نے اپنی کتاب شائع نہ کی اور نظریہ ارتقا کا سہرا ڈارون کے سر بندھا ، لیکن ڈارون کے نظریات کے برعکس ولاس کا کہنا تھا کہ محض فطری قوتوں کے ذریعے انسانی وجود کی تشریح نہیں کی جاسکتی ۔ اس کا خیال یہ تھا کہ ”خلقیاتی دنیا میں کم از کم تین ایسے مقامات آتے ہیں جہاں کسی نئی قوت یا علت کی مداخلت لازمی ہوئی ہے ۔ ایک وہ وقت جب کہ پہلے جان دار خلیے کی تشکیل ہوئی ، دوسرا وہ مقام جہاں سے حیواناتی اور نباتاتی زندگی جدا ہوئی ، اور تیسرا وہ وقت جب انسان عالم وجود میں آیا ۔“ یہ بات کہنے سے ولاس کا مقصد بھی یہی ہے کہ کم از کم تین ایسے نمایاں مقامات آتے ہیں جہاں بات کو اتفاقات کا سہارا لے کر نہیں ٹالا جاسکتا اور کسی بلند تر قوت کے وجود کو ماننا پڑتا ہے ۔

ارتقائے کائنات کے مسئلہ پر جتنا غور کیا جائے ایک خالق اور رب کی ضرورت کا احساس اتنا ہی شدید ہوتا جاتا ہے ۔ نظریہ ارتقا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات میں زندگی کے ظہور سے قبل بے شمار غیر معمولی اور ہمہ گیر تبدیلیاں واقع ہوئیں ۔ زمین نے ایک خاص ہیئت اختیار کی ، ہوا اور پانی کی ایک مخصوص شکل قایم ہوئی ۔ موسم کا نظام اور ٹمپریچر زندگی کے قیام اور بقا کے لیے سازگار ہوئے ۔ ان گنت تبدیلیوں کے بعد یہ زمین انسان کا مستقر بننے کے لیے تیار ہوئی اور پھر زندگی کا ظہور ہوا ۔ سوال یہ ہے کہ اتنی منظم ، مرتب اور منضبط تبدیلیاں آپ سے آپ کیسے واقع ہوسکتی ہیں ؟ ہر چیز ایک دوسرے سے پیوست ہو اور تمام تبدیلیوں کے تعاون و توافق سے زندگی کے آئندہ مراحل طے ہونے کے لائق بنیں ۔ کیا ایک ہمہ گیر حکمت کے بغیر یہ سب متناسب تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں ؟ کیا عقل اسے ماننے کے لیے تیار ہے کہ یہ سب محض ایک حادثہ اور اتفاق کی بنا پر ہوگیا ۔ اگر اس کا نام ’ حادثہ ‘ اور ’ اتفاق ‘ ہے تو پھر لغت میں ان الفاظ کے معنی تبدیل کرنے پڑیں گے !

کیا کبھی ایسا ’ اتفاق ‘ بھی واقع ہوا ہے کہ حروف کو ایک ڈبے میں ڈال کر ہلایا گیا ہو اور جب ان کو دوبارہ زمین پر ڈالا گیا ہو تو ان سے ایک

Marfat.com

مربوط عبارت بن گئی ہو ؟ کیا کبھی ایسا ' حادثہ ' بھی پیش آیا ہے کہ غالب یا اقبال کی کسی غزل کے الفاظ الٹ پلٹ کر کسی جاہل کو دیے گئے ہوں اور وہ الفاظ کو آگے پیچھے رکھ کر ترتیب دے اور غالب یا اقبال کی غزل نکل آئے ، حالاں کہ حروف ، الفاظ ، ترکیبیں ، استعارے سب وہی ہوں ؟ اگر اس طرح ایک شعر نہیں بن سکتا تو یہ پوری کائنات اور جو کچھ اس میں ہے کس طرح بن سکتے ہیں ؟ بے شک

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے
کو مضبوط (نظام پر) بنایا۔ (النمل - ۸۸)

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا

خدا نے ہر چیز کو پیدا کیا ، پھر اس
کا ایک اندازہ معین کیا - (فرقان - ۲)

حیات و کائنات کی ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سائنسی تجربات اور عقل سلیم دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ہم اس دنیا کو محض اتفاقات کا نتیجہ قرار نہیں دے سکتے - اس کی ہر شے زبان حال سے پکار رہی ہے کہ کسی صاحب حکمت اور ذی اختیار ہستی نے اسے وجود بخشا ہے - وہی اس کی خالق ہے اور وہی اس کی حاکم اور فرماں روا ہے -

وجود باری پر قرآن کا استدلال*

وحی محمدی کا سب سے پہلا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادر مطلق ، خالق عالم اور صانع کائنات ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے - متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے - آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سیکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا ، جس میں سامان تمدن ، اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو ، مگر مذہبی عقیدت اور کسی خدا کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی - ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہوتی ہے - آج بھی دنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی

* یہ حصہ مولانا سید سلیمان ندوی کی کتاب سیرت النبی جلد چہارم سے ماخوذ ہے - (مرتب)

Marfat.com

قومیں مثلی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں ۔ غرض ، جماعت انسانی کا کوئی حصہ ، زمین کا کوئی گوشہ ، زمانہ کا کوئی عہد اس تخیل سے خالی نہیں ملتا ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف بھی انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے ، اس لیے وحی محمدی نے اس کو فطرت سے تعبیر کیا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

اپنا منہ سب طرف سے پھیر کر ، دین کی طرف کر ، یہ خدا کی وہ فطرت ہے
جس پر خدا نے لوگوں کو پیدا کیا خدا کی خلقت میں تبدیلی نہیں ، یہی
سیدھا اور ٹھیک دین ہے ، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ۔ (روم ۔ ۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل مولود یولد علی الفطرة — ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے ۔

اسی لیے خدا کا اعتراف روز ازل کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالق و مخلوق کے درمیان ہوا تھا ۔ اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے ۔

انسان کا یہ جذبہ فطرت کبھی کبھی خارجی اثرات سے دب جاتا ہے ۔ وحی محمدی نے بار بار انسان کے اسی دبے ہوئے جذبہ کو ابھارا ہے ۔ اور اسی زیر خاکستر آگ کو ہوا دی ہے اور انسان کو اس کا بھولا ہوا وعدہ یاد دلایا ہے ۔ وہ انسانوں سے پوچھتی ہے:

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

کیا آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے
والے خدا میں شک ہے؟ (ابراہیم۔۱۰)

اور مقام پر اس نے کہا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝

کیا وہ آپ ہی آپ بن گئے یا وہی اپنے خالق ہیں یا انہیں نے آسمانوں
اور زمین کو پیدا کیا ہے (یہ کوئی بات نہیں) بلکہ ان کو یقین نہیں ہے ۔
(طور ۔ ۳۵ ۔ ۳۶)

دنیا اور کائنات جس میں انسان بھی شامل ہے ، اور جو اپنی عقل اور فہم کی بنا پر سب سے بالاتر ہے ، بہر حال موجود ہے ، اور اس کے اس وجود

Marfat.com

میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کسی کے بن بنائے وہ آپ سے آپ بن گئی ہے، یا خود اس نے اپنے آپ کو بنا لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں باطل ہیں۔ نہ آپ سے آپ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ کوئی مفعول اپنا فاعل آپ ہو سکتا ہے، اگر کوئی بے وقوف یہ کہے کہ نر و مادہ مل کر اپنا بچہ پیدا کرتے ہیں تو اس سے پوچھا جائے گا کہ سلسلہ توالد و تناسل کا آغاز کیوں کر ہوا اور اولین نر و مادہ کا اور مادہ تخلیق و روح کا خالق کون ہے؟

یہ گوناگوں عالم، یہ رنگا رنگ کائنات، یہ تاروں بھرا آسمان، یہ بوقلموں زمین، یہ سورج، یہ چاند، یہ درخت، یہ سمندر، یہ پہاڑ، لاکھوں جان دار اور بے جان اشیا، یہ علل و اسباب کا تسلسل، یہ تغیر و انقلاب کا نظام، یہ کائنات کا نظم، اور اس کے ذرہ ذرہ کا قاعدہ و قانون، انسان کے اندرونی قویٰ اور ان کی باہمی ترتیب، موت و حیات کے اسرار، خواص و قویٰ کے رموز، انسان کی خیالی بلند پروازی، اور عملی عجز و درماندگی، یہ تمام باتیں ایک خالق و صانع کے اعتراف پر مجبور کرتی ہیں۔ یہ نیل گوں آسمان کی چھت، یہ زمین کا سبزہ زار فرش، اور ایک ہی حرکت سے شب و روز کا انقلاب ایک خالق کل کا پتہ دیتا ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ

آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات اور دن کے بدلنے میں
عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں (آل عمران۔ ۱۹۰)

یہ شب و روز کا نور و ظلمت، یہ سورج اور یہ چاند کی روشنی، ان کی مقررہ رفتار، اور باقاعدہ طلوع و غروب اس کی دلیل ہے کہ اس ابلق ایام پر کوئی سوار ہے جس کے ہاتھ میں اس کا سیاہ و سپید ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ

اور اس کی نشانیوں میں سے رات دن اور
سورج اور چاند ہیں۔ (فصلت۔ ۳۷)

آسمان و زمین کی عجیب و غریب خلقت کے ساتھ خود انسان کی اپنی پیدائش کی حکایت کتنی عجیب ہے:

Marfat.com

إِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَفِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

بے شک آسمانوں میں اور زمین میں ایمان والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں، جن کو زمین میں پھیلا رکھا ہے، یقین کرنے والوں کے لیے دلیلیں ہیں - (الجاثیۃ - ۳-۴)

سورۂ انعام میں نباتات اور ان کی نیرنگیوں کو اپنی ہستیوں کی دلیل میں پیش کیا - یہ کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ ایک ہی زمین ہے جس میں سے وہ اگتے ہیں، ایک ہی پانی ہے جس سے وہ سینچے جاتے ہیں، ایک ہی ہوا ہے جس میں وہ سانس لیتے ہیں، مگر کتنے رنگ برنگ کے پھل پھول، میوے اور درخت لگتے ہیں، جن میں سے ہر ایک کا رنگ، ہر ایک کا مزہ، ہر ایک کی پتی، ہر ایک کا قد و قامت، ہر ایک کے خواص اور فائدے، دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں -

سورۂ روم میں پہلے مٹی سے انسان کی پیدائش کو، پھر اس میں عورت مرد کے جوڑے ہونے کو، اور ان کے درمیان مہر و محبت کے جذبات کے ظہور کو اپنی ہستی کی دلیل بتایا ہے - پھر اپنی قدرت کے دوسرے عجائبات کو، جو آسمان سے زمین تک پھیلے ہیں، ایک ایک کرکے پیش کیا ہے، اول تو خود انسانوں کی پیدائش، پھر ان میں عورت مرد ہونا اور ان کے درمیان جذبات کی لہر، پھر مختلف قوموں کی بولیوں، شکلوں اور رنگوں کو دیکھو کہ ایک ایک سے الگ ہے، پھر انسانوں کے اندر کے اعمال کو دیکھو، ایک نیند ہی کی حقیقت پر غور کرو، یہی تمہاری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے -

سورۂ لقمان میں آسمانوں کے، کسی نظر نہ آنے والے سہارے کے بغیر کھڑے ہونے اور زمین کے اپنی جگہ پر ٹھیرے ہونے کا ذکر ہے، یہ نظر نہ آنے والا سہارا، قوت کشش ہی سہی، لیکن وہ بھی تو اسی کے اسرار میں سے ہے - اس کے بعد ایک جامد اور بے حیات مردہ زمین کے اندر سے پانی برسنے کے ساتھ انواع و اقسام کی زندگی کے نمونوں کا ابھر آنا کتنا حیرت انگیز ہے، یہ بھی اسی کا کرشمہ ہے -

سورۂ سجدہ میں انسان کی پیدائش کا مٹی سے آغاز، پھر قطرۂ آب (نطفہ) کے ذریعہ توالد و تناسل، پھر اس کے سڈول جسم کا بن جانا، پھر اس مٹی کے

Marfat.com

مردہ قالب میں دفعتاً کہیں سے زندگی آ جانا اور اس میں روح پھونک جانا اور اس میں علم و حواس کے حیرت انگیز آلات کا پیدا ہو جانا ان سب کو اپنی صنعت میں پیش کیا ہے۔

مردہ زمین کے اندر کیا کیا قوتیں ودیعت ہیں، اور خود انسانوں کے جسم و جان میں عجائبات کا کتنا خزانہ رکھا ہے، لیکن کوئی صاحب نظر نہیں دیکھتا۔ انسان کی زندگی، اس کے اندرونی جذبات، حواس، ذہنی قویٰ اور دماغی حرکات، ان میں سے ہر شے معمہ ہے:

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ۝

اور زمین میں یقین کرنے والوں کے لیے، نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری جانوں کے اندر، کیا تم نظر نہیں کرتے؟ (ذاریات - ۲۰-۲۱)

جانوروں کے جسموں کے اندر جو عجیب و غریب نظام ہے، وہ بھی غور کے قابل ہے۔ ایک ہی گھاس پھوس کی غذا ان کے پیٹ میں جاتی ہے، پھر اسی کا کچھ حصہ لید اور گوبر، کچھ خون اور کچھ دودھ بن جاتا ہے۔ اور اسی لید اور گوبر کے باہر آنے کے راستوں اور سرخ خون کی رگوں کے درمیان سے خالص سپید شیریں دودھ کی دھاروں کا نکلنا کتنا عجیب ہے!

ایک ہی قسم کے پھل ہیں۔ اگر ان کو ایک طرح سے کھاؤ تو تمہاری عقل اور قوت کو بڑھاتے ہیں، اور دوسری طرح کھاؤ (یعنی منشیات بنا کر استعمال کرو) تو اس کو ضائع کر دیتے ہیں۔

زمین اور زمین پر کی مخلوقات کو چھوڑ کر، آسمان کی طرف نظر اٹھاؤ، سورج کا روشن چراغ اور چاند کی خوش نما قندیل کتنی عجیب ہے، پھر سورج کو دیکھو کہ سال کے بارہ مہینوں میں آسمان کے بارہ برج طے کر کے کس طرح زمین میں مختلف موسموں اور زمانوں کو نمایاں کرتا ہے۔

ان ہی چند چیزوں تک اس کی قدرت کے عجائبات محدود نہیں، بلکہ ہر شے اپنی خلقت، اپنی محکم روش، اور اپنے قانون فطرت سے اس کی گواہی دیتی ہے:

Marfat.com

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَیْءٍ

اس اللہ کی صنعت ہے جس نے ہر شے کو
مضبوط (نظام پر) بنایا۔ (النمل - ۸۸)

اس کی صنعت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔ اس میں مستحکم نظم و نسق کی بندش نظر آتی ہے۔

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ

تجھے مہر والے خدا کی بناوٹ میں کوئی بے برابری نظر آتی ہے؟ پھر نگاہ کر کیا کوئی فطور دکھائی پڑتا ہے، پھر دھرا کر دوبارہ نظر کر، تیری نگاہ رد ہوکر تھک کر تجھ تک پلٹ آئے گی (مگر کوئی نقص نہ پا سکے گی)۔ (الملک - ۳)

اس قسم کی اور سیکڑوں آیتیں ہیں جن کا ذکر بھی مشکل ہے، ان آیتوں میں تین قسم کے دلائل ہیں،

۱- قدرت کے عجائبات اور نیرنگیاں، اور پھر ان کا ایک قانون کے ماتحت ہونا۔

۲- عالم کا نظم و نسق اور اس کا مرتب سلسلہ۔

۳- کائنات اور سلسلۂ عالم کی ہر کڑی میں بے انتہا مصلحتوں، حکمتوں اور فائدوں کا ہونا۔

ان مقدمات سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے یہ عجائبات اور اس کے یہ منظم علل و اسباب، خود بہ خود بخت و اتفاق سے نہیں بن گئے بلکہ کسی حکیم و دانا اور قادر مطلق صانع نے اپنی قدرت اور ارادہ سے ان کو بنایا ہے۔

توحید کے دلائل *

اس سے پہلے ہم دیکھ چکے ہیں کہ عقل و وجدان اس بات پر متفق ہیں کہ اس کائنات کی تخلیق کے لیے کسی ذی شعور اور صاحب اختیار ہستی کی ضرورت ہے۔

* یہ حصہ مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب "حقیقت توحید" سے ماخوذ ہے۔ لیکن مضمون کی موجودہ ترتیب مرتب کتاب کی قایم کردہ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ عقل کی رو سے اس کائنات کا وجود و بقا محض ایک ہستی کا رہین منت ہے ۔ عقلی طور پر ایک سے زیادہ خالق و مالک ہستیوں کا وجود ممکن نہیں ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہر اجتماعی نظام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو ۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصور اس وقت تک نہیں کرسکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں ۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرے میں پھیلانے کی کوشش کی ہے ، تاہم اس میں بھی ایک نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے ۔ بہ ہر حال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ اب ذرا سوچیے کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزاء پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قایم ہے بلکہ پورے استحکام کے ساتھ قایم ہے ، اس میں مختلف قوتوں کا تصادم بھی ہے، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں ، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں ، لیکن دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی سنبھلتی اور اتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے ۔ ان اضداد کے باوجود دنیا کی بقا محض اس بنا پر ہے کہ اس دنیا میں کئی حکمراں نہیں بلکہ صرف ایک حکمراں ہے ، جس کا اختیار سب سے بالاتر ہے اور وہ ان سب کو سنبھالے ہوئے ہے ۔

ایک اور اہم پہلو اس کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق اور ان کی باہمی سازگاری ہے ، اسی طرح کی موافقت اور سازگاری جیسی کہ زوجین میں نظر آتی ہے ۔ عورت اور مرد اپنی خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں لیکن اس کے باوجود اگر عورت نہ ہو تو مرد کی قابلیتوں اور قوتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہوجاتا ہے ۔ اسی طرح اگر مرد کو معدوم فرض کرلیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جائے گی ۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے ۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی ، نور و ظلمت ، حرارت و برودت سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں ۔

Marfat.com

توافق کا یہ پہلو صرف ضدین ہی میں نہیں ۔ بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق اور سازگاری ہے ، ہر چیز اپنی ہستی کی بقا اور اپنے وجود کی نشو و نما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے ۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں ، زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے ، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے ، سورج اس کو گرم رکھے ، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے ، ہوائیں اس کو لوریاں دیں اور جب یہ سب کچھ ایک نظم و ضبط کے ساتھ مکمل ہولے تب گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے ۔ یہی حال دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے ۔

جو انسان اپنی دونوں آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں ، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی ہے اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے ، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں ، وہ انسان یہ کیسے تصور کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں ، بارش کوئی لاتا ہے اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے ؟ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر ، قوت ، حکمت و رحمت کے ساتھ ایک خاص مقصد کے لیے تصرف میں لائے ۔

قرآن اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارہ کرتا ہے ۔ بادلوں سے پانی برستا ہے ، اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے ۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں ۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے ۔ پھر آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے ۔ پھر اس بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے ۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر ، درختوں پر ، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنالیتی ہیں ۔ پھول پھول کا رس چوس چوس کر اس کو جمع کرتی ہیں ۔ جس کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف ۔ انسان اس کو پیتا ہے ،

Marfat.com

اس سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی ۔ ان مناظر کو جو بھی دیدۂ عبرت سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مناظر بالکل ایک اتفاقی حادثے کے طور پر ظہور میں آگئے ہیں؟ یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں ؟ جو دنیا اتنے بعید اجزا کی کشاکشوں کے اندر بھی توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہے وہ نہ تو اتفاقی حادثہ ہوسکتی ہے اور نہ مختلف ارادوں کی رزم گاہ ہوسکتی ہے ۔ ظاہر بیں نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں ، موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی ۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں ۔ اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے ۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے ۔ تاہم دیکھو ، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں ۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے ۔ کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں ۔

پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو ، دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود ، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں ، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سر گرم ہیں ۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے ، اور گرمی اور دھوپ کا سر چشمہ ہے ۔ چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے ۔ بہ ظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلا واسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں ۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے ؟ کیا یہ نظم ، یہ ضابطہ کی پابندی ، یہ سازگاری ، یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے ؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے

Marfat.com

اتفاق حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض ' نہ ماننے کی خواہش ' پر مبنی ہے ۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے ۔

پھر جو چیز ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے جو اس کے ہر گوشے میں جلوہ آرا ہے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ ، بے رنگ نہیں ہے ۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی ایسا چپہ نہیں ہے جہاں سے انسان غافل اور بے پروا گزر سکے ۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے ، اس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اس کے کانوں کے کھولنے کے لیے دلفریب مناظر ، بے حجاب جلوے ، اور شیریں نغمے موجود ہیں ، اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کر دیا گیا ہے ۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے ارد گرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے تو دفعتاً اس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے ، کیوں کہ وہ یہ تصور کرنے سے بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمور دنیا خود بہ خود وجود میں آ گئی ۔ اگر اس کے دل و دماغ پر پردہ نہ پڑا ہو تو وہ بے اختیار پکار اٹھتا ہے :

فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۝

بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو تمام
صناعوں سے بڑھ کر ہے ۔ (المومنون ۔ ۱۴)

یعنی صرف اس بات کا احساس نہیں ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ خالق بہترین خالق ہے ۔ یکسر خیر و برکت ہے ، اس نے جو چیز بنائی ہے وہ کمال قدرت ، کمال صنعت ، اور کمال خیر و برکت کا کامل نمونہ ہے :

الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ

جس نے جو چیز بنائی خوب بنائی (السجدہ ۔ ۷)

ظاہر ہے کہ دنیا اپنی بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگ حسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی ۔ یہ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن ، یہ نشیب و فراز ، یہ وادی و کوہسار نہ ہوتے ۔ ممکن تھا یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے ، ممکن تھا یہ آسمان

Marfat.com

ہوتا مگر ستاروں کی یہ بزم آرائیاں ، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس و قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں - لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا ان تمام جلوؤں سے معمور ہے - سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ انسان کے باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمال قدرت ، کمال صنعت و حکمت ، اور کمال خیر و برکت کی تمام صفات سے متصف ہے -

یہ رنگا رنگ جلوے ، جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے ، صرف ایک علت العلل کی شہادت نہیں دیتے ، جیسا کہ ہمارے متکلمین کہتے ہیں - بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو تمام صفات جمال و کمال سے متصف ہے کیوں کہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دنیا بنی ہے بلکہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو چیز بنی ہے ، خوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے ، حکیم ہے ، قدیر ہے ، علیم ہے ، مہربان ہے ، کریم ہے - اس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت پر ، بہترین قویٰ اور قابلیتوں اور نہایت اعلیٰ فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے -

ظاہر ہے کہ یہ صرف خلق نہیں ہے بلکہ کمال خلق اور کمال قدرت ہے - صرف بخشنا نہیں ہے بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے - صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمال ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے -

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزا کے حسن و جمال کے مشاہدہ نے ہمارے سامنے آتا ہے - لیکن جب ہم ان اجزا کے انفرادی وجود سے گذر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین و جمیل وحدت یعنی اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے ، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے - یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے - جس طرح ہم ایک حسین متناسب الاعضا اور خوب صورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے

Marfat.com

ہیں کہ یہ ایک ہی خوش ذوق اور کار فرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے - اگر اس کے مختلف اعضا و اجزا کی تشکیل مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا - اسی طرح اس مجموعی دنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے - اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس میں کار فرما ہوتے تو اولاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دوکان کی شکل میں ہوتی اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے جہاں ہر چیز بے قرینہ ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی کیوں کہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے -

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبر ہستی ہے جو ان اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی اور اس کو پروان چڑھاتی ہے ؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے اور اس کے مختلف اجزاء کا ارتقا بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاق ہے ؟ کیا اس کا جمال اور حسن بھی محض ایک حادثہ ہیں ؟ کیا نتائج کی یکسانی اور نظام کی وحدت بھی بلا منصوبہ ہیں؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحے کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے ؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ صورت حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور وہ اپنے علم و حکمت اور بلا شرکت غیرے مکمل اختیارات کی وجہ سے مختلف اجزاء میں ربط و اتصال پیدا کرتا ہے - اگر آسمان و زمین میں اس کی قوت میں کوئی شریک ہوتا یا یہاں بہت سے ارادوں اور ذہنوں کی کار فرمائی ہوتی تو کائنات میں توافق و تناسب ہرگز نہ ہوتا -

Marfat.com

اسلام کا تصور خدا*

مختلف اقوام و مذاہب نے خدا کو جن جن صفات کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے تصور نے ان مذاہب کے پیروؤں کی سیرت و کردار پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ خدا کا ایک تصور انسان کو ڈرپوک اور بزدل بنا دیتا ہے، دوسرا ظالم اور سنگ دل۔ ایک تصور انسان کو کشمکش حیات سے مفرور کرکے پہاڑوں اور جنگلوں میں جا ڈالتا ہے، دوسرا اسے ناچ رنگ کے جلسوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اسی طرح ایک تصور خدا انسان کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ آگ، پانی، پہاڑ، جنگل جیسی اشیا کے سامنے گھٹنے ٹیک دے اور دوسرا اسے خلیفۃ اللہ بنا کر عناصر کی تسخیر پر مامور کرتا ہے۔ ذیل میں ہم دیکھیں گے کہ اسلام نے خدا کا کیا تصور پیش کیا ہے۔

بہت سے جدید معاشروں میں خدا کا تصور یہ رہا ہے کہ اگرچہ وہ آخری اقتدار کا مالک ہے لیکن اسے اپنے بندوں کی زندگی اور ان کے مسائل سے کوئی خاص دلچسپی نہیں، اس نے محض تخلیق کا ایک کھیل رچا رکھا ہے اور اس سے اسی طرح لطف اندوز ہو رہا ہے جیسے کوئی بچہ پھلجڑی چھوڑ کر مزا لیتا ہے۔ زندگی اور موت، صحت و بیماری، قحط و خوش حالی، مسرت و نکبت اس کی قدرت کے تماشے ہیں جن سے اس کی مخلوق کو واسطہ پڑتا ہے لیکن اس کی تقدیر کا دریا اپنے بہاؤ کی رو میں مگن ہے، نہ اس کی فکر کہ کون ڈوبتا ہے، نہ اس سے واسطہ کہ کون بچتا ہے، خدا کو نہ ہمارے دکھ درد سے واسطہ ہے نہ ہمارے خیر و شر سے، وہ ہمارے آنسوؤں اور تبسموں سے بے پرواہ اور ہمارے خیر و شر سے بے نیاز ہے۔

خدا کے بارے میں یہ تصورات انسان کے ناقص شعور کے مظہر ہیں۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پوری مخلوق اور خصوصاً انسانی زندگی کی فلاح و بہبود سے براہ راست دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ محض موجودات کا خالق اور تقدیر ساز ہی نہیں، ہادی و رہنما بھی ہے:

---

* یہ حصہ جناب نعیم صدیقی صاحب کے ایک مقالے " ہمارا تصور خدا " سے ماخوذ ہے۔ ملاحظہ ہو فکر و نظر از نعیم صدیقی۔ (مرتب)

Marfat.com

الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى ۙ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى ۙ

(رب تو وہی ہے) جس نے ہر شے کو پیدا
کیا پھر اس کو درست بنایا اور جس نے
ایک اندازہ بنایا (تجویز کیا) پھر ہدایت
عطا فرمائی (الا علیٰ)

اس نے انسان کو جب حیاتِ ارضی کے لیے میدان میں آتارا تو آسے اطمینان بھی دلا دیا کہ تم کو اندھیرے میں نہیں چھوڑا جا رہا ہے، تمہاری رہنمائی کی جائے گی:

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

پھر جب میری طرف سے کوئی ہدایت (دین و شریعت) آئے تو جو
شخص میری اس ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگوں کو
نہ تو کچھ خوف و اندیشہ ہوگا اور نہ ایسے لوگ غمگین
ہوں گے۔ (البقرہ۔ ۳۸)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کی روز مرہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک ایک معاملے سے اتنا گہرا اور قریبی واسطہ رکھتا ہے کہ انہیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی ٹوکتا ہے، مختلف سرگرمیوں کے بھلے اور برے پہلو نمایاں کرتا ہے، قدم قدم پر ہدایت دیتا ہے۔ وہ کہیں عدل، احسان اور اقربا سے محبت کی نصیحت کرتا ہے، کہیں نفاق اور بزدلی اور مفاد پرستی سے روکتا ہے۔ کہیں وہ مرد و زن کو گھر کی پاکیزہ فضا کو قایم رکھنے کا سبق دیتا ہے، کہیں رضاعت اور میراث کے معاملات میں ان کو پریشانیوں سے نکالتا ہے۔ کہیں آداب مجلس سکھاتا ہے۔ کہیں حدود و تعزیرات اور قوانین متعین کرتا ہے۔ الغرض دکھ درد میں وہ ساتھی اور مشکلات میں شفیق ترین استاد ہے۔ وہ اپنے بندوں کو کبھی بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ ایسے خدا کو ماننے سے جو اعتماد، یقین اور پختہ شعور حاصل ہوتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔

یہ خدا سب کچھ جاننے اور دیکھنے والا ہے۔ کوئی آڑ نہیں جو بیچ میں حائل ہو، کوئی مغالطہ نہیں جس کا وہ شکار ہو جائے، وہ دلوں کے بھید اور نیتوں کے ہر گوشے سے واقف ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کا پورا علم رکھتا ہے، پھر وہ صاحب قوت بھی ہے، جس پر ضعف و نقاہت کا غلبہ نہیں ہوتا، جسے کام کا بوجھ دوسروں پر بانٹنے کی کوئی مجبوری در پیش نہیں ہے اور جو اپنی ذمہ داریوں میں کسی دوسرے کے مشورے یا تعاون کا محتاج نہیں!

Marfat.com

یہ خدا صرف صاحب قوت ہی نہیں، اپنے بندوں کا رفیق و دم ساز اور ولی و کارساز بھی ہے:

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ مَوْلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

یہ اس سبب سے کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کا
کارساز ہے۔ (محمد - ۱۱)

رفیق بھی ایسا رفیق نہیں جو وقت پڑے پر ھاتھ نہ آئے۔ بلکہ پکا ساتھی، ہر ہر لمحے کا ساتھی، برے اور بھلے کا ساتھی:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ

تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے
ساتھ ہے۔ (الحدید - ۴)

ایسا ساتھی جو کٹھن گھڑیوں میں ہمت بندھاتا ہے۔ جب بندوں کو کوئی چرکہ لگتا ہے تو فوراً مرہم تسکین لیے پاس موجود ہوتا ہے۔ اپنے قصر رحمت کا باب قبول کھول دیتا ہے کہ ناسازگار حالات کی آندھیوں میں مجھے پکارو میں تمہاری فریاد بس سنتا ہوں اور ان پر مناسب کارروائی کرتا ہوں:

اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ

مجھے پکارو (دعا کرو) میں تمہاری
(دعا کو) قبول کروں گا۔
(المومن - ۶۰)

وہ دلوں کو اطمینان دلاتا ہے کہ جب تم کرب کی گھڑیوں میں مجھے بے بس ہو کر پکارتے ہو تو میں مصیبت کی گھٹاؤں کو چھانٹ دیتا ہوں:

اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ

وہ کون ہستی ہے کہ جب بے قرار آدمی
اس کو پکارتا ہے تو اس کی سنتا ہے۔ اور
اس کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔
(النمل - ۶۲)

یہ وہ خدا ہے جو قہار و جبار بن کر اپنے تخت پر براجمان نہیں ہوتا بلکہ اپنے بندوں کے سروں پر شفقت کا ھاتھ پھیرتا ہے، ان کے جلتے ہوئے سینوں کو تسکین کی ٹھنڈک پہنچاتا ہے، ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، اس کا تصور اتنی بڑی طاقت ہے کہ انسان — اگر اس نے اسے فی الواقع اپنے اندر جذب کر لیا ہو تو — رضائے الٰہی پر نگاہ جما کر اپنی زندگی کو داؤں پر رکھ سکتا ہے،

Marfat.com

وہ آروں کے نیچے چر سکتا ہے ، اپنے تئیں کھال کھینچنے والے قصائیوں کے حوالے کر سکتا ہے ، پھانسی کے تختوں پر کھڑا ہو سکتا ہے ، کوڑوں کی بارش میں ثابت قدم رہ سکتا ہے ، اور کیا نہیں کر سکتا ۔ لیکن یہ سب اس بات پر منحصر ہے کہ انسان اس تصور کو حقیقتاً جذب کر لے !

توحید کے اثرات انفرادی اور اجتماعی زندگی پر*

توحید مجرد ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت بھی ہے ۔ انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی ، توحید کے تصور سے یک سر بدل کر رہ جاتی ہے ۔ ان اثرات میں سے چند کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے ۔

انسانی زندگی پر اس کا سب سے نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہ عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی حیثیت سے مستحق ہے ۔ تمام کائنات انسان کے لیے ہوتی ہے لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دنائت اور رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے ۔ جو چیزیں اس کی تابع داری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابع داری اور اطاعت کرتا ہے ۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے ، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے یہاں تک کہ زندوں سے گذر کر مُردوں سے بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے اور بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور اپنے شرف اور اپنی عزت سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے ۔ اس کے برخلاف عقیدۂ توحید انسان میں انتہا درجے کی خود داری اور عزت نفس پیدا کر دیتا ہے ۔ اس پر اعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ صرف ایک خدا تمام طاقتوں کا مالک ہے ۔ اس کے سوا کوئی نفع نقصان پہنچانے والا نہیں ، کوئی مارنے اور جلانے والا نہیں ، کوئی صاحب اختیار اور با اثر نہیں ۔ یہ علم اور یقین اس کو خدا کے سوا تمام قوتوں سے بے نیاز اور بے خوف کر دیتا ہے ۔ اس کی گردن کسی مخلوق کے سامنے نہیں جھکتی ، اس کا ہاتھ کسی کے آگے نہیں پھیلتا ، اس کے دل میں کسی کی بزرگی کا سکہ نہیں بیٹھتا ۔ یہ صفات سوائے عقیدۂ توحید کے اور کسی عقیدے سے پیدا

* یہ حصہ بھی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی کتاب "حقیقت توحید" سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

نہیں ہوسکتیں ۔ شرک اور کفر کی لازمی خصوصیات یہ ہیں کہ انسان مخلوقات کے آگے جھکے، ان کو نفع و نقصان کا مالک سمجھے ، ان سے خوف کھائے اور ان ہی سے امیدیں وابستہ رکھے ۔

اس تمام خود داری اور عزت نفس کے ساتھ یہ عقیدہ انسان میں تواضع اور انکسار بھی پیدا کرتا ہے ۔ اس کا قائل کبھی مغرور اور متکبر نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہے خدا کا دیا ہوا ہے اور خدا جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح چھین لینے پر بھی قادر ہے ۔ اس کے مقابلے میں الحاد کا عقیدہ رکھنے والے کسی انسان کو کوئی دنیوی کمال حاصل ہوتا ہے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ اس کمال کو محض اپنی قابلیت کا نتیجہ سمجھتا ہے ۔

یہ عقیدہ رکھنے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہوسکتا ، وہ ایسے خدا کا قائل ہوتا ہے جو زمین و آسمان کا خالق ، مشرق و مغرب کا مالک اور تمام جہان کا پالنے والا ہے ۔ اس ایمان کے بعد ساری کائنات کی کوئی چیز اسے غیر نظر نہیں آتی ۔ وہ سب کو اپنی ذات کی طرح ایک ہی مالک کی ملکیت اور ایک بادشاہ کی رعیت سمجھتا ہے ۔ اس کی ہمدردی ، محبت اور خدمت کسی دائرے کی پابند نہیں رہتی ۔ اس کی نظر ویسی ہی غیر محدود ہو جاتی ہے جیسی خود خدائے تعالیٰ کی بادشاہی غیر محدود ہے ۔ یہ بات کسی ایسے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتی جو بہت سے چھوٹے چھوٹے خداؤں کا قائل ہو ۔

اسی طرح عقیدۂ توحید پر ایمان لانے والا یہ سمجھ لیتا ہے کہ نفس کی پاکیزگی اور نیک عمل کے سوا اس کے لیے نجات اور فلاح کا کوئی ذریعہ نہیں کیوں کہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جو بے نیاز ہے ، کسی سے کوئی رشتہ نہیں رکھتا ، بے لاگ عدل کرنے والا ہے اور کسی کو اس کی خدائی میں کوئی دخل نہیں ۔ اس کے مقابلے میں کفار و مشرکین ہمیشہ جھوٹی توقعات پر زندگی بسر کرتے ہیں ، ان میں کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہمارے لیے کفارہ بن گیا ، کوئی اپنے کو خدا کا چہیتا سمجھتا ہے، کوئی اپنے بزرگوں پر مغرور ہے تو کسی کو گمان ہے کہ ہم نذر و نیاز دے کر چھوٹ جائیں گے ۔ اس طرح کے اعتقادات انسان کو گمراہی میں پھنسائے رکھتے ہیں ۔

اس عقیدے کا حامل کسی حال میں مایوس اور شکستہ دل نہیں ہوتا ۔ وہ ایک ایسے خدا پر ایمان رکھتا ہے جو زمین اور آسمان کے تمام خزانوں کا مالک ہے ،

Marfat.com

جس کا فضل و کرم بے حد و حساب ہے، جس کی قوتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایمان اس کے دل کو غیر معمولی تسکین بخشتا ہے، اس کو اطمینان سے بھر دیتا ہے اور ہمیشہ امیدوں سے لبریز رکھتا ہے، چاہے وہ دنیا کے سارے دروازوں سے ٹھکرا دیا جائے۔ سارے اسباب کا رشتہ ٹوٹ جائے اور وسائل، ذرائع ایک ایک کرکے اس کا ساتھ چھوڑ دیں پھر بھی ایک خدا کا سہارا کسی حال میں اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اسی کے بل بوتے پر وہ نئی امیدوں کے ساتھ کوشش پر کوشش کیے چلا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف کفار و مشرکین کے دل چھوٹے ہوتے ہیں، ان کا بھروسہ محدود طاقتوں پر ہوتا ہے، اس لیے مشکلات میں بہت جلد مایوسی ان کو گھیر لیتی ہے اور اکثر ایسی حالت میں وہ خودکشی تک کر گذرتے ہیں۔[۱]

عقیدۂ توحید انسان میں قناعت اور بے نیازی کی شان پیدا کر دیتا ہے۔ حرص و ہوس اور رشک و حسد کے رکیک جذبات اس کے دل سے نکال دیتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے ناجائز اور ذلیل طریقے اختیار کرنے کا خیال تک اس کے ذہن میں نہیں آتا، وہ سمجھتا ہے کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے زیادہ دے جس کو چاہے کم دے۔ عزت اور طاقت، ناموری اور حکومت سب کچھ خدا کے اختیار میں ہے۔ اگر وہ دینا چاہے تو دنیا کی کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی اور نہ دینا چاہے تو کوئی طاقت دلوا نہیں سکتی۔ اس کے مقابلے میں مشرکین اور کفار اپنی کامیابی اور ناکامی کو اپنی کوششوں اور دنیوی طاقتوں کی مخالفت یا مدد پر موقوف سمجھتے ہیں، اسی لیے ان پر حرص و ہوس کا غلبہ رہتا ہے۔ کامیابی حاصل کرنے کے لیے رشوت، خوشامد اور سازش اور ہر قسم کے بدترین ذرائع اختیار کرنے میں انہیں باک نہیں ہوتا۔

یہ عقیدہ انسان میں عزم و حوصلہ اور صبر و توکل کی زبردست طاقت پیدا کر دیتا ہے۔ صبر و توکل کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مومن کوشش اور سعی کو چھوڑ دیتا ہے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاتا ہے بلکہ وہ جانتا ہے کہ اچھے مقاصد کے لیے سعی پیہم اللہ کی خوشنودی کا سبب ہے۔ وہ جب دنیا میں بڑے کام انجام دینے کے لیے اٹھتا ہے تو اس کے دل میں یہ یقین ہوتا ہے کہ میری پشت پر

۱- مورخین مثلاً فلپ کے۔ ہٹی نے اس بات کی طرف خاص طور پر اشارہ کیا ہے کہ مسلمان اس حیثیت سے تاریخ میں ممتاز ہیں کہ ان میں خودکشی کی وارداتیں بالکل شاذ ہیں۔ (مرتب)

Marfat.com

زمین و آسمان کے بادشاہ کی قوت ہے۔ ایسی قوت جس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ یہ خیال انسان کو پہاڑ کی سی مضبوطی عطا کرتا ہے اور دنیا کی ساری مشکلات اور ساری مصیبتیں اور مخالف طاقتیں مل کر بھی اس کو اس کے عزم سے نہیں ہٹا سکتیں۔

پھر یہ اعتقاد انسان کو بہادر بنا دیتا ہے۔ انسان کو بزدل بنانے والی در اصل دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک تو جان و مال اور بچوں کی محبت اور دوسرے یہ خیال کہ خدا کے سوا کوئی اور مارنے یا جلانے کی طاقت رکھتا ہے اور یہ کہ انسان اپنی تدبیر سے موت کو ٹال سکتا ہے۔ توحید کا عقیدہ ان چیزوں کو دل سے نکال دیتا ہے۔ پہلی چیز تو اس لیے نکل جاتی ہے کہ اس کا قائل اپنی جان و مال اور ہر چیز کا مالک خدا ہی کو سمجھتا ہے اور اس کی خوشنودی کے لیے سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ رہی دوسری چیز تو وہ اس وجہ سے باقی نہیں رہتی کہ توحید کا عقیدہ رکھنے والے کے نزدیک جان لینے کی قدرت کسی انسان یا حیوان یا توپ یا تلوار میں نہیں، اس کا اختیار صرف خدا کو ہے اور اس نے موت کا جو وقت مقرر کردیا ہے اس سے پہلے دنیا کی تمام قوتیں مل کر بھی چاہیں تو کسی کی جان نہیں لے سکتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ پر ایمان رکھنے والے سے زیادہ بہادر کوئی نہیں ہوتا اس کے مقابلے میں تلواروں کی باڑھ اور گولیوں کی بوچھاڑ اور گولوں کی بارش اور فوجوں کی یورش سب ناکام رہ جاتی ہیں اور جب وہ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے بڑھتا ہے تو اپنے سے دس گنی طاقت کا بھی منہ پھیر دیتا ہے۔

توحید کا عقیدہ انسان کو خدا کے قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کا ماننے والا جانتا ہے کہ خدا ہر چھپی اور کھلی چیز سے با خبر ہے، ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے، اگر ہم رات کے اندھیرے میں اور تنہائی کے گوشے میں بھی کوئی گناہ کریں تو خدا کو اس کا علم ہو جاتا ہے۔ اگر ہمارے دلوں کی گہرائی میں بھی کوئی برا ارادہ پیدا ہو تو خدا تک اس کی خبر پہنچ جاتی ہے، ہم سب سے چھپا سکتے ہیں مگر خدا سے نہیں چھپا سکتے، سب سے بھاگ سکتے ہیں مگر خدا سے فرار ممکن نہیں، سب کی پکڑ سے بچ سکتے ہیں مگر خدا کی گرفت سے نہیں نکل سکتے۔ یہ یقین جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی زیادہ انسان اپنے خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، جس چیز کو خدا نے حرام کیا ہے وہ اس کے پاس بھی نہ پھٹکے گا، جس چیز کا

Marfat.com

اس نے حکم دیا ہے اس کو تنہائی اور تاریکی میں بھی بجا لائے گا کیوں کہ اس کے ساتھ ایک ایسی پولیس لگی ہے جو کسی حال میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی اور اس کو ایک ایسی عدالت کا کھٹکا لگا رہتا ہے جس کے وارنٹ سے وہ کہیں بھاگ ھی نہیں سکتا ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم ہونے کے لیے سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط ' لا الہ الا اللہ ' پر ایمان لانا ہے ۔ مسلم کے معنیٰ خدا کے فرماں بردار بندے کے ھیں اور خدا کا فرماں بردار ھونا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ انسان اس بات پر یقین نہ لائے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ۔

عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی

عقیدۂ توحید کا جتماعی زندگی پر بھی گہرا اثر پڑتا ہے ۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قایم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت الہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے ۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا میں سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے انسان کے شعور نے ترقی نہیں کی ۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حد بندیاں توڑ ڈالیں اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح مختصر کر دیا ، رسل و رسائل کی آسانیوں نے اخبار و افکار کی نشر و اشاعت انتہائی سہل کر دی ۔ لیکن اس سب کے باوجود انسانی ذہن کی تنگی کا حال یہ ہے کہ دنیا اب تک قوم پرستی اور وطن پرستی سے نجات حاصل نہیں کر سکی ۔ وطن پرستی کے معنیٰ یہ ھیں کہ انسان ھر حال میں اپنے وطن کا ساتھ دے ، خواہ وہ حق پر ھو یا نہ ھو۔[1] یہ قوم پرستی بھی در حقیقت شرک کی ایک قسم ہے اسی قوم پرستی نے گذشتہ نصف صدی میں تاریخ انسانی کی ھولناک ترین جنگوں کو جنم دیا اور آج بھی انسانیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے ۔ اسی خطرے کے پیش نظر دنیا کے سوچنے سمجھنے والے لوگ عالمی ریاست کی حمایت کرتے ھیں لیکن ظاھر ہے کہ یہ ساری کوششیں اس وقت تک بے کار ھیں جب تک انسانیت وحدت الہ اور وحدت آدم پر اشتراک نہیں کرتی ۔

۱۔ یہ ذھن میں رہے کہ وطن پرستی اور حب الوطنی دو بالکل مختلف چیزیں ھیں۔ حب الوطنی ایک فطری جذبہ ہے لیکن وطن پرستی کے معنیٰ یہ ھیں کہ انسان حق و ناحق کا معیار خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر محض اپنے وطن کو بنالے ۔ یہ شرک کی ایک شکل ہے اور اسلام اس کی بھی اسی طرح بیخ کنی کرتا ہے جس طرح شرک کی باقی تمام شکلوں کی ۔ (مرتب)

Marfat.com

اس وقت اقوام میں افراتفری کا عالم یہ ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے اور نہ آدم ۔ ہر قوم کا خدا الگ ہے ، اس کی نسل الگ ہے ، اس کی شریعت جدا ہے ، اس کے معتقدات اور اخلاق جدا ہیں ۔ اور ہر قوم اس علیحدگی کو نہ صرف قایم رکھنا چاہتی ہے بلکہ اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک رشتہ موجود نہیں ۔ مشترک رشتہ صرف ایک ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ سب ایک ہی خدا کو مانیں ، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلا شبہ ایک عالم گیر سیاسی تنظیم کی عمارت قایم ہو سکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے ۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کی جائیں گی وہ رشتے میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی اور کسی مشکل کو حل نہیں کر سکیں گی ۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی ، **سیرت النبی** (جلد چہارم ، ابواب بر توحید) ۔ دارالمصنفین ، اعظم گڑھ ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، **ترجمان القرآن** (جلد اول : تفسیر سورۃ الفاتحہ ۔ یا **ام الکتاب** باب ۳ - ۴ ، اور مقالہ بر ' قرآن اور صفات الٰہی کا تصور') ۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔

مولانا ابوالکلام آزاد ، **غبار خاطر** (مکتوب ۱۷ اکتوبر ۱۹۴۲) ۔ کتاب گھر ، انارکلی ، لاہور ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** ، (باب سوم ، فصل سوم) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، **رسالہ دینیات** (باب چہارم) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

مولانا امین احسن اصلاحی ، **حقیقت شرک** ۔ مکتبہ جماعت اسلامی ، لاہور ۔

مولانا امین احسن اصلاحی ، **حقیقت توحید** ۔ مکتبہ جماعت اسلامی ، لاہور ۔

شبلی نعمانی ، **الکلام** (صفحہ ۳۰ تا ۶۰) ۔ نفیس اکیڈمی ، کراچی ۔

مولانا مناظر احسن گیلانی ، **الدین القیم** (صفحہ ۲۷ تا ۱۵۰) نفیس اکیڈمی ، کراچی ۔

شیخ عبدالعزیز شاویش مصری (مترجم افتخار احمد بلخی) ۔ **اسلام اور فطرت ۔ مضامین متعلقہ توحید** ۔ عباسی کتب خانہ ، کراچی ۔

Marfat.com

۱۱

رسالت

انبیا کی ضرورت *

انسان کو انبیاؑ کی کیا ضرورت ہے؟ رسولوں کا سلسلہ کیوں قایم کیا گیا؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ ان مسائل پر غور کرنے کے لیے ہمیں پہلے یہ دیکھنا پڑے گا کہ انسان کو اپنی زندگی میں فلاح کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اور وہ صحیح کامیابی کیوں کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تو ظاهر ہے کہ دنیا کی کامیابی زیادہ عرصہ قایم رہنے والی نہیں ہے، بڑی کامیابی یہ ہے کہ انسان کو آخرت میں، جو باقی رہنے والی ہے، کامیابی نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ انسان دونوں عالم میں کامیابی حاصل کرے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقاصد کا تعین صحیح طور پر کرے اور اس کے حصول کے لیے صحیح راہ عمل تلاش کرے۔ اس کے لیے اُسے هدایت کی ضرورت ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ فلاح کس عقیدے اور کس طریقے میں ہے۔

اسلام نے اس دوگونہ کامیابی کے حصول کا جو طریقہ بتایا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت ہے اس لیے کہ هدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے اور اس کی اطاعت کے ذریعے سے اس هدایت سے پورا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

---

* یہ حصہ مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب ''اسلام ایک نظر میں'' سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

اللہ کی بندگی اور اطاعت کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آ کھڑا ہوتا ہے کیوں کہ اطاعت احکام ہی کی ہوتی ہے اور احکام کے بغیر اس کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ایک انسان جوں ہی اپنے پروردگار کا بندہ اور اطاعت گزار بن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لا محالہ یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے مالک کے وہ احکام کیا ہیں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے، اس کا مالک کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کن باتوں کو ناپسند کرتا ہے؟ اس کا وفادار ٹھیرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے اور اس کی نافرمانی سے محفوظ رہنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے؟ یہ ساری باتیں جانے بغیر اطاعت الٰہی کی راہ میں پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ انسان یہ کیسے معلوم کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فلاں فلاں باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے اور فلاں فلاں کاموں سے روکا ہے؟

اس کے جواب میں جن چیزوں کا نام لیا جا سکتا ہے ان میں سے ایک تو ہر شخص کی اپنی عقل ہے۔ لیکن انسان کے لیے بہ طور خود یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ اس کی زندگی کے اور اس کائنات کے بنیادی حقائق کیا ہیں؟ اس کے خالق و پروردگار میں کیا صفات پائی جاتی ہیں؟ انسانوں سے ان صفات کے تقاضے کیا ہیں؟ اور ہمارے لیے اس کے احکام کیا ہیں؟ غرض کہ اس سلسلے میں عقل کی نارسائی بالکل مسلم و ثابت ہے۔[1]

دوسری چیز انسان کا وجدان اور اس کی قلبی قوت ہے۔ لیکن اس قوت کا معاملہ بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ ریاضت نفس کی کوئی بڑی سے بڑی کوشش بھی یہاں کوئی کارکردگی نہیں دکھا سکتی کیوں کہ انسان اپنے باطن کو مانجھ کر چاہے کیسا ہی آئینہ کیوں نہ بنالے، اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام و مرضیات کا عکس آپ سے آپ ہرگز نہیں دکھائی دے سکتا۔ آئینے میں کسی چیز کا عکس پڑنے کے لیے یہی تو کافی نہیں ہے کہ آئینہ صاف اور چمک دار ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ چیز کھلی شکل میں اس کے سامنے اور قریب موجود ہو۔ اس لیے اللہ تعالیٰ جب تک خود ہی اپنے احکام کا تعین کرکے انہیں وجود میں نہ لائے اور وجود میں لا کر قلب انسانی کے سامنے

۱۔ اس موضوع پر باب ایک میں مفصل گفتگو ہو چکی ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

نہ رکھنے دے، لاکھ صاف اور چمک دار ہونے کے باوجود بھی اس کے اندر ان کی چھاپ نہیں پڑ سکتی۔

تیسری چیز مختلف افراد کے الگ الگ تفکر کے بجائے اجتماعی غور و فکر ہے۔ لیکن جس طرح ہزاروں اور لاکھوں اندھے مل کر ایک آنکھوں والے شخص کی حیثیت حاصل نہیں کرسکتے اسی طرح افراد انسانی کی کوئی بڑی سے بڑی تعداد بھی احکام الٰہی کے دریافت کر لینے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ آخر بہت سے افراد کا مجموعہ بھی تو ایسے ہی لوگوں سے مل کر بنا ہوگا جن میں کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہوگا جو اپنی عقل سے احکام الٰہی معلوم کرلینے کا خواب بھی دیکھ سکے۔ اس لیے یہ ذریعہ بھی اتنا ہی ناکام ذریعہ ہے جتنا کہ پہلا۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ ان تینوں ذرائع میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو انسان کی یہ ضرورت پوری کرسکے۔

بلا شبہ بہت سے کام ایسے ہیں جن کا برا یا بھلا ہونا ہمیں خود بہ خود محسوس ہو جاتا ہے اور ان کی برائی یا بھلائی کا فیصلہ ہم اپنی عقل یا اپنی فطرت یا اپنے وجدان سے کرسکتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہدایت الٰہی بھی برے اور بھلے کاموں کے تعین ہی کا دوسرا نام ہے۔ لیکن محض اتنی سی بات سے یہ خیال کر بیٹھنا صحیح نہ ہوگا کہ انسان بہ طور خود اللہ تعالیٰ کے سارے احکام اور مرضیات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ کیوں کہ کچھ کاموں کے برے یا بھلے ہونے کا علم و اندازہ تمام کاموں کے بارے میں علم و اندازے کا قایم مقام کسی طرح نہیں بن سکتا۔ ذرا اپنی دنیا کو دیکھیے۔ آخر وہ کتنی قدروں کے بارے میں متفق ہے؟ کتنے کام ہیں جن کے بھلے ہونے پر اور کتنے کام ہیں جن کے برے ہونے پر پوری نوع انسانی متفق ہے؟ بڑی رعایت کے بعد بھی آپ ایسے کاموں اور ایسی قدروں کی کوئی قابل لحاظ تعداد نہیں گنا سکتے جن کی بھلائی اور برائی پر تمام لوگوں کا اتفاق ہو اور جن تھوڑی سی باتوں پر اتفاق ہوگا تفصیلات میں یہ اتفاق بھی قایم نہیں رہے گا۔ چند باتوں کے برے یا بھلے ہونے کا فیصلہ اگر نوع انسانی کر بھی سکتی ہے تو یہ خیر و شر کے پورے مسئلے کو حل کرسکنے کی قابلیت کی سند نہیں ہوسکتی۔ بلا شبہ یہ نہ کہا جائے گا کہ دیے کی روشنی، روشنی ہی نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ پوری دنیا کو منور کرنے کے لیے سورج کی ضرورت ہے اور ٹمٹماتا ہوا دیا سورج کی جگہ نہیں لے سکتا۔

Marfat.com

غرض اس معاملے میں انسانی قوتوں کی بے بسی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس کے خلاف نہ عقل کچھ کہہ سکتی ہے نہ تجربہ و مشاہدہ زبان کھول سکتا ہے۔ اس صورت حال کا مطالبہ واضح طور پر یہی تھا کہ اس معاملے میں انسان کو بھٹکنے کے لیے چھوڑنے کے بجائے اس کی اوپر سے رہنمائی کی جاتی کیوں کہ اس کی اپنی فکری اور وجدانی قوتوں میں اگر یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مرضیات معلوم کرلیتیں — حالاں کہ انسان کو اس بات کی ضرورت اتنی ہی تھی جتنی غذا اور پانی کی — تو اب اس کی اس ضرورت کے پوری ہونے کی شکل اس کے سوا اور کوئی رہ ہی نہیں جاتی کہ اس کا اللہ کی طرف سے کوئی خارجی انتظام ہو۔

ایک طرف تو یہ صورت حال اور انسان کی سب سے بڑی بنیادی ضرورت تھی۔ دوسری طرف اللہ کی ربوبیت تھی، اس کی رحمت تھی، اس کا عدل تھا، اس کی حکمت تھی اور ان میں سے ہر ایک صفت کا مطالبہ تھا کہ انسان کو یوں بے بسی کے اندھیرے میں نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس کی مدد کی جائے، اس کو وہ احکام صاف صاف بتا دیے جائیں جن کے جانے بغیر وہ بندگی اور اطاعت کی راہ اختیار کر ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں ممکن ہی نہ تھا کہ اللہ رب العالمین اپنے احکام و مرضیات کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے کوئی خارجی اہتمام نہ کرتا اور اس سلسلے میں ایک دن کی بھی تاخیر روا رکھی جاتی، اور نسل انسانی کی ابتدا کے ساتھ ہی ساتھ اس اہتمام کی بھی ابتدا نہ ہو جاتی۔ جس پروردگار نے انسان کی مادی ضروریات کا اتنا بڑا انتظام کر رکھا تھا، اس کی شانِ پروردگاری سے بالکل بعید تھا کہ وہ اس کی اخلاقی، دینی اور سماجی ضرورتوں کی طرف توجہ نہ فرماتا۔ جس آقا نے انسان پر اپنی مرضی کی راہ چلنے کی ذمہ داری ڈالی تھی اس کی رحمت اور اس کا انصاف یہ کیسے گوارہ کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرے۔ چناں چہ اس نے یہ انتظام کیا — اور یہی وہ انتظام ہے جسے دین کی اصطلاح میں 'رسالت' کہا جاتا ہے اور جس واسطے سے یہ انتظام ہوتا ہے اسے "رسول" کہتے ہیں۔

جہاں یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ رسالت کے بغیر انسان اللہ تعالیٰ کے احکام سے واقف نہیں ہو سکتا وہاں اس بات کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ مومن اور مسلم بننے کے لیے رسالت پر ایمان لانا انتہائی ضروری ہے، ٹھیک اسی طرح جس طرح آنکھوں کی پتلی میں بینائی ضروری ہوتی ہے۔

Marfat.com

ظاھر ہے کہ جو چیز کسی منزل تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ھو جب تک اسے اپنا نہ لیا جائے منزل تک پہنچنے کا کوئی سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ۔

اس کے علاوہ غور کیجیے تو معلوم ھوگا کہ رسالت کی عملی اھمیت اس سے بھی اونچی ہے ۔ نہ صرف یہ کہ اس کے بغیر اللہ کے احکام کو نہیں جانا جا سکتا بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے بغیر خود اللہ اور آخرت کو بھی نہیں جانا جا سکتا۔ رسالت ھی وہ ذریعہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم عطا کرتا ہے ۔ اس لیے رسالت کے بغیر اللہ اور آخرت پر ایمان بھی ، جیسا کہ چاھیے ، نہیں لایا جا سکتا ۔

انبیاؑ کی خصوصیات*

اس سے پہلے ' انبیاؑ کی ضرورت ' کے تحت ھم دیکھ چکے ھیں کہ انسانوں کو جیسے ھوا اور پانی کی ضرورت ہے ویسے ھی الہامی ھدایت اور انبیاؑ کی تعلیم کی ضرورت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں سب سے پہلے جس انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کو بھیجا اسے منصب نبوت سے سرفراز کیا ۔ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنی اولاد تک خدا کے تمام فرمان پہنچائے ، اور ان کی اولاد نے اپنے بیٹوں پوتوں تک ان ھدایات کو منتقل کیا۔ لیکن جوں جوں انسانی نسل پھیلتی اور دور دراز کے علاقوں میں آباد ھوتی گئی اس تعلیم کے نقوش مدھم پڑتے گئے ، یہاں تک کہ بہت سے لوگوں نے ان تعلیمات کو فراموش کر دیا — ان جگہوں پر اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیا بھیجے تاکہ انسانوں کی ھدایت اور رھنمائی کا کام سر انجام دیں۔ یہ پیغمبر مختلف زمانوں اور مختلف علاقوں میں آئے ۔ ان میں چند مثلاً حضرت نوح ، حضرت ابراھیم ، حضرت اسمٰعیل ، حضرت اسحاق ، حضرت موسیٰ ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام سے ھم اچھی طرح مانوس ھیں ۔ لیکن ان کے علاوہ بھی ھزارھا انبیا آئے ۔ ایک اندازہ کے مطابق تمام انبیا کی تعداد تقریباً ایک لاکھ چوبیس ھزار ہے ۔

---

* یہ حصہ مندرجہ ذیل کتب کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے ۔

سید سلیمان ندوی : سیرۃ النبی جلد چہارم
ڈاکٹر آصف قدوائی : مقالات سیرت
صدر الدین اصلاحی : اسلام ایک نظر میں

Marfat.com

قرآن کریم میں انبیا کی جو خصوصیات بیان کی گئیں ہیں ان میں سے نمایاں خصوصیات ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

۱ - **بشریت:** اگرچہ انبیائے کرام علیہم السلام باطن اور معنویت میں عام انسانوں سے بہت بلند تھے لیکن اس کے باوجود وہ سب انسان ہی تھے۔ نہ وہ فرشتوں کے گروہ سے تھے اور نہ جنوں سے۔ اسلام کے نزدیک یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ خدا یا اس کا بیٹا یا اس کا کوئی اوتار انسانی شکل میں آکر الہامی ہدایت پہنچائے۔ دراصل انبیا میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی تسلیم کر لینے کے بعد توحید و نبوت کی حیثیتیں مشتبہ ہو جاتی ہیں۔ خدا کی یکتائی کا تصور مجروح ہوتا ہے اور انبیا کی بعثت کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے ہمیشہ اس بات کا اعلان کیا کہ:

إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

میں تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں۔ (الکہف - ۱۱۰)

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ بسا اوقات انبیا پر یہ اعتراض بھی ہوا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایسا شخص جو ہماری طرح کھاتا پیتا اور دیگر انسانی ضروریات رکھتا ہے نبوت کے منصب پر فائز ہو جائے۔ لیکن ان کے اعتراضات کے باوجود انبیائے کرام نے کبھی یہ نہیں کہا، نہیں، ہم تو بشر نہیں ہیں اس سے بلند تر کچھ چیز ہیں، ان کا متفقہ جواب تھا:

إِنْ نَّحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

بلا شبہ ہم تمہاری ہی طرح انسان ہیں۔
(ابراہیم - ۱۱)

خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہی اعتراض ہوا، لوگوں نے کہا کہ اگر خدا کو کوئی پیغامبر بھیجنا ہی تھا تو وہ ہمارے ہی جیسے انسان کے بجائے کسی فرشتے کو کیوں نہ بھیجتا۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ

> "اگر اس زمین پر فرشتے ہی چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجتے" (بنی اسرائیل: ۹۵)

یہ در حقیقت بڑا ہی حکیمانہ جواب ہے۔ اس لیے کہ (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے) پیغمبروں کا کام محض یہ نہیں ہے کہ، نعوذ باللہ ڈاکیے، کی طرح

Marfat.com

اللہ کی کتاب پہنچا دیں بلکہ ان کے کاموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی زندگی کو ھدایات الہیٰ کا مظہر بنا کے دکھا دیں اور دنیا کے سامنے مثال اور نمونہ بن کر پیش ہوں ۔ اب اگر فرشتوں یا کسی اور مخلوق کو پیغمبر بنا کر بھیجا جاتا تو اگرچہ وہ خدا کا پیغام پہنچا دیتے لیکن فرشتہ ہوتے ہوئے آخر وہ ان احکام پر کیسے عمل کر پاتے جن کا تعلق خاص بشری جذبات و داعیات اور مخصوص انسانی مسائل سے ہے اور جب وہ شریعت کے ایک بڑے حصے پر عمل ہی نہ کر پاتے تو اپنے پیروؤں کے لیے اچھا نمونہ کیسے ثابت ہوتے ۔ مزید برآں فرشتوں یا دیگر غیر انسانی مخلوقات کی مثال انسانوں کے کام کی ھی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ انسان اقتدا اسی کی کرسکتا ہے جو قوت و اختیار کے اعتبار سے اسی جیسا ہو ۔ مختلف الجنس مخلوق ہمیں مرعوب تو کرسکتی ہے لیکن ھمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی ۔

۲۔ وہبیت : وہبیت کے معنی یہ ہیں کہ رسالت کوئی اکتسابی شے نہیں جو محنت اور تلاش و جستجو سے مل جائے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہے اور اسی شخص کو ملتی ہے جسے وہ مرحمت فرماتا ہے ۔ اس کے ملنے میں انسانی کوشش اور ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا ۔

اکثر پیغمبروں کے حالات میں ہمیں یہ ملتا ہے کہ آغاز وحی سے پہلے وہ ایک عرصے تک عبادت و مراقبہ میں مشغول رہے ۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ کے ملنے سے پہلے چالیس روز تک روزے کی حالت میں کوہ طور پر رہے ۔ حضرت مسیح علیہ‌السلام ایک سنسان جنگل میں چالیس روز تک عبادت میں مشغول رہے ۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مہینوں غار حرا میں عزلت گزیں رہے ۔ اس طرح کی عبادت و ریاضت نفس میں وحی کے قبول کرنے کی استعداد پیدا کردیتی ہے ۔ لیکن اس کے باوجود نبوت کا منصب اکتسابی نہیں جو محنت و کوشش سے حاصل ہو جائے بلکہ جس طرح خدائے تعالیٰ نے انسانوں میں مختلف کمالات عطا کیے ہیں لیکن ان کے بالفعل حصول کے لیے جد و جہد کرنی پڑتی ہے اسی طرح انبیا میں نبوت بالقوہ موجود ہوتی ہے البتہ قبول وحی کے لیے استعداد حاصل کرنے کے لیے انبیاء کو بھی تیاری کرنی پڑتی ہے ۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اسی قسم کی عبادت و ریاضت خواہ کتنی ہی کیوں نہ کرے، چوں کہ بالقوہ نبوت کی صلاحیت سے محروم ہے

Marfat.com

لہذا نبوت حاصل نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس منصب و ذمہ داری کے لیے افراد کا انتخاب خود کیا۔ اس انتخاب ربانی کو قرآن کی زبان میں 'اصطفا' کہتے ہیں۔ اصطفا کے معنی ہیں بہت سی چیزوں میں سے بہترین چیز کو چن لینا۔ یہ لفظ خود بتاتا ہے کہ رسالت کے لیے انتخاب ایسے ہی افراد کا ہوا تھا جو خدا کے نزدیک اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کے اعتبار سے اس عظیم مقصد کے لیے موزوں ترین تھے۔ چناں چہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین نے آپ کے نبی بنائے جانے پر اعتراض کیا اور اپنے لیے بھی برابر کے استحقاق کی باتیں کیں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسٰلَتَهٗ

اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی
پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے۔
(الانعام۔ ۱۲۵)

۳۔ تعلیمات من جانب اللہ: پیغمبر، دین اور شریعت کے نام پر جو کچھ انسانوں کے سامنے پیش کرتے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ وہ ہدایت ربانی کے تابع ہوتے ہیں، نہ خود ان کی کوئی مرضی ہوتی ہے اور نہ ذاتی ارادہ۔ وہ وہی کرتے اور کہتے ہیں جس کا انہیں خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝

وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام
نہیں کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو
خدا کی طرف سے کہا جاتا ہے۔
(النجم۔ ۳، ۴)

نبی کی ساری تعلیمات کے اللہ ہی کے جانب سے ہونے کا مطلب بہت وسیع ہے۔ اس کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہ راست یا فرشتے کے ذریعے نبی کو سکھا دیے ہوں، دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو خصوصی حکمت اور نور نبوت اس کو عطا ہوئے ہیں ان کے ذریعے سے اس نے خود مزید احکام نکالے ہوں، یہ دونوں قسم کی تعلیمات بلا واسطہ یا بالواسطہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہیں۔

Marfat.com

وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

(یعنی) جو کچھ حکم رسول تمہیں دے اسے مان لو
اور جس چیز سے وہ منع کردے اس سے رک جاؤ۔
(الحشر۔ ۷)

۴۔ عصمت: نبی معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں نہ اخلاق و اعمال کی لغزشیں۔ نفس اور شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق و افکار اور اعمال سبھی پاک ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس میں غلط کام کرنے کی قابلیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان کی طرح انبیا علیہم السلام کے اندر بھی یہ قابلیت طبعی طور پر لازماً موجود ہوتی ہے، لیکن اس قابلیت کو بروئے کار آنے میں کامیابی نہیں ہو پاتی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ نبی کی فکر و بصیرت بھی حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام الٰہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعے سے مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے۔ دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس، اس کا خوف خدا اور اس کا اندیشۂ آخرت اس درجہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں کہ گناہ کے محرکات سر اٹھا ہی نہیں پاتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی نگرانی رہتی ہے اور یہی نگرانی انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور اخلاق و عمل کی کوتاہیوں سے بچائے رکھتی ہے۔ اور اس طرح اس کا ہر قول حق اور ہر عمل صحیح و صواب ہوتا ہے اور پوری زندگی ایک صاف اور روشن آئینہ کی مانند ہوتی ہے جسے خالق کائنات نے انسانوں کے لیے اسوۃ (مثالی نمونہ) مقرر فرمایا ہے اور جس کی اتباع میں نجات ہے۔

درحقیقت نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لیے بالکل ناگزیر تھا جس کے لیے رسالت کا سلسلہ قایم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کے متعلق یہ اندیشہ ہو کہ وہ جھوٹ بول سکتا ہے، یا خیانت کر سکتا ہے یا نفسانیت کا شکار ہو سکتا ہے، یا منشائے الٰہی کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے، آخر دوسروں کا اعتماد کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ لوگ کیسے یقین کریں کہ وہ فلاں حکم دیتے ہوئے سچ بول رہا ہے۔ یا خدا کے نام پر جو ہدایات دے رہا ہے وہ سب کی سب فی الواقع خدا کی

Marfat.com

طرف سے ہیں ۔ اور اس نے اپنی طرف سے کوئی کمی و بیشی نہیں کی ۔ پھر ایسا شخص جس کا دامن غلطیوں یا گناہوں سے آلودہ ہو ، لوگوں کے لیے اعلیٰ ترین اور قابل تقلید نمونہ (اسوۂ حسنہ) کیسے بن سکتا ہے ؟ نبی کو چوں کہ اللہ تعالیٰ نے احکام الٰہی کی کامل اطاعت کا اعلیٰ ترین نمونہ بنا کر بھیجا تھا لہٰذا ان کے دامن کو گناہ کی آلودگی سے پاک رکھا تاکہ لوگ بلا خوف و خطر ان کی زندگی کے ہر پہلو کی پیروی کر سکیں ۔

یاد رہے کہ نبی نہ صرف یہ کہ معصوم ہوتا ہے بلکہ فی الحقیقت معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے ۔ فکر و اجتہاد کی غلطیوں اور سیرت و کردار کی لغزشوں سے پاک ہونا صرف اللہ کے انہی خاص بندوں کا حصہ ہے ۔ دوسرے لوگ خواہ فہم و بصیرت اور نیکی و تقویٰ کی کتنی ہی بلند چوٹیوں پر کیوں نہ پہنچ جائیں لیکن معصوم عن الخطا نہیں ہو سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ بزرگوں کی زندگیاں قابل تقلید ضرور ہیں لیکن ان کے اعمال دین میں حجت بالذات نہیں ہیں اور نہ تنقید سے بالاتر ہیں ۔ اس کے مقابلہ میں انبیا کی زندگیاں سند و حجت کی بنا پر تنقید سے بالاتر ہیں ۔

ہر قوم کے لیے نبی

ان موٹی موٹی باتوں کے علاوہ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انبیا ہر قوم میں بھیجے گئے ہیں :

وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ

کوئی بھی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی خبردار
کرنے والا (رسول) نہ آیا ہو ۔ (فاطر ۔ ۲۴)

اس کی وجہ ظاہر ہے ۔ تمام انسان برابر ہیں اور سب ایک ہی مقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں ۔ اللہ کی بندگی سبھی کا فریضہ ہے اور آخرت میں اس فرض کے متعلق ہر ایک سے پوچھ گچھ ہوگی ۔ پھر ایسا کیوں ہوتا کہ کچھ لوگوں میں تو اللہ نبی بھیجتا اور باقی لوگوں کو ان سے محروم رکھتا حالاں کہ وہ خالق و مالک سب کا ہے ۔

ان تمام انبیا کو ماننا ہر مسلمان کا فرض ہے ، اور نہ صرف ماننا بلکہ ان کا احترام کرنا بھی ضروری ہے ۔ بدقسمتی سے اکثر مذاہب اس سلسلے میں اپنے پیرووں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں ۔ یہودیوں پر انبیائے بنی اسرائیل کے

Marfat.com

علاوہ کسی اور نبی کا اقرار فرض نہیں رہا ، ہندو تمام غیر ہندو انسانوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھ کر ہی بہترین ہندو رہ سکتے ہیں۔ مسیحی حلقوں میں پیغمبر اسلام کی جی بھر کر توہین ہوتی ہے ، غرض کہ عام طور پر ایک مذہب کے ماننے والے اپنے دائرے کے باہر کسی نبی کی عزت و توقیر ضروری نہیں سمجھتے ، لیکن مسلمان ایسا نہیں کرسکتے ، ان پر تمام انبیا کی تعظیم فرض ہے ۔

منصب رسالت*

انبیا علیہم السلام کے منصب اور ان کے درجے کے بارے میں اچھی خاصی غلط فہمیاں رہی ہیں اور بعض حلقوں میں اب بھی ہیں ۔ ایک طرف تو یہ خیال تھا کہ انبیا درجۂ بشریت سے بلند ، فرشتے یا خدا ہوتے ہیں ، یا کم از کم خدائی میں تھوڑے بہت شریک ہوتے ہیں ۔ حالاں کہ انبیائے کرام نے خود ہمیشہ اس کی تردید کی ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا :

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضے میں خدا کے خزانے ہیں
اور نہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں
فرشتہ ہوں ۔ (ھود ۔ ۳۱)

اسی طرح بعض انبیا کو ان کی قوموں نے خدا کا بیٹا بنا لیا ۔ حالاں کہ انہوں نے بھی اعلان کردیا تھا :

اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِىَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِىْ نَبِيًّا

میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ تعالیٰ
نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا
ہے ۔ (مریم ۔ ۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ کر کہ پچھلی امتوں نے اپنے انبیا کی تعظیم و تکریم میں غلو کرتے کرتے انہیں خدائی کے مرتبے تک پہنچا دیا ، اس بات کا بڑا خیال رکھا کہ کوئی شخص آپ کی ایسی بے جا تعظیم نہ کرے جس سے فتنہ پیدا ہو ۔ کئی بار لوگوں نے آپ کو سجدہ کرنے کی اجازت چاہی لیکن آپ نے سختی سے روک دیا ، اور بار بار خدا کے سامنے اپنی بندگی اور بے چارگی کا اعلان کیا ۔

* یہ حصہ سیرت النبی جلد چہارم از مولانا سید سلیمان ندوی اور ترجمان القران کا "منصب رسالت نمبر" از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

ایک طرف تو انبیا کے مرتبے میں اس درجہ غلو کیا گیا کہ انہیں خدائی تک پہنچادیا گیا۔ دوسری طرف ایک گروہ نے رسالت کے درجے کو اس قدر کم سمجھا کہ رسول کی حیثیت ایک ڈاکیہ یا نامہ بردار سے زیادہ نہ رہی۔ انہوں نے کہنا شروع کردیا کہ نبی کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اللہ کی کتاب انسانوں تک پہنچادے اور بس۔ لیکن اگر رسولوں کا کام اتنا ہی ہوتا تو خدا یہ کام دوسروں سے بھی لے سکتا تھا۔ آخر اس کے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ لوگوں پر لکھی لکھائی کتابیں نازل کر دیتا یا فرشتوں کے ذریعے کتب بھیج دیتا۔ لیکن چوں کہ شہادت حق کا کام بڑا وسیع ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رسل بھیجے۔ ان انبیا کی ذمہ داریاں اور ان کے مناصب کیا تھے، اس سلسلے میں ہم قرآن سے رہنمائی حاصل کریں گے کہ اس نے انبیا کی کیا حیثیت بیان کی ہے۔

۱۔ قابل اطاعت : قرآن کی رو سے نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہوتی ہے اور ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں و چرا نہ کرے اور مصلحت خواہ اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہ ہر صورت یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے
بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس
کی اطاعت کی جائے۔ (النساء۔ ۶۴)

پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہیں ہونی چاہیے، بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے، نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے حق اطاعت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

پس نہیں، اے نبی! تمہارا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے
جب تک وہ آپس کے تمام معاملات میں تمہیں حکم نہ بنائیں اور پھر تمہارے
فیصلے پر بلا کسی دلی تنگی کے آمادگی کے ساتھ سر تسلیم خم نہ کردیں۔
(النساء۔ ۶۵)

Marfat.com

اور یہ بات عقل کے مطابق بھی ہے اس لیے کہ اگر انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ نبی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل رہ ہی نہیں جاتی - یہی وجہ ہے کہ ہر نبی نے اپنی دعوت کے ساتھ یہ مطالبہ کیا :

فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوۡنِ

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو - (الشعراء - ۱۳۱)

اس دعوت سے اس حقیقت کا اظہار مطلوب ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ صرف رسول کی اطاعت ہی سے معلوم ہوسکتی ہے اور صرف رسول ہی بتا سکتا ہے کہ خدا کے احکام کیا ہیں اور ان احکام پر کس طرح عمل کیا جانا چاہیے - یہی وجہ ہے کہ قرآن میں بار بار اطیعو اللہ (اللہ کی اطاعت کرو) کے ساتھ ساتھ اطیعوالرسول (رسول کی اطاعت کرو) کا بھی حکم آیا ہے - نبی دین و شریعت کے دائرے میں جو کچھ کہتا ہے وہ سب کا سب اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے - یہ حقیقت نبی کی حیثیت کو اور بھی اہم بنا دیتی ہے کیوں کہ ایسی صورت میں نبی کی اطاعت نبی کی اطاعت نہیں رہ جاتی بلکہ خدا کی اطاعت بن جاتی ہے ، جیسا کہ فرمایا بھی گیا :

مَنۡ یُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰہَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اسی نے خدا کی اطاعت کی - (النساء - ۸۰)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ نبی کا ایک بڑا اہم منصب "مطاع" کا ہے - وہ ایک ایسی ہستی ہے جس کی کامل اطاعت کی جانی چاہیے ، ایسی اطاعت جس میں نہ کوئی قید و شرط ہو نہ کوئی بے دلی - جو شخص نبی کا مقام اس سے نیچے سمجھتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی پر ایمان ہی نہیں رکھتا اور بالکل نہیں جانتا کہ نبوت کسے کہتے ہیں -

۲ - **شارح کتاب اللہ** : اللہ تعالیٰ کی شریعت چوں کہ ہمیشہ رہنے کے لیے ہے لہذا کتاب اللہ میں زیادہ تر زور اصول و مبادی پر دیا گیا ہے اور اللہ کے پیغمبر کے ذمے یہ کام کیا گیا ہے کہ وہ ان کی تشریح و توضیح کریں ،

Marfat.com

سورۂ نحل میں ارشاد کیا گیا ہے کہ:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ

اور ہم نے یہ ذکر (قرآن) تمہاری طرف
اس لیے نازل کیا ہے تا کہ لوگوں کے
لیے تم اس ہدایت کو واضح کر دو، جو
ان کی طرف اتاری گئی ہے۔ (آیت - ۴۴)

یہ بات ظاہر ہے کہ تشریح و توضیح خود کتاب کے الفاظ پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ تشریح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد بھی کچھ کہتا ہے تا کہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اسی طرح اگر کتاب میں کسی عملی مسئلے کا ذکر ہو تو بسا اوقات شارح کو عملی مظاہرے کے ذریعے سے مطلب سمجھانا پڑتا ہے۔ جیسا کہ ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں انبیا معصوم ہوتے ہیں، اسی بنا پر ان کی یہ تشریح و تعبیر خطا سے بالاتر اور ہمیشہ کے لیے حجت ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے لوگ قرآن کی تشریح اور اس سے احکام اخذ کرنے کا جو کام کریں گے ضروری نہیں کہ وہ صحیح ہی ہو، وہ حجت نہیں ہوگا۔

۳ - **معلم و مربی**: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ

بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان فرمایا ہے کہ خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انہیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (آل عمران - ۱۶۴)

اور دیگر متعدد مقامات پر اس مفہوم کی آیات وارد ہوئی ہیں[۱] ان ساری آیات میں جو بات مشترک نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف قرآن کی آیات سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین اور مقاصد تھے۔

---

۱ سورہ جمعہ ۲، سورہ بقرہ ۱۲۹ و ۱۵۱۔

Marfat.com

(۱) لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ''کتاب'' کی تعلیم دیں -
(۲) اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں -
(۳) افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشو و نما دیں -

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ پڑھ کر سنانے کے علاوہ نبی کے جو فرائض ہیں ان میں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی ہے - اور جب یہ تعلیم آپ کے فرائض نبوت میں سے ہے تو یہ بات بدیہی ہے کہ اسی تعلیم کو پیغمبرانہ حیثیت حاصل ہوگی اور اس کی تعمیل امت مسلمہ کے لئے فرض ہوگی - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اسی زبانی تعلیم اور عملی مظاہرے کو صحابہ اور تابعین نے اپنی روایات اور عمل کے ذریعے محفوظ رکھا اور وہ 'احادیث و سنن' کے نام سے موسوم ہوا -

۴ - پیشوا اور نمونہ تقلید: اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما بنایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے - ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں ، وہ جس امت میں مبعوث ہوتے ہیں ، اس کے سامنے ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ (کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ) روشن ہوتے ہیں جن کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے - سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ ۝

اے نبی کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو ، اللہ تم سے محبت رکھے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اللہ غفور و رحیم ہے - کہو کہ اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا - (آیات - ۳۱ ، ۳۲)

اسی طرح سورہ احزاب میں کہا گیا ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَن كَانَ يَرْجُو اللَّهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ تقلید موجود ہے - ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کی امید رکھتا ہے - (آیت - ۲۱)

Marfat.com

ان دونوں آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو پیشوا مقرر کیا تھا اور ان کی پیروی اور تقلید کو مسلمانوں کے لیے لازم قرار دیا ہے ۔ یہ آیات اسی بات کی طرف واضح رہنمائی کرتی ہیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے آخری خطبوں میں سے ایک میں حجۃ الوداع کے موقع پر کہی تھی ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا :

انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اللہ کی کتاب اور اپنی سنت (یعنی عملی زندگی) ۔

جو مسلمان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عہد مبارک میں تھے ان کے تو سامنے ہی آپ کی زندگی تھی لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی وفات کے بعد بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی سنت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے اور قرآن کریم کے بعد ہماری ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہے ۔

۵ ۔ شارع اور قانون ساز: سورۂ اعراف میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ

وہ ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن (غیر الہٰی قوانین) اتار دیتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے ۔
اعراف (آیت ۔ ۱۵۷)

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تشریعی اختیارات عطا کیے ہیں ۔ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حلال و حرام قرار دیا ہے اور جس چیز کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے یا جس سے منع کیا ہے وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے اختیارات سے ہے اس لیے وہ بھی قانون خداوندی کا حصہ ہے ۔ یہی بات سورۂ حشر میں بڑی صراحت سے ارشاد ہوئی تھی :

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝

جو کچھ رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے منع کردے ، اس سے رک جاؤ ، اور اللہ سے ڈرو ، بلا شبہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے ۔ (الحشر آیت ۔ ۷)

Marfat.com

۶۔ قاضی اور حکم : قرآن میں بے شمار جگہوں پر اس امر کی تصریح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قاضی و حکم مقرر کیا ہے۔

اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ

اے نبی، ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم فیصلے کرو جیسا کہ اللہ تمہیں دکھائے۔ (النساء - ۱۰۵)

مومنین کی صفات میں سے ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ جب رسول کے فیصلے کی طرف دعوت دی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا (سمعناواطعنا)۔ اسی طرح ایک اور جگہ بیان کیا گیا ہے کہ مومنین کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا رسول کسی معاملے میں انہیں کوئی حکم دے دے تو وہ اسے بسر و چشم تسلیم کر لیتے ہیں اور ان کے دل میں فیصلے کے خلاف ذرا بھی تنگی نہیں ہوتی۔

انبیا کے گوناں گوں مناصب میں سے یہ صرف چند تھے جن کا ذکر اوپر کیا گیا۔ قرآن میں ان کے علاوہ بتایا گیا ہے کہ انبیا ہادی (رہنما)، نذیر (ڈرانے والے)، داعی (خدا کی طرف دعوت دینے والے)، مبشر (خوش خبری سنانے والے)، مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے)، مزکی (برائیوں سے پاک کرنے والے)، سراج منیر (روشن چراغ) بھی تھے۔

یہاں اس بات کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ انبیا علیہم السلام عام رہنماؤں سے کوئی مشابہت نہیں رکھتے۔ اگرچہ عام رہنماؤں میں ہمیں معلم بھی مل جاتے ہیں، حاکم بھی، قانون ساز بھی اور جج بھی لیکن ان لوگوں کی رہنمائی اور انبیا کی رہنمائی میں سب سے بڑا فرق یہ ہوتا ہے کہ عام رہنما یا تو خود ساختہ ہوتے ہیں یا عوام کے بنائے ہوئے۔ اس کے برخلاف انبیا کو لیڈری کا نہ کوئی شوق ہوتا ہے اور نہ وہ عوام الناس کے منتخب کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے جملہ مناصب کے ساتھ خدا کے مقرر کردہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی یہ جملہ حیثیتیں حاکم، قاضی، شارع وغیرہ سب خدا کی طرف سے ہوتی ہیں۔ اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ کوئی بات اپنے دل سے گھڑ کر نہیں کرتے۔ صرف وہی کچھ کہتے ہیں جس کا خدا نے انہیں حکم دیا ہو۔ وہ خدا کے فرمان میں تبدیلی یا اضافہ بھی نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ ان کی پوری زندگی اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ علیہم الصلوٰۃ والسلام۔

Marfat.com

رسالت محمدی

گزشتہ صفحات کے مطالعے سے یہ حقیقت آپ پر روشن ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے جو نظام بنایا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف قوموں کے پاس اللہ کے رسول وحی الہیٰ لے کر آئے اور انہوں نے اپنی زندگی اور اسوۂ حسنہ سے ان تعلیمات کے عملی پہلو کو روشن کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے کہ اس نے انسان کو اول روز ہی سے نبیوں کی رهنمائی سے سرفراز فرمایا ہے۔ پہلا انسان نبی تھا اور اس طرح تاریخ انسانی کا آغاز ہدایت اور روشنی میں ہوا، ظلمات اور تاریکی میں نہیں۔ پھر یہ روشن سلسلہ برابر جاری رہا اور ہر دور اور ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کے ذریعے سے اپنی ہدایت انسانوں تک پہنچاتا رہا۔ اس سلسلے کی آخری کڑی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہ زمانہ چھٹی صدی عیسوی کا ہے۔ جب تمام دنیا اور تمام انسانی قوموں کے لیے ایک پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کی سرزمین میں پیدا کیا گیا اور ان کو اسلام کی پوری تعلیم اور مکمل قانون دے کر اس خدمت پر مامور کیا گیا کہ اسے سارے جہان میں پھیلا دیں۔

* دنیا کا جغرافیہ اٹھا کر دیکھو، تم ایک ہی نظر میں محسوس کر لوگے کہ تمام جہان کی پیغمبری کے لیے روئے زمین پر عرب سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ملک ایشیا اور افریقہ کے عین وسط میں واقع ہے اور یورپ بھی یہاں سے قریب ہے، خصوصاً اس زمانے میں یورپ کی متمدن قومیں زیادہ تر یورپ کے جنوبی حصے میں آباد تھیں اور یہ حصہ عرب سے اتنا ہی قریب ہے جتنا پاکستان ہے۔

پھر اس زمانے کی تاریخ پڑھو، تم کو معلوم ہوگا کہ اس نبوت کے لیے اس زمانہ میں عربی قوم سے زیادہ موزوں کوئی قوم نہ تھی۔ دوسری بڑی بڑی قومیں اپنا اپنا زور دکھا کر گویا بے دم ہو چکی تھیں اور عربی قوم تازہ دم تھی۔ تمدن کی ترقی سے دوسری قوموں کی عادتیں بگڑ گئی تھیں اور عربی قوم میں اس وقت کوئی ایسا تمدن نہیں تھا جو اس کو آرام طلب اور عیش پسند اور رذیل بنا دیتا۔ چھٹی صدی عیسوی کے عرب اس زمانہ کی متمدن قوموں

---

* یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب 'رسالہ دینیات' سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

کے برے اثرات سے بالکل پاک تھے - اُن میں وہ تمام انسانی خوبیاں موجود تھیں جو ایک ایسی قوم میں ہو سکتی ہیں جس کو زوال پذیر تمدن کی ہوا نہ لگی ہو۔ وہ بہادر تھے ، بے خوف تھے ، فیاض تھے ، عہد کے پابند تھے ، آزاد خیال اور آزادی کو پسند کرنے والے تھے ، کسی قوم کے غلام نہ تھے ، اپنی عزت پر جان دے دینا اُن کے لیے آسان تھا ، نہایت سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور عیش و عشرت سے بیگانہ تھے - اس میں شک نہیں کہ ان میں بہت سی برائیاں بھی تھیں ، مگر یہ برائیاں اس لیے تھیں کہ ڈھائی ہزار برس سے اُن کے ہاں کوئی پیغمبر نہ آیا تھا ، نہ کوئی ایسا رہنما پیدا ہوا تھا جو اُن کے اخلاق درست کرتا اور انہیں تہذیب سکھاتا ، صدیوں تک ریگستان میں آزادی کی زندگی بسر کرنے کے سبب ان میں جہالت پھیل گئی تھی - اور وہ اپنی جہالت میں اس قدر سخت ہوگئے تھے کہ ان کو آدمی بنانا کسی معمولی آدمی کے بس کا کام نہ تھا ، لیکن اسی کے ساتھ ان میں یہ قابلیت ضرور موجود تھی کہ اگر کوئی زبردست انسان ان کی اصلاح کر دے اور اس کی تعلیم کے اثر سے وہ کسی اعلیٰ درجہ کے مقصد کو لے کر اٹھ کھڑے ہوں تو دنیا کو زیر و زبر کر ڈالیں۔ پیغمبر عالم کی تعلیم کو پھیلانے کے لیے ایسی ہی جوان اور طاقت ور قوم کی ضرورت تھی -

اس کے بعد عربی زبان کو دیکھو - اس زبان کی واقفیت اور اس کے علم و ادب کے مطالعے سے تم کو معلوم ہوگا کہ بلند خیالات کو ادا کرنے اور خدائی علم کی نہایت نازک اور باریک باتیں بیان کرنے اور دلوں میں اثر پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں کوئی زبان نہیں ہے - اس زبان کے مختصر جملوں میں بڑے بڑے مضامین ادا ہوجاتے ہیں پھر اُن میں ایسا زور ہوتا ہے کہ دلوں میں تیر و نشتر کی طرح اثر کرتے ہیں - ایسی شیرینی ہوتی ہے کہ کانوں میں رس پڑتا معلوم ہوتا ہے - ایسا نغمہ ہوتا ہے کہ آدمی بے اختیار جھومنے لگتا ہے - قرآن جیسی کتاب کے لیے ایسی ہی زبان کی ضرورت تھی -

پس اللہ تعالیٰ کی یہ بہت بڑی حکمت تھی کہ اس نے تمام جہان کی پیغمبری کے لیے عرب کے مقام کو منتخب کیا - جس ذات مبارک کو اس کام کے لیے پسند کیا گیا وہ بھی عدیم المثال تھی -

Marfat.com

نبوت محمدی کا عقلی ثبوت

ایک ہزار چار سو برس پیچھے دنیا میں نہ تار برقی تھی، نہ ٹیلیفون تھے، نہ ریل تھی، نہ چھاپے خانے تھے۔ نہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے تھے، نہ کتابیں چھپتی تھیں، نہ سفر اور سیاحت کی وہ آسانیاں تھیں جو آج کل پائی جاتی ہیں۔ ایک ملک سے دوسرے ملک تک جانے میں مہینوں کی مسافت طے کرنی پڑتی تھی۔ ان حالات میں دنیا کے درمیان عرب کا ملک سب سے الگ تھلگ پڑا ہوا تھا۔ اس کے ارد گرد، ایران، روم اور مصر کے ملک تھے جن میں کچھ علوم و فنون کا چرچا تھا مگر ریت کے بڑے بڑے سمندروں نے عرب کو ان سے جدا کر رکھا تھا۔ عرب سوداگر اونٹوں پر مہینوں کی راہ طے کر کے ان ملکوں میں تجارت کے لیے جاتے تھے۔ مگر یہ تعلق صرف مال کی خرید و فروخت کی حد تک تھا۔ خود عرب میں کوئی اعلیٰ درجہ کا تمدن نہ تھا، نہ کوئی مدرسہ تھا، نہ کوئی کتب خانہ، نہ لوگوں میں تعلیم کا چرچا تھا، تمام ملک میں گنتی کے چند لوگ تھے جن کو کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ مگر وہ بھی اتنا نہیں کہ اس زمانے کے علوم و فنون سے آشنا ہوتے۔ وہاں کوئی باقاعدہ حکومت بھی نہ تھی، کوئی قانون بھی نہ تھا۔ ہر قبیلہ اپنی جگہ خود مختار تھا، آزادی کے ساتھ لوٹ مار ہوتی تھی، آئے دن خون ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں، آدمی کی جان کوئی قیمت ہی نہ رکھتی تھی، جس کا جس پر بس چلتا اسے مار ڈالتا اور اس کے مال پر قبضہ کر لیتا۔ اخلاق اور تہذیب کی اُن کو ہوا بھی نہ لگی تھی۔ بدکاری اور شراب خوری اور جوئے بازی کا بازار گرم تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے سامنے بے تکلف برہنہ ہو جاتے تھے، عورتیں تک خانۂ کعبہ میں ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، حرام و حلال کی کوئی تمیز نہ تھی، عربوں کی آزادی اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ کوئی شخص کسی قاعدے، کسی قانون، کسی ضابطے کی پابندی کے لیے تیار نہ تھا، نہ کسی حاکم کی اطاعت قبول کر سکتا تھا۔ اس پر جہالت کی یہ کیفیت کہ ساری قوم پتھر کے بتوں کو پوجتی تھی۔ راستہ چلتے میں کوئی اچھا سا چکنا پتھر مل جاتا تھا اسی کو سامنے رکھ کر پرستش کر لیتے تھے، یعنی جو گردنیں کسی کے سامنے نہ جھکتی تھیں وہ پتھروں کے سامنے جھک جاتی تھیں، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ پتھر اُن کی حاجت روائی کریں گے۔

Marfat.com

ایسی قوم اور ایسے حالات میں ایک شخص پیدا ہوتا ہے ، بچپن ہی میں ماں باپ اور دادا کا سایہ سر سے اٹھ جاتا ہے ۔ اس لیے اس گئی گذری حالت میں جو تربیت مل سکتی تھی ، وہ بھی اس کو نہیں ملتی ، ہوش سنبھالتا ہے تو عرب لڑکوں کے ساتھ بکریاں چرانے لگتا ہے ، جوان ہوتا ہے تو سوداگری میں لگ جاتا ہے ۔ اٹھنا بیٹھنا ، ملنا جلنا سب انہی عربوں کے ساتھ ہے جن کی حالت ابھی بیان ہو چکی ہے ۔ تعلیم کا نام تک نہیں حتیٰ کہ پڑھنا بھی نہیں آتا ، مگر اس کے باوجود اس کی عادتیں ، اس کے اخلاق ، اس کے خیالات سب سے جدا ہیں ۔ وہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا ، کسی سے بد کلامی نہیں کرتا ۔ اس کی زبان میں سختی کے بجائے شیرینی ہے اور وہ بھی ایسی کہ لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے ہیں ۔ وہ کسی کا ایک پیسہ بھی ناجائز طریقے سے نہیں لیتا ۔ اس کی ایمان داری کا حال یہ ہے کہ لوگ اپنے قیمتی مال اس کے پاس حفاظت کے لیے رکھواتے ہیں اور وہ ہر ایک کے مال کی حفاظت اپنی جان کی طرح کرتا ہے اور ساری قوم اس کی دیانت پر بھروسہ کرتی ہے اور اسے 'امین' کے نام سے پکارتی ہے ۔ اس کی شرم و حیا کا یہ حال ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد کسی نے اس کو برہنہ نہیں دیکھا ۔ اس کی شائستگی کا یہ حال ہے کہ بد تمیز اور گندے لوگوں میں پلنے اور رہنے کے باوجود ہر بد تمیزی اور گندگی سے نفرت کرتا ہے ، اور اس کے ہر کام میں صفائی اور ستھرائی پائی جاتی ہے ۔ اس کے خیالات اتنے پاکیزہ ہیں کہ اپنی قوم کو لوٹ مار اور خون ریزی کرتے دیکھ کر اس کا دل دکھتا ہے اور وہ لڑائیوں کے موقع پر صلح و صفائی کرانے کی کوشش کرتا ہے ۔ دل ایسا نرم ہے کہ ہر ایک کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے ، یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرتا ہے ، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے ، مسافروں کی میزبانی کرتا ہے ، کسی کو اس سے دکھ نہیں پہنچتا اور خود دوسروں کی خاطر دکھ اٹھاتا ہے ۔ پھر عقل ایسی صحیح ہے کہ بت پرستوں کی اس قوم میں رہ کر بھی وہ بتوں سے نفرت کرتا ہے ، کبھی کسی مخلوق کے آگے سر نہیں جھکاتا ، اس کے ضمیر سے خود بہ خود آواز آتی ہے کہ زمین و آسمان میں جتنی چیزیں نظر آتی ہیں ان میں کوئی پوجنے کے لائق نہیں ۔ اس کا دل آپ سے کہتا ہے کہ خدا تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور ایک ہی ہے ، اس جاہل قوم میں یہ شخص ایسا ممتاز نظر آتا ہے گویا پتھروں کے ڈھیر میں ایک ہیرا چمک رہا ہے یا گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک شمع روشن ہو ۔

Marfat.com

چالیس برس کے قریب اس قدر پاک صاف اور اعلیٰ درجے کی شریفانہ زندگی بسر کرنے کے بعد یہ شخص اس تاریکی سے جو اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی گھبرا اٹھتا ہے ۔ جہالت ، بد اخلاقی ، بد کرداری ، بد نظمی ، اور شرک و بت پرستی کا یہ ہولناک سمندر جو اس کو گھیرے ہوئے تھا ، اس سے وہ نکل جانا چاہتا ہے ۔ کیوں کہ یہاں کوئی چیز بھی اس کی طبیعت کے مناسب نہیں ۔ آخر وہ آبادی سے دور ایک پہاڑ کے غار میں جا جا کر تنہائی اور سکون کے عالم میں کئی کئی دن گذارنے لگتا ہے ۔ فاقے کرکر کے اپنی روح اور اپنے دل و دماغ کو اور زیادہ پاک صاف کرتا ہے ، سوچتا ہے ، غور و فکر کرتا ہے اور کوئی روشنی ڈھونڈتا ہے ، جس سے وہ اس چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکی کو دور کردے ۔ ایسی طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے وہ اس بگڑی ہوئی دنیا کو توڑ پھوڑ کر پھر سے سنوار دے ۔

پھر اس حالت میں ایک عظیم الشان تغیر رونما ہوتا ہے ۔ یکا یک اس کے دل میں وہ روشنی آجاتی ہے جس کو اس کی فطرت مانگ رہی تھی ۔ اچانک اس کے اندر وہ طاقت بھر جاتی ہے جس کا ظہور اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا ۔ وہ غار کی تنہائی سے نکل آتا ہے ۔ اپنی قوم کے پاس آتا ہے ، کہتا ہے کہ بت کسی کام کے نہیں ، انہیں چھوڑ دو ۔ یہ زمین و آسمان ، یہ چاند ، یہ سورج ، یہ تارے ، زمین و آسمان کی یہ ساری قوتیں ۔ ایک خدا کی مخلوق ہیں ۔ وہی تمہارا پیدا کرنے والا ہے ، وہی رزق دینے والا ہے ، وہی مارنے والا ، وہی جلانے والا ہے ۔ سب کو چھوڑ کر اسی کو پوجو ۔ سب کو چھوڑ کر اسی سے اپنی حاجتیں طلب کرو ۔ یہ چوری ، یہ لوٹ مار ، یہ شراب خوری ، یہ جوا ، یہ بدکاریاں ، جو تم کرتے ہو ، سب گناہ ہیں ۔ انہیں چھوڑ دو خدا انہیں پسند نہیں کرتا ۔ سچ بولو ، انصاف کرو ، نہ کسی کی جان لو نہ کسی کا مال چھینو ، جو کچھ لو حق کے ساتھ لو ، جو کچھ دو حق کے ساتھ دو ۔ تم سب انسان ہو ، انسان اور انسان سب برابر ہیں ۔ بزرگی اور شرافت انسان کی نسل اور نسب میں نہیں ، رنگ روپ اور مال و دولت میں نہیں ۔ خدا پرستی ، نیکی اور پاکیزگی میں ہے ۔ جو شخص خدا سے ڈرتا ہے اور نیک اور پاک ہے وہ ہی اعلیٰ درجے کا انسان ہے اور جو ایسا نہیں وہ کچھ بھی نہیں ۔ مرنے کے بعد تم سب کو اپنے خدا کے پاس حاضر ہونا ہے ۔ اس عادل حقیقی کے ہاں نہ کوئی سفارش کام آئے گی ، نہ رشوت چلے گی ، نہ کسی کا نسب پوچھا جائے گا ۔ وہاں صرف ایمان اور

Marfat.com

نیک عمل کی پوچھ ہوگی - جس کے پاس یہ سامان ہوگا وہ جنت میں جائے گا اور جس کے پاس ان میں سے کچھ نہ ہوگا وہ نامراد دوزخ میں ڈالا جائے گا -

جاہل قوم نے اس نیک انسان کو صرف اس قصور میں ستانا شروع کیا کہ وہ ایسی باتوں کو برا کیوں کہتا ہے ، جو باپ دادا کے وقت سے ہوتی چلی آرہی ہیں اور ان باتوں کی تعلیم کیوں دیتا ہے جو بزرگوں کے طریقے کے خلاف ہیں - اسی قصور پر انہوں نے اسے گالیاں دیں ، پتھر مارے ، اس کے لیے جینا مشکل کردیا ، اس کے قتل کی سازشیں کیں ، ایک دن دو دن نہیں اکٹھے تیرہ برس تک سخت سے سخت ظلم توڑے ، یہاں تک کہ اسے وطن چھوڑنے پر مجبور کردیا اور پھر وطن سے نکال کر بھی دم نہ لیا - جہاں اس نے پناہ لی تھی وہاں بھی کئی برس اس کو پریشان کرتے رہے -

یہ سب تکلیفیں اس عظیم المرتبت انسان نے کس لیے اٹھائیں؟ صرف اس لیے کہ وہ اپنی قوم کو سیدھا راستہ بتانا چاہتا تھا - اس کی قوم اسے بادشاہی دینے کے لیے تیار تھی ، دولت کے ڈھیر اس کے قدموں پر ڈالنے پر آمادہ تھی بشرطیکہ وہ اس تعلیم سے باز آجائے - مگر اس نے سب چیزوں کو ٹھکرا دیا اور اپنی بات پر قایم رہا - کیا اس سے پڑھ کر نیک دلی اور صداقت تمہارے خیال میں آسکتی ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی فائدے کی خاطر نہیں محض دوسروں کے بھلے کی خاطر تکلیفیں اٹھائے ؟ وہی لوگ جن کے فائدے کے لیے وہ کوشش کررہا ہے ، اس کو پتھر مارتے ہیں اور وہ ان کے لیے دعائے خیر کرتا ہے - انسان تو کیا فرشتے بھی اس نیکی پر قربان ہو جائیں -

پھر دیکھو ، جب یہ شخص اپنے غار سے یہ تعلیم لے کر نکلا تو اس میں کتنا بڑا انقلاب ہوگیا - اب جو کلام وہ سنا رہا تھا ، وہ ایسا فصیح و بلیغ تھا کہ کسی نے نہ اس سے پہلے ایسا کلام کہا اور نہ اس کے بعد کوئی کہہ سکا - عرب والوں کو اپنی شاعری ، اپنی خطابت ، اپنی فصاحت پر بڑا ناز تھا - اس نے عربوں سے کہا کہ تم ایک ہی سورت اس کلام کے مانند بنا لاؤ مگر سب کی گردنیں عاجزی سے جھک گئیں - حد یہ کہ خود اس شخص کی عام بول چال اور تقریر کی زبان بھی ایسی بلند پایہ نہ تھی جتنی اس خاص کلام کی تھی ، چناں چہ آج بھی جب ہم اس کی دوسری تقریروں کا مقابلہ اس کلام سے کرتے ہیں تو دونوں میں نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے -

اس ان پڑھ صحرا نشین انسان نے حکمت اور دانائی کی ایسی باتیں کہنا شروع کیں کہ نہ اس سے پہلے کسی انسان نے کہی تھیں ، نہ اس کے بعد آج

Marfat.com

تک کوئی کہہ سکا ۔ نہ چالیس برس کی عمر سے پہلے خود اس کی زبان سے وہ کبھی سنی گئی تھیں ۔

اس اُمّی نے اخلاق ، معاشرت ، معیشت ، سیاست ، اور انسانی زندگی کے تمام معاملات کے متعلق ایسے قانون بنائے کہ بڑے بڑے عالم اور عاقل برسوں کے غور و خوض اور ساری عمر کے تجربات کے بعد بہ مشکل ان کی حکمتوں کو سمجھ سکتے ہیں ، اور دنیا کے تجربات جتنے بڑھتے جاتے ہیں ، ان کی حکمتیں اور زیادہ کھلتی جاتی ہیں ۔ تیرہ سو برس سے زیادہ مدت گذر چکی ہے ، مگر آج بھی اس کے بنائے ہوئے قانون میں کسی تبدیلی کی ضرورت نظر نہیں آتی ۔ دنیا کے قانون ہزاروں مرتبہ بنے اور بگڑے ۔ ہر آزمائش میں ناکام ہوئے اور ہر بار ان میں ترمیم کرنی پڑی مگر اس صحرا نشین اُمّی نے تن تنہا بغیر کسی دوسرے انسان کی مدد کے جو قانون بنا دیے ، ان کی کوئی ایک دفعہ بھی ایسی نہیں جو اپنی جگہ سے ہٹائی جا سکتی ہو ۔

اس نے تیئیس برس کی مدت میں اپنے اخلاق ، اپنی نیکی ، اپنی شرافت اور اپنی اعلیٰ تعلیم کے زور سے اپنے دشمنوں کو دوست بنایا ، اپنے مخالفوں کو موافق بنایا ، بڑی بڑی طاقتیں اس کے مقابلے میں آئیں اور آخر کار شکست کھا کر اس کے قدموں پر آ رہیں ۔ اس نے جب فتح پائی تو کسی دشمن سے بدلہ نہ لیا کسی پر سختی نہ کی ، جنہوں نے اس کے حقیقی چچا کو قتل کیا تھا اور اس کا کلیجہ نکال کر چبا گئے تھے ، ان کو بھی فتح پا کر اس نے معاف کر دیا ، جنہوں نے اس کو پتھر مارے تھے ، اس کو وطن سے نکالا تھا ، ان کو فتح پا کر اس نے بخش دیا ۔ اس نے کبھی کسی سے دغا نہ کی ، عہد کرکے کبھی نہ توڑا ، جنگ میں بھی کسی پر زیادتی نہ کی ، اس کے سخت سے سخت دشمن بھی کبھی اس پر کسی گناہ یا ظلم کا الزام نہ رکھ سکے ، یہی نیکی تھی جس نے بالآخر تمام عرب کا دل موہ لیا ۔ پھر اس نے اپنی تعلیم و ہدایت سے عربوں کو ، جن کا حال اوپر بیان ہو چکا ہے ، وحشت اور جہالت سے نکال کر اعلیٰ درجے کی مہذب قوم بنا دیا ۔ جو عرب کسی قانون کی پابندی پر تیار نہ تھے ، ان کو اس نے ایسا پابند قانون کر دیا کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی قوم ایسی پابند قانون نظر نہیں آتی ۔ جو عرب کسی کی اطاعت پر آمادہ نہ تھے ، اس نے ان کو ایک عظیم الشان سلطنت کا تابع بنا دیا ۔ جن لوگوں کو اخلاق کی ہوا تک نہ لگی تھی ان کے اخلاق ایسے پاکیزہ بنا دیے کہ آج ان کے حالات پڑھ کر

Marfat.com

دنیا دنگ رہ جاتی ہے ۔ جو عرب اس وقت دنیا کی قوموں میں سب سے زیادہ پست تھے وہ اس تنہا انسان کے اثر سے تیئیس برس کے اندر یکایک ایسے زبردست ہو گئے کہ انہوں نے ایران ، روم اور مصر کی عظیم الشان سلطنتوں کے تختے الٹ دیئے ، دنیا کو تمدن ، تہذیب ، اخلاق اور انسانیت کا سبق دیا اور اسلام کی ایک تعلیم اور ایک شریعت کو لے کر ایشیا ، افریقہ اور یورپ کے دور دراز گوشوں تک پھیلتے چلے گئے ۔

یہ تو وہ اثرات ہیں جو عرب قوم پر ہوئے ۔ اس سے زیادہ حیرت انگیز اثرات اس اُمّی کی تعلیم سے تمام دنیا پر ہوئے ۔ اس نے ساری دنیا کے خیالات ، عادات اور قوانین میں انقلاب پیدا کر دیا ۔ ان کو چھوڑو جنہوں نے اس کو اپنا رہنما ہی مان لیا ہے ۔ مگر حیرت یہ ہے کہ جنہوں نے اس کی پیروی سے انکار کیا جو اس کے مخالف ہیں ، اس کے دشمن ہیں ، وہ بھی اس کے اثرات سے نہ بچ سکے ۔ دنیا توحید کا سبق بھول گئی تھی ، اس نے یہ سبق پھر سے یاد دلایا اور اتنے زور کے ساتھ اس کا صور پھونکا کہ آج بت پرستوں اور مشرکوں کے مذہب بھی توحید کا دعویٰ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں ۔ اس نے اخلاق کی ایسی زبردست تعلیم دی کہ اس کے بنائے ہوئے اصول تمام دنیا کے اخلاقیات میں پھیل گئے اور پھیلتے چلے جا رہے ہیں ۔ اس نے قانون اور سیاست اور تہذیب و معاشرت کے جو اصول بتائے وہ ایسے پکے اور سچے اصول تھے کہ مخالفوں نے بھی چپکے چپکے ان کی خوشہ چینی شروع کر دی اور آج تک کیے جا رہے ہیں ۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے ، یہ شخص ایک جاہل قوم اور ایک نہایت تاریک ملک میں پیدا ہوا تھا ۔ چالیس برس کی عمر تک گلہ بانی اور سوداگری کے سوا اس نے کوئی کام نہ کیا تھا ۔ کسی قسم کی تعلیم و تربیت اس نے نہ پائی تھی ۔ مگر غور کرو چالیس برس کی عمر کو پہنچنے کے بعد کہاں سے اس کے اندر یکایک اتنے کمالات جمع ہو گئے ؟ کہاں سے اس کے پاس ایسا علم آ گیا ؟ کہاں سے اس میں یہ طاقت پیدا ہو گئی ؟ ایک اکیلا انسان ہے ، ایک ہی وقت میں سپہ سالار بھی ہے ، ایک اعلیٰ درجے کا جج بھی ہے ، ایک زبردست مقنن بھی ہے ، ایک بے مثل فلاسفر بھی ہے ، ایک لاجواب مصلح اخلاق و تمدن بھی ہے ، ایک حیرت انگیز ماہر سیاست بھی ہے ۔ پھر اتنی مصروفیتوں کے باوجود وہ راتوں کو گھنٹوں اپنے خدا کی عبادت بھی کرتا ہے ، اپنی بیویوں اور بچوں کے حقوق بھی ادا کرتا ہے ، غریبوں اور مصیبت زدوں کی خدمت بھی کرتا ہے ،

Marfat.com

ایک بڑے ملک کی بادشاہی مل جانے پر بھی وہ خود فقیر کی سی زندگی بسر کرتا ہے، بورئیے پر سوتا ہے، موٹا جھوٹا پہنتا ہے، غریبوں کی سی غذا کھاتا ہے، بلکہ کبھی فاقے کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔

یہ حیرت انگیز کمالات دکھا کر اگر وہ کہتا کہ میں انسان سے بالاتر ہستی ہوں تب بھی کوئی اس کے دعوے کی تردید نہ کرسکتا تھا۔ مگر اس نے یہ نہیں کہا کہ یہ سب میرے اپنے کمالات ہیں، اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ میرے پاس کچھ بھی اپنا نہیں ہے، سب کچھ خدا کا ہے اور خدا کی طرف سے ہے۔ میں نے جو کلام پیش کیا ہے، جس کی نظیر لانے سے سب انسان عاجز ہیں، یہ میرا کلام نہیں ہے، نہ میرے دماغ کی قابلیت کا نتیجہ ہے، یہ خدا کا کلام ہے اور اس کی ساری تعریف خدا کے لیے ہے۔ میرے جتنے کام ہیں یہ بھی میری اپنی قابلیت سے نہیں ہیں، محض خدا کی ہدایت سے ہیں۔ اُدھر سے جو کچھ اشارہ ہوتا ہے وہی کرتا ہوں اور کہتا ہوں۔ ایسے سچے انسان کو خدا کا پیغمبر کیسے نہ مانا جائے؟ اس کے کمالات ایسے ہیں کہ تمام دنیا میں ابتدا سے لے کر آج تک ایک انسان بھی اس کے مانند نہیں ملتا۔ مگر اس کی سچائی ایسی ہے کہ وہ ان کمالات پر فخر نہیں کرتا، ان کو اپنی ذات سے منسوب نہیں کرنا چاہتا، بلکہ جس نے یہ سب کچھ دیا ہے، صاف صاف اسی کا حوالہ دیتا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم اس کی تصدیق نہ کریں؟ جب وہ خود اپنی خوبیوں کے متعلق کہتا ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہیں، تو ہم کیوں کہیں کہ نہیں یہ سب تیرے اپنے دماغ کی پیداوار ہیں؟ جھوٹا آدمی تو دوسروں کی خوبیوں کو بھی اپنی طرف منسوب کرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر یہ شخص ان خوبیوں کو بھی اپنی طرف منسوب نہیں کرتا جنہیں وہ آسانی کے ساتھ اپنی خوبیاں کہہ سکتا تھا، جن کے حاصل ہونے کا ذریعہ کسی کو معلوم ہی نہیں ہوسکتا تھا، جن کی بنا پر اگر وہ انسان سے بالاتر ہونے کا بھی دعویٰ کرتا تو کوئی اس کی تردید نہ کر سکتا تھا۔ پھر بتاؤ کہ اس سے زیادہ سچا انسان کون ہوگا۔

یہ ہیں ہمارے سرکار، تمام جہان کے پیغمبر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کی پیغمبری کی دلیل خود ان کی سچائی ہے۔ ان کے عظیم الشان کارنامے، ان کے اخلاق، ان کی پاک زندگی کے واقعات، سب تاریخوں سے ثابت ہیں۔

Marfat.com

جو شخص صاف دل سے حق پسندی اور انصاف کے ساتھ ان کو پڑھے گا اس کا دل خود گواہی دے گا کہ وہ ضرور خدا کے پیغمبر ہیں ۔ وہ کلام جو انہوں نے پیش کیا وہ یہی قرآن ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔ اس بے نظیر کتاب کو جو شخص بھی سمجھ کر کھلے دل سے پڑھے گا ، اس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ ضرور خدا کی کتاب ہے ، کوئی انسان ایسی کتاب تصنیف نہیں کر سکتا ۔

ختم نبوت *

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ خدا کے سچے نبی ہیں بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کے آخری نبی بھی ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھوں دین کی تکمیل ہوگئی ، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شریعت نے پہلے کی تمام شریعتوں کو منسوخ کر دیا اور اب قیامت تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی لائی ہوئی ہدایات انسانیت کے لیے مشعل راہ ہونگی اور کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا ۔ قرآن پاک میں اس کا صریح بیان اس آیت میں کیا گیا ہے :

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝

(لوگو) محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے ۔
(الاحزاب ۔ ۴۰)

خاتم النبیین کے معنی سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے کے ہیں ۔ یعنی یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ۔ عربی لغت اور محاورے کی رو سے "ختم" کے معنی مہر لگانے ، بند کرنے ، آخر تک پہنچ جانے اور کسی کام کو پورا کر کے فارغ ہو جانے کے ہیں ۔ مثلاً

ختم العمل کے معنی ہیں فرغ من العمل ، "کام سے فارغ ہو گیا ۔"

ختم الاناء کے معنی ہیں "برتن کا منہ بند کر دیا اور اس پر مہر لگا دی تا کہ کوئی چیز اس میں سے نکلے اور نہ کچھ اس کے اندر داخل ہو ۔"

ختم الکتاب کے معنی ہیں "خط بند کر کے اس پر مہر لگدی تا کہ خط محفوظ ہو جائے ۔"

---

* یہاں سے باقی حصہ مولانا مودودی صاحب کے رسالہ 'ختم نبوت' سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

ختم الشئی ، بلغ آخرہ، "کسی چیز کو ختم کرنے کا مطلب ہے اس کے آخر تک پہنچ جانا ۔" اسی معنی میں ختم قرآن بولتے ہیں اور اسی معنی میں سورتوں کی آخری آیات کو خواتیم کہا جاتا ہے ۔

خاتم القوم آخر ھم ؛ "خاتم القوم سے مراد ہے قبیلے کا آخری آدمی ۔" ۱

اسی بنا پر تمام اھل لغت اور اھل تفسیر نے بالاتفاق خاتم النبیین کے معنی آخرالنبیین کے لیے ھیں ۔ عربی لغت و محاورے کی رو سے خاتم کے معنی ڈاک خانے کی مہر کے نہیں ھیں جسے لگا کر خطوط جاری کیے جاتے ھیں ۔ بلکہ اس سے مراد وہ مہر ہے جو لفافے پر اس لیے لگائی جاتی ہے کہ نہ اس کے اندر سے کوئی چیز باھر نکلے نہ باھر کی کوئی چیز اندر جائے ۔

اس لفظ کا جو مفہوم ھم نے اوپر بیان کیا ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کرتی ھیں ۔ مثال کے طور پر چند صحیح ترین احادیث ھم یہاں نقل کرتے ھیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

۱ ۔ بنی اسرائیل کی قیادت انبیا کیا کرتے تھے ۔ جب کوئی نبی مرجاتا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ھوتا ۔ مگر میرے بعد کوئی نبی نہ ھوگا بلکہ خلفا ھوں گے ۔۲

۲ ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، میری اور مجھ سے پہلے گزرے ھوئے انبیا کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص نے ایک عمارت بنائی اور خوب حسین و جمیل بنائی ۔ مگر ایک کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑی ھوئی تھی ۔ لوگ اس عمارت کے گرد پھرتے اور اس کی خوبی پر اظہار حیرت کرتے تھے ۔ مگر کہتے تھے کہ اس جگہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی ؟ تو وہ اینٹ میں ھوں اور میں خاتم النبیین ھوں (یعنی میرے آنے پر نبوت کی عمارت مکمل ھو چکی ہے ، اب کوئی جگہ باقی نہیں ہے جسے پُر کرنے کے لیے کوئی نبی آئے) ۔

۳ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : رسالت اور نبوت کا سلسلہ ختم ھوگیا ۔ میرے بعد اب نہ کوئی رسول ہے اور نہ نبی ۔۳

---

۱ ملاحظہ ھو لسان العرب ، قاموس اور اقرب الموارد ۔
۲ بخاری ، کتاب المناقب ، باب ماذکر عن بنی اسرائیل ۔
۳ ترمذی ۔ مسند احمد ۔

Marfat.com

۴ - رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے بعد کوئی نبی نہیں اور میری امت کے بعد کوئی امت (یعنی کسی نئے آنے والے نبی کی امت) نہیں -

یہ احادیث بہ کثرت صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہیں اور بہ کثرت محدثین نے ان کو بہت سی قوی سندوں سے نقل کیا ہے - ان کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مواقع پر مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں اس امر کی تصریح فرمائی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آخری نبی ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے ' نبوت کا سلسلہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ختم ہو چکا ہے، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد جو لوگ بھی رسول یا نبی ہونے کا دعویٰ کریں وہ دجال و کذاب ہیں - قرآن کے الفاظ "خاتم النبیین" کی اس سے زیادہ مستند و معتبر اور قطعی الثبوت تشریح اور کیا ہو سکتی ہے - رسول پاک کا ارشاد تو بجائے خود سند و حجت ہے - مگر جب وہ قرآن کی ایک نص کی شرح کر رہا ہو تب تو وہ اور بھی زیادہ قوی حجت بن جاتا ہے - اب سوال یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر قرآن کو سمجھنے والا اور اس کی تفسیر کا حق دار اور کون ہو سکتا ہے کہ وہ ختم نبوت کا کوئی دوسرا مفہوم بیان کرے اور ہم اسے قبول کرنا کیا معنی، قابل التفات بھی سمجھیں؟

قرآن و سنت کے بعد تیسرے درجے میں اہم ترین حیثیت صحابہؓ کرام کے اجماع کی ہے - یہ بات تمام معتبر تاریخی روایات سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے فوراً بعد جن لوگوں نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور جن لوگوں نے ان کی نبوت تسلیم کی، ان سب کے خلاف صحابہؓ کرام نے بالاتفاق جنگ کی تھی -

اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ مسیلمہ کذاب کا معاملہ قابل ذکر ہے - یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا منکر نہ تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک نبوت بنایا گیا ہے - اس صریح اقرار رسالت محمدی کے باوجود اسے کافر اور خارج از ملت قرار دیا گیا اور اس کے خلاف جنگ کی گئی -

اس جائزے کے بعد آیے اب یہ دیکھیں کہ ختم نبوت کے باب میں عقل کا فیصلہ کیا ہے؟ نبوت کوئی ایسی صفت نہیں ہے جو ہر اس شخص میں پیدا

Marfat.com

ہو جایا کرے جس نے عبادت اور عمل صالح میں ترقی کرکے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا لیا ہو۔ نہ یہ کوئی ایسا انعام ہے جو کچھ خدمات کے صلے میں عطا کیا جاتا ہو۔ بلکہ یہ ایک منصب ہے جس پر ایک خاص ضرورت کی خاطر اللہ تعالیٰ کسی شخص کو مقرر کرتا ہے۔ وہ ضرورت جب داعی ہوتی ہے تو ایک نبی اس کے لیے مامور کیا جاتا ہے۔ اور جب ضرورت نہیں ہوتی یا باقی نہیں رہتی تو خواہ مخواہ انبیا پر انبیا نہیں بھیجے جاتے۔

قرآن مجید سے جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ نبی کے تقرر کی ضرورت کن کن حالات میں پیش آئی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف چار حالتیں ایسی ہیں جن میں انبیا مبعوث ہوئے ہیں۔

اول یہ کہ کسی خاص قوم میں نبی بھیجنے کی ضرورت اس لیے ہو کہ اس میں پہلے کبھی کوئی نبی نہ آیا تھا اور کسی دوسری قوم میں آئے ہوئے نبی کا پیغام بھی اس تک نہ پہنچ سکتا تھا۔

دوم یہ کہ نبی بھیجنے کی ضرورت اس وجہ سے ہو کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کی تعلیم بھلا دی گئی ہو، یا اس میں تحریف ہوگئی ہو، اور اس کے نقش قدم کی پیروی کرنا ممکن نہ رہا ہو۔

سوم یہ کہ پہلے گزرے ہوئے نبی کے ذریعے سے مکمل تعلیم و ہدایت لوگوں کو نہ ملی ہو اور تکمیلِ دین کے لیے مزید انبیا کی ضرورت ہو۔

چہارم یہ کہ ایک نبی کے ساتھ اس کی مدد کے لیے ایک اور نبی کی حاجت ہو۔

اب یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ضرورت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد باقی نہیں رہی ہے۔

قرآن خود کہہ رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام دنیا کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا گیا ہے، اور دنیا کی تمدنی تاریخ بتا رہی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کے وقت سے مسلسل ایسے حالات موجود رہے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت سب قوموں کو پہنچ سکتی تھی اور ہر وقت پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد الگ الگ قوموں میں انبیا آنے کی کوئی حاجت باقی نہیں رہتی۔

Marfat.com

قرآن اس پر بھی گواہ ہے اور اس کے ساتھ حدیث و سیرت کا پورا ذخیرہ اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیم بالکل اپنی صحیح صورت میں محفوظ ہے ۔ اس میں مسخ و تحریف کا کوئی عمل نہیں ہوا ہے ۔ جو کتاب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لائے تھے اس میں ایک لفظ کی بھی کمی و بیشی آج تک نہیں ہوئی ، نہ قیامت تک ہو سکتی ہے ۔ جو ہدایت آپ نے اپنے قول و عمل سے دی اس کے تمام آثار آج بھی اس طرح ہمیں مل جاتے ہیں کہ گویا ہم آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانے میں موجود ہیں ۔ اس لیے دوسری ضرورت بھی ختم ہو گئی ۔

پھر قرآن مجید یہ بات بھی صاف صاف کہتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دین کی تکمیل کردی گئی ۔ لہذا تکمیل دین کے لیے بھی اب کوئی نبی درکار نہیں رہا ۔

اب رہ جاتی ہے چوتھی ضرورت ، تو اگر اس کے لیے کوئی نبی درکار ہوتا تو وہ حضور صلعم کے زمانے میں آپ کے ساتھ مقرر کیا جاتا ۔ ظاہر ہے کہ جب وہ مقرر نہیں کیا گیا تو یہ وجہ بھی ساقط ہو گئی ۔

اب، ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ پانچویں وجہ کون سی ہے جس کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد ایک نبی کی ضرورت ہو؟ اگر کوئی کہے کہ قوم بگڑ گئی ہے اس لیے اصلاح کی خاطر ایک نبی کی ضرورت ہے ، تو ہم اس سے پوچھیں گے کہ محض اصلاح کے لیے نبی دنیا میں کب آیا ہے کہ آج صرف اس کام کے لئے وہ آئے ؟ نبی تو اس لیے مقرر ہوتا ہے کہ اس پر وحی کی جائے اور وحی کی ضرورت یا تو کوئی نیا پیغام دینے کے لیے ہوتی ہے ، یا پچھلے پیغام کی تکمیل کرنے کے لیے یا اس کو تحریفات سے پاک کرنے کے لیے ۔ قرآن اور سنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے محفوظ ہو جانے اور دین کے مکمل ہو جانے کے بعد جب وحی کی سب ممکن ضرورتیں ختم ہو چکی ہیں ، تو اب اصلاح کے لیے صرف مصلحین کی حاجت باقی ہے نہ کہ انبیا کی ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں*

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے سلسلے میں موجودہ دور میں بہت غلط فہمیاں

* یہ حصہ مولانا امین احسن اصلاحی کی کتاب ' تزکیہ نفس ' جلد اول سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

پھیلی ہوئی ہیں ۔ ایک گروہ کے نزدیک اللہ کے رسول کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں جو کاتب اور مکتوب الیہ کے درمیان ایک دیانت دار قاصد کی ہوتی ہے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن ہم تک پہنچا دیا اور اس کے بعد آپ کا تعلق ہم سے اور ہمارا تعلق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ۔ لیکن ہم اس سے پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یہ تصور صحیح نہیں اس لیے کہ رسول صرف پیغامبر ہی نہیں ہوتا بلکہ معلم، مزکی، قانون ساز اور رہنما بھی ہوتا ہے اور یہ سارے مناصب اسے خدا ہی کی طرف سے ملتے ہیں ۔ دوسرے گروہ کے نزدیک علم کے دو حصے ہیں، علم ظاہر اور علم باطن ۔ ان کے نزدیک علم ظاہر یعنی شریعت کا علم (جو ان کے نزدیک کم تر درجے کا علم ہے)، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عام لوگوں میں پھیلایا لیکن علم باطن یعنی طریقت کا علم صرف چند لوگوں کو دیا اور انہی سے یہ علم سینہ بہ سینہ چلا ۔ یہ خیال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کو مجروح اور ان سے ہمارے تعلق کو کمزور کرتا ہے، اس لیے کہ انہیں جس علم سے نوازا گیا تھا وہ پوری انسانیت کے لیے ضروری تھا ۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ماضی کی ایک قابل احترام شخصیت سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ۔ ماحول کے زیر اثر احترام بھی کرتے ہیں لیکن بس اس طرح کہ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ! ان کے ذہن میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان کی دنیوی اور آخروی سعادت کا دار و مدار صرف اس بات پر ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو بلا چون و چرا مان لے ۔ ان لوگوں کے نزدیک "زمانے کے تقاضے" کچھ اور ہیں، اور زمانۂ قدیم کی روش پر اب بھی اصرار کرنا جہالت اور تاریک خیالی سے زیادہ کچھ نہیں ۔ چوتھا گروہ ہمارے عوام الناس کا ہے جس کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بس ایک اندھی بہری عقیدت کا مرجع ہے اور اس عقیدت کی تسکین کے لیے میلاد کرنے کے علاوہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا ۔

ان امور کے پیش نظر ضروری ہے کہ جن بنیادوں پر قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمیں اپنا تعلق استوار کرنے کی ہدایت کی ہے وہ بنیادیں واضح کی جائیں ۔ قرآن نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کو چار بنیادوں پر قایم کیا ہے ۔ ایمان، اطاعت، اتباع اور محبت ۔ ذیل میں ہم ان سب کی مختصر تشریح کریں گے ۔

۱۔ ایمان : نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی یہ پہلی بنیاد ہے ۔ ایمان کا مطلب صرف یہ مان لینا ہی نہیں ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کے

Marfat.com

رسول ہیں بلکہ اس ایمان کی اصل روح آپ کی ذات پر سچا اور پکا اعتماد ہے، اس بات پر اعتماد کہ آپ صادق و امین ہیں، آپ کے ہر قول و فعل میں گہری حکمت ہے، جو راہ آپ نے دکھائی ہے اگرچہ اس میں ظاہراً کتنے ہی خطرات نظر آرہے ہوں مگر نجات اور فلاح کی حقیقی راہ وہی ہے۔ اس بات پر اعتماد کہ آپ نے زندگی کے جو اصول سکھائے ہیں وہ دائمی اور ابدی ہیں اور انسان ان سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکے گا۔ اور سب سے بڑھ کر اس بات پر اعتماد کہ خدا کی معرفت کا طریقہ جو آپ نے بتایا اور سکھایا ہے اس سے بہتر طریقہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ یہ اعتماد اور یقین انسانوں میں پیدا نہ ہو وہ ایمان کی حقیقی لذت سے آشنا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے حدیث میں کہا گیا ہے:

ذاق طعم الایمان من رضی باللہ ربا و بالاسلام دیناً وبمحمد رسولا (مسلم)	ایمان کا مزہ اس نے چکھا جو اللہ کے اپنا رب ہونے پر، اسلام کے اپنا دین ہونے پر اور محمد کے اپنا رسول ہونے پر مطمئن ہوگیا۔

اس ایمان کے معنی یہ ہیں کہ دنیا کے دوسرے علوم و افکار اگر کچھ قابل لحاظ ہو سکتے ہیں تو صرف اس حد تک ہو سکتے ہیں جس حد تک وہ کتاب و سنت کے مؤید ہوں۔ اگر کوئی شخص اس حد سے بڑھ کر کسی فکر و فلسفہ کو یا کسی وجدان و کشف کو نبی کے علم و عمل پر ترجیح دے یا اس کے برابر ہی ٹھیرائے، یا اس کسوٹی پر جانچے بغیر ہی اس کو تسلیم کرے اور اس کے ساتھ ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کا دعویٰ بھی کرے تو اس کا دعوائے ایمان محض ایک فریب نفس ہے اس لیے کہ اس کا ایمان اس اعتماد سے خالی ہے جو اس ایمان کی اصل روح ہے۔

۲۔ اطاعت: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد اطاعت ہے۔ دنیا میں کوئی بھی نبی یا رسول محض اس لیے نہیں بھیجا گیا کہ بس اس کو مان لینے کی حد تک لوگ اس کو نبی اور رسول مان لیں بلکہ اس کے بھیجے جانے سے اصل شے جو مقصود رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسی کی اطاعت بھی کی جائے اور زندگی کے معاملات میں جو احکام و ہدایت وہ دے اس کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔

Marfat.com

اس حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں واضح فرمایا ہے :

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے
بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس
کی اطاعت کی جائے - (النسا - ۶۴)

رسول کی اطاعت کے مطالبے کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی اطاعت ، جو اصل مقصود ہے ، اس کا راستہ ہی یہ ہے کہ اس کے رسول کی اطاعت کی جائے - اللہ اپنے بندوں سے براہ راست معاملہ نہیں کرتا بلکہ اپنے رسول کے واسطے سے کرتا ہے - رسول ہی لوگوں کو اس کی ہدایات اور اس کے احکام سے آگاہ کرتا ہے - اس وجہ سے جو اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرے - کیوں کہ رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے -

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی
اطاعت کی - (النسا - ۸۰)

احادیث میں بھی اس حقیقت کو بہت تشریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے - مثلاً ایک حدیث میں آیا ہے کہ " جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی - اللہ کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی نشان امتیاز ہیں - " (بخاری)

اس اطاعت کے بارے میں بھی قرآن نے بڑے واشگاف الفاظ میں کہ دیا ہے کہ محض ظاہری اطاعت مطلوب نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ آدمی پورے خلوص دل کے ساتھ اطاعت کرے ، جو قضیے اور جھگڑے پیدا ہوں ان کے لیے اللہ کے رسول کی طرف رجوع کرے اور وہاں سے جو بھی فیصلہ ہو اسے اطمینان اور پوری رضامندی سے قبول کرے اور دل میں بد گمانی اور شکایت نہ رکھے -

ان احکام کا تعلق صرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات مبارک ہی سے نہیں تھا بلکہ اب بھی جب کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پاک ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو آپ کی سنت آپ کی قایم مقام ہے اور اس کی اطاعت بھی

Marfat.com

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت ہے۔ اپنی وفات سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اس بات کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا "میں نے تم میں دو چیزیں چھوڑی ہیں، جب تک تم ان دونوں پر مضبوطی سے قایم رہو گے گمراہ نہ ہو گے، ایک کتاب اللہ اور دوسری سنت رسول۔"

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو رسول ماننے کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کتاب و سنت کی پیروی کریں جن کے ذریعے سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے احکام سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے۔ اگر محض زبان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کیا جاتا رہے اور اطاعت اپنی ہوائے نفس کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کے بالکل خلاف دوسروں کی کی جاتی رہے تو یہ رسول کو صحیح معنوں میں ماننا نہیں ہوگا۔

۳۔ اتباع: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی تیسری بنیاد اتباع ہے۔ اتباع کا دائرہ اطاعت سے زیادہ وسیع ہے۔ اطاعت کے دائرے میں تو عموماً وہی باتیں آتی ہیں جن کی حیثیت احکام و واجبات اور اوامر و نواہی کی ہو لیکن اتباع کے دائرے میں مستحبات اور نوافل بھی آجاتے ہیں۔ پھر اطاعت بعض حالات میں محض ظاہری اور رسمی بھی ہوسکتی ہے۔ آدمی ایک شخص کی اطاعت کرتا ہے لیکن اس کی اطاعت میں اخلاص اور محبت کا جذبہ ذرا بھی شامل نہیں ہوتا لیکن اتباع میں متبوع کے لیے عقیدت و احترام کا جذبہ پایا جانا بھی شرط ہے۔

صحابۂ کرام آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صرف اطاعت ہی نہیں کرتے تھے بلکہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع بھی کرتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کوئی حکم دیا تو اطاعت کرلی بلکہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک ادا کو دیکھتے، اس کو نگاہوں میں رکھتے اور اس کی تقلید کرتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کی دلی خواہش ہوتی کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ سے زیادہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سانچے میں ڈھال دے اور یہ اہتمام کسی خارجی دباؤ کے تحت نہیں بلکہ محض محبت اور عقیدت کے جذبے سے سرشار ہو کر کرتے تھے۔

اتباع رسول میں صحابۂ کرام کے اس ذوق و شوق کی وجہ یہ تھی کہ خدا کی محبت اور محبوبیت کا درجہ صرف اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں

Marfat.com

بلکہ فی الحقیقت اتباع رسول سے حاصل ہوتا ہے۔ رسول خدا کی معرفت کا مظہر کامل ہوتا ہے اور اس کی ہر ہر ادا معرفت الہیٰ کا نشان ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ خدا سے محبت رکھتے ہیں وہ رسول کی ایک ایک ادا سے محبت رکھتے ہیں، اتباع کرتے ہیں، یہاں تک کہ خدا کے محبوب بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

اے نبی، کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔ (آل عمران۔۳۱)

۴ - محبت : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے تعلق کی چوتھی بنیاد آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ہماری محبت ہے۔ دین میں وہ ایمان یا اطاعت معتبر نہیں جس کی بنیاد محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ ہو۔ محبت بھی محض ظاہری اور رسمی قسم کی مطلوب نہیں بلکہ ایسی محبت مطلوب ہے جو تمام محبتوں پر غالب آجائے جس کے مقابل میں عزیز سے عزیز رشتے اور محبوب سے محبوب تعلقات کی بھی قدر و قیمت نہ رہ جائے، جس کے لیے دنیا کی ہر چیز کو چھوڑا جاسکے لیکن خود اس کو کسی قیمت پر نہ چھوڑا جا سکے۔ قرآن مجید میں اس محبت کا معیار یہ بتایا گیا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کے گر جانے کا تمہیں اندیشہ ہے اور مکانات جو تمہیں پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر کردے۔ (توبہ۔ ۲۴)

اسی حقیقت کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے احادیث میں بھی واضح فرمایا ہے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ "کسی شخص کا ایمان متحقق نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھ کو اپنے باپ بیٹے اور دوسرے تمام عزیز و اقارب سے عزیز نہ رکھے۔" اسی طرح ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "ایمان کی حقیقی لذت سے وہی آشنا ہو سکتا ہے جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم دوسری تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔"

Marfat.com

لیکن یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جس محبت کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد وہ جذباتی محبت نہیں جو انسان کو بیوی بچوں سے ہوتی ہے - بلکہ وہ عقلی اور اصولی محبت ہے جس کی بنا پر انسان اپنی عزیز ترین چیزوں پر ان اصولوں کو مقدم رکھتا ہے - اگر ان اصولوں کی راہ میں خود اس کا اپنا نفس مزاحم ہوتا ہے تو اس سے لڑتا ہے ، دوسرے مزاحم ہوتے ہیں تو ان کا مقابلہ کرتا ہے ، یہاں تک کہ بیوی بچے ، خاندان ، ملک اور قوم بھی ان اصولوں کے مخالف ہو جاتے ہیں تو ان سب کے مطالبات ٹھکرا دیتا ہے - اس محبت کی اصولی نوعیت کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود ایک حدیث میں واضح فرما دیا ہے - آپ کا ارشاد ہے:

من احب سنتی فقد احبنی — جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی - (ترمذی)

اسی حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا یہی تقاضا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل کیا جائے اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات پر عمل نہ ہو تو محبت کا دعویٰ کھوکھلا اور بے بنیاد ہے -

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی ' سیرۃ النبی جلد چہارم - دارالمصنفین - اعظم گڑھ -

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی **اسلام کا نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

پروفیسر محمود علی ، **دین و دانش** - امرتسر -

ڈاکٹر آصف حسین قدوائی ، **مقالات سیرت** - مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ -

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، **سنت کی آئینی حیثیت** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

شیخ عبدالعزیز شاویش مصری، **اسلام اور فطرت** (مضامین متعلقہ اثبات نبوت) - مترجمہ افتخار احمد بلخی، عباسی کتب خانہ کراچی -

Marfat.com

۱۴

اسوۂ حسنہ

اسوۂ انبیا *

تاریخ کی دنیا میں ایسے ہزاروں لاکھوں اشخاص نمایاں ہیں جنھوں نے آنے والوں کے لیے اپنی اپنی زندگیاں نمونے کے طور پر پیش کی ہیں ۔ ایک طرف شاہان عالم کے با شان و شکوہ دربار ہیں ۔ ایک طرف سپہ سالاروں کے جنگی پرے ہیں۔ ایک طرف حکما اور فلاسفروں کا متین گروہ ہے ۔ ایک طرف فاتحین عالم کی پر جلال صفیں ہیں ۔ ایک طرف شعرا کی بزم رنگین ہے۔ ایک طرف دولت مندوں اور خزانوں کے مالکوں کی نرم گدیاں اور کھنکھناتی تجوریاں ہیں ۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی آدم کے بیٹوں کو اپنی اپنی طرف کھینچتی ہے ۔ قرطاجنہ کا ہنیبال ، مقدونیہ کا سکندر ، روم کا قیصر ، ایران کا دارا ، یورپ کا نیپولین، ہر ایک کی زندگی ایک کشش رکھتی ہے ۔ سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، دیو جانس اور یونان کے دوسرے مشہور فلسفیوں سے لے کر اسپنسر تک تمام حکما اور فلاسفروں کی زندگیوں میں ایک خاص رنگ نمایاں ہے ۔ نمرود، فرعون اور ابو جہل و ابو لہب کی دوسری شخصیتیں ہیں۔ قارون کی ایک الگ زندگی ہے ۔ غرض دنیا کے اسٹیج پر ہزاروں قسم کی زندگیوں کے نمونے ہیں جو بنی آدم کی عملی زندگی کے لیے سامنے ہیں ۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان مختلف اصناف انسانی میں سے کس کی زندگی نوع انسانی کی سعادت ، فلاح اور ہدایت کی ضامن اور کفیل ہے ۔ اور اس کے لیے قابل تقلید نمونہ ہے ۔

ان لوگوں میں بڑے بڑے فاتح اور سپہ سالار ہیں ۔ ایسے جنھوں نے اپنی تلوار کی نوک سے دنیا کے نقشے بدل ڈالے ہیں۔ لیکن کیا انسانیت کی فلاح و ہدایت

* یہ حصہ مولانا سید سلیمان ندوی کے " خطبات مدراس " کے پہلے چھ خطبات کی تلخیص پر مشتمل ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

کے لیے انہوں نے کوئی نمونہ چھوڑا ؟ کیا ان کی تلوار کی کاٹ میدان جنگ سے آگے بڑھ کر انسانی اوہام و خیالات فاسدہ کی بیڑیوں کو کاٹ سکی؟ انسانوں کے باھمی برادرانہ تعلقات کی گتھی بھی سلجھا سکی ؟ انسانی معاشرت کا کوئی خاکہ پیش کر سکی ؟ ھماری روحانی مایوسیوں اور نا امیدیوں کا کوئی علاج بتا سکی ؟ ھمارے دلوں کی ناپاکی اور زنگ کو مٹا سکی ؟ ھمارے اخلاق اور اعمال کا کوئی نقشہ بنا سکی ؟ دنیا میں بڑے بڑے شاعر بھی پیدا ہوئے ھیں - لیکن خیالی دنیا کے یہ شہنشاہ عملی دنیا میں بالکل بے کار ثابت ہوئے - کیونکہ ان کی شیریں بیانیوں کے پیچھے ان کے حسن عمل کا کوئی خوشنما نمونہ نہ تھا - حکما اور فلاسفر، جنہوں نے بارھا اپنی عقل رسا سے نظام عالم کے نقشے بدلے ھیں، انسانیت کے نظام ہدایت کا کوئی عملی نقشہ پیش نہ کر سکے - اور نہ فرائض انسانی کی طلسم کشائی میں کوئی عملی امداد دے سکے - پھر دنیا کے اسٹیج پر بڑے بڑے بادشاہ اور حکمران بھی رونما ہوئے ھیں - ان کی تلواروں کی دھاک نے آبادیوں سے تو مجرموں کو روپوش کر دیا لیکن تنہائیوں اور خلوت خانوں کے روپوش مجرموں کو وہ باز نہ رکھ سکی - انہوں نے بازاروں اور راستوں میں امن و امان قایم کیا لیکن دلوں کی بستی میں وہ امن و اماں قایم نہ کر سکے - انہوں نے ملک کا نظم و نسق درست کیا لیکن روحوں کی مملکت کا نظم و نسق ان سے درست نہ ہو سکا - بڑے بڑے مقنن سولن سے لے کر اس وقت تک پیدا ہوئے ھیں لیکن ان کے قانون کی عمر بڑی مختصر رھی - دوسرے دور کے حاکموں اور عدالتوں نے خود اس کو حرف غلط سمجھ کر مٹا دیا -

غرض، مذھب اور اعتقاد سے ھٹ کر عملی تاریخ کی روشنی میں دیکھیں تو آپ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ بنی نوع انسان کی حقیقی بھلائی، اعمال کی نیکی، اخلاق کی بہتری، دلوں کی صفائی، اور انسانی قویٰ میں اعتدال اور میانہ روی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں اگر کسی طبقۂ انسانی نے انجام دی ھیں تو وہ صرف انبیائے کرام کا طبقہ ھے - وہ خدا کے فرستادہ ہو کر اس دنیا میں آئے اور دنیا کو نیک تعلیم اور ہدایت دے کر اپنے بعد بھی لوگوں کے لیے چلنے کا ایک راستہ بنا کر چھوڑ گئے - جن کی تعلیم و عمل کے سرچشمے سے بادشاہ و رعایا، امیر و غریب، جاھل و عالم سب برابر کا فیض پا رہے ھیں - چناں چہ پاٹلی پتر کے راجہ اشوکا کے احکام صرف پتھر کی لاٹوں پر کندہ ھیں مگر بدھا کا حکم دلوں کی تختیوں پر منقوش ھے - اجین، ھستناپور (دھلی) اور قنوج کے راجاؤں کے احکام مٹ چکے ھیں لیکن منوجی

Marfat.com

کا دھرم شاستر اب تک نافذ اور جاری ہے۔ بابل کے سب سے پہلے قانون ساز بادشاہ حمّورابی کے قانونی دفعات مدت ہوئی کہ مٹی کے ڈھیر میں دفن ہوگئیں: مگر حضرت ابراھیم علیہ السلام کی تعلیم آج بھی موجود ہے۔ فرعون کی ندائے 'انا ربکم اعلیٰ'، کتنے دن قایم رھی، مگر موسیٰ علیہ السلام کے اعجاز کا آج بھی زمانہ معترف ہے۔ سولن کے بنائے ہوئے قانون کتنے دن چل سکے؟ مگر توریت کا آسمانی قانون آج بھی انسانوں میں عدل کی ترازو ہے۔ وہ رومن لا، جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عدالت میں گنہگار ٹھیرایا تھا، صدیاں گذریں کہ معدوم ہو چکا مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم و ھدایت آج بھی گنہگاروں کو نیک اور مجرموں کو پاک بنانے میں اسی طرح مصروف ہے۔ مکہ کے ابو جہل، ایران کے کسریٰ، اور روم کے قیصر کی حکومتیں مٹ گئیں مگر شہنشاہ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں روائی بدستور قایم اور مسلّم ہے۔

بہ ہرحال انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ سیرت کی تکمیل اور کائنات کے اندر اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً تمام طبقات انسانی کا حصہ ہے، اور ہم سب ان کے شکر گزار ھیں مگر سب سے زیادہ ممنون ہم ان بزرگوں کے ھیں جنہوں نے ھمارے قلب کی دنیا کو آباد کیا، جنہوں نے ھماری حرص و ھوا کی اندرونی چالیں درست کیں، ھماری روحانی بیماریوں کے لیے نسخے تجویز کیے۔ اور اصلاح کے ایسے نقشے ترتیب دیے جن سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیرت انسانیت کا جوھر قرار پایا، نیکی اور بھلائی ایوان عمل کے نقش و نگار ٹھیرے۔ خدا اور بندے کا رشتہ باھم مضبوط ھوا۔ اس طرح اس برگزیدہ اور پاک طبقہ انسانی کے احسانات ھم انسانوں پر سب سے زیادہ ھیں۔ اور اس لیے ھر فرد انسانی پر خواہ وہ کسی صنف سے تعلق رکھتا ھو ان کی شکر گزاری کا اظہار واجب ہے۔

عالم گیر اور دائمی نمونے کی شرائط اور اسوۂ محمدی صلعم

یہ نفوس قدسیہ (انبیائے کرام) اپنے اپنے وقت پر آئے اور گذر گئے۔ ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانے کے مناسب حال اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معجزانہ نمونہ پیش کیا اور انسان کی پُر پیچ زندگی کے راستے میں روشنی کا ایک ایسا مینار قایم کردیا جس سے صراط مستقیم کا پتہ لگ سکے۔ مگر اب ضرورت ایک ایسے رھنما اور رھبر کی تھی جو اس سرے سے لے کر اس سرے تک پوری راہ کو اپنی ھدایات اور عملی مثالوں سے روشن کردے۔

Marfat.com

اور ہمارے ہاتھ میں اپنی عملی زندگی کا وہ مکمل ہدایت نامہ دےدے جس کو لے کر اس کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ پالے۔ یہ راہ نما سلسلۂ انبیا کے آخری فرد محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو بہ یک وقت شاہد و مبشر، نذیر و داعی اور سراج منیر بنا کر بھیجے گئے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا کے آخری پیغمبر تھے۔ اس لیے ایسی شریعت دے کر بھیجے گئے جس کی تکمیل کے لیے پھر کسی دوسرے کو نہ آنا تھا۔ آپ کی تعلیم دائمی وجود رکھنے والی تھی۔ یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا تھا اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پاک کو مجموعۂ کمال اور دولت بے زوال بنا کر بھیجا گیا۔

لیکن یہ محض تخمین و ظن یا مذہبی عقیدہ نہیں، بلکہ ایک ایسی حقیقت اور امر واقعہ ہے جس کی بنیاد دلائل اور شہادتوں پر قایم ہے۔ اس سیرت یا نمونۂ حیات میں جو انسانوں کے لیے ایک مثال کا کام دے، متعدد شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ ان میں سب سے پہلی اور اہم شرط 'تاریخیت' ہے۔ یعنی ایک کامل انسان کے جو سوانح اور حالات پیش کیے جائیں، ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو کیوں کہ فرضی افسانوں پر انسانی زندگی کی بنیاد نہیں ڈالی جا سکتی۔ ضروری ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت تاریخی اسناد کے معیار پر پوری اترے اور اسے جھٹلایا نہ جا سکے۔

غور کرو کہ ہر ملک میں، ہر قوم، ہر زمانہ، اور ہر زبان میں کتنے لاکھ انسان خدا کا پیغام لے کر آئے ہوں گے۔ ایک اسلامی روایت کے مطابق ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبر آئے مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں۔ اور جتنوں کا نام ہم جانتے ہیں ان کا کیا حال جانتے ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں میں سب سے زیادہ قدیم اور پرانے ہونے کا دعویٰ ہندوؤں کو ہے۔ گو یہ دعویٰ مُسلّم نہیں لیکن بغور دیکھو کہ ان کے مذہب میں سینکڑوں رہنماؤں کے نام ہیں۔ مگر ان میں کسی کو 'تاریخی' ہونے کی عزت حاصل نہیں ہے۔ بہت سوں کے تو نام کے سوا کسی اور چیز کا ذکر تک نہیں اور افسانوں سے بڑھ کر تاریخ کے میدان میں ان کا گذر بھی نہیں۔ ایران کے پرانے مجوسی مذہب کا بانی زرتشت اب بھی لاکھوں آدمیوں کی عقیدت کا مرکز ہے مگر اس کی تاریخی شخصیت بھی قدامت کے پردہ میں گم ہے۔ اور کرن اور ڈارمسٹیٹر جیسے محققین کو زرتشت کی تاریخی شخصیت سے انکار کرنا پڑا۔ قدیم ایشیا کا سب سے زیادہ وسیع مذہب بودھ ہے جو کبھی ہندوستان، چین، اور تمام ایشیائے وسطیٰ، افغانستان، ترکستان تک پھیلا ہوا تھا۔ لیکن

Marfat.com

ایک مورخ اور سوانح نگار کے لیے اس میں کوئی روشنی نہیں ۔ چینی مذہب کے بانی کا حال اس سے بھی زیادہ غیر یقینی ہے ۔ اور چین کے ایک بانیٔ مذہب کنفیوشس کی نسبت ہم کو بودھ جتنی واقفیت بھی نہیں ۔

سامی قوم میں سینکڑوں پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا اور کچھ حال نہ جانا ۔ حضرت نوح ، حضرت ابراھیم ، حضرت ھود ، حضرت صالح ، حضرت اسماعیل ، حضرت یعقوب ، حضرت زکریا ، حضرت یحییٰ علیہم السلام کے حالات اور سیرتوں کے ایک حصے کے علاوہ کیا ھمیں کوئی کچھ بتا سکتا ھے؟ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزا تاریخ کی کڑیوں سے بہ ہر حال گم ھیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا حال ہم کو تورات سے معلوم ھوتا ھے مگر خود وہ تورات اھل تحقیق کے بیانات کے مطابق ، جیسا کہ خود مصنفین انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا تسلیم کرتے ھیں ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صدھا سال کے بعد عالم وجود میں آئی ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حالات انجیلوں میں درج ھیں ۔ لیکن ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ھے ۔ باقی انجیل طفولیت ، برنباس وغیرہ غیر مستند قرار دی جاتی ھیں ۔ ان چار انجیلوں میں سے کسی ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خود نہیں دیکھا تھا ۔ انہوں نے کسی سے سُن کر حالات کا یہ مجموعہ لکھا ھوگا ۔ یقین سے یہ بھی معلوم نہیں ۔ یہ بھی واضح طور سے ثابت نہیں کہ وہ کن زمانوں میں لکھی گئیں ۔ چناں چہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ھوتی ھے ۔

کسی انسانی سیرت کے دائمی نمونۂ عمل بننے کے لیے یہ بھی ضروری ھے کہ اس کے صحیفۂ حیات کے تمام حصے ھماری نگاھوں کے سامنے ھوں ، کوئی واقعہ پردۂ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں گم نہ ھو ۔ اس معیار پر اگر شارعینِ ادیان اور بانیانِ مذاھب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالیں تو معلوم ھوگا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ھستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی ۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ آپ خاتم الانبیا ھوکر دنیا میں تشریف لائے تھے ۔

ھزاروں ، لاکھوں انبیا علیہم السلام اور مصلحین کے زمرے میں سے صرف تین چار ھی ھستیاں ایسی ھیں جو تاریخی کہی جا سکتی ھیں لیکن کاملیت کی حیثیت سے وہ بھی پوری نہیں ۔ مثلاً ابھی دیکھا کہ بودھ کی تو تاریخی حیثیت

Marfat.com

سے زندگی بھی مشکوک و مشتبہ ہے ۔ انبیائے سابقین میں سب سے مشہور زندگی حضرت موسیٰ علیہ الصلواۃ و السلام کی ہے ۔ مگر غور سے دیکھو تو ان کی طویل عمر کے چند اجزا ہاتھ میں آئے ہیں ۔ پیدائش ، جوانی میں ہجرت ، شادی اور نبوت کے واقعات معلوم ہیں ۔ پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں ۱۲۰ کی عمر ہوتی ہے ۔ ان واقعات کو جانے دیجیے ، یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش آتے ہیں ۔ انسان کو اپنی سوسائٹی کے لیے عملی نمونہ بننے کے لیے جن اجزا کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور طریق ہیں ۔ اور یہی اجزا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ سوانح عمری سے گم ہیں ۔ اسلام سے سب سے زیادہ قریب زمانے کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں ۔ لیکن انہی کے سوانح سب سے زیادہ کم معلوم ہیں ۔ انجیل کے بیان کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی ۳۳ برس کی تھی لیکن آخری تین برس کے کچھ حالات یعنی چند معجزے ، مواعظ اور سولی کے علاوہ کچھ حالات کا علم نہیں ۔

پھر کسی سیرت کے عملی نمونہ بننے کے لیے تیسری ضروری شرط 'جامعیت' ہے ۔ یعنی مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نمونوں کی ضرورت ہے یا ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس مثالی زندگی میں موجود ہوں

اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیا علیہ الصلواۃ و السلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی ۔ مذہب کیا چیز ہے ۔ خدا اور بندوں اور خود بندوں کے باہم تعلقات کے بارے میں جو فرائض اور واجبات ہیں ان کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا ، دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کا نام ہے ۔ اس لیے ہر مذہب کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے پیغمبروں اور بانیوں کی سیرتوں میں ان حقوق و فرائض وغیرہ کی تفصیلات تلاش کریں ۔ اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کی کوشش کریں ۔

اس لحاظ سے ایک طرف تو وہ مذاہب جن میں خدا کا وجود تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے ، جیسا کہ بودھ اور جین مذہب ، جن میں خدا ، اس کی ذات ، صفات اور دیگر حقوق الہیٰ کا پتہ نہیں ۔ دوسری طرف وہ مذاہب ہیں جنہوں نے

Marfat.com

خدا کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے ۔ ان مذاہب کے پیغمبروں اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں ، پوری تورات پڑھ جاؤ خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تورات کی پانچوں کتابیں حقوق اللہ کی تفصیل سے خالی ہیں ۔ انجیل میں بھی اس ایک مسئلے کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ تھا ، ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات و روابط تھے ۔ اب حقوق العباد کو لیجیے ، تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا تمام دیگر انبیا اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں ۔ بودھ نے اپنے تمام اہل و عیال اور خاندان کو چھوڑ کر جنگل کا راستہ لیا ۔ حکومت ، اور سلطنت کے بار گراں سے سبکدوشی حاصل کی اور نروان یا نجات کے حصول کو انسانی زندگی کا آخری مقصد قرار دیا ۔ ان حالات میں کیا کوئی انسان یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس دنیا کے بسنے والوں کے لیے، جن میں حکومت و رعیت ، شاہ و گدا ، آقا و نوکر ، باپ بیٹے ، بھائی بہن اور دوست احباب کے تعلقات ہیں ؛ بودھ کی سیرت کچھ کار آمد ہو سکتی ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی ، کا ایک ہی پہلو ، جنگ اور سپہ سالاری کا نہایت واضح ہے ورنہ اس کے علاوہ اُن کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیاوی حقوق ، واجبات ، فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا اسوہ کیوں کر قابل تقلید ہوگا جب کہ انہوں نے گھر بار ، اہل و عیال ، مال و دولت، صلح و جنگ ، دوست و دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ ہی نہ رکھا ہو ۔ وہ اس دنیا کے لیے جو انہی تعلقات سے معمور ہے کیوں کر مثال ہو سکتا ہے ۔

معیاری زندگی کا سب سے آخری معیار 'عملیت' ہے، یعنی شارع دین اور بانیٔ مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہو خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو قابل عمل ثابت کیا ہو ۔ ورنہ خوش کن سے خوش کن فلسفہ اور دلچسپ سے دلچسپ نظریہ ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے۔ البتہ جو چیز ہر وقت پیش نہیں کی جا سکتی وہ عمل ہے ۔ اسی لیے انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال و خیالات اور اخلاقی و فلسفیانہ نظریے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں ۔ اگر یہ معیار قایم نہ کیا جائے تو اچھے اور برے کی تمیز اٹھ جائے اور دنیا صرف بات بنانے والوں کا مسکن بن کر رہ جائے ۔ نیکیاں صرف سلبی ہی پہلو نہیں رکھتیں

Marfat.com

کہ بدیوں اور برائیوں سے بچنے کے لیے آپ پہاڑ کی کھوہ میں جا کر بیٹھ گئے بلکہ زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا ہے ، مثلاً غریبوں کی مدد ، کمزوروں کی حمایت ، حق گوئی ، عفو ، کرم ، سخاوت ، مہمان نوازی ، حق کی نصرت کے لیے جوشِ جہاد وغیرہ ۔ گویا جس سیرت کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو "معیاری زندگی" اور قابلِ تقلید نمونے کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان اس کی کس چیز کی نقل کرے گا؟ اور کس عمل سے سبق حاصل کرے گا؟ ہم کو تو صلح و جنگ ، فقر و دولت ، ازدواج و تجرد ، تعلقات خداوندی و تعلقات عباد ، حاکمیت و محکومیت ، سکون و غضب ، جلوت و خلوت ، غرض ، زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے۔ دنیا کا بیشتر بلکہ تمام تر حصہ انہی مشکلات اور تعلقات میں الجھا ہوا ہے ۔ اس لیے لوگوں کو ان کے حل اور بوجہ احسن انجام دینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے ۔ قولی نہیں بلکہ عملی ۔ لیکن یہ کہنا شاعری اور خطابت نہیں بلکہ تاریخی واقعہ ہے کہ اس معیار پر بھی سیرت محمدی کے سوا کوئی دوسری سیرت پوری نہیں اتر سکتی ۔ آیئے اب ان چاروں معیاروں کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پر نظر ڈالیں:

اسوہٴ محمدی کا تاریخی پہلو

اس امر پر تمام دنیا متفق ہے کہ اسلام نے اپنے پیغمبر کی اور نہ صرف اپنے پیغمبرؑ بلکہ ہر اس چیز اور اس شخص کی جس کا ادنیٰ سا تعلق بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک سے تھا ، جس طرح حفاظت کی ہے وہ عالم کے لیے مایہٴ حیرت ہے ۔ ان لوگوں کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال اور متعلقات زندگی کی روایت ، تحریر اور تدوین کا فرض انجام دیتے تھے ، راویانِ حدیث و روایت ، محدثین اور اربابِ سِیَر کہتے ہیں ۔ اس مقدس گروہ میں صحابہ ، تابعین ، تبع تابعین اور بعد کے چوتھی صدی ھجری تک کے اشخاص داخل ہیں ، جب تمام سرمایہٴ روایت تحریری صورت میں آ گیا تو ان تمام راویوں کے نام و نشان ، تاریخ زندگی ، اخلاق و عادات کو بھی قید تحریر میں لایا گیا ۔ ان کی تعداد ایک لاکھ کے قریب ہے اور ان سب کے مجموعہٴ احوال کا نام "اسماء الرجال" ہے ۔ جس کے متعلق مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اسپرنگر کا قول ہے ۔ " نہ کوئی قوم دنیا میں ایسی گذری نہ آج موجود ہے جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ اشخاص کا حال معلوم ہو سکتا ہے ۔"

Marfat.com

یہی وہ لوگ ہیں جن کی روایات آج سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ ان کی وفات کی تاریخوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوجائے گا کہ ان کی وفات کے سال اس قدر متاخر ہیں کہ ان سے فیض اٹھانے اور ان کی روایتوں کو حفظ اور تدوین کرنے والوں کی تعداد بے شمار ہوگی۔ انہی باتوں کی واقفیت اور آگاہی کا نام اس زمانے میں علم تھا۔ اور وہ دینی اور دنیاوی دونوں عزتوں کا ذریعہ تھیں۔ اس لیے ہزاروں صحابہ نے جو کچھ دیکھا اور جانا تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم "بلغوا عنی" (مجھ سے جو کچھ سنو اور دیکھو اس کی اشاعت کرو) یا "فلیبلغ الشاھد الغائب" (جو مجھے دیکھ رہے ہیں اور مجھ سے سن رہے ہیں وہ ان کو مطلع کردیں جو اس سے محروم رہے ہیں) کے مطابق وہ سب اپنی اپنی اولاد، عزیزوں، دوستوں اور ملنے والوں کو سناتے اور بتاتے رہتے تھے۔ یہی ان کی زندگی کا کام اور یہی ان کے شب و روز کا مشغلہ تھا۔ اس لیے صحابہ کے بعد فوراً ہی دوسری نوجوان پود ان معلومات کی حفاظت کے لیے کھڑی ہوگئی۔ ان میں سے ہر ایک کو ہر واقعے کا لفظ لفظ یاد کرنا پڑتا تھا۔ ان کو دھرانا پڑتا تھا۔ اور حرفاً حرفاً محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں اپنے اقوال اور افعال کی اشاعت کی تاکید کی تھی وہاں یہ بھی تہدید کردی تھی کہ "جو کوئی میرے متعلق قصداً کوئی غلط یا جھوٹ بات بیان کرے گا، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔" اس اعلان کا اثر یہ تھا کہ بڑے بڑے صحابہ روایت کرتے وقت کانپنے لگتے تھے۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رض نے ایک دفعہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی بات نقل کی تو چہرے کا رنگ بدل گیا، تھرا گئے پھر کہا "حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی فرمایا تھا یا اس کے قریب قریب فرمایا تھا۔"

عربوں کا حافظہ فطرتاً نہایت قوی تھا۔ وہ سینکڑوں اشعار کے قصیدے زبانی یاد رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ فطرت کا قاعدہ یہ ہے کہ جس قوت سے جس قدر کام لیا جائے اسی قدر زیادہ اس کو ترقی ہوتی ہے۔ صحابہ اور تابعین نے قوت حفظ کو معراج کمال تک پہنچایا۔ وہ ایک ایک واقعہ اور ایک ایک حدیث کو اس طرح زبانی سن کر یاد کرتے تھے جیسے آج مسلمان قرآن مجید یاد کرتے ہیں۔ ایک ایک محدث کئی کئی ہزار اور کئی کئی لاکھ حدیثیں زبانی یاد کرتا تھا۔ اور یاد رکھتا تھا۔ اور گو بعد میں لوگ اپنی یادداشت کے لیے لکھ بھی لیتے تھے مگر جب تک وہ زبانی یاد نہ رکھتے اہل علم کی نگاہوں میں

Marfat.com

ان کی عزت نہیں ہوتی تھی - اور وہ خود اپنی تحریری یادداشتوں کو عیب کی طرح چھپاتے تھے تاکہ لوگ ایسا نہ سمجھیں کہ ان کو یہ چیزیں یاد نہیں ہیں۔ اور صرف اس حفظا اور تحریری یادداشت ہی پر محدثین سلف ، اور خلفائے اسلام نے قناعت نہیں کی بلکہ اس فن کے بڑے بڑے اماموں کے لیے مغازی اور سیرت کی تعلیم کی غرض سے درس گاہیں اور مسجدوں میں حلقے قایم کیے - پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک سے لے کر اس وقت تک ہر زمانہ میں، ہر ملک میں ، ہر زبان میں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات ، حالات اور ارشادات پر جو کتابیں لکھی گئیں ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا - اور اسلام کے دشمنوں اور غیر مسلموں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سیرتیں لکھ کر فخر محسوس کیا چناں چہ مارگولیس کے الفاظ ہیں :

> ” نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سوانح نگاروں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس کا خاتم ہونا ناممکن ہے لیکن اس میں جگہ پانا بھی باعث عزت ہے -“ [1]

جان ڈیون پورٹ نے اپنی کتاب کو شروع کرتے ہوئے لکھا :

> ” اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مصنفین اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کے وقائع عمری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وقائع عمری سے زیادہ مفصل اور سچے ہوں -“

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا سب سے مستند ، سب سے زیادہ صحیح تو وہ حصہ ہے جس کا ماخذ خود قرآن پاک ہے ، جس کی صحت اور اعتبار میں دوست کیا دشمن بھی شک نہ کر سکے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے تمام ضروری اجزا — قبل نبوت کی زندگی ، یتیمی ، غربت، تلاش حق، نبوت ، وحی ، اعلان و تبلیغ ، معراج ، مخالفین کی دشمنی ، ہجرت ، لڑائیاں ، وقائع ، اخلاق — اس میں موجود ہیں ، اور اس سے زیادہ معتبر تاریخی سیرت دنیا کے پردہ پر کوئی موجود نہیں ہے - دوسرا ماخذ احادیث ہیں جس کی صحت کے لیے اوپر کا بیان کافی ہوگا - تیسرا ماخذ مغازی ہیں جن میں زیادہ تر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات اور لڑائیوں کا حال اور ضمناً دوسرے واقعات بھی موجود ہیں - چوتھا ماخذ عام تاریخ کی کتابیں ہیں جن کا پہلا حصہ خاص حضور اکرم صلی اللہ

---

1 "The biographers of the Prophet Mohammed form a long series that is impossible to end but in which it would be honourable to find a place"

Marfat.com

علیہ وسلم کے سوانح پر ہے - پانچواں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات اور روحانی کارناموں کا الگ دفتر ہے جن کو کتب دلائل کہتے ہیں - چھٹا ماخذ کتب شمائل ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اخلاق و عادات اور فضائل و معمولات زندگی کا بیان ہے - اس سے الگ پھر وہ کتابیں ہیں جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے حالات میں ہیں جن میں ان شہروں کے عام حالات کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقامی حالات اور ان مقامات کے نام و نشان ہیں جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی تعلق ہے -

اس پورے تذکرے سے موافق و مخالف ہر ایک کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ سیرت محمدی کی تاریخی حیثیت کیا ہے ، اور اس کی ترتیب میں کس قدر احتیاط ، استناد ، اور اہتمام برتا گیا ہے جو کسی شارع یا بانی دین کی سیرت و احوال کے مجموعہ کی ترتیب میں نظر نہیں آتی - یہ تاریخیت صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتیاز ہے -

کامل زندگی

کوئی زندگی خواہ کسی قدر تاریخی ہو جب تک وہ کامل نہ ہو ہمارے لیے نمونہ نہیں بن سکتی - کسی زندگی کا کامل اور ہر نقص سے بری ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس زندگی کے تمام اجزا ہمارے سامنے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کے زمانے کے لوگوں کے سامنے اور ان کی وفات کے بعد تاریخ عالم کے سامنے ہے - ان کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گذرا جب وہ اپنے اہل وطن کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر آیندہ کی تیاری میں مصروف ہوں -

پیدائش ، شیر خوارگی ، بچپن ، ہوش و تمیز ، جوانی ، تجارت ، آمد و رفت ، شادی ، احباب ، قبل نبوت ، قریش کی لڑائی اور قریش کے معاھدے میں شرکت ، امین بننا ، خانہ کعبہ میں پتھر نصب کرنا ، رفتہ رفتہ تنہائی پسندی ، غار حرا کی گوشہ نشینی ، وحی ، اسلام کا ظہور ، دعوت ، تبلیغ ، مخالفت ، سفر طائف ، معراج ، ھجرت ، غزوات ، حدیبیہ کی صلح ، دعوت اسلام کے نامہ و پیام ، اسلام کی اشاعت ، تکمیل دین ، حجۃ الوداع ، وفات ، ان میں سے کون سا زمانہ ہے جو انسانوں کی نگاھوں کے سامنے نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کون سی حالت ہے جس سے اہل تاریخ ناواقف ہیں - اٹھنا بیٹھنا ، سونا جاگنا ، شادی بیاہ ،

Marfat.com

بال بچے ، دوست احباب ، نماز روزہ ، دن رات کی عبادت ، صلح و جنگ ، سفر و حضر ، نہانا دھونا ، کھانا پینا ، ھنسنا رونا ، پہننا اوڑھنا ، چلنا پھرنا ، ھنسی مذاق ، بول چال ، خلوت جلوت ، ملنا جلنا ، طور طریق ، رنگ و بو ، خد و خال ، قد و قامت ، یہاں تک کہ میاں بیوی کے خانگی تعلقات اور نجی معاملات بھی پوری روشنی میں مذکور ، معلوم اور محفوظ ھیں -

بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنے گھر میں معمولی آدمی ھوتا ھے - اسی لیے والٹیر نے کہا تھا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں ھیرو نہیں بن سکتا - لیکن باسورتھ اسمتھ کی رائے میں کم از کم یہ اصول پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحیح نہیں - گیبن نے لکھا ھے کہ " تمام پیغمبروں میں سے کسی نے اپنے پیروؤں کا اس قدر سخت امتحان نہیں لیا جس قدر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ، انہوں نے دفعتاً اپنے کو سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے بہ حیثیت پیغمبر کے پیش کیا جو ان کو بہ حیثیت انسان کے بہت اچھی طرح جانتے تھے - اپنی بیوی ، اپنے غلام ، اپنے بھائی ، اپنے سب سے واقف کار دوست کے سامنے ، اور ان سب نے بلا پس و پیش آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیا -" بیوی سے بڑھ کر انسان کی اندرونی کمزوریوں کا واقف کار کوئی دوسرا نہیں ھو سکتا مگر کیا یہ واقعہ نہیں ھے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر سب سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ھی کی بیوی ایمان لائیں جو نبوت سے پہلے پندرہ برس تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفاقت میں رہ چکی تھیں - اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ھر حال اور ھر کیفیت کی نسبت ذاتی واقفیت رکھتی تھیں - بایں ھمہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو سب سے پہلے انہی نے ان کی سچائی کو تسلیم کیا -

بڑے سے بڑا انسان جو ایک ھی بیوی کا شوھر ھو وہ بھی ھمت نہیں کر سکتا کہ وہ اس کو یہ اذنِ عام دے کہ تم میری ھر بات ، ھر حالت ، اور ھر واقعے کو برملا کہ دو اور جو کچھ چھپا ھے سب پر ظاھر کر دو - مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات میں سے ھر ایک کو یہ اذنِ عام تھا کہ خلوت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو کچھ دیکھیں وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کر دیں ، جو رات کی تاریکی میں دیکھیں وہ دن کی روشنی میں ظاھر کر دیں - جو بند کوٹھریوں میں دیکھیں اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہ دیں - اس اخلاق وثوق و اعتماد کی مثال اور کہاں مل سکتی ھے ؟

Marfat.com

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوت میں ہوں یا خلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، نماز شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشۂ تنہائی میں، ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظر عام پر لائی جائے۔ ایک طرف ازواج مطہرات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں اور دوسری طرف اصحاب صفّہ معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات دیکھنے اور دوسروں سے ان کو بیان کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ مدینے میں رہنے والی آبادی دس برس تک مستقل آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک حرکت و سکون اور ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی۔ غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزارہا صحابہ کو شب و روز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھنے اور آپ کے حالاتِ مبارکہ سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جو زیر پردہ رہا ہوگا اور اس پر بھی ایک شخص تک کو بلکہ بڑے سے بڑے دشمن اور مخالف کو پوری چھان بین اور تلاش و جستجو کے بعد بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حرف گیری کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

ایک حیثیت سے اور غور فرمایئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صرف اپنے معتقدوں ہی کے حلقے میں نہیں رہے بلکہ مکے میں قریش کے مجمع میں رہے۔ نبوت سے پہلے ۴۰ برس آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی انہیں کے ساتھ گذری اور پھر تاجرانہ زندگی، لین دین کی زندگی، معاملہ اور کاروبار کی زندگی، جس میں قدم قدم پر بدمعاملگی، بد نیتی، خلاف وعدگی، اور خیانت کاری کے عمیق غار تھے۔ مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح بے خطر اس راستے سے گذر گئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان سے امین کا خطاب حاصل ہوا۔ نبوت کے بعد بھی لوگوں کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر یہ اعتماد تھا کہ اپنی امانتیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے پاس رکھواتے تھے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوائے نبوت پر تمام قریش نے برہمی ظاہر کی، مقاطعہ کیا، دشمنیاں ظاہر کیں، گالیاں دیں، راستے روکے، نجاستیں ڈالیں، پتھر پھینکے، قتل کی سازشیں کیں، آپ کو ساحر و مجنون کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہ کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے خلاف ایک حرف بھی زبان سے نکال سکے۔ حالاں کہ نبوت اور پیغمبری کے دعوے ہی کے یہ معنی ہیں کہ

Marfat.com

مدعی اپنی بے گناہی اور معصومیت کا دعویٰ کر رہا ہے ۔ اس دعوے کے ابطال کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے متعلق چند مخالفانہ شہادتیں بھی کافی تھیں، تاہم اس دعوے کے توڑنے کے لیے انہوں نے اپنی دولت لگائی، اپنی اولاد کو قربان کیا، اپنی جانیں دیں لیکن یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پر معمولی خردہ گیری کر کے بھی اس کو باطل کر سکیں۔ کیا اس سے نہیں ثابت ہوتا کہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دوستوں کی نظر میں تھے وہی دشمنوں کی نگاہ میں بھی تھے۔ اور کوئی چیز زیر پردہ اور نا معلوم نہ تھی ۔

پھر ایک بات پر اور غور فرمایے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدا میں ایمان لائے وہ ماہی گیر نہ تھے ، اور وہ مصر کے محکوم اور غلام قوم کے افراد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزاد قوم کے افراد تھے جو اپنے جذبۂ حریت کے لحاظ سے ممتاز تھی ۔ اور جس نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی کسی کی اطاعت نہیں کی تھی ۔ جن کے تجارتی کاروبار دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور جو اسلام لانے کے بعد ساری عظمتوں اور رفعتوں کے مالک بن گئے ۔ کیا ایک لمحے کے لیے بھی کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایسے پُر زور ، قوی بازو اور دانایان روزگار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا کوئی گوشہ چھپا رہ سکتا تھا اور وہ دھوکا کھا سکتے تھے ؟ بلکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک جنبش کی نقل کی ہے ۔ اور جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک ایک نقش قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے ۔ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کاملیت کی نا قابل تردید دلیل ہے ۔

اسلام کی نگاہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات ایک مسلمان کے لیے کامل نمونہ ہے ۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ اس لیے اس نمونے کے تمام پہلو سب کے سامنے ہونے چاہئیں اور وہ سب کے سب سامنے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوگا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کے سلسلہ کی کوئی کڑی گم نہیں ہے ، کوئی واقعہ زیر پردہ نہیں ہے ، جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل ، معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے ۔ نیز ایسی ہی زندگی ، جس کے ہر پہلو اس طرح روشن ہوں ، انسان کے لیے نمونے کا کام دے سکتی ہے ۔

Marfat.com

اسوۂ محمدی کی جامعیت

اس دنیا کی بنیاد ہی اختلاف عمل پر ہے - باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے یہ دنیا چل رہی ہے - اس میں بادشاہ یا رئیس جمہور اور حکام بھی ضروری ہیں اور محکوم، مطیع اور فرماں بردار رعایا بھی - امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے - اور سپہ سالاروں کا بھی، غریبوں، دولت مندوں، عابد و زاہد، سپاہی و مجاہد، اہل و عیال، دوست احباب، تاجر و سوداگر، امام اور پیشوا، سب ہی کا ہونا ضروری ہے - غرض اس دنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام پر ہی موقوف ہے۔ اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے -

اسلام ان تمام انسانوں کو سنت نبوی صلعم کی دعوت دیتا ہے - اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ مختلف طبقات انسانی کے لیے اپنے پیغمبر کی عملی سیرت میں نمونے اور مثالیں رکھتا ہے جو ان میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ ہدایت کا چراغ بن سکتا ہے - اسلام کے صرف اسی نظریے سے ثابت ہو جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلعم کی سیرت میں جامعیت ہے - یعنی انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لیے اس سیرت پاک میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے درس اور سبق موجود ہیں -

اصناف انسانی کے بعد دوسری جامعیت خود ہر انسان کے مختلف لمحوں کے مختلف افعال کی ہے - ہم چلتے پھرتے بھی ہیں - اٹھتے بیٹھتے بھی ہیں - کھاتے پیتے بھی ہیں - سوتے جاگتے بھی ہیں - لین دین بھی کرتے ہیں - ہنستے بھی ہیں روتے بھی ہیں - پہنتے بھی ہیں اتارتے بھی ہیں - سیکھتے بھی ہیں - سکھاتے بھی ہیں - مرتے بھی ہیں مارتے بھی ہیں، کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی - عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی - مہمان بھی بنتے ہیں اور میزبان بھی - ہم کو ان تمام امور کے متعلق، جو ہمارے مختلف افعال جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں، عملی نمونوں کی ضرورت ہے جو ہم کو ہر نئی حالت کے پیش آنے پر ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دیں -

ان افعال کے بعد، جن کا تعلق اعضا سے ہے، وہ افعال ہیں جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے - اور جن کی تعبیر ہم اعمال قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں - ہر آن ہم ایک نئے قلبی عمل یا جذبہ یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں -

Marfat.com

ہم کبھی راضی ہیں کبھی خوش ہیں ، کبھی غم زدہ ، کبھی مصائب سے دو چار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال ، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب ، ان سب حالتوں میں ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں ۔ اخلاق فاضلہ کا تمام تر انحصار ان ہی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے ۔ ان سب کے لیے ہم کو ایک عملی سیرت اور نمونے کی حاجت ہے ۔

عزم ، استقلال ، شجاعت ، صبر ، شکر ، توکل ، رضا بہ تقدیر ، مصیبتوں کی برداشت ، قربانی ، قناعت ، استغنا ، ایثار ، جود ، تواضع ، خاکساری ، غرض نشیب و فراز ، بلند و پست تمام اخلاق پہلوؤں کے لیے ، جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں ، ہم کو عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے ، مگر وہ کہاں مل سکتی ہے ؟ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس !

ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طائفۂ انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر میں ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے ۔ اگر دولت مند ہو تو مکے کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو ، اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینے کے مہمان کی کیفیت سنو ، اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو ، اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو ، اگر فاتح ہو تو بدر و حنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ ، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو ، اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفّہ کی درس گاہ کے معلم مقدس کو دیکھو ، اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماؤ ، اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو ، اگر تنہائی و بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکّے کے بے یار و مددگار نبی کا اسوۂ حسنہ تمہارے سامنے ہے ۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکّہ کا نظارہ کرو ، اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر ، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو ، اگر یتیم ہو تو عبداللہ و آمنہ کے جگر گوشے کو نہ بھولو ، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو ، اگر تم جوان ہو تو مکّے کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو ، اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرے

Marfat.com

کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پنچایتوں کے ثالث ہو تو کعبے میں نور آفتاب سے پہلے آنے والے ثالث کو دیکھو، جو حجر اسود کو کعبے کے ایک گوشہ میں کھڑا کر رہا ہے، مدینے کی کچی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر میں شاہ و گدا، امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقدس شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو۔ اگر اولاد والے ہو تو فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے باپ اور حسن و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نانا (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال پوچھو، غرض، تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمت خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لیے طبقۂ انسانی کے ہر طالب اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

غرض ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو، وہی اس لائق ہے جو غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا اور فقر و فاقہ، شجاعت و بہادری اور رحم دلی و رقیق القلبی، خانہ داری، اور خدا دانی، دنیا اور دین دونوں کے لیے ہم کو اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کردے۔ جو دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی کی بشارت دے۔ اور دونوں بادشاہتوں کے قواعد و قوانین اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں برت کر دکھا دے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف عفو و در گذر، معافی اور نرمی انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں۔ بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں۔ اس لیے جس ہستی میں صرف ایک یہی پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی مصلح اور محسن ہے۔ لیکن ہمیں یہ بتاؤ کہ انسان کے اخلاق میں کیا فقط یہی قوتیں ودیعت ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھو تو ہر قسم کے فطری جذبات مثلاً غصہ اور کرم، محبت اور عداوت، خواہش و قناعت، انتقام اور عفو وغیرہ موجود ہیں۔ اس لیے ایک کامل معلم وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قویٰ اور جذبات میں اعتدال پیدا کرکے ان کے صحیح مصرف کو متعین کرے۔

Marfat.com

حضرت نوح علیہ السلام کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے ۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد ، شاھانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قانون کی مثال پیش کرتی ہے ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی صرف خاکساری ، تواضع ، عفو و درگذر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی زندگی شاھانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے ۔ حضرت ایوب علیہ السلام کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے ۔ حضرت یونس علیہ السلام کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی قید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی سیرت گریہ و بکا ، حمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زندگی امید ، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے ۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراھیم، موسیٰ اور عیسیٰ ، سلیمان اور داؤد ، ایوب اور یونس ، یوسف اور یعقوب علیہم السلام سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر آگئی ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام قانون لے کر آئے ، حضرت داؤد علیہ السلام دعا اور مناجات لے کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام زھد و اخلاق لے کر ۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون بھی لائے ، دعا و مناجات بھی ، اور زھد و اخلاق بھی ۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معنی میں قرآن اور عمل میں سیرت محمدی ہے ۔

اب سیرت محمدی کی جامعیت کا ایک اور پہلو دیکھیے ۔ دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاھیں ھیں ۔ ایک وہ جہاں صرف فن سکھایا جاتا ہے ۔ جیسے کوئی میڈیکل کالج ہے ، کوئی انجینیرنگ کالج ہے ، ایک آرٹ اسکول ہے ، ایک تجارت کا مدرسہ ہے ۔ ان میں سے ھر مدرسہ اور تعلیم گاہ صرف ایک ھی قسم کے طالب علموں کا انتظام کرسکتی ہے ۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے ۔ قانون کے مدرسے سے قانون داں تیار ھوں گے ۔ تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کار پیدا ھوں گے ۔ علم و فن کے مدرسے کی خاک سے صرف اھل علم اور اھل فن اٹھیں گے۔ لیکن کہیں کہیں بڑی بڑی یونیورسٹیاں ھوتی ھیں۔ یہ دوسری قسم کی تعلیم گاھیں ھیں جو اپنی وسعت کے مطابق ھر قسم کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتی ھیں ۔ ان کے احاطے میں ڈاکٹری کا کالج بھی ھوتا ہے اور صنعت و حرفت کا مدرسہ بھی ۔ طلبہ

Marfat.com

مختلف دیار سے آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق ، مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ایک ایک کالج یا مدرسے کا انتخاب کر لیتے ہیں ۔ پھر وہاں فوجوں کے جنرل اور سپاہی ، عدالتوں کے قاضی ، اور قانون داں اور ماہر سب ہی پیدا ہوتے ہیں ۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ صرف ایک ہی تعلیم ، ایک ہی پیشہ اور ایک ہی علم کے جاننے والوں سے انسانی سوسائٹی کی تکمیل نہیں ہو سکتی بلکہ ان سب کے مجموعے سے وہ کمال کو پہنچتی ہے اور پہنچ سکتی ہے ۔ اگر صرف ایک ہی علم اور ایک ہی پیشے کے ماہرین سے تمام دنیا معمور ہو جائے تو اس تمدن و تہذیب کی مشین فوراً بند ہو جائے ۔ اور انسانی کاروبار یک قلم مسدود ہو جائے ۔ یہاں تک کہ اگر دنیا صرف زہد پیشہ خلوت نشینوں سے بھر جائے تب بھی وہ اپنی تکمیل کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی ۔ اب اس معیار سے مختلف انبیائے کرام علیہم السلام کی سیرتوں پر آپ غور کریں اور تعلیم انسانی کی ان درس گاہوں کا جائزہ لیں جن کے اساتذہ انبیا رہے ہیں تو پہلے تو کہیں دس دس ، بیس بیس ، کہیں ساٹھ ستر ، کہیں سو دو سو ، کہیں ہزار دو ہزار کہیں پندرہ بیس ہزار طالب علم ملیں گے لیکن جب مدرسۂ نبوت کی آخری تعلیم گاہ کو دیکھیں گے تو آپ کو ایک لاکھ سے زیادہ طالب علم بہ یک وقت نظر آئیں گے ۔ پھر ان دوسری نبوت کی تعلیم گاہوں کے طلبہ کو اگر جاننا چاہیں کہ وہ کہاں کے تھے ؟ کون تھے ؟ کیسے تیار ہوئے ؟ اور ان کے اخلاق و عادات ، روحانی حالات ، اور دیگر سوانح زندگی کیا تھے ؟ اور عملی تربیت کے عملی نتائج کیسے ثابت ہوئے ؟ تو آپ کو ان سوالات کا کوئی جواب نہیں مل سکتا ۔ مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی درس گاہ میں آپ کو ہر چیز معلوم ہوسکتی ہے ۔ اس کے ہر ایک طالب علم کا نام و نشان ، حالات و سوانح ، نتائج تعلیم و تربیت ، ہر چیز تاریخ اسلام کے اوراق میں ثبت ہے ۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس درس گاہ کو آفاقی اور عالم گیری کہیے ، کہ ہر ملک ، ہر قوم ، ہر وطن ، اور ہر خانوادے کا باشندہ عملاً اس میں داخل ہے ۔ کیوں کہ اس میں داخلے کے لیے رنگ و روپ ملک و وطن ، قوم و نسل اور زبان و لہجے کا سوال نہ تھا بلکہ وہ دنیا کے تمام خانوادوں ، تمام قوموں ، اور تمام زبانوں کے لیے عام تھی ۔ پھر اس درس گاہ کی حیثیت و درجہ ملاحظہ کیجیے کہ اس جامع اور عمومی درس گاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی میں ذوق ، مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو ، ہر قوم کے افراد کو الگ تعلیم ملتی ہے ۔ ایک طرف عقلائے روزگار ، اسرار فطرت

Marfat.com

کے محرم ، دنیا کے جہاں بان اور ملکوں کے فرماں روا اس درس گاہ سے تعلیم پا کر نکلتے ہیں - دوسری طرف ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی زمانے پر بیٹھی ہوئی ہے - تیسری طرف وہ بیسیوں صحابہ ہیں جنہوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کی - چوتھی طرف علما اور فقہا کی صف ہے - پانچویں صف عام اربابِ روایت و تاریخ کی ہے جس میں سینکڑوں صحابہ ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں - چھٹی جماعت اہل صفہ کی ہے ، جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے چبوترے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی - بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی - وہ دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے ، ان کو بیچ کر خود کھاتے ، کچھ راہ خدا میں دیتے اور رات طاعت و عبادت میں بسر کرتے - یہاں وہ لوگ بھی نظر آتے ہیں جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو کوئی پیدا نہ ہوا - ایک اور طرف بہادر کار پردازوں اور عرب کے مدبرین کی جماعت ہے تو ایک جماعت حق کے ان شہیدوں اور بے گناہ مقتولوں کی ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانیں قربان کیں مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے -

غور کا مقام ہے ! یہ وہی وحشی عرب ، وہی بت پرست عرب ، وہی بد اخلاق عرب ہیں - یہ کیا انقلاب ہوگیا تھا ؟ ایک اُمّی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل ، روشن دل ، روشن دماغ اور متقن کیوں کر بنا گئی ؟ ایک نہتے پیغمبر کا ولولہ تبلیغ کس مِسِّیرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کر زور و قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا ؟ جو خدا کے نام سے بھی آشنا نہ تھے ، وہ ایسے شب زندہ دار ، عابد ، متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہوگئے؟ اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انسانی کمالات اور صفات حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب انہی کی جامعیت کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں - گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک آفتاب عالم تاب تھا، جس سے اونچے پہاڑ ، رتیلے میدان ، بہتی نہریں ، سر سبز کھیت ، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے یا ابرباراں تھا جو پہاڑ اور جنگل ، میدان اور کھیت ، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا - اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا - اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ کے پھول اور پتے جم رہے تھے - اور اُگ رہے تھے -

Marfat.com

نبیؐ اکرم کا عملی نمونہ

یہ انبیائے کرام اور بانیان مذہب کی موجودہ سیرتوں کا وہ باب ہے جو تمام تر خالی اور سادہ ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا یہی باب سب سے بڑا اور ضخیم ہے۔ اور یہی ایک معیار اس فیصلے کے لیے کافی ہے کہ نبیوں کا سردار اور رسولوں کا خاتم کون ہو سکتا ہے۔ مفید نصیحتوں، میٹھی میٹھی باتوں اور اچھی اچھی تعلیموں کی دنیا میں کمی نہیں۔ کمی جس چیز کی ہے وہ کام اور عمل ہے۔ موجودہ مذاہب کے شارعوں اور بانیوں کی سیرتوں کے تمام صفحے پڑھ جایئے۔ دلچسپ تھیوریاں ملیں گی۔ دل آویز حکایتیں ملیں گی، خطیبانہ بلند آہنگیاں ملیں گی۔ تقریر کا زور و شور اور فصاحت و بلاغت کا جوش نظر آئے گا۔ موثر حکایتیں تھوڑی دیر کے لیے خوش کردیں گی۔ مگر جو چیز نہیں ملے گی وہ عملی کام اور اپنے احکام و نصائح کو آپ برت کر اور کر کے دکھانا ہے۔

انسان کی عملی سیرت کا نام خُلق (اخلاق) ہے۔ قرآن کے سوا اور کس مذہب کے صحیفے نے اپنے شارع کی نسبت اس بات کی کھلی شہادت دی ہے کہ وہ اپنے عمل کے لحاظ سے بھی بہ درجہا بلند انسان تھا؟ لیکن قرآن نے صاف کہا اور دوست و دشمن کے مجمع میں علی الاعلان کہا

وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۚ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝

(اے محمد) بے شک تیری مزدوری نہ ختم ہونے
والی ہے اور بے شک تو بڑے (درجے کے) اخلاق
پر (فائز) ہے۔ (القلم۔ ۳-۴)

چناں چہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا سب سے روشن پہلو یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بہ حیثیت ایک پیغمبر کے اپنے پیروؤں کو جو نصیحت فرمائی اس پر سب سے پہلے خود عمل کرکے دکھا دیا۔[1]

۱- یہ بات بھی قابل غور ہے کہ قرآن نے حضور صلعم کی زندگی کو خود آپ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کے لیے بہ طور دلیل پیش کیا ہے۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

میں اس سے پہلے ایک عمر تم میں رہا ہوں،
کیا تم سمجھتے نہیں ہو۔ (سورۃ یونس۔ ۱۶)

یعنی یہ کہ حضور صلعم تمہارے درمیان ایک زندگی گزار رہے ہیں، کیا اس زندگی اور پاک نمونے کو دیکھ کر بھی تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ یہ شخص کیسا راست باز، سچا اور امین ہے۔ جو تمہارے معاملات میں خیانت نہیں کرتا وہ خدا کے بارے میں یہ خیانت کیسے کر سکتا ہے؟ لیکن افسوس کہ تم عقل استعمال نہیں کرتے۔ عقل تو آپ کی صداقت کا ببانگ دہل اعلان کر رہی ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو خدا کی یاد اور محبت کی نصیحت کی تو شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب خدا کی یاد سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا دل اور خدا کے ذکر سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زبان غافل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے، سوتے جاگتے، پہنتے اوڑھتے، ہر حالت میں اور ہر وقت خدا کا ذکر اور اس کی حمد زبان مبارک پر جاری رہتی تھی۔ چناں چہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر وقت اور ہر لمحے خدا کی یاد میں مصروف رہتے تھے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو نماز کا حکم دیا مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا حال کیا تھا؟ عام پیروؤں کو تو پانچ وقتوں کی نماز کا حکم تھا، مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) آٹھ وقت نماز پڑھتے تھے۔ طلوع آفتاب کے بعد اشراق، کچھ اور دن چڑھنے پر چاشت، پھر ظہر، عصر، مغرب، عشاء، پھر تہجد پھر صبح کی نماز ادا کرتے۔ اور نماز بھی کیسی کہ رات رات بھر خدا کے حضور میں کھڑے ہیں حتیٰ کہ کھڑے کھڑے پائے مبارک میں ورم آجاتا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا عرض کرتیں " اللہ نے تو آپ کو ہر طرح معاف کر دیا ہے پھر اس قدر کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں۔" فرماتے " اے عائشہ، کیا میں خدا کا شکر گذار بندہ نہ بنوں۔" یعنی نماز خشیتِ الٰہی سے نہیں ہے بلکہ محبت الٰہی اس کا منشا ہے۔ رکوع میں اتنی دیر جھکے رہتے کہ دیکھنے والے کہتے کہ شاید آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سجدہ کرنا بھول گئے۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے روزہ کا حکم دیا۔ عام مسلمانوں پر سال میں تیس دن کے روزے فرض ہیں۔ مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کیفیت کیا تھی؟ کوئی ہفتہ اور کوئی مہینہ روزوں سے خالی نہیں جاتا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہتی ہیں " جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) روزے رکھنے پر آتے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب کبھی افطار نہ کریں گے۔" آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مسلمانوں کو دن بھر سے زیادہ روزہ رکھنے کی ممانعت فرمائی مگر خود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ حال تھا کہ کبھی کبھی دو دو تین تین دن بغیر کھائے پیے متصل روزے رکھتے اور اس عرصے میں ایک دانہ بھی منہ میں نہ جاتا تھا۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو زکواۃ و خیرات کا حکم دیا تو پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی شہادت مشہور ہے " یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ قرابت والوں کا حق پورا کرتے

Marfat.com

ہیں ، مقروضوں کا قرض ادا کرتے ہیں ، غریبوں کی مدد کرتے ہیں ، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے ہیں ۔'' ہمیشہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عمل یہ رہا کہ جو کچھ آتا سب خدا کی راہ میں خرچ کر دیتے۔ حالاں کہ غزوات اور فتوحات کی وجہ سے مال و اسباب میں کمی نہ تھی ، مگر وہ سب غیروں کے لیے تھا ۔ اپنے لیے کچھ نہ تھا ۔ تھا تو بس وہی فقر و فاقہ تھا ۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام لوگوں سے زیادہ سخی تھے۔ اور سب سے زیادہ سخاوت آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) رمضان المبارک میں فرماتے تھے ۔ تمام عمر کسی کے سوال کے جواب میں '' نہیں '' کا لفظ نہیں فرمایا ۔

حضرت ابو ذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ رات کو میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ ایک راستے سے گذر رہا تھا راہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا '' ابو ذر ، اگر احد کا یہ پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو کبھی میں پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور اس میں سے ایک دینار بھی میرے پاس رہ جائے ، البتہ یہ کہ کسی قرض کے ادا کرنے کے لیے کچھ چھوڑ دوں ۔'' یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خوش نما الفاظ ہی نہ تھے بلکہ عمل تھا۔ ایک دفعہ عصر کی نماز کے بعد خلاف معمول فوراً اندر تشریف لے گئے اور باہر آ گئے۔ لوگوں کو تعجب ہوا ، فرمایا '' مجھ کو نماز میں یاد آیا کہ سونے کا چھوٹا سا ٹکڑا گھر میں پڑا رہ گیا ہے ، خیال ہوا ایسا نہ ہو کہ رات ہو جائے اور محمد کے گھر میں پڑا رہ جائے ۔'' اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مرض الموت میں ہیں ۔ بیماری کی سخت تکلیف اور بے چینی ہے ۔ لیکن اسی وقت یاد آیا کہ کچھ اشرفیاں گھر میں پڑی ہیں ۔ حکم ہوتا ہے کہ '' انہیں خیرات کردو کیا محمد اپنے رب سے اس طرح ملے گا کہ اس کے پیچھے اس کے گھر میں اشرفیاں پڑی ہوں ۔''

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے زہد و قناعت کی تعلیم دی لیکن اس راہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنا طرز عمل کیا تھا؟ آپ سن چکے ہیں کہ عرب کے گوشے گوشے سے جزیہ ، خراج ، عشر اور زکواۃ و صدقات کے خزانے لدے چلے آتے تھے مگر امیر عرب کے گھر میں وہی فقر تھا اور وہی فاقہ تھا ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کہا کرتی تھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے مگر دو وقت بھی سیر ہو کر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کھانا نصیب نہ ہوا ۔ جب آپ (صلی اللہ

Marfat.com

علیہ وسلم) نے وفات پائی تو گھر میں اس دن کے کھانے کے لیے تھوڑے سے جو کے سوا کچھ موجود نہ تھا اور چند سیر جو کے بدلے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زرہ ایک یہودی کے یہاں رھن تھی - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا کرتے تھے کہ "فرزند آدم کو ان چیزوں کے سوا اور کسی چیز کا حق نہیں - رھنے کو ایک جھونپڑا، تن ڈھانکنے کو کپڑا، پیٹ بھرنے کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی -" یہ محض الفاظ کی خوش نما بندش نہ تھی بلکہ یہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرز زندگی کا عملی نقشہ تھا - رھنے کا مکان ایک حجرہ تھا جس میں کچی دیوار اور کھجور کے پتوں اور اونٹ کے بالوں کی چھت تھی - حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا فرماتی ھیں، آپ کا کپڑا کبھی تہہ کر کے نہیں رکھا جاتا تھا یعنی جو بدن مبارک پر کپڑا ھوتا تھا اس کے سوا کوئی اور کپڑا ھی نہیں ھوتا تھا جو تہہ کیا جاتا - ایک دفعہ ایک سائل خدمت اقدس میں آیا اور عرض کیا کہ سخت بھوکا ھوں - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ازواج مطہرات کے پاس کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ھو تو بھیج دیں - ھر جگہ سے یہی جواب آیا کہ " گھر میں پانی کے سوا کچھ نہیں ھے -" سنہ ۹ ھجری میں جب اسلام کی حکومت یمن سے شام تک پھیلی ھوئی تھی، آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے توشہ خانے کی مالیت یہ تھی: جسم مبارک پر ایک تہبند، ایک کھری چارپائی، سرھانے ایک تکیہ جس میں خرمے کی چھال بھری تھی، ایک طرف تھوڑے سے جو، کھونٹی میں پانی کا مشکیزہ، اور بس!

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لوگوں کو ایثار کی تعلیم دی تو ساتھ ھی ان کے سامنے اپنا نمونہ پیش کیا - حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھا سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت معلوم ھے، مگر جب انہوں نے اپنی عسرت اور تنگ دستی کی وجہ سے ایک خادمہ کی خواھش ظاھر کی تو کاشانۂ نبوت سے جواب ملا "اے فاطمہ! اب تک صفہ کے غریبوں کا انتظام نہیں ھوا ھے -" ایک دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس چادر نہ تھی - ایک صحابیہ نے لا کر پیش کی - اس وقت ایک صاحب نے کہا، کیسی اچھی چادر ھے - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فوراً اتار کر ان کی نذر کر دی - ایک صحابی کے گھر کوئی تقریب تھی مگر کوئی سامان نہ تھا - ان سے کہا، عائشہ کے پاس جا کر آٹے کی ٹوکری مانگ لاؤ - وہ گئے اور جا کر لے آئے حالاں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں اس آٹے کے سوا رات کے کھانے تک کو کچھ نہ تھا -

Marfat.com

خدا پر اعتماد، توکل اور بھروسے کی شان دیکھنا ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں دیکھیے - حکم الہٰی تھا کہ " واصبر کما صبر اولوالعزم من الرسل" یعنی، جس طرح اولوالعزم پیغمبروں نے صبر و استقلال دکھایا تو بھی دکھا - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے وہی کرکے دکھا دیا - پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ایسی جاہل اور ان پڑھ قوم میں پیدا ہوئے تھے، جو اپنے معتقدات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سن سکتی تھی اور اس کے لیے مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی تھی - مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی کبھی پروا نہ کی اور اپنے فرض کو پورا کرتے رہے - قریش نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسی کیسی تکلیفیں دیں مگر صبر و استقلال کا سر رشتہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا - ہجرت کے وقت غار ثور میں پناہ لیتے ہیں - کفار آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیچھا کرتے ہوئے غار کے منہ تک پہنچ جاتے ہیں - بے یار و مددگار، نہتے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور مسلح قریش کے درمیان چند گز کا فاصلہ رہ جاتا ہے - ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھبرا اٹھتے ہیں کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم دو ہی ہیں!! لیکن ایک تسکین بھری ہوئی آواز آتی ہے - ابوبکر ہم دو نہیں "لاتحزن ان اللہ معنا" گھبراؤ نہیں، ہمارا خدا ہمارے ساتھ ہے - حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ پہونچنے کے بعد چوں کہ یہود، منافقین اور قریش کی ریشہ دوانیاں اور غارت گری حد سے بڑھ چکی تھیں اس لیے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مسکن کی رات کو حفاظت کرتے - لیکن جب آیت "واللہ یعصمک من الناس" (خدا تجھ کو لوگوں سے بچائے گا) نازل ہوئی تو اس وقت خیمہ سے سر باہر نکال کر پہرے کے سپاہیوں سے فرمایا " لوگو، واپس جاؤ مجھے چھوڑ دو کہ میری حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے لی ہے -" غزوهٔ نجد سے واپسی میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک درخت کے نیچے آرام فرماتے ہیں - صحابهٔ کرام ادھر ادھر ہٹ گئے ہیں - ایک بدو تلوار کھینچ کر سامنے آ جاتا ہے - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) بیدار ہوتے ہیں - موقع کی نزاکت قابل غور ہے، بدو پوچھتا ہے "بتاؤ اے محمد، اب کون تم کو میرے ہاتھ سے بچا سکتا ہے؟" اطمینان اور تسکین سے بھری ہوئی آواز آتی ہے کہ " اللہ! " اس پُر اثر جواب سے دشمن متاثر ہوجاتا ہے - اور تلوار نیام میں پہنچ جاتی ہے - عفو و درگذر سے کام لینا اور دشمنوں سے پیار کرنا گویا صرف حضور علیہ الصلواۃ والسلام کا ہی خصہ تھا - چناں چہ ابو سفیان، جو برابر سات سال تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف فوجیں لاتے رہے، بارہا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے قتل کا فیصلہ کیا، ہر قدم پر اسلام کے سخت ترین

Marfat.com

دشمن ثابت ہوئے ، لیکن فتح مکہ سے پہلے جب حضرت عباس رض کے ساتھ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے آتے ہیں تو گو ان کا ہر جرم ان کے قتل کا طالب ہے مگر رحمت عالم کا عفو عام ابو سفیان سے کہتا ہے کہ ڈر کا مقام نہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انتقام کے جذبے سے بالا تر ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف ان کو معاف فرماتے ہیں بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں :

من دخل دار ابی سفیان کان آمنا۔ — جو ابو سفیان کے گھر میں پناہ لے گا اس کو بھی امن ہے۔

ہندہ (ابو سفیان رض کی بیوی) جو احد کے معرکے میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ گا گا کر قریش کے سپاہیوں کا دل بڑھاتی تھی ، جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رض کی لاش کے ساتھ بے ادبی کی تھی اور جس نے ان کے سینے کو چاک کرکے کلیجہ چبانا چاہا ، وہ فتح مکہ کے دن نقاب پوش سامنے آتی ہے۔ اور یہاں بھی گستاخی سے باز نہیں آتی۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم پھر بھی کچھ تعرض نہیں فرماتے بلکہ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ تو نے یہ کیوں کیا۔ چناں چہ عفوِ عام کی اس معجزانہ مثال کو دیکھ کر وہ پکار اٹھتی ہے۔ ”اے محمد! آج سے پہلے تمہارے خیمے سے زیادہ کسی خیمے سے مجھے نفرت نہ تھی لیکن آج تمہارے خیمے سے زیادہ کسی کا خیمہ مجھے محبوب نہیں ہے۔“ اسی طرح ھبار بن الاسود وہ شخص تھا جو ایک حیثیت سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاحبزادی حضرت زینب رض کا قاتل تھا اور کئی شرارتوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ مکے کی فتح کے موقع پر اس کا خون ہدر کیا جاتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ بھاگ کر ایران چلا جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر سیدھا در دولت پر حاضر ہوتا ہے۔ اور کہتا ہے ”یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) میں بھاگ کر ایران چلا جانا چاہتا تھا لیکن مجھے حضور کا رحم و کرم اور عفو و حلم یاد آیا۔ میں حاضر ہوں۔ میرے جرائم کی جو اطلاعیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ملی ہیں۔ وہ سب درست ہیں۔“ اتنا سنتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رحمت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور دوست و دشمن کی تمیز اٹھ جاتی ہے۔

غرض ، تمام دنیا میں یہ فخر صرف اسلام کے پیغمبر کو حاصل ہے کہ وہ تعلیم اور اصول کے ساتھ ساتھ اپنے عمل اور اپنی مثال کو پیش کرتا ہے۔ آخری حج کے موقع پر جب کہ شمع نبوت کے گرد ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم تھا ،

Marfat.com

انسانوں کو خدا کا آخری پیغام سنایا جاتا ہے۔ عرب کے باطل رسوم اور نہ ختم ہونے والی لڑائیوں کا سلسلہ توڑا جاتا ہے۔ مگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی نظیر اور عملی مثال بھی ہر قدم پر پیش کی جاتی ہے:

"آج عرب کے تمام انتقامی خون باطل کر دیے گئے یعنی تم سب ایک دوسرے کے قاتلوں کو معاف کر دو۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون اپنے بھتیجے، ربیعہ بن حارث کے بیٹے کا خون معاف کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سودی لین دین اور کاروبار آج باطل کیے جاتے ہیں۔ اور سب سے پہلے میں اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سودی بیوپار توڑتا ہوں۔"

بہ ہر حال، آدم علیہ السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام تک اور شام سے لے کر ہندوستان تک ہر ایک تاریخی انسان کی مصلحانہ زندگی کا جائزہ لے جایے۔ لیکن ایسی عملی ہدایتوں اور کامل مثالوں کا کوئی نمونہ نظر نہیں آ سکتا۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی، **خطبات مدراس** - مطبع معارف، اعظم گڑھ۔

مولانا سلیمان منصور پوری، **رحمۃ للعالمین** (جلد اول)۔ شیخ غلام علی، لاہور۔

عبدالحی صاحب، **حیات طیبہ** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

ڈاکٹر آصف حسین قدوائی، **مقالاتِ سیرت** - مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ

نعیم صدیقی، **محسن انسانیت** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

مولانا شبلی نعمانی، **سیرت النبی**، (جلد دوم از باب "معمولات" تا "اخلاق نبوی")۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ۔

Abdul Hamid Siddiqui, *Life of Muhammad.* Islamic Publications Ltd, Lahore.

Faqir Waheeduddin, *The Benefector.* Lions Press Karachi.

Khurshid Ahmad, *The Prophet of Islam.* Jamiyatul Falah Publications, Karachi.

Marfat.com

۱۳

عقیدۂ آخرت

چند فطری اور عقلی سوالات *

انسان خوشی سے زیادہ غم اور راحت سے زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اور یہ کچھ فطری بات ہے کہ جو چیز انسان کے حسیات کو جتنی زیادہ ٹھیس لگاتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کی قوت فکر کو حرکت میں لاتی ہے۔ جب کوئی چیز ہم کو حاصل ہوتی ہے تو اس کی خوشی میں ہم یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ یہ کہاں سے آئی؟ کیوں کر آئی اور کب تک رہے گی؟ لیکن جب کوئی شئے ہم سے کھو جاتی ہے تو اس کا صدمہ ہمارے توسن فکر پر ایک تازیانہ لگا دیتا ہے اور ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ کیسے کھو گئی؟ کہاں گئی؟ اب کہاں ہوگی؟ اور کیا یہ ہمیں پھر حاصل ہوگی یا نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ زندگی اور اس کے آغاز کا سوال ہمارے لیے اتنی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہمیت موت اور اس کے انجام کے سوال کو حاصل ہے۔ اگرچہ دنیا کی اس تماشاگاہ اور اس میں خود اپنے وجود کو دیکھ کر ہمارے دل میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ یہ ہنگامہ کیسا ہے؟ کیسے شروع ہوگیا؟ کس نے برپا کردیا؟ لیکن یہ سب فرصت کی باتیں ہیں۔ اور گہری فکر رکھنے والے خواص کو چھوڑ کر عام انسان ان سوالات میں کم الجھتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے موت اور اس کی تلخیوں

* یہ مضمون مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتب "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی"، "رسالہ دینیات" اور "زندگی بعد موت" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

سے ہر شخص کو دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ ہر شخص کی زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے عزیزوں ، دوستوں ، اور پیاروں کو مرتے دیکھتا ہے ۔ بے کس اور کمزور بھی مرتے ہیں ۔ طاقت اور ہیبت والے بھی مرتے ہیں ۔ حسرت ناک موتیں بھی واقع ہوتی ہیں ۔ عبرت ناک موتیں بھی پیش آتی ہیں ۔ اور آخر میں ہر شخص کو خود اسی راہ پر گذرنے کا یقین ہوتا ہے جس پر سب گذرتے ہیں ۔ ان مناظر کو دیکھ کر شاید ہی کوئی انسان دنیا میں ایسا ہو جس کے دل میں موت کے سوال نے ایک الجھن نہ پیدا کی ہو ۔ اور جس نے اس امر پر غور نہ کیا ہو کہ موت کیا ہے ؟ انسان اس دروازے سے گذر کر آخر کہاں چلا جاتا ہے ؟ اور اس دروازے کے پیچھے کیا ہے ؟ بلکہ کچھ ہے بھی یا نہیں ؟

یہ تو ایک عام سوال ہے جس پر عوام اور خواص سب نے غور کیا ہے ۔ ایک معمولی کسان سے لے کر ایک بڑے فلسفی اور حکیم تک سب ہی اس میں الجھے ہوئے ہیں ۔ لیکن اسی ضمن میں بعض اور سوالات بھی ہیں جو قریب قریب ہر صاحب فکر آدمی کے دل میں کھٹکتے ہیں ۔ اور زندگی کے بہت سے تلخ واقعات اس کھٹک کو اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں ۔

یہ چند برس کی زندگی جو ہم میں سے ہر شخص کو اس دنیا میں ملتی ہے ہر لمحہ اور ہر آن کسی نہ کسی کام ، کسی نہ کسی سعی اور کسی نہ کسی حرکت میں بسر ہوتی ہے ۔ جس کو ہم سکون سمجھتے ہیں وہ بھی ایک حرکت ہے ۔ جس کو ہم بے کاری خیال کرتے ہیں وہ بھی ایک کام ہے ۔ ان سب میں ہر فعل کا رد فعل ، ہر حرکت کی بازگشت ، ہر کوشش کا ثمرہ اور ہر سعی کا انجام ضرور ہونا چاہیے ۔ نیکی کا پھل اچھا اور بدی کا پھل برا ملنا لازم ہے ۔ اچھی کوشش کا نتیجہ اچھا اور بری کوشش کا نتیجہ برا ہونا ضروری ہے ۔ مگر کیا ہماری تمام کوششوں کے نتائج، تمام مساعی کے ثمرات ، تمام افعال کے جواب ہماری اس زندگی میں ہم کو مل جاتے ہیں ؟ ایک بدکار نے تمام عمر شرارتوں میں گذاری ۔ بعض شرارتوں کا پھل بلا شبہ اس کو دنیا میں مل گیا ۔ کسی شرارت نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا ۔ کسی شرارت نے اس کو تکلیفوں ، مصیبتوں اور پریشانیوں میں پھنسا دیا ۔ مگر بہت سی شرارتیں ایسی بھی تو رہ گئیں جن کا پورا پورا بدلہ اس کو دنیا میں نہ ملا ۔

Marfat.com

بہت سی شرارتیں ایسی ڈھکی چھپی رہیں کہ ان کی وجہ سے اس کی بدنامی اور رسوائی تک نہ ہوئی ، اور اگر بالفرض بدنامی ہوئی بھی تو جس غریب پر اس نے ظلم کیا تھا اس کے نقصان کی کون سی تلافی ہوئی ؟ پھر کیا اس شریر کے یہ ظلم اور مظلوموں کے صبر ، سب کے سب بے نتیجہ ہی رہیں گے ؟ کیا ان کا کوئی انجام کبھی ظاہر ہی نہ ہوگا ؟ یہی حال نیکیوں کا بھی ہے - بہت سے نیک انسان عمر بھر نیکی کرتے رہے اور ان کا پورا پورا ثمرہ انہیں دنیا میں نہ ملا - بعض نیکیوں پر انہیں سزائیں ملیں - بعض نیکیوں کا حال کبھی دنیا پر کھلا ہی نہیں - پھر کیا ان غریبوں کی سب نیکیاں اکارت گئیں ؟ کیا اتنی سخت محنتوں اور کوششوں کا صرف اتنا ہی ثمرہ کافی ہے کہ انہیں ضمیر کا اطمینان نصیب ہو گیا؟

یہ سوال تو صرف اشخاص و افراد سے تعلق رکھتا ہے - لیکن اس کے بعد ایک اور سوال انواع اور اجناس اور عناصر اور اس تمام عالم کے انجام سے بھی تعلق رکھتا ہے - ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی مرتے ہیں اور ان کی جگہ دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں - درخت اور جانور سب فنا ہو جاتے ہیں - اور ان کی جگہ دوسرے درخت اور جانور پیدا ہو جاتے ہیں - مگر کیا مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ یونہی جاری رہے گا ؟ کیا کہیں پہنچ کر یہ ختم نہ ہوگا ؟ یہ ہوا ، یہ پانی ، یہ زمین ، یہ روشنی ، یہ حرارت اور یہ قدرتی طاقتیں جن کے ساتھ یہ کارخانۂ عالم ایک خاص ڈھنگ پر چل رہا ہے ، کیا یہ سب لا زوال ہیں ؟ کیا ان کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں ہے ؟ کیا ان کے نظم اور ان کی ترتیب میں کبھی کوئی تغیر واقع نہ ہوگا ؟

اسلامی تصور آخرت

اسلام نے ان تمام سوالات کو حل کیا ہے اور اس کے نزدیک ان کا جواب یہ ہے کہ :

(۱) انسان کی دنیوی زندگی در اصل اس کی آخروی زندگی کا مقدمہ ہے - یہ زندگی عارضی ہے اور وہ پائیدار ہے - یہ ناقص ہے اور وہ کامل - تمام اعمال کے پورے پورے نتائج اس عارضی زندگی میں مترتب نہیں ہوتے - اور نہ ہر وہ بیج جو یہاں بویا جاتا ہے اپنے فطری ثمرات کے ساتھ اس ناقص زندگی میں بارآور ہوتا ہے - اس نقص کی تکمیل اس دوسری زندگی میں ہوگی - اور جو کچھ یہاں بے نتیجہ اور بے ثمرہ رہ گیا ہے وہ اپنے حقیقی نتائج اور ثمرات کے ساتھ وہاں ظاہر ہوگا -

Marfat.com

(۲) جس طرح دنیا کی ہر چیز فرداً فرداً اپنی ایک عمر رکھتی ہے جس کے ختم ہو جانے کے بعد اس میں فساد رونما ہو جاتا ہے ، اسی طرح اس پورے نظام عالم کی بھی ایک عمر ہے جس کے تمام ہونے پر یہ سارا کارخانہ درھم برھم ہوجائے گا ، اور کوئی دوسرا نظام اس کی جگہ لے گا جس کے قوانین طبیعی اس نظام کے قوانین طبیعی سے مختلف ہوں گے ۔

(۳) اس نظام کے درھم برھم ہونے پر ایک زبردست عدالت قایم ہوگی جس میں انسان کے اُس کے ہر عمل کا حساب لیا جائے گا ۔ انسان کو اس روز پھر ایک نئی جسمانی زندگی ملے گی ۔ وہ اپنے خدا کے سامنے حاضر ہوگا ۔ اس کے تمام اعمال جو اس نے اپنی پہلی زندگی میں انجام دیے تھے ٹھیک ٹھیک جانچے اور تولے جائیں گے ۔ حق اور انصاف کے ساتھ اس کے مقدمے کا فیصلہ کیا جائے گا ۔ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے گی اور برے اعمال کی بری سزا دی جائے گی ۔

لیکن اسلام کے پیش کردہ اس حل کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ان کوششوں کا تذکرہ مفید ہوگا جو انسان نے ان سوالات کے حل کرنے کے لیے خود کی ہیں ۔

مادہ پرستوں کا نقطۂ نظر اور اس کا علمی جائزہ

ایک جماعت کے نزدیک زندگی جو کچھ بھی ہے یہی دنیا کی زندگی ہے ۔ اور موت کے معنی بالکل فنا اور معدوم ہو جانے کے ہیں ۔ جس کے بعد حیات شعور ، احساس ، پھل اور نتائج کچھ بھی نہیں ۔

إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَيَقُولُونَ ۝ إِنْ هِيَ إِلَّا مَوْتَتُنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُنشَرِينَ ۝

اور (انکار آخرت کرنے والے) یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں
صرف پہلی مرتبہ (ایک بار) مرنا ہے اور پھر ہمیں اٹھنا
نہیں ہے ۔ (الدخان ۔ ۳۵)

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ

اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس صرف
اسی دنیا کی ہے کہ یہیں مرتے اور جیتے ہیں ۔ اور ہمیں
تو زمانہ مار دیتا ہے ۔ (الجاثیہ : ۲۴)

Marfat.com

ان لوگوں کے نزدیک یہ کارخانۂ عالم جس طرح چل رہا ہے، یونہی چلتا رہے گا۔ اس نظام میں ایسی پائیداری ہے کہ یہ کبھی درہم برہم ہونے والا نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ ایسا کہتے ہیں وہ یہ بات اس بنا پر نہیں کہتے کہ فی الواقع موت کے بعد کچھ نہیں ہے اور فی الحقیقت یہ کارخانۂ عالم لا زوال ہے، بلکہ دراصل انہوں نے محض اپنے حواس پر اعتماد کیا ہے، اور یہ رائے اس لیے قایم کی ہے کہ موت کے بعد کی کوئی کیفیت ان کو محسوس نہیں ہوئی۔[1] اور نظام عالم کی برہمی کے کوئی آثار انہوں نے نہیں دیکھے۔ مگر کیا ہمارا کسی شے کو محسوس نہ کرنا اس کے انکار کے لیے کافی دلیل ہے؟ کیا ہمارا احساس ہی دراصل اشیا کا وجود اور ہمارا عدم احساس اشیا کا عدم ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جو چیز جس وقت میرے احساس میں آتی ہے وہ دراصل اسی وقت وجود میں آتی ہے۔ اور جب وہ میرے حواس سے غائب ہو جاتی ہے تو وہ در اصل فنا ہوجاتی ہے۔ میں نے جس دریا کو بہتے دیکھا تھا وہ اسی وقت پیدا ہوا جب میں نے محسوس کیا اور اسے بہتے دیکھا اور جب وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو معدوم ہوگیا۔ کیا کوئی صاحب عقل میرے اس قول کو صحیح مان لے گا؟ اگر نہیں تو کوئی صاحب عقل اس قول کو کیسے صحیح مان سکتا ہے کہ موت کے بعد کی کیفیت چوں کہ ہم کو معلوم نہیں اس لیے موت کے بعد سرے سے کوئی کیفیت ہی نہیں ہے۔ پھر جس طرح موت اور فنا کے متعلق محض حواس پر بھروسہ کر کے حکم لگانا غلط ہے، اسی طرح زندگی اور بقا کے متعلق بھی جو احکام محض حواس کے بل پر لگائے جاتے ہیں ان کا کچھ اعتبار نہیں، کیوں کہ ہمارے پاس وہ آنکھیں نہیں جن سے ہم موت کی سرحد کے اس پار جھانک سکیں کہ وہاں کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ ہمارے پاس وہ کان نہیں جن سے ہم ادھر کی کوئی آواز سن سکیں۔ ہم کوئی ایسا آلہ بھی نہیں رکھتے جس کے ذریعے سے تحقیق کے ساتھ معلوم کیا جاسکے کہ ادھر کچھ ہے بھی یا کچھ نہیں ہے۔ پھر اگر کارخانۂ عالم کے دائمی اور لازوال ہونے کا حکم محض اس بنا پر لگانا درست ہے کہ ہم نے اس امر کو درہم برہم ہوتے نہیں دیکھا تو میں بھی ایک مضبوط عمارت کو دیکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہمیشہ ہمیشہ قایم رہے گی، کیوں کہ میں نے اس کو نہ

---

[1] اور محض حواس پر اعتماد کر کے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے۔ سائنسدانوں کا مؤثر گروہ اس رائے کا حامل ہے کہ یہ نظام آہستہ آہستہ انتشار اور فنا کی طرف سرگرم عمل ہے۔ ملاحظہ ہو سر جیمس جینز کی کتاب، *The Mysterious Universe* (مرتب)

Marfat.com

کرتے دیکھا ہے اور نہ اس میں کوئی بوسیدگی نظر آتی ہے جو اس کے کبھی گرنے کی پیشن گوئی کرتی ہو۔ کیا میرا یہ استدلال ارباب عقل کی بارگاہ میں مقبول ہوگا ؟

لیکن زندگی بعد موت کا سوال محض ایک عقلی اور فلسفیانہ سوال نہیں ہے۔ بلکہ ہماری عملی زندگی سے اس بات کا بہت گہرا تعلق ہے اور در اصل ہمارے اخلاقی رویے کا سارا انحصار ہی اس سوال پر ہے۔ کیونکہ اگر میرا یہ خیال ہو کہ زندگی جو کچھ ہے بس یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی دوسری زندگی نہیں ہے تو میرا اخلاقی رویہ ایک طرح کا ہوگا ، اور اگر میں یہ خیال رکھتا ہوں کہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی بھی ہے جس میں مجھے اپنی زندگی کا حساب دینا ہوگا ، اور وہاں میرا اچھا یا برا انجام میرے یہاں کے اعمال پر منحصر ہوگا ، تو یقیناً میرا اخلاقی طرز عمل بالکل ایک دوسری ہی طرح کا ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک شخص یہ سمجھتے ہوئے سفر کر رہا ہے کہ اسے بس لاہور سے کراچی تک جانا ہے۔ اور کراچی پہنچ کر نہ صرف یہ کہ اس کا سفر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا بلکہ وہ وہاں پولیس اور عدالت اور اس طاقت کی دسترس سے باہر ہوگا جو اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی ہے۔ برعکس اس کے ایک دوسرا شخص یہ سمجھتا ہے کہ لاہور سے کراچی ہی تک تو اس کے سفر کی صرف ایک منزل ہے۔ اس کے بعد اسے ایک ایسے ملک میں جانا ہوگا جہاں کا بادشاہ وہی ہے جو پاکستان کا بادشاہ ہے اور اس بادشاہ کے دفتر میں میرے اس کارنامے کی خفیہ مثل موجود ہے جو میں نے پاکستان میں انجام دیا ہے اور وہاں میرے ریکارڈ کو جانچ کر فیصلہ کیا جائے گا کہ میں اپنے کام کے لحاظ سے کس درجے کا مستحق ہوں۔

آپ بآسانی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شخصوں کا طرز عمل کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔ پہلا شخص لاہور سے کراچی ہی تک کے سفر کی تیاری کرے گا اور دوسرے کی تیاری بعد کی طویل منزلوں کے لیے بھی ہوگی۔ پہلا شخص یہ سمجھے گا کہ نفع یا نقصان جو کچھ بھی ہے کراچی پہنچنے تک ہے۔ آگے کچھ نہیں۔ اور دوسرا یہ خیال کرے گا کہ اصل نفع و نقصان سفر کے پہلے مرحلے میں نہیں ہے بلکہ آخری مرحلے میں ہے۔ پہلا شخص اپنے افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو کراچی تک سفر میں نکل سکتے ہیں۔ لیکن دوسرے شخص کی نگاہ ان نتائج پر ہوگی جو اس دوسرے ملک میں پہنچ کر

Marfat.com

نکلیں گے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں شخصوں کے طرز عمل کا یہ فرق براہ راست نتیجہ ہے ان کی اس رائے کا جو وہ اپنے سفر کی نوعیت کے متعلق رکھتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ہماری اخلاقی زندگی میں بھی وہ عقیدہ فیصلہ کن اثر رکھتا ہے جو ہم زندگی اور موت کے بارے میں رکھتے ہیں۔ عمل کے میدان میں جو قدم بھی ہم اٹھائیں گے اس کی سمت کا تعین اس بات پر منحصر ہوگا کہ آیا ہم اس زندگی کو پہلی اور آخری زندگی سمجھ کر کام کر رہے ہیں یا کسی بعد کی زندگی اور اس کے نتائج کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ پہلی صورت میں ہمارا قدم ایک سمت اٹھے گا اور دوسری صورت میں اس کی سمت بالکل مختلف ہوگی۔

چناں چہ اگر انسان کے اخلاق اور سیرت کی تعمیر اس اعتقاد پر قایم ہو کہ بس زندگی تو دنیا ہی کی زندگی ہے، یہ ہمیشہ رہے گی۔ تو یقیناً ایسے شخص کی زندگی دو حال سے خالی نہ ہوگی۔ نا موافق حالات میں اس سے ایک شدید قسم کی مایوسی اور پست ہمتی انسان پر طاری ہوگی۔ کیوں کہ جب وہ اپنی نکوکاری کا کوئی نتیجہ دنیا میں ظاہر ہوتے نہ دیکھے گا تو اس کی قوت عمل سرد پڑجائے گی، جب وہ اپنی مظلومی کی داد رسی کا کوئی ذریعہ دنیا میں نہ پائے گا تو اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور جب وہ شریروں، بدکاروں اور ظالموں کو دنیا میں پھلتے پھولتے دیکھے گا تو خیال کرے گا کہ عالم ہستی میں شر ہی کا بول بالا ہے اور خیر صرف سرنگوں ہونے ہی کے لیے ہے۔[1]

بخلاف اس کے اگر حالات موافق ہوں تو اس اعتقاد کے اثر سے انسان ایک نفس پرست حیوان بن جائے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ جو دن عیش اور لطف میں بسر ہو جائیں بس وہی غنیمت ہیں۔ اگر دنیا کی کسی لذت اور کسی لطف سے محروم رہ گئے تو پھر کوئی زندگی نہیں جس میں اس کی کسر پوری ہو۔ وہ ظلم و ستم کرے گا، لوگوں کے حقوق غصب کرے گا، اپنے فائدے اور اپنے نفس کی خواہشات کے لیے کوئی بدتر سے بدتر فعل کرنے میں بھی اس کو باک نہ ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ نیکی اور شرافت جو ایسے شخص کے تصور میں آ سکتی ہے وہ بس وہی ہے جس کے اظہار سے نیک نامی، شہرت، عزت یا اسی قسم کے اور دنیوی فائدے حاصل

۱۔ یہی وجہ ہے کہ جن ممالک میں مادہ پرستی کا غلبہ ہے وہاں خود کشی کی رفتار نہایت تیز ہے اور وہ اقوام جن کا پختہ یقین زندگی بعد موت پر ہے ان میں خود کشی کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پروفیسر فلپ ہتی اس امر کا تذکرہ بہ طور خاص کرتا ہے کہ مسلمانوں میں خود کشی کا رواج سب سے کم ہے اور قرون اولیٰ میں تو اس کا نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ در اصل نتیجہ ہے تصور آخرت پر زندہ ایمان کا۔ (مرتب)

ہو سکتے ہیں ۔ اسی طرح وہ صرف ایسے جرائم کو جرائم اور ایسے ہی گناہوں کو گناہ سمجھے گا جس کا نتیجہ کسی دنیوی سزا یا جسمانی عقوبت یا مادی نقصان کی شکل میں ظاہر ہونے کا اندیشہ ہو ۔ رہیں وہ نیکیاں جن کا کوئی نفع اس دنیا میں ظاہر ہونے والا نہ ہو، تو وہ اس کے نزدیک حماقت سے کم نہ ہوں گی ۔ اور وہ برائیاں جن کا کوئی نقصان اس دنیا میں عائد ہونے والا نہ ہو تو وہ اس کے نزدیک عین صواب ہوں گی ۔

اگر کہیں پورے معاشرے کا نظام اخلاق اسی اعتقاد اور اسی ذہنیت پر قایم ہو تو سرے سے اس کے اخلاقی تصورات ہی بدل جائیں گے، اس کا پورا نظام اخلاق خود غرضی اور نفسیات کی بنیاد پر تعمیر ہوگا ۔ نیکی محض دنیوی فائدے کے ہم معنی ہوگی ۔ اور بدی محض دنیوی نقصان کی مترادف ہوکر رہ جائے گی ۔ غرض، دنیوی زندگی سے آگے کسی اچھے یا برے نتیجے کے مترتب ہونے کا خوف یا امید نہ ہو تو انسان افعال کے صرف ان ہی نتائج پر نظر رکھے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہونے والے ہیں ۔ اور اس سے اعمال کی اخلاقی قدروں میں ایسا تغیر واقع ہو جائے گا جو ہرگز کسی مہذب انسانی سوسائٹی کے لیے سازگار نہیں ہو سکتا ۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ سزا و جزا کے لیے دنیا میں صرف مادی و جسمانی نقصانات اور فوائد ہی نہیں بلکہ خود انسان کے اندر بھی ایک قوت موجود ہے جس کا نام 'ضمیر' ہے ۔ اس کی ملامتیں اور اس کی بے اطمینانی اس دنیا میں بدی کے لیے کافی سزا ہیں، اور اس کا اطمینان انسان کے لیے نیکی کا کافی معاوضہ ہے ۔ مگر اول تو بہت سے گناہ ایسے ہیں جن کے مادی فوائد انسان کو ضمیر کی سرزنش برداشت کرنے کے لیے آمادہ کر دیتے ہیں اور بہت سی نیکیوں کے لیے انسان کو اتنی قربانی کرنا پڑتی ہے کہ محض ضمیر کا اطمینان ان کا پورا معاوضہ نہیں ہو سکتا ۔ دوسرے، اگر آپ ضمیر کی حقیقت پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس کا کام اخلاقی تصورات پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ جو اخلاقی تصورات ایک خاص قسم کی تعلیم و تربیت سے انسان کے ذہن میں راسخ ہو جاتے ہیں ان ہی کی تائید اس کا ضمیر کرنے لگتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ایک غیر مسلم کا ضمیر جن باتوں پر سرزنش کرتا ہے ایک مسلمان کا ضمیر ان پر سرزنش نہیں کرتا ۔ اگر کسی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات بدل جائیں اور خیر و شر کے معیار متغیر ہو جائیں تو ان کے ساتھ ساتھ ضمیر کا رخ بھی پھر جائے گا ۔

Marfat.com

فلسفہ تناسخ اور اس پر نقد و تبصرہ

بعض لوگوں کے خیال میں موت کے معنی فنائے محض کے نہیں ہیں۔ بلکہ محض تبدیل جسم کے ہیں۔ روح اس جسم سے مفارقت کرنے کے بعد کوئی دوسرا جسم اختیار کرتی ہے، اور وہ دوسرا جسم یا زیادہ صحیح الفاظ میں دوسرا قالب اس قابلیت کی مناسبت سے ہوتا ہے جو انسان نے اپنی پہلی زندگی میں اپنے اعمال اور اپنے رجحانات سے بہم پہنچائی ہے۔ اگر اس کے اعمال برے رہے ہیں اور ان کے اثر سے اس کے نفس میں بری قابلیتیں پیدا ہوگئی ہیں تو اس کی روح ادنیٰ درجہ کے حیوانی یا نباتی طبقات میں چلی جائے گی۔ اور اگر اچھے اعمال سے اچھی قابلیتیں اس نے بہم پہنچائی ہیں تو روح اعلیٰ طبقوں کی طرف ترقی کرے گی۔ غرض، اس نظریے کی رو سے جزا اور سزا جو کچھ بھی ہے اس دنیا اور ان ہی اجسام کے عالم میں ہے۔ ارواح بار بار اس دنیا میں قالب بدل بدل کر آتی ہیں تاکہ اپنے پچھلے اعمال کے نتایج بھگتیں۔ گویا اس عقیدے کی رو سے ایک شخص جو اس وقت انسان ہے وہ اس لیے انسان ہوگیا کہ جب وہ جانور تھا تو اس نے اچھے عمل کیے تھے۔ اور ایک جانور جو اس وقت جانور ہے وہ اس لیے جانور ہوگیا کہ انسان کی جون میں اس نے برے عمل کیے تھے۔ دوسرے الفاظ میں انسان و حیوان اور درخت ہونا سب دراصل پہلے جنم کے اعمال کا نتیجہ ہے! اس طرح اس نظریے کو ماننے کے لیے ایسی باتوں کو ماننا ضروری ہے جو صریح علم و عقل کے خلاف ہیں۔ چناں چہ

۱۔ تناسخ کا یہ چکر ایسا ہے جس کا کوئی آغاز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان ہونے کے لیے لازم ہے کہ اس سے پہلے نبات اور حیوان ہو، اور نبات اور حیوان ہونے کے لیے لازم ہے کہ ان سے پہلے انسان ہو۔ ایں چہ بوالعجبی است؟

۲۔ اگر تناسخ کا چکر ازلی اور ابدی ہے تو ماننا پڑے گا کہ نہ صرف وہ ارواح، جو بار بار قالب بدلتی ہیں، بلکہ وہ مادے بھی، جو ان ارواح کو قالب مہیا کرتے ہیں، ازلی اور ابدی ہیں۔

۳۔ ماننا پڑے گا کہ نباتات، حیوانات اور نوع بشری کی جتنی امتیازی خصوصیات ہیں وہ سب دراصل ان کے اجسام کے خاصے ہیں نہ کہ نفوس کے۔ اس لیے جو نفس انسان کے قالب میں

Marfat.com

عقلی و فکری قوتیں رکھتا تھا وہ حیوان کے قالب میں لا یعقل ہوگیا - اور نباتی قالب میں اس غریب سے حرکت ارادی کی قوت بھی سلب ہوگئی -

۴- نیک اور بد کا اطلاق ان اعمال پر ہوتا ہے جو سوچ سمجھ کر بالارادہ کیے جائیں - اس لحاظ سے انسان کے اعمال تو نیک اور بد ہوسکتے ہیں ، اور ان پر جزا اور سزا بھی ہوسکتی ہے ، لیکن نباتات اور حیوانات کے اعمال پر نہ تو نیکی اور بدی کا اطلاق جائز ہے - اور نہ ان کے لیے جزا و سزا کی کوئی وجۂ جواز ہے -

۵- اگر بعد کی زندگی ہمارے موجودہ جنم کے کرموں کا پھل ہے تو ظاہر ہے کہ برے کرموں کا پھل برا ہی ہونا چاہیے - اور جب دوسرے جنم میں وہ برا پھل ہم کو ملا تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اس برے پھل سے نیک اعمال صادر ہوں - لا محالہ اس سے برے ہی اعمال صادر ہوں گے اور پھر ان کا پھل تیسرے جنم میں اور بھی زیادہ برا ہوگا -

غرض ، عقل سلیم اس نظریے کو قبول نہیں کرسکتی - اور یہی وجہ ہے کہ انسان عقل اور علم میں جتنی ترقی کرتا گیا ، تناسخ کا اعتقاد باطل ہوتا چلا گیا -

ظاہر ہے کہ اس رویے کا اثر انسانی زندگی اور تمدن پر اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہمتوں کو پست کرنے والا اور ترقی کی روح کو مردہ کرنے والا ہو جب کہ اس میں سرے سے کوئی معقولیت ہی نہیں پائی جاتی - اسی اعتقاد سے ' اہنسا ' کا عقیدہ نکلا ہے جو انسان کی شخصی اور قومی زندگی کے لیے حد درجہ مہلک ہے - جو قوم اس عقیدے کی قائل ہو اس کا جذبۂ شجاعت فنا ہوجاتا ہے - اس کی جسمانی قوتیں مضمحل ہوجاتی ہیں - اور وہ قوائے جسمانی کو نشو و نما دینے والی بہترین غذاؤں سے محروم ہوجاتی ہے - یہ عقیدہ تمدن و تہذیب کا بھی دشمن ہے اور انسان کو رہبانیت اور ترک دنیا کی طرف لے جاتا ہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ نجات کے طالب ہوں وہ سنیاسی بن کر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا بیٹھیں اور جو ایسا نہ کریں وہ نجات سے مایوس ہوکر جانوروں اور درختوں کے طبقات میں جانے کے لیے مستعد ہوجائیں - کیا یہ تخیل تمدن و تہذیب کی ترقی میں کسی طرح مددگار ہوسکتا ہے ؟ اور کیا کوئی قوم یہ اعتقاد رکھ کر دنیا میں ترقی کرسکتی ہے ؟

Marfat.com

اسلامی عقیدۂ آخرت اور اس کے اثرات

سوالات کے ان دو غیر مطمئن جوابات کے بعد تیسرا حل زیر بحث ہے جو اسلام پیش کرتا ہے۔ اور جیسے جیسے اسلام کے جوابات کو غائر نظر سے دیکھیں گے اس کی حقانیت و صداقت مبرھن ہوتی چلی جائے گی۔

اسلام کے نزدیک، جیسا کہ ابتداً اشارہ کیا گیا، ان بنیادی فطری سوالات کا جواب یہ ہے کہ

(ا) ایک دن اللہ تعالیٰ تمام عالم اور اس کی مخلوقات کو مٹا دے گا۔ یہ دنیا کی زندگی عارضی اور فانی ہے۔

(ب) پھر وہ سب کو ایک دوسری زندگی بخشے گا، اور سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔

(ج) تمام لوگوں نے اپنی دنیوی زندگی میں جو کچھ کیا ہے اس کا پورا نامۂ اعمال خدا کی عدالت میں پیش ہوگا۔

(د) اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور برے اعمال وزن فرمائے گا، جس کی بھلائی خدا کی میزان میں برائی سے زیادہ وزنی ہوگی اس کو بخش دے گا اور جس کی برائی کا پلہ بھاری رہے گا اسے سزا دے گا۔

یہ ہے فطری سوالات کا وہ جواب جسے اسلام 'عقیدۂ آخرت' کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ وہ مذہب ہے جسے انبیا علیہم السلام نے پیش کیا ہے۔ قرآن مجید اسی مذہب کا پرزور وکیل ہے۔ بلکہ قرآن مجید کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جو اس کے تذکرے سے خالی ہو۔ مگر قبل اس کے کہ ہم اس عقیدہ کے اخلاقی نتائج اور تہذیب اسلامی میں اس کے رتبے اور اہمیت پر کلام کریں، ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اس نظریے کے حق میں کیا دلائل ہیں؟ اور عقل کہاں تک اس کو قبول کرتی ہے؟

عقل کا فیصلہ

یہ سوال کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہے یا نہیں ان امور سے تعلق رکھتا ہے جو ہمارے حواس اور حسیّی تجربے کے حدود سے باہر ہیں۔ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ایک شخص، جو چند لمحہ قبل تک

Marfat.com

سانس لیتا اور اپنے ارادے سے حرکت کرتا تھا ، وہ اب زندگی کے تمام آثار سے محروم ہوگیا اور اس کے جسم سے کوئی ایسی شئے غائب ہوگئی جس نے اس جامد ، غیر نامی ، غیر متحرک مادے کو نمو اور حرکت کی قوت مہیا کر رکھی تھی - اب رہا یہ سوال کہ وہ شئے کہاں چلی گئی ؟ جسم سے الگ ہوکر بھی موجود ہے یا معدوم ہوگئی ؟ اور پھر کبھی اس جسم یا ایسے ہی کسی اور جسم سے اس کا تعلق دوبارہ قایم ہوگا یا نہیں ؟ تو جہاں تک ہمارے حواس اور تجربی علم کا تعلق ہے ہم اس سوال کا نفیاً یا اثباتاً کوئی جواب نہیں دے سکتے - کیوں کہ اس چیز کو فی نفسہ نہ ہم نے پہلے کبھی محسوس کیا تھا اور نہ اب محسوس کرتے ہیں - اس بنا پر جہاں تک سائنس کا تعلق ہے ، یہ سوال اس کے دائرے سے قطعی خارج ہے - جو شخص سائنس کا نام لے کر کہتا ہے کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے ، وہ سائنس سے انحراف کرتا ہے - سائنس کی رو سے کوئی یہ تو کہ سکتا ہے کہ میں کچھ نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے (کیوں کہ یہ میرے حسّی اور تجربی علم سے باہر ہے) لیکن ، اگر وہ یہ کہے کہ " چوں کہ میں نہیں جانتا کہ مرنے کے بعد کیا ہوتا ہے اس لیے میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا " تو یقیناً معقولیت کے حدود سے تجاوز کر جائے گا - ایک گنوار نے اگر ' راکٹ ' نہیں دیکھا تو وہ کہ سکتا ہے کہ " مجھے نہیں معلوم کہ ' راکٹ ' کیا چیز ہے -" لیکن جب وہ کہے گا کہ " میں جانتا ہوں کہ راکٹ کوئی چیز نہیں ہے " (کیوں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا) تو عقل مند اس کو احمق کہیں گے - اس لیے کہ اس کا کسی چیز کو نہ دیکھنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ چیز ہے ہی نہیں - ایک آدمی کیا ، اگر ساری دنیا کے لوگوں نے بھی کسی چیز کو نہ دیکھا ہو تو بھی یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ نہیں ہے یا نہیں ہو سکتی - اس لیے جب تک ہم کوئی یقینی ذریعہ علم نہیں پاتے کم از کم اس وقت تک تو صحیح سائنٹفک رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ ہم زندگی بعد موت کا نہ انکار کریں ، نہ اقرار -

مگر کیا عملی زندگی میں ہم اس سائنٹفک رویے کو نباہ سکتے ہیں ؟ یقیناً نہیں - عقلی حیثیت سے تو یہ ممکن ہے کہ جب ایک چیز کو جاننے کے ذرائع ہمارے پاس نہ ہوں تو اس کے متعلق ہم نفی اور اثبات دونوں سے پرہیز کریں - لیکن جب اسی چیز کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہو تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ یا تو انکار پر اپنا طرز عمل قایم کریں یا اقرار پر - مثلاً

Marfat.com

ایک شخص ہے جس سے آپ واقف نہیں ہیں ۔ اگر اس کے ساتھ آپ کا کوئی معاملہ در پیش نہ ہو تو آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ اس کے ایمان دار ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں کوئی حکم نہ لگائیں۔ لیکن جب آپ کو اس سے معاملہ کرنا ہو تو آپ مجبور ہیں کہ یا تو اسے ایمان دار سمجھ کر معاملہ کریں یا بے ایمان سمجھ کر۔ اپنے ذہن میں آپ ضرور یہ خیال کر سکتے ہیں کہ جب تک اس کا ایمان دار ہونا یا نہ ہونا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک ہم شک کے ساتھ معاملہ کریں گے ، مگر اس کی ایمان داری کو مشکوک سمجھتے ہوئے جو معاملہ آپ کریں گے ، عملاً اس کی صورت تو وہی ہوگی جو اس کی ایمان داری کا انکار کرنے کی صورت میں ہو سکتی تھی ۔ لہذا فی الواقع انکار اور اقرار کے درمیان شک کی حالت صرف ذہن ہی میں ہو سکتی ہے ۔ عملی رویہ کبھی شک پر قایم نہیں ہو سکتا ۔ لہذا ہم بہ ہر حال اس امر کا تعین کرنے پر مجبور ہیں کہ آیا موت کے بعد کوئی اور زندگی ہے یا نہیں ۔ اگر سائنس اس کے تعین میں ہماری مدد نہیں کرتی تو ہمیں عقلی استدلال سے مدد لینی چاہیے ۔

اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایک تو خود انسان ہے ۔ اور دوسرے یہ نظامِ کائنات ۔ ہم انسان کو اس نظامِ کائنات کے اندر رکھ کر دیکھیں گے کہ جو کچھ انسان میں ہے آیا اس کے سارے مقتضیات اس نظام میں پورے ہو جاتے ہیں یا کوئی چیز بچی رہتی ہے جس کے لیے کسی دوسری نوعیت کے نظام (دوسری زندگی ، ' آخرت ') کی ضرورت ہو ۔

انسان ایک تو جسم رکھتا ہے ، جو بہت سے معدنیات ، نمکیات ، پانی اور گیسوں کا مجموعہ ہے ۔ اس کے جواب میں کائنات کے اندر بھی مٹی ، پتھر ، دھاتیں ، نمک ، گیسیں ، دریا اور اسی جنس کی دوسری چیزیں موجود ہیں ۔ ان چیزوں کو کام کرنے کے لیے جن قوانین کی ضرورت ہے ، وہ سب کائنات کے اندر کار فرما ہیں ، اور جس طرح وہ باہر کی فضا میں پہاڑوں ، دریاؤں اور ہواؤں کو اپنے حصے کا کام پورا کرنے کا موقع دے رہے ہیں اسی طرح انسانی جسم کو بھی ان قوانین کے تحت کام کرنے کا موقع حاصل ہے ۔

پھر انسان ایک ایسا وجود ہے جو گرد و پیش کی چیزوں سے غذا لے کر بڑھتا اور نشو و نما حاصل کرتا ہے ۔ اسی جنس کے درخت ، پودے ، اور گھاس پھونس کائنات میں بھی موجود ہیں ۔ اور وہ قانون بھی یہاں پائے جاتے ہیں جو

Marfat.com

نشو و نما پانے والے اجسام کے لیے درکار ہیں ۔ پھر انسان ایک زندہ وجود ہے ۔ جو اپنے ارادے سے حرکت کرتاہے ، اپنی غذا خود اپنی کوشش سے فراہم کرتا ہے ، اپنے نفس کی آپ حفاظت کرتا ہے اور اپنی نوع کو باقی رکھنے کا انتظام کرتا ہے ۔ کائنات میں اس جنس کی بھی دوسری بہت سی قسمیں موجود ہیں ۔ خشکی ، تری ، اور ہوا میں بے شمار حیوانات پائے جاتے ہیں ، اور وہ قوانین بھی بہ تمام و کمال یہاں کارفرما ہیں جو ان زندہ ہستیوں کے پورے دائرۂ عمل پر حاوی ہونے کے لیے کافی ہیں ۔

ان سب سے اوپر انسان ایک اور نوعیت کا وجود بھی رکھتا ہے ، جس کو ہم اخلاقی وجود کہتے ہیں ۔ اس کے اندر نیکی اور بدی کرنے کا شعور ہے ۔ نیک اور بد کی تمیز ہے ۔ نیکی اور بدی کرنے کی قوت ہے ۔ اور اس کی فطرت یہ مطالبہ کرتی ہے کہ نیکی کا اچھا اور بدی کا برا نتیجہ ظاہر ہو ۔ اور وہ ظلم اور انصاف ، سچائی اور جھوٹ ، حق اور ناحق ، رحم اور بے رحمی ، احسان اور احسان فراموشی ، فیاضی اور بخل ، امانت اور خیانت اور ایسی ہی مختلف اخلاق صفات کے درمیان فرق کرتا ہے ۔ یہ صفات عملاً اس کی زندگی میں پائی جاتی ہیں اور یہ محض خیالی چیزیں نہیں ہیں ۔ بلکہ بالفعل ان کے اثرات انسانی تمدن پر مرتب ہوتے ہیں ۔ لہٰذا انسان جس فطرت پر پیدا ہوا ہے اس کا شدت کے ساتھ یہ تقاضا ہے کہ جس طرح اس کے افعال کے طبیعی نتائج رونما ہوتے ہیں اسی طرح اخلاقی نتائج بھی رونما ہوں ۔

مگر نظام کائنات پر گہری نگاہ ڈال کر دیکھیے ۔ کیا اس نظام میں انسانی افعال کے اخلاقی نتائج پوری طرح رونما ہو سکتے ہیں ؟ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں اس کا امکان نہیں ہے ۔ اس لیے کہ یہاں کم از کم ہمارے علم کی حد تک کوئی دوسری ایسی مخلوق نہیں پائی جاتی جو اخلاقی وجود رکھتی ہو ۔ سارا نظام کائنات طبیعی قوانین کے ماتحت چل رہا ہے ۔ اخلاقی قوانین کسی طرف کار فرما نظر نہیں آتے ۔ یہاں روپے میں وزن اور قیمت ہے ، مگر سچائی میں نہ وزن ہے نہ قیمت ۔ یہاں آم کی گٹھلی سے ہمیشہ آم پیدا ہوتا ہے مگر حق پرستی کا بیج بونے والے پر کبھی پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور کبھی بلکہ اکثر جوتیوں کی ۔ یہاں مادی عناصر کے لیے مقرر قوانین ہیں جن کے مطابق ہمیشہ مقرر نتائج نکلتے ہیں مگر اخلاقی عناصر کے لیے کوئی مقرر قانون نہیں ہے کہ ان کی فعلیت سے ہمیشہ

Marfat.com

مقرر نتیجہ نکل سکے۔ طبیعی قوانین کی فرماں روائی کے سبب سے اخلاق نتائج کبھی تو نکل ہی نہیں سکتے، کبھی نکلتے ہیں تو صرف اس حد تک جس کی اجازت طبیعی قوانین دے دیں۔ اور بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اخلاق ایک فعل سے ایک خاص نتیجہ نکلنے کا تقاضا کرتا ہے مگر طبیعی قوانین کی مداخلت سے نتیجہ بالکل برعکس نکل آتا ہے۔ اس لیے اول تو موجودہ نظام کائنات جن قوانین پر چل رہا ہے ان کے اندر اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ انسانی افعال کے اخلاق نتائج پوری طرح مرتب ہو سکیں۔ دوسرے یہاں چند سال کی زندگی میں انسان جو عمل کرتا ہے اس کے رد عمل کا سلسلہ اتنا وسیع ہوتا ہے اور مدت تک جاری رہتا ہے کہ صرف اس کے پورے نتائج وصول کرنے کے لیے ہزاروں بلکہ لاکھوں برس کی زندگی درکار ہے۔ اور موجودہ قوانین قدرت کے ماتحت ظاہر ہے کہ انسان کو اتنی زندگی ملنی ناممکن ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی ہستی کے خاکی، عضوی، اور حیوانی عناصر کے لیے تو موجودہ طبیعی دنیا اور اس کے طبیعی قوانین کافی ہیں۔ مگر اس کے اخلاق عنصر کے لیے یہ دنیا بالکل ناکافی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرا نظامِ عالم درکار ہے جس میں اخلاق کا قانون حکمراں ہو اور طبیعی قوانین اس کے ماتحت محض مددگار کی حیثیت سے کام کریں۔ جس میں زندگی محدود نہ ہو بلکہ غیر محدود ہو، جس میں وہ تمام اخلاقی نتائج جو یہاں مرتب ہونے سے رہ گئے ہیں یا اُلٹے مرتب ہوئے ہیں اپنی صحیح صورت میں پوری طرح مرتب ہو سکیں، جہاں سونے اور چاندی کے بجائے نیکی اور صداقت میں وزن اور قیمت ہو، جہاں آگ صرف اس چیز کو جلائے جو اخلاقاً جلنے کی مستحق ہو، جہاں عیش اس کو ملے جو نیک ہو اور مصیبت اس کے حصے میں آئے جو بد ہو۔ عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ ایک ایسا نظام عالم ضرور ہونا چاہیے۔

عقلی استدلال سے آگے

جہاں تک عقلی استدلال کا تعلق ہے وہ ہم کو صرف "ہونا چاہیے" کی حد تک لے جا کر چھوڑ دیتا ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آیا واقعی کوئی ایسا عالم ہے بھی؟ تو ہماری عقل اور ہمارا علم دونوں اس کا حکم لگانے سے عاجز ہیں۔ یہاں قرآن ہماری مدد کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری عقل اور تمہاری فطرت جس چیز کا مطالبہ کرتی ہے فی الواقع وہ ہونے والی ہے۔ موجودہ نظامِ عالم جو

Marfat.com

طبیعی قوانین پر بنا ہے ایک وقت میں توڑ ڈالا جائے گا ۔ اس کے بعد ایک دوسرا نظام بنے گا جس میں زمین و آسمان اور ساری چیزیں ایک دوسرے ڈھنگ پر ہوں گی پھر اللہ تعالیٰ تمام انسانوں کو، جو ابتدائے آفرینش سے قیامت تک پیدا ہوئے تھے، دوبارہ پیدا کردے گا اور بہ یک وقت ان سب کو اپنے سامنے جمع کرے گا ۔ وہاں ایک ایک شخص کا، ایک ایک قوم کا اور پوری انسانیت کا ریکارڈ غلطی اور فروگزاشت کے بغیر محفوظ ہوگا، ہر شخص کے ایک ایک عمل کا جتنا رد عمل دنیا میں ہوا ہے، اس کی پوری روداد موجود ہوگی، وہ تمام نسلیں گواہوں کے کٹہرے میں حاضر ہوں گی جو اس رد عمل سے متاثر ہوئیں ۔ ایک ایک ذرہ جس پر انسان کے اقوال اور افعال کے نقوش ثبت ہوئے اپنی داستان سنائے گا ۔ خود انسان کے ہاتھ اور پاؤں اور آنکھ اور زبان اور تمام اعضا شہادت دیں گے کہ ان سے اس نے کس طرح کام لیا ۔ پھر اس روداد پر وہ سب سے بڑا حاکم پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کرے گا کہ کون کتنے انعام کا مستحق ہے، اور کون کتنی سزا کا مستوجب ہے ۔ یہ انعام اور یہ سزا، دونوں چیزیں اتنے بڑے پیمانے پر ہوں گی جس کا کوئی اندازہ موجودہ نظام عالم کی محدود مقداروں کے لحاظ سے نہیں کیا جا سکتا ۔ وہاں وقت اور جگہ کے معیار کچھ اور ہوں گے، وہاں مقداریں کچھ اور ہوں گی، وہاں کے قوانین قدرت کسی اور قسم کے ہوں گے، انسان کی جن نیکیوں کے اثرات دنیا میں ہزاروں برس چلتے رہے ہیں وہاں وہ ان کا بھرپور صلہ وصول کر سکے گا ۔ بغیر اس کے کہ موت، اور بیماری اور بڑھاپا اس کے عیش کا سلسلہ توڑ سکیں اور جس انسان کی برائیوں کے اثرات دنیا میں ہزارہا برس تک اور بے شمار انسانوں تک پھیلتے رہے ہیں وہ ان کی پوری سزا بھگتے گا بغیر اس کے کہ موت اور بے ہوشی آکر اسے تکلیف سے بچا سکے ۔

ایسی ایک زندگی اور ایسے ایک عالم کو جو لوگ ناممکن سمجھتے ہیں ان کے ذہن کی تنگی پر ترس آتا ہے ۔ خصوصاً آج کل جب کہ سائنسی ایجادات اور انکشافات قدم قدم پر اس نظریۂ آخرت کی تائید و توثیق کرتے چلے جا رہے ہیں ۔ مثلاً خود سائنس دانوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایک دن سورج ٹھنڈا اور بے نور ہو جائے گا ۔ سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے ۔ اور یہ دنیا تباہ ہو جائے گی ۔ یا جیسا کہ پہلے سمجھا جاتا تھا کہ جو آواز ہمارے منہ سے نکلتی ہے وہ ہوا میں تھوڑی سی لہر پیدا کرکے فنا ہو جاتی ہے ۔ مگر اب معلوم ہوا کہ ہر آواز اپنے گرد و پیش کی چیزوں پر اپنا نقش چھوڑ جاتی ہے جس کو دوبارہ پیدا کیا

Marfat.com

جا سکتا ہے ۔ چناں چہ گراموفون کا ریکارڈ اسی اصول پر بنا ہے ۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہماری ہر حرکت کا ریکارڈ ان تمام چیزوں پر منقوش ہو رہا ہے جن کے ساتھ اس حرکت کا کسی طور پر تصادم ہوتا ہے ۔ غرض ، اگر ہمارے موجودہ نظام عالم کا موجودہ قوانین قدرت کے ساتھ موجود ہونا ممکن ہے تو آخر ایک دوسرے نظام عالم کا دوسرے قوانین کے ساتھ وجود میں آنا کیوں ناممکن ہو ؟

قرآنی استدلال

اس موقع پر اگر مختصراً قرآنی طرزِ استدلال پر کچھ روشنی ڈال دی جائے تو بے جا نہ ہوگا ۔ اس سلسلے میں اصولی طور پر قرآن نے جو طرزِ استدلال اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے وہ قدرت الٰہی کے آثار کا مشاہدہ کرنے اور ان پر فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے ۔ مثلاً

أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

کیا ان لوگوں نے آسمانوں اور زمین
کے انتظام پر غور نہیں کیا ۔
(الاعراف ۔ ۱۸۵)

گویا اشارہ کیا گیا کہ اگر تم آنکھیں کھول کر ان آثار کو دیکھو ، جو شب و روز تمہارے سامنے پیش ہو رہے ہیں اور زمین و آسمان کے انتظام کا مشاہدہ کرو اور ان سب محسوسات اور مشاہدات پر غور و فکر کرکے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرو تو تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ درست ہے ۔ پھر وہ ان ہی آثار و مظاہر میں سے ان چیزوں کو پیش کرتا ہے جو سب سے زیادہ بدیہی ہیں ۔ اور ان سے استدلال کرتا ہے کہ جس بات (اُخروی زندگی) کو تم بعید از عقل سمجھ رہے ہو ، تمہاری عقل و قیاس سے دور ہو مگر حقیقت میں ناممکن نہیں ہے ۔ چناں چہ فرمایا :

ءَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ ۚ بَنَاهَا

کیا تمہارا پیدا کرنا زیادہ دشوار ہے
یا آسمان کا ؟ خدا نے تو ایسی
(بڑی چیز کو) بنایا ہے ۔ (النازعات ۔ ۲۷)

Marfat.com

جس خدا نے اتنا بڑا نظام کائنات پیدا کیا ہے ، جس نے اجرام سماوی کو اپنے قانون کی بندشوں میں جکڑ رکھا ہے - جس کی قدرت ان عظیم الشان اجرام کو اس انتظام کے ساتھ حرکت دے رہی ہے کہ کوئی جرم اپنے مدار سے بال برابر تجاوز نہیں کرسکتا اور جس کی طاقت نے کائنات کے طبقوں کو ایسا غیر مرئی اور غیر محسوس سہاروں پر قایم کیا ہے جن کے ادراک سے تم عاجز ہو ، اس خدا کے متعلق یہ گمان کرنا کہ وہ تم جیسی حقیر مخلوق کو ایک دفعہ ہلاک کرکے دوبارہ زندہ کرنے پر قادر نہیں ہے ، کیسی بڑی خام خیالی ہے - آسمان کے بعد وہ ہمارے قریب ترین ماحول یعنی زمین کے آثار کی طرف ہم کو متوجہ کرتا ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ تو زمین کو دیکھتا ہے کہ سونی پڑی ہے - پھر جہاں ہم نے پانی برسایا اور وہ بھبک اٹھی اور لہلہانے لگی - تو جس نے اس کو زندہ کیا وہی مردوں کو بھی زندہ کرنے والا ہے - یقیناً وہ ہر چیز پر قادر ہے - (حم السجدہ - ۳۹)

اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ

اگر تم کو مرنے کے بعد جی اٹھنے میں شک ہے
تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے مٹی جیسی بے جان
شے سے تم کو پیدا کیا ہے - (الحج - ۵)

اسی طرح ان صاف اور واضح اور ہمارے مشاہدہ و احساس سے قریب تر شواہد پیش کرنے کے بعد قرآن مجید ایک ایسی کھلی ہوئی دلیل پیش کرتا ہے جو بالکل معمولی سمجھ سے تعلق رکھتی ہے - وہ کہتا ہے کہ اشیا کو عدم سے وجود میں لانا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت اس کے کہ ان کو منتشر اور پراگندہ ہوجانے کے بعد دوبارہ پہلی صورت پر پیدا کیا جائے - پس جو طاقت اس دشوار تر کام کو انجام دینے سے عاجز نہ ہوئی ، وہ آسان تر کام کو انجام دینے سے کیوں کر عاجز ہوسکتی ہے ؟ اگر ایک شخص موٹر ایجاد کرنے پر قادر ہے اور اس کو بنا چکا ہے تو کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ وہ موٹر کے پرزوں کو الگ الگ کرنے کے بعد دوبارہ جوڑنے پر قادر نہیں ہے ؟ اسی مثال پر قیاس کرلو کہ صانع عالم

Marfat.com

جو تم کو عدم سے وجود میں لایا ہے، تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ پیدا کرنے سے ہرگز عاجز نہیں ہوسکتا۔

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ

اور وہی تو ہے جو آفرینش کی ابتدا کرتا ہے پھر وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس کے لیے سہل تر ہے۔ (الروم - ۲۷)

زندگی پر اثرات

اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہوگئی ہوگی کہ اس دنیوی زندگی کے بعد ایک آخروی زندگی کا وجود میں آنا ممکن اور اغلب اور اقتضائے حکمت کے مطابق ہے۔ اور عقل سلیم اور علم ہم کو آخروی زندگی کے اس تصور پر، جو قرآن نے پیش کیا ہے، ایمان لانے سے نہیں روکتے بلکہ اس پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ حیات آخروی کا مسئلہ محض ایک فلسفیانہ مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ انسان کی اخلاقی اور عملی زندگی سے اس کا ایک گہرا تعلق ہے۔ اس کو ماننے سے دنیوی زندگی اور اس کے معاملات کے متعلق انسان کا نقطۂ نظر بنیادی طور پر بدل جاتا ہے۔ اس اعتقاد کو تسلیم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے آپ کو ایک ذمہ دار اور جواب دہ ہستی سمجھے اور اپنی زندگی کے تمام معاملات یہ سمجھتے ہوئے انجام دے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور ہر فعل کے لیے ذمہ دار ہے۔ آئندہ زندگی میں اس کو اپنے تمام اعمال کی جواب دہی کرنی ہے اور مستقبل کی سعادت و شقاوت اس کے حال کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے۔ جو شخص اس آخروی زندگی کا معتقد ہوگا اس کی نظر اپنے اخلاق افعال کے صرف انہی نتائج پر نہ ہوگی جو اس زندگی میں مترتب ہوتے ہیں، بلکہ وہ ان آخری نتائج پر نگاہ رکھے گا جو اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی میں ظاہر ہونے والے ہیں۔ اور ان نتائج کے لحاظ سے ہر فعل کے مفید یا مضر ہونے کا فیصلہ کرے گا۔ اس کو جس طرح زہر کے مہلک اور آگ کے موذی ہونے کا یقین ہوگا اسی طرح خیانت اور جھوٹ کے مہلک اور موذی ہونے کا بھی یقین ہوگا۔ وہ جس طرح روٹی اور پانی کو مفید سمجھنے کا اسی طرح عدل و امانت اور عفت کو بھی مفید سمجھے گا۔ وہ اپنے ہر فعل کے ایک متعین اور یقینی نتیجہ کا قائل ہوگا۔

Marfat.com

خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں قطعاً ظاہر نہ ہو بلکہ برعکس صورت میں ظاہر ہو۔ اس کے پاس اخلاقی اعمال کی متعین اخلاقی قدریں ہوں گی اور ان قدروں میں دنیوی فوائد یا مضرتوں سے کوئی تغیر واقع نہ ہوگا۔

اس طرح اسلام نے آخرت کے عقیدے کو اپنے اخلاقی ضابطے اور نظام شرعی کے لیے ایک زبردست پشت پناہ بنا دیا ہے، جس میں ایک طرف خیر و صلاح پر عمل کرنے اور شر و فساد سے بچنے کے لیے عقلی ترغیب بھی موجود ہے اور دوسری طرف نیکی پر یقینی جزا اور ابدی پر یقینی سزا کا خوف بھی ہے۔ اس کا ضابطہ اور نظام اپنی بقا و استحکام کے لیے مادی طاقت اور حاکمانہ اقتدار کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایمان بالیوم الآخر کے ذریعے سے انسان کے نفس میں ایک ایسے طاقتور ضمیر کی تشکیل کرتا ہے جو کسی بیرونی لالچ اور خوف کے بغیر انسان کو آپ سے آپ ان نیکیوں کی طرف راغب کرتا ہے جن کو اسلام نے آخری نتائج کے اعتبار سے نیکی قرار دیا ہے اور ان گناہوں سے بچنے کی تاکید کرتا ہے جن کو اس نے آخری نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے گناہ ٹھیرایا ہے۔

قرآن میں جگہ جگہ اس عقیدے کو مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ تقویٰ اور پرہیزگاری کا حکم دیا جاتا ہے، تو ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۗ

اللہ سے ڈرو اور جان رکھو کہ تم
کو اس کے پاس حاضر ہونا ہے۔
(البقرہ - ۲۲۳)

راہ خدا میں سرفروشی کے لیے ابھارا جاتا ہے تو ساتھ ہی یہ بھی یقین دلایا جاتا ہے کہ اگر تم مارے جاؤگے تو درحقیقت مر نہ جاؤگے بلکہ ہمیشہ کی زندگی پاؤگے:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں ان کو مردہ نہ کہو
بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں ہوتا۔
(البقرہ - ۱۵۴)

Marfat.com

مصائب پر صبر کی تلقین کی جاتی ہے تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ صابرین کے لیے خدا کی طرف سے عنایت اور رحمت ہے:

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ

یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب
کی جانب سے بڑی عنایات ہوں گی اور
رحمت الٰہی ان پر سایہ کرے گی۔
(البقرہ - ۱۵۷)

بے خوفی اور بہادری کا جذبہ اس طرح پیدا کیا جاتا ہے کہ

قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُم مُّلَاقُو اللَّهِ كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ

جو لوگ سمجھتے تھے کہ انہیں اللہ کے پاس حاضر ہونا ہے انہوں
نے کہا کہ اللہ کے حکم سے چھوٹی جماعت بھی بڑی جماعت پر
غالب آ جاتی ہے۔ (البقرہ - ۲۴۹)

سخت سے سخت مشکلات کے مقابلے میں ڈٹ جانے کی قوت یہ کہہ کر پیدا کی جاتی ہے کہ

نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَرًّا

جہنم کی آگ دنیا کی گرمیوں سے زیادہ
سخت ہے۔ (براۃ - ۸۱)

نیک کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے ابھارتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے

وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ

جو کچھ تم خیرات کرو گے اس کا پورا اجر تم
کو ملے گا اور تمہارے ساتھ ظلم نہ ہوگا۔
(البقرہ - ۲۷۲)

بخل سے روکنے کے لیے فرمایا جاتا ہے

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُم بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے مال دار کیا ہے۔ اور پھر وہ اس میں بخل کرتے ہیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کے لیے اچھا ہے بلکہ در حقیقت یہ ان کے حق میں برا ہے۔ جس مال میں وہ بخل کرتے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے میں طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔
(آل عمران - ۱۸۰)

Marfat.com

سود خوری کے ظاہری فائدوں سے دست بردار ہونے کے لیے یہ کہہ کر آمادہ کیا جاتا ہے کہ

وَاتَّقُوْا یَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِیْهِ اِلَی اللّٰهِ

اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ
کے پاس لوٹائے جاؤ گے۔
(البقرہ - ۲۸۱)

متاعِ دنیا سے بے نیازی اور بدکاروں کی خوش حالی پر رشک نہ کرنے کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ

لَا یَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِی الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِیْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ۝

دنیا کے ملکوں میں کفر کی روش اختیار کرنے والے لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ لیکن جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لیے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، ان کے لیے اللہ کی طرف سے یہ سامان ضیافت ہے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لیے وہی سب سے بہتر ہے۔ (آل عمران - ۱۹۶ - ۱۹۷ - ۱۹۸)

عقیدۂ آخرت کی اس اہمیت و افادیت کے پیش نظر اس عقیدے پر ایمان و ایقان رکھنا ایک مسلمان کے لیے ناگزیر ہے۔ اور جب تک اس پر ایمان نہ لائے کوئی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مسلمان تو خیر بڑی چیز ہے، سچ یہ ہے کہ آخرت کا انکار انسان کو انسانیت سے گرا کر حیوانیت سے بھی بدتر درجے میں لے جاتا ہے۔

مزید مطالعے کے لیے

- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، **اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی** (باب سوم، فصل ہفتم، اور باب چہارم)۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔
- مولانا سید سلیمان ندوی، **سیرت النبی**، (جلد چہارم: ابواب بر عقیدۂ آخرت)۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ۔
- مولانا صدر الدین اصلاحی، **اساس دین کی تعمیر** (باب سوم)۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔
- مولانا محمد منظور نعمانی، **قرآن کیا کہتا ہے؟** مکتبہ الفرقان، لکھنؤ۔
- افتخار احمد بلخی، **جواہر رسالت** (عنوان "انداز بود و باش" اور "مسئولیت")۔ المطبوعات، کراچی۔

Marfat.com

۱۴

اسلامی تصور عبادت اور اسلامی عبادات

• قرآن کی رو سے عبادت وہ اصل مقصد ہے جس کی خاطر انسانوں کو پیدا کیا گیا ہے۔ و ما خلقت الجن و الانس الا لیعبدون (میں نے جنوں اور انسانوں کو محض عبادت کے لیے پیدا کیا ہے)۔ لہذا ہمارے لیے اس بات کا سمجھنا بڑا ضروری ہے کہ عبادت کیا ہے اور اس کا صحیح تصور کیا ہے۔

عبادت کا ایک تصور وہ ہے جسے جاہلی تصور عبادت کہا جا سکتا ہے۔ اس تصور کی رو سے عبادت محض پوجا پاٹ تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جاہل لوگ اپنے معبودوں کو انسانوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح بڑے آدمی، سردار یا بادشاہ خوشامد سے خوش ہوتے ہیں، نذرانے پیش کرنے سے مہربان ہو جاتے ہیں، ذلت اور عاجزی کے ساتھ ہاتھ جوڑنے اور سر جھکانے سے پسیج جاتے ہیں، اور ان سے یوں ہی کام نکالا جا سکتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی انسانوں سے خوشامد، نذر و نیاز اور عاجزی کا طالب ہے۔ اس تصور کی بنا پر جاہلی مذہب چند مخصوص اوقات میں مخصوص مراسم ادا کرنے کو عبادت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

عبادت کا دوسرا تصور، جسے جوگیانہ یا راہبانہ تصور عبادت کہنا موزوں ہوگا، یہ ہے کہ انسان دنیاوی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگائے، مراقبہ، نفس کشی اور مجاہدات و ریاضات کے ذریعے سے اپنی اندرونی قوتوں کو نشو و نما دے اور دنیوی زندگی کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل کرکے آخروی نجات حاصل

---

* پہلے تین حصے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب "اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر" سے ماخوذ ہیں البتہ اس میں موجودہ کتاب کی ضرورتوں کے پیش نظر کہیں کہیں ضروری اضافے کیے گئے ہیں۔ (مرتب)

Marfat.com

کرے - عبادت کا یہ تصور اُن مذاہب میں پایا جاتا ہے جن کی بنیاد زندگی کے راہبانہ تصور پر ہے اور جن کے نزدیک دین اور دنیا ایک دوسرے کی ضد ہیں ، اور جو دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریوں اور اس کے علائق سے باہر نجات کا راستہ ڈھونڈتے ہیں -

اسلام کا تصورِ عبادت ان دونوں سے مختلف ہے - اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے - اس کا خالق ، اس کا مالک ، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے جس نے اس زمین پر اس کو اپنے نائب کی حیثیت سے مقرر کیا - کچھ اختیارات عطا کیے ، کچھ ذمہ داریاں دیں ، کچھ خدمتیں سپرد کیں - اپنی مملکت اور رعیت کے حصے پر اقتدار دیا - اس دنیا میں اس کا کام اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے ، اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے ، آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے - اس کی آئندہ ترقی کا انحصار اسی پر ہے کہ اپنی تقرری کی مدت ختم کرنے کے بعد جب وہ مالک کے سامنے حساب کے لیے پیش ہو تو اس کے کارنامۂ زندگی سے یہ ثابت ہو کہ وہ ایک فرض شناس ، مطیع اور فرماں بردار بندہ تھا ، نہ یہ کہ سست ، کام چور ، فرض ناشناس یا باغی و نافرمان تھا -

اس نقطۂ نظر سے عبادت کے وہ دونوں تصور ، جو اوپر بیان کیے گئے ہیں ، ناقص ہیں - جو شخص اپنے اوقات میں سے تھوڑا سا وقت خدا کو پوجنے میں صرف کر کے یہ سمجھتا ہے کہ اب وہ آزاد ہے کہ جو چاہے کرے ، اس کی مثال ایک ایسے ملازم کی ہے جسے آپ نے رات دن کے لیے رکھا ہو اور جسے پوری تنخواہ دے کر آپ پرورش کر رہے ہوں لیکن وہ بس صبح شام آ کر آپ کو جھک جھک کر سلام کر دیا کرے اور اس کے بعد آزادی کے ساتھ جس جس کی چاہے نوکری بجا لائے - اسی طرح جو شخص دنیا اور اس کے معاملات سے الگ ہو کر ایک گوشے میں جا بیٹھتا ہے اور اپنا سارا وقت پوجا پاٹ اور ریاضت میں صرف کر دیتا ہے ، اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جسے آپ اپنے باغ کی رکھوالی کے لیے مقرر کریں مگر وہ باغ کو اور اس کے کام کاج کو چھوڑ کر آپ کے سامنے ہر وقت ہاتھ باندھے کھڑا رہے ، صبح سے شام اور شام سے صبح تک آقا آقا پکارتا رہے اور باغبانی کے متعلق جو ہدایات آپ نے اسے دی ہیں ان کو خوش الحانی اور ترتیل کے ساتھ پڑھتا رہے لیکن باغ کی اصلاح و ترقی کے لیے کچھ نہ کر کے دے - ایسے ملازموں

Marfat.com

ملازموں کے متعلق جو کچھ رائے آپ قایم کریں گے وہی رائے اسلام بھی، ایسے عبادت گزاروں کے متعلق قایم کرتا ہے۔

اسلام کا تصور عبادت یہ ہے کہ آپ کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو، آپ اپنے آپ کو دائمی اور ہمہ وقتی ملازم سمجھیں، آپ کی زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو، اس دنیا میں آپ جو کچھ بھی کریں خدا کی شریعت کے مطابق کریں، آپ کا سونا جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، کھانا پینا، غرض کہ سب کچھ خدا کے قانون کی پابندی میں ہو۔ خدا نے جو خدمات آپ کے سپرد کی ہیں، اور زندگی کے جو فرائض آپ سے متعلق کیے ہیں، ان سب کا بار آپ نفس کی پوری رضامندی کے ساتھ اٹھائیں اور ان کو اس طریقے سے ادا کریں جس کی طرف خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے آپ کی رہنمائی کی ہے۔ آپ ہر وقت اور ہر کام میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور سمجھیں کہ آپ کو اپنی ایک ایک حرکت کا حساب دینا ہے۔ اپنے گھر میں بیوی بچوں کے ساتھ، اپنے محلے میں ہمسایوں کے ساتھ، اپنی سوسائٹی میں دوستوں کے ساتھ، اپنے کاروبار میں اہل معاملہ کے ساتھ برتاؤ کرتے وقت ایک ایک بات اور ایک ایک کام میں خدا کی مقرر کردہ حدود کا آپ کو خیال رہے۔

پس دنیا کو چھوڑ کر کونوں اور گوشوں میں جا بیٹھنا اور ریاضت کرنا عبادت نہیں ہے بلکہ دنیا کے دھندوں میں پھنس کر اور دنیوی زندگی کی ساری ذمہ داریوں کو سنبھال کر خدا کے قانون کی پابندی کرنا عبادت ہے۔ ذکر الٰہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض زبان پر اللہ اللہ جاری ہو بلکہ اصل ذکر الٰہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا سے غافل کرنے والی ہیں ان میں آپ پھنسیں اور پھر خدا سے غافل نہ ہوں۔ دنیا کی زندگی میں جہاں قانون الٰہی کو توڑنے کے بے شمار مواقع، بڑے بڑے فائدوں کا لالچ اور بڑے بڑے نقصانوں کا خوف لیے ہوئے سامنے آتے ہیں، وہاں خدا کو یاد رکھیے اور اس کے قانون کی پیروی کرتے رہیے۔ حکومت کی کرسی پر بیٹھیے لیکن یہ ذہن میں رہے کہ میں بندوں کا خدا نہیں، خدا کا بندہ ہوں۔ عدالت کے منصب پر متمکن ہوںیے اور ظلم کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود یہ خیال رکھیے کہ میں خدا کی طرف سے عدل قایم کرنے پر مامور ہوں، زمین کے خزانوں پر قابض و متصرف ہوںیے اور پھر یاد رکھیے کہ میں ان خزانوں کا مالک نہیں ہوں بلکہ امانت دار ہوں اور پائی پائی کا حساب مجھے اصلی مالک کو دینا ہے۔ فوجوں کے کمانڈر بنیے اور خوف خدا آپ کو

Marfat.com

طاقت کے نشے میں مدہوش ہونے سے بچا تا رہے ، سیاست و جہاں بانی کا کٹھن کام ہاتھ میں لیجیے اور پھر سچائی ، انصاف اور حق پسندی کے اصول پر عمل کرکے دکھایئے۔ تجارت ، صنعت و مالیات کی باگیں سنبھالیے اور پھر کامیابی کے ذرائع میں پاک و ناپاک کا امتیاز کرتے ہوئے چلیے - ہر طرف ظلم و دغا اور فریب و بدکاری کے راستے آپ کے لیے کھلے ہوں اور دنیاوی کامیابیاں اور مادی لذات ہر طرف سے دعوت دے رہی ہوں اور پھر خدا کی یاد اور آخرت کی باز پرس کا خوف آپ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دے - حدود اللہ میں سے ایک ایک کے قایم کرنے میں ہزاروں مشکلیں دکھائی دیں ، حق کا دامن تھامنے اور عدل و صداقت پر قایم رہنے میں جان و مال کا زیاں نظر آئے ، خدا کے قانون کی پیروی کرنا زمین و آسمان کو دشمن بنا لینے کا ہم معنی ہو جائے پھر بھی آپ کا ارادہ متزلزل نہ ہو اور آپ کی جبین عزم پر شکن نہ آئے - یہ ہے اصلی عبادت!

اسلام نے روحانی ترقی اور خدا کی یافت کا بھی یہی راستہ بتایا ہے - انسان خدا کو جنگلوں اور پہاڑوں میں یا گوشہ ہائے عزلت میں نہیں پا سکتا - خدا اس کو انسانوں کے درمیان اور دنیوی زندگی کے ہنگاموں میں ملے گا اور اس قدر قریب ملے گا کہ گویا وہ اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا ہے - جس انسان کے سامنے حرام کے فائدے اور ظلم کے مواقع قدم قدم پر آئے اور ہر قدم پر وہ خدا سے ڈر کر ان سے بچتا ہوا چلا ، اسے خدا کی یافت ہوگئی - جس نے گھر میں تفریح کے لمحوں میں اور کاروبار کے ہنگاموں میں ، ہر کام اس احساس کے ساتھ کیا کہ خدا مجھ سے دور نہیں ہے ، اس نے خدا کو ہر لمحہ اپنے قریب سے قریب تر پا لیا - جس نے سیاست اور حکومت اور صلح و جنگ اور مالیات اور صنعت و تجارت جیسے ایمان کی سخت آزمائش کرنے والے کام کیے اور یہاں کامیابی کے شیطانی ذرائع سے بچ کر خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کا پابند رہا ، اس سے بڑھ کر مضبوط اور سچا ایمان اور کس کا ہوسکتا ہے ؟ اس سے زیادہ خدا کی معرفت اور کسے حاصل ہوسکتی ہے ؟ اور اس سے زیادہ خدا کا مقرب اور کون ہوگا ؟

اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کی روحانی قوتوں کے نشو و نما کا راستہ یہی ہے - روحانی ارتقا اس کا نام ہے کہ آپ اپنے نفس کی خواہشات پر قابو پائیں - اپنے ذہن اور جسم کی تمام طاقتوں سے صحیح کام لیں ، اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونے کی کوشش کریں ، دنیوی زندگی میں ، جہاں قدم قدم پر آزمائش کے مواقع پیش آتے ہیں ، اگر آپ حیوانی اور شیطانی طریق کار سے بچتے ہوئے

Marfat.com

چلیں اور پورے شعور اور تمیز سے اس طریقے پر کار بند رہیں جو انسان کے شایان شان ہے تو آپ کی روحانیت روز بروز ترقی کرتی چلی جائے گی اور آپ روز بہ روز خدا سے قریب تر ہوتے چلے جائیں گے۔ حتیٰ کہ وہ آپ کا ہاتھ ہو جائے گا جس سے آپ کام کرتے ہیں، وہ آپ کی آنکھ ہو جائے گا جس سے آپ دیکھتے ہیں اور وہ آپ کے پاؤں ہو جائے گا جس سے آپ راہ چلتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں بندہ اللہ کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اس کی مرضیات کا پابند ہو جاتا ہے۔ وہ رب سے راضی ہو جاتا ہے اور رب اس سے راضی۔ رضی اللہ عنہم و رضواعنہ۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام انسان کی پوری دنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کر دینا چاہتا ہے، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ آدمی کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہ ہو۔ 'لا الہ الا اللہ' کا اقرار کرنے کے ساتھ ہی یہ بات لازم آ جاتی ہے کہ جس اللہ کو آدمی نے اپنا معبود تسلیم کیا ہے اس کا عبد یعنی بندہ بن کر رہے۔ اور بندہ بن کر رہنے کا نام ہی عبادت ہے۔ کہنے کو تو یہ بات بہت چھوٹی سی ہے اور بڑی آسانی سے اسے زبان ہلا کر ادا کیا جا سکتا ہے مگر عملاً انسان کی پوری زندگی کا اپنے تمام گوشوں کے ساتھ عبادت بن جانا آسان کام نہیں؛ اس کے لیے بڑی زبردست تربیت کی ضرورت ہے؛ اس کے لیے ضروری ہے کہ خاص طور پر ذہن کی تربیت کی جائے، مضبوط کردار بنایا جائے، عادات و خصائل کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا جائے اور صرف انفرادی سیرت ہی کی تعمیر پر اکتفا نہ کر لیا جائے بلکہ ایک ایسا اجتماعی نظام قایم کیا جائے جو بڑے پیمانے پر افراد کو اس عبادت کے لیے تیار کرنے والا ہو اور جس میں جماعت کی طاقت فرد کی پشت پناہ، اس کی مددگار، اور اس کی کمزوریوں کی تلافی کرنے والی ہو۔ یہی غرض ہے جس کے لیے اسلام میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کی عبادتیں فرض کی گئی ہیں۔ ان کو عبادات کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ بس عبادات یہی ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اس اصلی عبادت کے لیے انسان کو تیار کرتی ہیں، یا یہ کہ یہ اس کے لیے تربیت کا لازمی نصاب ہیں، انہی سے وہ مخصوص ذہنیت بنتی ہے، اس خاص کردار کی تشکیل ہوتی ہے، منظم عادات و خصائل کا وہ پختہ سانچہ بنتا ہے اور اس اجتماعی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کی زندگی کسی طرح عبادت الہیٰ میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ نیز یہ کہ ان کے ذریعے سے بندہ رب سے قریب تر آتا ہے، اس کی روح کو بالیدگی حاصل ہوتی ہے اور وہ زمین و آسمان کے مالک کا محبوب اور پسندیدہ بندہ بن جاتا ہے،

Marfat.com

ان چار چیزوں کے سوا اور کوئی ذریعہ ایسا نہیں جس سے یہ مقصد حاصل ہو سکے۔ اسی بنا پر ان کو ارکان اسلام قرار دیا گیا ہے، یعنی یہ وہ ستون ہیں جن پر اسلامی زندگی کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

آیے، اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے ایک ایک رکن اسلامی زندگی کی عمارت کو کس طرح قایم کرتا ہے اور کس طرح انسان کو اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

نماز

۱۔ مقصدِ حیات کی یاد دھانی: انسان کی پوری زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنے کے لیے سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذہن میں یہ شعور ہر وقت تازہ رہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے۔ یہ ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانی حواس سے بالاتر ہے لیکن گمراہی کی طاقتیں ہر سمت پھیلی ہوئی ہیں۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان کو بار بار اس بات کی یاد دھانی کی جاتی رہے کہ اسے اپنی زندگی ایک مخصوص انداز سے گذارنی ہے۔ یہ نماز کا سب سے بڑا فائدہ ہے۔ جیسے ہی آپ صبح کو اٹھیں وہ آپ کو یہ بات یاد دلاتی ہے۔ دن کے کام کاج کے ہنگاموں سے دو بار کھینچ کر لاتی ہے اور اسی چیز کو یاد دلاتی ہے۔ شام اور رات کو جب تفریح یا آرام کا وقت ہوتا ہے تو نماز آپ کو آگاہ کرتی ہے کہ تم خدا کے بندے ہو، شیطانی نفس کے بندے نہیں ہو۔ نماز کی اسی خصوصیت کی بنا پر قرآن میں اسے "ذکر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی یاد دھانی کے ہیں۔

۲۔ فرض شناسی: چوں کہ انسان کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ ہر قدم پر خدا کے احکام کو بجا لائے لہذا ضروری ہے کہ اس میں فرض شناسی اور مستعدی پیدا ہو بلکہ اس کی فطرت ثانیہ بن جائے۔ مثال کے طور پر فوج کو دیکھیے، وہاں کن کن طریقوں سے فرائض کو سمجھنے اور ادا کرنے کی مشق کرائی جاتی ہے۔ رات دن میں کئی بار بگل بجایا جاتا ہے، سپاہیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا حکم دیا جاتا ہے، ان سے قواعد کرائی جاتی ہے! آخر کس لیے؟ اس لیے کہ سپاہیوں میں فرض شناسی پیدا ہو اور جو لوگ ان صفات سے محروم ہوں ان کی آزمائش ہو جائے تاکہ ان کی اصلاح کی کوشش ہو یا بالاخر ان کو فوج سے نکال دیا جائے۔

Marfat.com

دنیوی فوج کے لیے کام کا وقت تو کبھی برسوں میں آتا ہے، تب بھی قواعد روزانہ کرائی جاتی ہے، لیکن اسلام کی تیار کردہ فوج تو ہر وقت برسر کار ہے۔ اسے زندگی کے ہر آن شیطانی قوتوں سے لڑنا ہے، فرائض بجا لانے ہیں، حدود اللہ کی حفاظت کرنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی فوج کے لیے زیادہ سخت تنظیم، تربیت اور آزمائش کی ضرورت ہے اور انہی مقاصد کے تحت نماز دن اور رات میں پانچ بار فرض کی گئی ہے تاکہ ایک طرف تو مسلمانوں کی تربیت ہو اور دوسری طرف سچے اور جھوٹے مسلمانوں میں امتیاز ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے کہ

بین العبد وبین الکفر ترك الصلواة بندے اور کفر کے درمیان ترک صلواۃ واسطہ ہے۔

یعنی ترکِ صلواۃ وہ پل ہے جسے پار کرکے آدمی ایمان سے کفر کی طرف جاتا ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت: نماز کا تیسرا اہم کام یہ ہے کہ وہ انسان کی سیرت کو اس خاص ڈھنگ پر تیار کرتی ہے جو اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے۔

دنیا میں ہر جگہ جیسا کام کسی جماعت کو کرنا ہوتا ہے اسی کے لحاظ سے اس کی تربیت کی جاتی ہے۔ مثلاً سول سروس کا مقصد وفاداری کے ساتھ ملک کا انتظام کرنا ہوتا ہے لہذا وہاں سارا زور نظم مملکت کی صلاحیت پیدا کرنے پر دیا جاتا ہے، سپاہیوں کا کام جنگ کرنا ہوتا ہے اس لیے انہیں اسلحے کا استعمال سکھایا جاتا ہے اور اطاعت امیر اور تنظیم کی تربیت دی جاتی ہے۔ اسلام کا مقصد ایک ایسی جماعت کی تیاری ہے جس کا مقصد اولین نیکی کو قایم کرنا اور بدی کو مٹانا ہے اور جسے سیاست، عدالت، تجارت، صنعت، صلح و جنگ غرض یہ کہ ہر شعبۂ زندگی میں خدا کے قوانین کی پابندی کرنی ہے اور انہیں پوری دنیا میں نافذ کرنے کی ذمہ داری سنبھالنی ہے۔ یہ عظیم کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک انسان میں خدا کا خوف، اس کی محبت اور اس کی خوشنودی کی خواہش نہ پیدا ہو اور جب تک آدمی یہ جان نہ لے کہ خدا حاکم اصلی ہے اور ہر انسان اس کے سامنے جواب دہ ہے۔ مسلمان اسلام کے طریقے پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جب تک کہ اسے یقین نہ ہو کہ خدا ہر جگہ ہر حال میں اسے دیکھ رہا ہے، اس کی ہر ہر حرکت سے با خبر ہے، اندھیرے میں بھی اس کو دیکھتا ہے، تنہائی میں بھی اس کے ساتھ ہے اور اس کے دل میں جو نیت چھپی ہوئی ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے۔ یہی یقین انسان کو خدا کے احکام کی

Marfat.com

اطاعت اور اس کے قانون کی پیروی کے لیے تیار کرتا ہے ، اور نماز کا مقصد یہ ہے کہ وہ اسی یقین کو بار بار انسان کے ذہن میں تازہ کرے ۔

نماز کا ارادہ کرنے کے ساتھ ہی روح کی تربیت اور اسلامی سیرت کی تعمیر کا عمل شروع ہو جاتا ہے ۔ اور پھر ایک ایک حرکت ، ایک ایک فعل اور ایک ایک قول جو نماز سے متعلق ہے کچھ اس طور پر رکھا گیا ہے کہ اس سے خود بہ خود انسان کی سیرت اسلام کے سانچے میں ڈھلتی چلی جاتی ہے ۔ اسی وجہ سے قرآن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ

یقیناً نماز بے حیائی اور برائی سے
روکتی ہے ۔ (العنکبوت ۔ ۲۵)

اسی بنا پر نماز قدیم ترین زمانے سے انبیا کی تعلیمات کا جزو رہی ہے ۔ جتنے انبیا خدا کی طرف سے آئے ہیں ان سب کی شریعت میں نماز اولین رکن اسلام تھی ۔ اسلامی تحریک میں جب بھی کبھی زوال آیا نماز کا نظام تربیت ٹوٹ جانے کی وجہ ہی سے آیا کیوں کہ اسلام کے طریقے پر چلنے کے لیے اسلامی سیرت ضروری ہے ، اور اسلامی سیرت نماز کے نظام تربیت ہی سے بنتی ہے اور جب یہ نظام ٹوٹے گا تو سیرتیں بگڑ جائیں گی اور اس کا لازمی نتیجہ زوال و انحطاط ہوگا ۔

۴ ۔ **ضبط نفس** : تعمیر سیرت کے ساتھ نماز انسان میں ضبط نفس کی طاقت بھی پیدا کرتی ہے ۔ نماز میں دعاؤں اور تسبیحوں کے ساتھ اوقات کی پابندی ، طہارت وغیرہ کی شرائط اور جسمانی حرکات کا جوڑ اسی لیے لگایا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس پر پوری طرح قابو یافتہ رہے ، اور اسے اپنے ارادے کے تحت چلانے میں مشاق ہو جائے ۔ صبح کا وقت ہے ، نیند آ رہی ہے ، آرام طلب نفس کہتا ہے پڑے رہو ، اب کہاں اٹھ کر جاؤگے ، نماز کہتی ہے کہ وقت آچکا ہے ، سیدھی طرح اٹھو ، وضو کرو ، جاڑے کا موسم ہے تو ہوا کرے ، پانی گرم نہیں ہے ، نہ سہی ، ٹھنڈا ہی پانی استعمال کرو اور چلو مسجد کی طرف ۔ ان دو مطالبات میں سے اگر کسی نے نفس کے مطالبے کو پورا کر دیا تو اس کا نفس اس سے جیت گیا ورنہ اس نے نفس پر قابو پالیا ۔ اسی طرح ظہر ، عصر ، مغرب ، عشا ہر وقت نفس کسی نہ کسی مشغولیت ، فائدے ، نقصان ، لطف ، لذت ، مشکلات وغیرہ کے

Marfat.com

بہانے ڈھونڈتا ہے لیکن نماز ہر وقت تازیانہ بن کر آجاتی ہے اور آپ کی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو جگاتی ہے۔ اگر آپ نماز کا مطالبہ پورا کرتے رہے تو آپ خواہشات نفس کا زور توڑ دیں گے، ان پر حکمران ہو جائیں گے اور آپ میں یہ طاقت پیدا ہو جائے گی کہ اپنے علم و ارادے کے مطابق انہیں تبدیل کر سکیں۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ نماز چھوڑ کر آدمی خواہشات نفس کا پیرو بن کر گمراہ ہو جاتا ہے:

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور خواہشات نفس کی پیروی اختیار کر لی، لہٰذا عنقریب وہ گمراہی میں مبتلا ہوں گے۔ (مریم - ۵۹)

یہاں تک ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ نماز کے فوائد و منافع کا صرف ایک پہلو ہے، یعنی یہ کہ نماز افراد کو کس طرح تیار کرتی ہے۔ ہم نے دیکھا کہ نماز

(۱) آدمی کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ رکھتی ہے کہ وہ دنیا میں خود مختار نہیں ہے بلکہ اللہ رب العالمین کا بندہ ہے اور اسی حیثیت سے کام کرتا ہے؛

(۲) انسان کو فرض شناس بناتی ہے؛

(۳) فرض شناس اور فرض نا شناس میں تمیز کا ذریعہ بہم پہنچاتی ہے؛

(۴) خیالات کا ایک پورا نظام ترتیب دیتی ہے تاکہ اس کی سیرت پختہ ہو سکے؛

(۵) انسان میں یہ قوت پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے عقیدے اور بصیرت کے مطابق جس طرز عمل کو صحیح سمجھتا ہے اس پر عمل کر سکے؛

اور (۶) بندے کو رب سے قریب لاتی ہے اور اس کے قلب کو پاکیزگی اور روح کو بالیدگی عطا کرتی ہے۔

اجتماعی فوائد: اب ہمیں نماز کے ایک دوسرے پہلو پر نظر ڈالنی چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ انفرادی سیرت تنہا کوئی نتیجہ نہیں پیدا کر سکتی جب تک کہ جماعت میں بھی وہی سیرت موجود نہ ہو۔ آدمی دنیا میں کوئی کام اکیلا نہیں

Marfat.com

کر سکتا ۔ اس کی ساری زندگی اپنے بھائی بندوں ، دوستوں اور ہمسایوں ، معاملہ داروں اور ساتھیوں کے ساتھ ہزاروں قسم کے تعلقات میں جکڑی ہوئی ہے ۔ اب اگر ایک انسان ایسے لوگوں کے درمیان گھرا رہے جو خدا کے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتے ، یا اس کی نافرمانی پر تُلے ہوئے ہیں تو اکیلے آدمی کے لیے اپنی زندگی میں اس قانون کو جاری کرنا دشوار ہو جائے گا ، حالاں کہ مسلمانوں کے ذمے کام نہ صرف یہ ہے کہ اسے اپنی زندگی میں جاری کریں بلکہ پوری دنیا پر غالب و نافذ کریں ۔ اس کام کے لیے آدھ ایک مسلمان کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ سب مسلمان مل کر ایک جتھا بنیں اور پھر اس کام کے لیے کوشش کریں ۔

نماز ہماری اس ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے ۔ وہ اس اجتماعی نظام کا پورا ڈھانچہ بناتی ہے ، اس کو قایم کرتی اور رکھتی ہے ۔ اور اسے روزانہ پانچ مرتبہ حرکت میں لاتی ہے تاکہ وہ ایک مشین کی طرح چلتا رہے ۔ اس لیے پنج وقتہ نماز کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے ، حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی دوڑ جاؤ ۔ جیسے فوجی سپاہی بگل سنتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ کمانڈر نے ہمیں طلب کیا ہے اور اس کی تعمیل کے لیے دوڑتا ہے اسی طرح ہر مسلمان جہاں بھی اذان کی آواز سنے سب کام چھوڑ کر قریب کی مسجد کا رخ کرے ۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ جب کبھی کوئی مہم در پیش آئے تو سارا گروہ ایک منظم جتھے کی صورت میں جمع ہو سکے اور اس کے لیے کام کر سکے ۔

یہ تو محض اذان کا فائدہ تھا ۔ اب آپ مسجد میں جمع ہوتے ہیں ، یہاں ایک دوسرے کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں ۔ اور اس حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں کہ سب ہم مقصد اور ایک ہی راہ کے مسافر ہیں ۔ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے کہ میرا کوئی بھائی پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے ، کوئی پریشان صورت ہے ، کوئی فاقہ زدہ ہے تو آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوگا اور جو لوگ خوش حال ہیں وہ غریبوں کی مدد کر سکیں گے ۔

پھر مسجد میں تمام مسلمان مساوی الحیثیت ہیں ۔ ایک چمار اگر پہلے آیا تو وہ اگلی صف میں ہوگا اور ایک رئیس اگر بعد میں آئے تو پچھلی صفوں میں رہے گا ؛ کوئی بڑے سے بڑا آدمی اللہ کی مسجد میں اپنی نشست محفوظ نہیں کرا سکتا اور نہ کوئی شخص اس بات کا مجاز ہے کہ کسی شخص کو اس کی جگہ سے

Marfat.com

ہٹا دے۔ تمام مسلمان ایک ہی صف میں کھڑے ہوں گے۔ یہاں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا، نہ اونچ نہ نیچ، کسی کے چھو جانے سے کوئی ناپاک نہیں ہوتا اور نہ کسی کے برابر کھڑے ہونے سے کسی کی عزت کو بٹہ لگتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی کے افراد کو یاد دلایا جاتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں تم سب برابر ہو۔ طبقاتی امتیاز یا نسل، قبیلہ، رنگ اور وطن کی عصبیتیں غلط ہیں۔

مسجد میں ہر مسلمان امام بن سکتا ہے۔ البتہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے شریعت میں وہ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ یہ صفات، جن کا ذکر ہم کریں گے، انتہائی معنی خیز ہیں، ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اس چھوٹی سی مسجد کے باہر اس وسیع مسجد میں، جس کا نام زمین ہے، مسلمانوں کا اجتماعی نظام کیسا ہونا چاہیے، انہیں کیسا امام یا لیڈر منتخب کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ کس قسم کا تعلق رکھنا چاہیے۔

ہدایت دی گئی ہے کہ امام ایسے شخص کو منتخب کیا جائے، جو پرہیزگار ہو، نیک سیرت ہو، دین کا علم رکھتا ہو۔ حکم دیا گیا ہے کہ امام ایسے شخص کو نہ بنایا جائے جس سے جماعت کی اکثریت ناراض ہو۔ یوں تو تھوڑے بہت مخالف کس کے نہیں ہوتے لیکن، اگر جماعت میں زیادہ تر آدمی کسی شخص کی اقتدا کرنے سے کراہت کرتے ہوں تو اسے امام نہ بنایا جائے۔ ان ساری ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سردار قوم کے انتخاب میں کن چیزوں کا لحاظ کرنا چاہیے۔

حکم ہے کہ جو شخص امام بنے وہ نماز پڑھانے میں جماعت کے ضعیف لوگوں کا بھی لحاظ رکھے، محض جوان، مضبوط اور فرصت والے آدمیوں کو پیش نظر رکھ کر لمبی لمبی قرأت اور لمبے لمبے رکوع اور سجدے نہ کرنے لگے بلکہ یہ بھی خیال رکھے کہ جماعت میں بوڑھے بھی ہیں، بیمار بھی ہیں اور کمزور اور مشغول آدمی بھی ہیں، جو اپنا کام چھوڑ کر آتے ہیں۔ اس طرح گویا سردار قوم کو تعلیم دی جا رہی ہے کہ جب وہ سردار بنایا جائے تو افراد کے ساتھ اس کا طرز عمل کیسا ہونا چاہیے۔

حکم دیا گیا ہے کہ امام کی سختی سے پیروی کرنی چاہیے۔ اس کی حرکت پہلے حرکت کرنا منع ہے۔ اس طرح قوم کو بتایا جا رہا ہے کہ اسے اپنے

Marfat.com

سردار کی اطاعت کس طرح کرنی چاہیے - البتہ اگر امام غلطی کرے تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ اسے ''سبحان اللہ'' کہہ کر ٹوک دیں - ''سبحان اللہ'' کے معنی ہیں کہ ''اللہ پاک ہے'' مطلب یہ کہ تم سے غلطی ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ، غلطیوں سے مبّرا ذات تو صرف خدا کی ہے - امام کا فرض ہے کہ اپنی غلطی کی اصلاح کرے لیکن اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو مقتدیوں کا فرض ہے کہ اس کی پیروی کرتے رہیں - یہ تو چھوٹی موٹی غلطیوں کی بات ہے ، لیکن اگر غلطی سنگین ہو اور کفر و شرک تک پہنچتی ہو تو جماعت کا فرض ہے کہ فوراً علیحدہ ہو جائے اور اس امام کو ہٹا کر دوسرا امام مقرر کرے - قومی زندگی میں بھی یہی حیثیت ہے - جب تک سردار قوم حدود اللہ میں کام کر رہا ہو اس کی اطاعت واجب ہے لیکن اگر وہ خدا کی حدود کو توڑ دے تو ملت اسلامیہ کا فرض ہے کہ ایسے رہنماؤں اور اکابر کو ان کے عہدوں سے اتار دے اور ان کی جگہ خدا ترس لوگ منتخب کرے -

نماز کے انہی فوائد کی بنا پر اس کو دین میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے - اسے 'عماد الدین' یعنی دین کا ستون کہا گیا ہے - جس نے اسے گرا دیا اس نے دین کی عمارت ڈھادی اور جس نے اس کی حفاظت کی اس نے دین کی عمارت محفوظ رکھی-

* مزید برآں نماز کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگا ہے کہ نماز کو قرآن پاک میں ''ایمان'' تک کہا گیا ہے اور فقہا وائمہ نے فرمایا ہے کہ ترک نماز اور ایمان ساتھ ساتھ جمع نہیں ہو سکتے - نماز روحانی ترقی اور قرب الٰہی کا سب سے موثر ذریعہ ہے - اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی تعریف ہی یہ فرمائی ہے کہ نماز اس طرح پڑھی جائے جیسے آپ خدا کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کہ خدا آپ کو دیکھ رہا ہے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے - حقیقت یہ ہے کہ نماز ایمان بھی ہے اور ایمان کی پہچان بھی ہے ، دل کا نور اور آنکھوں کی ٹھنڈک بھی ہے اور انفرادی اور اجتماعی سیرت کی صورت گر بھی - نماز دین کا وہ ستون ہے جس کے قیام سے دین قایم ہے اور جس کے منہدم ہو جانے سے دین کی عمارت بھی منہدم ہو جاتی ہے -

روزہ

نماز کی طرح روزہ بھی زمانۂ قدیم سے انبیا کی شریعتوں کا لازمی جزو رہا ہے -

* اضافہ از مرتب -

Marfat.com

نماز روز مرہ کا عمومی نظام تربیت ہے اور روزہ سال بھر میں ایک ماہ کا غیر معمولی نظام تربیت ہے جو آدمی کو تقریباً ۷۲۰ گھنٹے تک اپنے مضبوط ڈسپلن کے شکنجے میں کسے رکھتا ہے تاکہ روزانہ کی تربیت سے جو خرابیاں رہ گئی ہوں وہ دور ہو جائیں۔

روزے کا قانون یہ ہے کہ آخر شب طلوع سحر کی پہلی علامات ظاہر ہوتے ہی آدمی پر یکایک کھانا پینا اور مباشرت کرنا حرام ہو جاتا ہے اور غروب آفتاب تک پورے دن حرام رہتا ہے۔ شام آتے ہی حرمت کا بند اچانک ٹوٹ جاتا ہے، جو چیزیں ایک لمحہ پہلے تک حرام تھیں اب حلال ہو جاتی ہیں تا آنکہ دوسرے روز کی مقررہ ساعت آجاتی ہے۔ ماہ رمضان کی پہلی تاریخ سے یہ عمل شروع ہوتا ہے اور ایک مہینہ تک مسلسل اس کی تکرار جاری رہتی ہے، گویا پورے تیس دن انسان ایک شدید ترین ڈسپلن کے تحت رہتا ہے۔

۱۔ احساس بندگی: اس نظام تربیت پر غور کرنے سے جو بات پہلی نظر میں واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام اس طریقے سے انسان کے شعور میں اللہ کی حاکمیت کے اقرار و اعتراف کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور اس شعور کو اتنا مستحکم بنا دیتا ہے کہ احکام الٰہی کے روبرو انسان اپنی آزادی اور خود مختاری سے دست بردار ہو جائے۔ خدا کا وجود محض ایک مابعدالطبیعی عقیدہ نہ رہے بلکہ عملی زندگی میں محسوس و کارفرما ہو جائے۔ کفر اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان خدا کے مقابلے میں اپنے آپ کو خودمختار محسوس کرے اور اس کے مقابلے میں اسلام یہ ہے کہ انسان ہر آن اپنے آپ کو خدا کا بندہ اور محکوم محسوس کرے۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا نماز کا مقصد اس شعور بندگی کی یاد دہانی ہے، اسی طرح رمضان کے روزے سال میں ایک مرتبہ پورے ۷۲۰ گھنٹے پیہم اس شعور کو ذہن پر قایم رکھتے ہیں تاکہ سارے سال انسان کے ذہن پر اس کے اثرات قایم رہیں۔

۲۔ اطاعت امر: احساس بندگی کے ساتھ ساتھ جو چیز لازمی پیدا ہوگی وہ یہ ہے کہ انسان اپنے اپ کو جس خدا کا بندہ سمجھ رہا ہے اس کی اطاعت کرے۔ ان دونوں میں فطری طور پر ایسا ربط ہے کہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اپ جس کی خداوندی کا اعتراف کریں گے لازماً اطاعت بھی اسی کی کریں گے۔ اور احساس بندگی جس درجہ شدید ہوگا اطاعت امر بھی اتنی ہی شدت سے ہوگی۔

Marfat.com

چناں چہ روزے کا مقصد احساس بندگی کی یاد دھانی کے ساتھ ہی ساتھ اطاعت امر کی تربیت دینا بھی ہے۔ روزہ انسان کو مہینہ مہینہ بھر کئی کئی گھنٹے اس حالت میں رکھتا ہے کہ اس کو اپنی ابتدائی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی خداوند عالم سے اذن و اجازت کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اپنی خواہش ہو یا دوسروں کی، انسان بلا اذن خداوندی روزہ نہیں چھوڑ سکتا: اس طرح اس کی اطاعتیں ہر طرف سے سمٹ کر ایک مرکزی اقتدار کی طرف پھر جاتی ہیں۔

روزے میں اگرچہ بہ ظاہر صرف دو خواہشات (غذا اور صنفی خواہش) پر پابندی لگائی گئی ہے لیکن اس کی اصل روح یہ ہے کہ انسان پر بندگی کا احساس پوری طرح طاری رہے۔ اس کے بغیر اگر انسان محض بھوکا پیاسا رہ لے تو یہ روزہ لاش کی طرح بے روح ہوگا۔ نبی صلعم نے فرمایا ہے کہ "جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو خدا کو کوئی حاجت نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔" اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ "کتنے ہی روزہ دار ہیں کہ روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا انہیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" ان دونوں احادیث میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزے کا مقصد بھوکا پیاسا رہنا نہیں بلکہ تقویٰ اور طہارت ہے۔

۳۔ تعمیر سیرت: روزے کا تیسرا مقصد انسان کی سیرت کی تعمیر ہے۔ اس سیرت کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔ تقویٰ سے مراد کوئی خاص شکل و صورت اختیار کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن اس کو بڑے وسیع مضمون میں استعمال کرتا ہے وہ پوری انسانی زندگی کے ایسے رویے کو تقویٰ کے نام سے تعبیر کرتا ہے جس کی بنیاد احساس بندگی اور ذمہ داری پر ہو (اس کے مخالف رویے کا نام قرآن کی رو سے فجور ہے)۔ دنیا کے فساد کا سبب فجور ہے۔ اور دیگر عبادات کی طرح روزے کا مقصد بھی یہ ہے کہ انسان میں فجور کے رجحانات ختم کیے جائیں اور تقویٰ کو نشو و نما دیا جائے۔ اب دیکھیے کہ روزہ کس طریقے سے اس کام کے سر انجام دینے میں مدد دیتا ہے۔

ایک شخص سے کہا جاتا ہے کہ خدا نے تم پر پابندی لگائی ہے کہ صبح سے شام تک کچھ نہ کھاؤ۔ نہ صرف جلوت میں بلکہ خلوت میں بھی اکل و شرب سے پرہیز کرو۔ اب ایسی صورت میں اگر کوئی شخص روزے کی تمام شرائط پوری کرتا ہے تو غور کیجیے کہ اس کے نفس میں کس قسم کی کیفیات ابھرتی ہیں۔

Marfat.com

اول ، تو یہ کہ اسے خدا کے عالم الغیب ہونے کا پورا یقین ہے اور یہی یقین ہے جو اسے تنہائی میں بھی روزے کے حدود کا پابند رکھتا ہے -

دوم ، اس کو آخرت اور حساب و کتاب پر پورا ایمان ہے اس لیے کہ اس کے بغیر کوئی شخص ۱۲ ، ۱۴ گھنٹے بھوکا نہیں رہ سکتا ہے -

سوم ، اس کے اندر اپنے فرض کا احساس ہے - بغیر اس کے کہ کوئی شخص اس پر کھانے پینے کی پابندی لگائے اس نے خود سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی -

چہارم ، مادیت اور روحانیت کے انتخاب میں اس نے روحانیت کو منتخب کرلیا اور دنیا اور آخرت کے درمیان ترجیح کا سوال جب اس کے سامنے آیا تو اس نے آخرت کو ترجیح دی - اس کے اندر اتنی طاقت تھی کہ اخلاقی فائدے کی خاطر مادی نقصان برداشت کرلیا -

پنجم ، وہ اپنے آپ کو اس معاملے میں آزاد نہیں سمجھتا کہ سہولت دیکھ کر مناسب موسم میں روزے رکھ لے بلکہ جو بھی وقت مقرر کیا گیا ہے ، اس نے اس کی پابندی کی ہے -

ششم ، اس میں صبر و استقامت ، تحمل ، یکسوئی اور دنیوی تحریصات کے مقابلے کی طاقت کم از کم اتنی ہے کہ رضائے الٰہی کے بلند نصب العین کی خاطر وہ ایک ایسا کام کرتا ہے جس کا نتیجہ مرنے کے بعد دوسری زندگی پر ملتوی کردیا گیا ہے -

یہ کیفیات ، جو روزہ رکھنے کے ساتھ انسان کی زندگی میں ابھرتی ہیں ، روزوں میں عملاً ایک طاقت بن جاتی ہیں اور ہر سال ایک ماہ روزہ رکھتے رکھتے یہ انسان کی فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں -

۴ - **ضبط نفس :** اس تربیت کے ضابطے میں کسنے کے لیے دو خواہشوں کو خاص طور پر منتخب کیا گیا ہے - یعنی بھوک اور جنسی خواہش — اور ان کے ساتھ تیسری خواہش ، آرام کرنے کی خواہش ، بھی زد میں آ جاتی ہے اس لیے کہ تراویح پڑھنے اور سحری کے لیے اٹھنے سے اس پر بھی کافی ضرب پڑتی ہے -

Marfat.com

بقائے نفس کے لیے غذا اور آرام اور بقائے نسل کے لیے توالد و تناسل حیوانی زندگی کے مطالبات میں اصل و بنیاد کا حکم رکھتے ھیں ۔ انسان کے حیوانی جسم کے اھم ترین مطالبات یہی ھیں ۔ اور چوں کہ وہ ذرا اونچے قسم کا حیوان ھے لہذا وہ صرف غذا ھی نہیں مانگتا بلکہ اونچی قسم کی اور نت نئی غذائیں تلاش کرتا ھے ۔ یہی حال دیگر خواھشات کا ھے کہ ان میں بھی انسان کا مطالبہ محض جسمانی تسکین نہیں رہ جاتا ، ھزاروں نزاکتیں اور باریکیاں نکل آتی ھیں ۔ اب اگر انسان کا مطمح نظر یہ بن جائے کہ کسی طرح ان خواھشات کی تسکین کرتا رہے تو یہ خواھشات نفس انسانی پر سوار ھو جاتی ھیں ۔ اس کے برخلاف اگر انسان ارادے کی باگیں مضبوطی سے تھامے رھے تو ان خواھشات کو اپنے پیچھے اور مرضی کے مطابق چلا سکتا ھے ۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک اھم مقصد انسان کو اس کے حیوانی جسم پر اقتدار بخشنا ھے ۔ مذکورہ بالا تین خواھشات ، جو انسان کی تمام حیوانی خواھشات میں سب سے زیادہ اھم ھیں ، روزہ ان تینوں کو گرفت میں لے لیتا ھے اور ان کے منہ میں مضبوط لگام دے کر راسیں ھمارے ھاتھ میں دے دیتا ھے ۔ تیس دن کی مسلسل مشق کا مقصد یہ ھے کہ بجائے اس کے کہ ھمارا نفس ھم پر غلبہ حاصل کرلے ھم اپنے خادم پر پورا اقتدار حاصل کرلیں، جس خواھش کو چاھیں روک دیں اور اپنی جس قوت سے جس طرح چاھیں کام لے سکیں اس لیے کہ وہ شخص جسے اپنی خواھشات کا مقابلہ کرنے کی کبھی عادت نہ رھی ھو اور جو نفس کے ھر مطالبے پر بے چون و چرا سر جھکا دینے کا خوگر رھا ھو اور جس کے لیے حیوانی جبلت کا داعیہ ایک فرمان واجب الاذعان کا حکم رکھتا ھو ، دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا ۔

یہاں روزے اور غیر اسلامی نفس کشی کی مشقوں کا اصولی فرق ذھن میں رکھنا چاھیے ۔ اس لیے کہ یہ دوسری قسم کا اقتدار تو دراصل ایسی جاھل ، مطلق العنان خودی کا استبداد ھے جو اپنے سے بالاتر کسی حاکم کی مطیع اور کسی ضابطہ و قانون کی پابند نہیں ھے ۔ اس اقتدار کے لیے انسان خود اپنی فطرت سے لڑتا ھے اور جسم اور نفس سے ان کے جائز حقوق چھینتا ھے ۔ اس کے برخلاف اسلامی روزہ جس خودی کو نفس اور جسم پر اقتدار دیتا ھے وہ مطلق العنان خودی نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کی اطاعت کرنے والی خودی ھے ۔ ایسی خودی جو خدا کی طرف سے آئی ھوئی ھدایت ، علم اور کتاب منیر کی رھنمائی میں چلنے والی ھے ، وہ خدا کے دیے ھوئے نفس و جسم کو اپنی ملکیت نہیں سمجھتی بلکہ اسے خدا کی امانت مان کر اس پر خدا کی منشا کے مطابق حکومت کرتی ھے ۔

Marfat.com

ایسی خودی کا حامل اپنے جسم پر ظلم نہیں کرتا بلکہ اس کو تمام جائز راحتیں بہم پہنچاتا ہے لیکن وہ اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ حدود اللہ کو توڑ ڈالے -

اجتماعی اثرات : یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ افراد کی تربیت سے متعلق تھا - ہم نے دیکھا کہ

اول ، اس تربیت کے ذریعے سے جماعت کے ہر فرد کو خداوند عالم کی حاکمیت کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے -

دوم ، ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب و الشہادۃ ہونے اور آخرت کی باز پرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعے اس طرح جاگزیں کردیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر (نہ کہ خارجی دباؤ کی وجہ سے) قانون الہیٰ کی اطاعت کرنے لگے -

سوم ، ہر فرد میں روح پھونک دی جائے کہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے خالص ہو جائے -

چہارم ، ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طرح کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر مکمل اقتدار حاصل ہو جائے اور اس میں صبر و تحمل ، جفاکشی ، توکل علی اللہ ، ثابت قدمی و یکسوئی کی صفات پیدا ہو جائیں اور اس کے کردار میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور میلانات نفس کا مقابلہ کر سکے -

یہی وجہ ہے کہ روزے ہر عاقل و بالغ فرد پر فرض کیے گئے ہیں - اگرچہ ضروری نہیں کہ تمام افراد میں مندرجہ بالا خصوصیات بدرجہ اتم پیدا ہو جائیں جو اس سے پیدا کرنی مطلوب ہیں - اس لیے کہ خارجی عوامل کے علاوہ ذاتی استعداد اور خواہش بھی ضروری ہے ، لیکن خارجی طور پر اس سے بہتر نظام تربیت دنیا میں ممکن نہیں ہے -

اجتماعی فوائد : اگرچہ روزہ انفرادی فعل ہے لیکن نماز کے با جماعت ہونے کی وجہ سے جس طرح نماز اجتماعی فعل بن جاتی ہے اسی طرح روزہ رکھنے کے لیے ایک خاص مہینے کے تقرر نے اس فعل کو ایک اجتماعی عمل بنا دیا ہے -

Marfat.com

اس حکیمانہ تدبیر سے روزے کے اخلاقی و روحانی منافع میں جو اضافہ ہوا ہے اس کی طرف یہاں چند مختصر اشارات کیے جاتے ہیں:

تقویٰ اور پاکیزگی کی فضا: اس عمل کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے - ایک شخص انفرادی طور پر کسی ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو اور اس کے گرد و پیش دوسرے لوگوں میں وہ ذہنی کیفیت نہ ہو تو وہ اس ماحول میں اجنبی بن کر رہ جائے گا - اور ماحول نہ صرف یہ کہ اس کے بڑھانے میں کوئی مدد نہ دے گا بلکہ اس کی کیفیات کو گھٹا دے گا - لیکن ، اگر پورے ماحول پر وہی فضا طاری ہو اور تمام لوگ ایک ہی خیال اور ایک ہی ذہنیت کے ماتحت ایک ہی عمل کر رہے ہوں تو معاملہ برعکس ہوگا - اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر وہی ایک کیفیت چھائی ہوئی ہوگی اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی خارجی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی چلی جائے گی - ایک ایک سپاہی کا الگ الگ جنگ کرنا اور مہالک جنگ کا برداشت کرنا کس قدر مشکل ہے ؟ لیکن جہاں فوج کی فوج ایک ساتھ مارچ کر رہی ہو وہاں جذبات شہادت و حماست کا ایک طوفان امنڈ آتا ہے جس میں ہر سپاہی مستانہ وار بہتا چلا جاتا ہے -

روزے کے لیے رمضان کا مہینہ مقرر کرکے شارع نے یہی کام لیا ہے - جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ ہر غلہ اپنا موسم آنے پر خوب پھلتا پھولتا ہے اسی طرح رمضان کا مہینہ گویا خیر و صلاح اور تقویٰ و طہارت کا موسم ہے جس میں برائیاں دبتی اور نیکیاں پھلتی پھولتی ہیں - اسی لیے احادیث میں آیا ہے کہ جب رمضان آتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور جہنم کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں -

جماعتی احساس: اجتماعی عمل کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے لوگوں میں فطری اور اصلی وحدت پیدا ہوتی ہے - نسل یا زبان کا اشتراک فطری قومیت پیدا نہیں کرتی - آدمی کا دل صرف اسی سے ملتا ہے جو خیالات اور عمل میں اس سے ملتا ہے - یہی وہ اصلی رشتہ ہے جو دو آدمیوں کو ایک دوسرے سے باندھتا ہے - جب کوئی شخص اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو ذہنیت اور عمل

Marfat.com

میں اپنے سے مختلف پاتا ہے تو صریح طور پر اپنے آپ کو ان کے درمیان اجنبی محسوس کرتا ہے۔ مگر جب بہت سے لوگ مل کر ایک ہی ذہنی عمل کے ساتھ ایک ہی عمل کرتے ہیں تو ان میں باہمی یگانگت، رفاقت، یک جہتی اور برادری کے گہرے تعلقات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نیکی ہو یا بدی دونوں صورتوں میں اجتماعی نفسیات اسی طرح کام کرتی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ بدی کے راستے میں افراد کی نفسیات کا دخل رہتا ہے جس کا فطری میلان فرد فرد کو پھاڑ کر الگ کر دینے کی طرف ہے۔ اس بنا پر برادری مستحکم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف نیکی کے راستے میں نفسانیت دبتی ہے اور نیک خیالات و افعال کا اشتراک بہترین رشتۂ اخوت پیدا کر دیتا ہے۔

امداد باہمی کی روح: اس اجتماعی عبادت کا تیسرا زبردست کام یہ ہے کہ یہ عارضی طور پر تمام لوگوں کو ایک سطح پر لے آتی ہے، اگرچہ امیر امیر ہی رہتا ہے اور غریب غریب، لیکن روزہ چند گھنٹوں کے لیے امیر پر بھی وہی کیفیت طاری کر دیتا ہے جو اس کے فاقہ کش بھائی پر گذرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس کی مصیبت حقیقی طور پر محسوس کرتا ہے۔ اور خدا کی رضا کا جذبہ اسے غریب بھائیوں کی مدد پر اکساتا ہے۔ جس قوم کے امیروں میں غریبوں کی تکلیف کا احساس اور ان کی عملی ہمدردی کا جذبہ ہو اور جہاں صرف اداروں ہی کو خیرات نہ دی جاتی ہو بلکہ فرداً فرداً بھی حاجت مندوں کو تلاش کر کے مدد پہنچائی جاتی ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ قوم کے کمزور حصے تباہ ہونے سے بچ جاتے ہیں اور اجتماعی فلاح برقرار رہتی ہے بلکہ غربت اور امارت میں حسد و نفرت کے بجائے محبت اور شکر گزاری کے تعلقات استوار ہوتے ہیں اور وہ طبقاتی کشمکش کبھی رونما نہیں ہو سکتی جو ان قوموں میں برپا ہوتی ہے جن کے مالدار لوگ جانتے ہی نہیں کہ فقر و فاقہ کیا چیز ہوتی ہے اور جو قحط کے زمانے میں تعجب سے پوچھتے ہیں کہ لوگ بھوکے کیوں مر رہے ہیں — انہیں روٹی نہیں ملتی تو وہ کیک کیوں نہیں کھاتے؟

زکواۃ

* زکواۃ کے بارے میں قرآن و سنت میں جو کچھ کہا گیا ہے اس پر نظر ڈالیے تو محسوس ہوتا ہے کہ عبادات میں اس کا مقام نماز سے بس ایک ہی درجہ

• یہ حصہ مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی کی کتاب "اسلام ایک نظر میں" سے ماخوذ ہے۔ چند اقتباسات خطبات میں سے بھی لیے گئے ہیں۔ (مرتب)

Marfat.com

نیچے ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں ایمان کے بعد جہاں اعمال صالحہ کا ذکر آتا ہے بالعموم صرف دو اعمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ایک نماز کا اور دوسرے زکواۃ کا۔ یعنی ایک معیاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو عموماً اس طرح کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ

بلا شبہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے صالح اعمال کیے، اور نماز قایم کی اور زکواۃ دی، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔
(البقرۃ۔ ۲۷۷)

حالاں کہ نماز اور زکواۃ کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سے ایسے اچھے اعمال و اخلاق ہیں جن کا وجود معیاری مومن و مسلم بننے کے لیے ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن محض دو کا نام لے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے؟

اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز اور زکواۃ دین میں اتنا اہم مقام رکھتی ہیں کہ جس نے ان دونوں کو اچھی طرح ادا کر لیا اس نے گویا پورے دین پر عمل کرنے کی پکی ضمانت اور عملی شہادت فراہم کر دی۔ وہ اس طرح کہ احکام دین کی اصولی تقسیم دو ہی طرح ہو سکتی ہے۔ ایک قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے اور دوسری قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ نماز حقوق اللہ کا مغز ہے اور زکواۃ حقوق العباد کا جس طرح اگر ایک شخص واقعی نماز کا حق ادا کردے تو ممکن ہی نہیں کہ وہ مسجد سے باہر آکر خدا کو بھول جائے اسی طرح اگر ایک شخص زکواۃ کا حق ادا کر دے تو یہ ممکن نہیں کہ بندگان خدا کے حقوق پائمال کرتا رہے۔

زکواۃ کی اس اہمیت کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ قرآن اس حقیقت کی بار بار تلقین کرتا ہے کہ دین و ایمان میں زندگی اسی وقت آ سکتی ہے جب اللہ کی محبت ہر دوسری محبت پر غالب، اور آخرت کی طلب ہر دوسری طلب پر مقدم ہو۔ نماز اور زکواۃ انسان کو ایسا ہی خدا پرست اور آخرت پسند بنانے کی سب سے زیادہ موثر تدبیریں ہیں۔ ایک ایجابی طور پر اور دوسری سلبی طور پر۔ نماز انسان کو خدا اور آخرت کی طرف لے جاتی ہے اور زکواۃ اسے دنیا کی طرف لڑھک جانے سے محفوظ رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کی کامیابی کا راستہ اگر کڑی چڑھائی کا راستہ ہے تو یہ دونوں چیزیں اس راستے پر سفر کرنے والے انسانی عمل

Marfat.com

کی گاڑی کے دو انجن ہیں ۔ نماز کا انجن اسے آگے سے کھینچتا ہے اور زکواۃ کا انجن اسے پیچھے سے دھکیلتا ہے اور اس طرح گاڑی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے ۔

مقاصدِ زکواۃ

زکواۃ کے مقاصد کے بارے میں کتاب و سنت میں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس کا جائزہ لیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکواۃ کے تین اہم فوائد یا مقاصد ہیں ۔

تزکیۂ نفس : زکواۃ کا حقیقی اور بنیادی مقصد جس کا تعلق بالکلیہ شخص کی اپنی ذات سے ہوتا ہے ، یہ ہے کہ زکواۃ دینے والے کا دل دنیا کی حرص سے پاک ہو کر نیکی اور تقویٰ کے کاموں کے لیے تیار ہو جائے ۔ قرآن میں ہے :

وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى ۝ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى ۝

اس شخص کو جہنم سے دور رکھا
جائے گا جو خدا سے ڈرنے والا ہو
اور جو اپنے تزکیہ کی خاطر دولت
دوسروں کو دیتا ہو ۔ (اللیل ۱۸-۱۷)

گویا صدقہ اور زکواۃ کی اصل غایت دل کی پاکی اور نفس کا تزکیہ ہے ۔ ہر شخص جانتا ہے کہ دنیا کی محبت ہی وہ چیز ہے جو خدا پرستی کی اصل دشمن ہے اور جو انسان کو خدا اور آخرت سے بیگانہ بنا کر رکھ دیتی ہے ۔ حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا بھی ہے کہ ”دنیا کی محبت تمام برائیوں کی جڑ ہے ۔“ دنیا کی محبت مختلف شکلوں میں آ سکتی ہے لیکن اس کی سب سے معروف اور خطرناک شکل دولت کی محبت ہے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اسی کو امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ بتایا تھا ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قول ہے ” میری امت کا (سب سے بڑا) فتنہ مال ہے ۔“ اگر آدمی اپنے آپ کو اس فتنے کی گرفت سے بچالے تو اور بہت سی برائیوں سے بچ سکتا ہے ۔ اور اچھائیاں نشو و نما پاسکتی ہیں ۔ خود زکواۃ کے لفظی معنی بھی پاکیزگی اور نمو کے ہیں ، گویا اس طرح نفس میں پاکیزگی آتی ہے اور صفات حسنہ کی قوت نمو میں اضافہ ہوتا ہے ۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ زکواۃ کا بنیادی مقصد محض اس بات سے حاصل نہیں ہوتا کہ اپنی دولت کا ایک حصہ نکال کر کسی غریب کو دے دیا جائے بلکہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب اس عمل کے پیچھے سچی نیت اور عملی اہتمام ہو ۔ مقصود

Marfat.com

صرف خدا کی رضا کا حصول ہو ، نام و نمود کی خواہش یا کسی پر احسان دھرنے کا جذبہ کار فرما نہ ہو ، لینے والے کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچائی جائے ، زکواۃ پاک کمائی سے ادا کی جائے اور زکواۃ کے لیے جو چیزیں دی جائیں وہ عمدہ قسم کی ہوں ؛ جس طرح نماز کا ظاہری پہلو اس کے ارکان ہیں لیکن اصل چیز توجہ الی اللہ ہے اسی طرح زکواۃ کا ظاہری پہلو ادائیگی نقد و جنس ہے لیکن اس کا باطن دنیا کے مقابلے میں آخرت کو فوقیت دینا ہے ۔ اور باطن کے تقاضے اسی وقت پورے ہو سکتے ہیں جب اوپر کی شرائط کا خیال رکھا جائے ۔

امداد باہمی : زکواۃ کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملت کے نادار افراد کی مدد کی جائے تاکہ ان کی بنیادی ضروریات پوری ہوتی رہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

ان اللہ افترض علیھم صدقہ توخذ من اغنیا ئھم فترد الی فقراء ھم ۔

اللہ نے ان پر زکواۃ فرض کی ہے کہ ان کے امرا سے لی جائے اور غربا میں تقسیم کر دی جائے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکواۃ کا ایک خالص اجتماعی اور معاشی پہلو بھی ہے اور اس کے بغیر زکواۃ کا اسلامی پہلو مکمل نہیں ہوتا ۔ ایک شخص نے پوری للہیت کے ساتھ اپنی دولت کا حصہ نکالا تو بلا شبہہ اس نے اپنے دل کی پاکی اور اپنے نفس کے تزکیے کا اہتمام کرلیا ۔ مگر اس کا یہ فعل شریعت کے نزدیک ابھی ادائے زکواۃ نہیں بنا ـــ یہ ادائے زکواۃ اس وقت بنے گا جب وہ اپنی نکالی ہوئی دولت کو حق داروں کے حوالے کردے گا ۔ یعنی دل کی پاکی اور نفس کے تزکیے کا زکواۃ کی بنیادی غرض و غایت ہونا مسلم ، لیکن اس مال و زکراۃ کا غریبوں کی حاجت روائی کا ذریعہ بننا بھی اپنی جگہ بالکل ضروری ہے اور اس کے بغیر زکواۃ کا شرعی فریضہ ادا نہیں ہوتا ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے زکواۃ کو کھاتے پیتے افراد کی دولت میں غریبوں کا حصہ کہا ہے ـــ اور یہ حق ایسا ہے جس کی خاطر اسلامی حکومت تلوار بھی اٹھا سکتی ہے ۔ ذہن میں اس بات کی جو اہمیت ہے اس کا پورا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے کہ ”وہ شخص مومن نہیں جو خود تو سیر ہو کر کھالے اور اس کے پہلو میں اس کا پڑوسی بھوکا رہے ۔“ اسی طرح ایک طویل حدیث میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایک انسان سے کہے گا کہ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا ۔ بندہ جواب دے گا کہ خدا یا میں تجھے کیسے کھلا سکتا ہوں ،

Marfat.com

تو تو اس سارے جہان کا پالنہار ہے ۔ ارشاد ہوگا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے اسے کھلانے سے انکار کر دیا تھا ۔

جو دین ایک حاجت مند کی بھوک پیاس کو خود اللہ تعالیٰ کی بھوک پیاس سے تعبیر کرتا ہو ، اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کے یہاں غریبوں اور ناداروں کی حاجت برآری کی کیا اہمیت ہوگی ۔

دین کی نصرت : زکواۃ کا ایک اور مقصد دین کی حفاظت اور نصرت ہے ۔ قرآن میں اہل ایمان سے جگہ جگہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو ۔ جہاں اہل ایمان کی بنیادی صفات بیان کی جاتی ہیں ان میں اللہ کی راہ میں اپنے مال سے جہاد کرنے کی بات لازماً موجود ہوتی ہے ۔ اس کا مفہوم بالکل واضح ہے ۔ اور وہ یہ کہ دین کی خاطر جہاد کرنے کے لیے جن مصارف کی بھی ضرورت پڑے انہیں اپنے پاس سے مہیا کرو ۔

دین کی حفاظت و نصرت معمولی کام نہیں ، اس لیے اس کی خاطر اپنی دولت خرچ کرنا بھی معمولی کام نہیں ۔ قرآن حکیم نے ایک جگہ جہاد کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور ہاتھ روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو ۔ (البقرۃ ـ ۱۹۵)

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دین کی حفاظت و نصرت کے لیے مالی انفاق سے جی چرانا ہلاکت کو مول لینا ہے ۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی ۔

زکواۃ کی مقدار

زکواۃ کی قانونی اور لازمی مقدار مختصراً حسب ذیل ہے :

(۱) زرعی پیداوار پر — اگر آب پاشی کی ضرورت پیش آئی ہو تو پانچ فیصدی ۔ نہ آئی ہو تو دس فیصدی ؛

(۲) جمع شدہ رقموں ، زیوروں اور تجارتی مالوں پر ڈھائی فیصدی ؛

(۳) جنگل کی چرائی پر پلنے والے جانوروں پر ڈیڑھ سے ڈھائی فیصدی تک

(۴) معدنیات اور دفینوں میں سے بیس فیصدی تک ؛

Marfat.com

اتنی زکواۃ کا ادا کرنا تو ہر مالدار مسلمان پر فرض ہے ۔ یعنی قانونی طور پر ضروری ہے ۔ لیکن اسلام کی تلقین یہ ہے کہ اس قانونی حد پر نہ رکا جائے بلکہ اس سے آگے بڑھنے کی رضا کارانہ کوشش جاری رکھی جائے۔ جس قدر مال قانونی طور پر متعین کر دیا گیا ہے اس کی ادائیگی کو زکواۃ کہتے ہیں ، اس کے آگے رضاکارانہ طور پر جو کچھ خرچ کیا جائے اسے صدقہ یا انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں ۔

زکواۃ کے مصارف

زکواۃ کے مصارف اللہ تعالیٰ نے قرآن میں متعین کر دیے ہیں :

> زکواۃ فقرا اور مساکین اور زکواۃ کے صیغے میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لیے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور (غلامی سے) گردن چھڑانے میں ، قرض ادا کرنے میں ، اور خدا کی راہ میں اور مسافر پر خرچ کرنے کے لیے مقرر کی گئی ہے ۔

اس طرح قرآن نے متعین کر دیا کہ زکواۃ کے حق دار آٹھ ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

(۱) فقرا : یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس کچھ مال تو ہو مگر ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو ، تنگ دستی میں گزر بسر کرتے ہوں اور کسی سے مانگتے نہ ہوں ۔

(۲) مساکین : یہ بہت ہی تباہ حال لوگ ہیں جن کے پاس اپنے تن کی ضروریات پوری کرنے کے لیے بھی کچھ نہ ہو۔ بعض صحابہ ایسے لوگوں کو بھی مساکین کے زمرے میں رکھتے تھے جو کمانے کی طاقت رکھتے ہوں مگر جنہیں روزگار نہ ملتا ہو ۔

(۳) صیغۂ زکواۃ کے کارکن : ان سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں حکومت زکواۃ وصول کرنے کے لیے مقرر کرے ، ان کو زکواۃ ہی کی مد سے تنخواہ دی جائے گی ۔

(۴) مؤلفۃ القلوب : ان سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اسلام کی حمایت کے لیے یا اسلام کی مخالفت سے روکنے کے لیے روپیہ دینے کی ضرورت پیش آئے ۔ اگر کوئی نو مسلم اپنی قوم کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے بے روزگار ہو گیا ہو تو اس کی مدد کرنا مسلمانوں پر فرض ہے ۔

Marfat.com

(۵) غلامی سے رہائی دلانے کے لیے : اگر کوئی شخص غلامی کے بند سے نکلنا چاہتا ہو تو اسے زکواۃ دی جائے تاکہ اپنے مالک کو روپیہ دے کر اپنی گردن چھڑا لے ۔ آج کل کے زمانے میں غلامی کا رواج نہیں ہے اس لیے جو لوگ جرمانہ ادا نہ کر سکنے کی وجہ سے قید بھگت رہے ہوں ان کو زکواۃ دے کر رہائی حاصل کرنے میں مدد دی جا سکتی ہے ۔

(۶) قرض دار : جس شخص پر اتنا قرض ہو کہ اسے ادا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب سے کم مال بچتا ہو اسے زکواۃ دی جا سکتی ہے ۔

(۷) فی سبیل اللہ ۔ یہ لفظ تمام نیک کاموں پر استعمال ہوتا ہے لیکن اس سے خصوصی طور پر مراد دین حق کا علم بلند کرنے کی جدوجہد میں مالی اعانت کرنا ہے ۔

(۸) مسافر : اگرچہ مسافر کے پاس اس کے وطن میں کتنا ہی مال کیوں نہ ہو لیکن حالت مسافرت میں اگر وہ محتاج ہوگیا ہے تو اسے زکواۃ دینی چاہیے ۔

زکواۃ معاشی نقطہ نظر سے

* اسلام دین اور دنیا کے امتزاج کا داعی ہے ۔ اس لیے اس کی عبادات بھی اخلاقی فوز و فلاح کے ساتھ دنیوی زندگی کی اصلاح اور اس کی صحیح خطوط پر تعمیر کی بھی ضامن ہیں ۔ زکواۃ جہاں جب مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہیں معاشی نقطہ نظر سے یہ سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے جس کے ذریعہ ملک و ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے ۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اسی کے لیے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اسے فنا ہوجانا چاہیے ۔ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے ۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے ۔ وہ کہتا ہے : جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں ۔ نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے پر تمہارا معاون و مددگار ہے ۔ اس لیے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ

* یہ حصہ مرتب کا اضافہ کردہ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

دوسروں کا بھی حق ہے - اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں - جو معاشرہ کمزوروں کی مدد نہ کرے، ناداروں کو سہارا نہ دے، اور گرتوں کو تھام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں - اسلام نظام زکواۃ کے ذریعے سے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اس میں امداد باھمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے -

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے - لیکن اسلام نے پہلے ھی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکواۃ کی شکل میں امداد باھمی کا ایک ایسا نظام قایم کیا جس کے ذریعے سے تمام شہریوں کی بنیادی ضروریات کی ضمانت دی گئی - اسلامی حکومت نے ابتدا سے ھی اس نظام کو عملاً قایم کیا، آبادی کی مردم شماری کی، ناداروں کے رجسٹر بنائے، ھر ضرورت مند کو سرکاری وظیفے دیئے اور تھوڑے ھی عرصے میں یہ حال ھوگیا کہ بہ قول مورخ طبری زکواۃ دینے والے تو ھر طرف تھے مگر زکواۃ لینے والے نہ ملتے تھے -

پھر زکواۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے - اس ذریعے سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ھوتی ہے اور اس طرح تقسیم دولت صحت مند بنیادوں پر واقع ھوتی ہے -

معیشت کا ایک اور بنیادی مسئلہ دولت کی ذخیرہ اندوزی کو روکنا اور سرمایہ کاری کو بڑھانا رہا ہے - آج کی دنیا میں جہاں جہاں معاشی پس ماندگی ہے اس کا بڑا سبب دولت کی غلط تقسیم اور صحیح سرمایہ کاری کا فقدان ھی ہے - زکواۃ کا ایک معاشی وظیفہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے سے دولت آپ سے آپ سرمایہ کاری کی طرف منتقل ھوتی ہے اس لیے کہ اگر اسے ذخیرہ کیا جائے تو ۴۰ سال میں وہ آپ سے آپ ختم ھو جائے گی - اس لیے اس کا فطری تقاضا یہ ھوتا ہے کہ دولت کو روک رکھنے کے بجائے کاروبار میں لگایا جاتا ہے اور اس سے معاشی ترقی رونما ھوتی ہے -

پھر معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکواۃ بڑی مفید و معاون ھوسکتی ہے - تجارتی چکر سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ھوتا ہے لیکن زکواۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز تر کرتی ہے وھیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ

Marfat.com

بنی کرتی ہے ۔ اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قایم کرنے کا ایک خود کار آلہ[1] بن جاتی ہے ۔

زکواۃ ایک انقلابی معاشی تصور ہے اور یہ حقیقت بڑی افسوس ناک ہے کہ خود مسلمانوں نے ابھی تک اس کے ہمہ جہتی معاشی پہلوؤں کا مطالعہ نہیں کیا ہے ۔ اگر اس کے معاشی فوائد پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ زکواۃ پورے نظام معاشی کی قلب ماہیت کر دیتی ہے ۔ اسے صحت مند اور انسانی بنیادوں پر قایم کرتی ہے اور ایک ایسا نظام قایم کرتی ہے جس میں جد و جہد کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوں اور زندگی کی نعمتیں تمام انسانوں کے لیے عام ہوں ۔

حج

• حج کے لغوی معنیٰ زیارت کا ارادہ کرنے کے ہیں ۔ شریعت کی زبان میں حج کی عبادت کو حج اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں انسان کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتا ہے ۔ حج ہر بالغ اور صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں ایک بار فرض کیا گیا ہے ۔ جو شخص حج کی قدرت رکھنے کے باوجود حج نہیں کرتا وہ اپنے مسلمان ہونے کو جھٹلاتا ہے :

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝

لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو بھی استطاعت رکھتا ہو اس کے گھر کا حج کرے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی (اسے جان لینا چاہیے کہ) اللہ سارے اہل جہان سے بے نیاز ہے (آل عمران ۔ ۹۷)

اسی طرح ایک حدیث میں آیا ہے کہ '' جس شخص کو کسی بیماری یا واقعی ضرورت یا ظالم حکم ران نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو چاہے وہ یہودی مرے چاہے نصرانی ۔''

حج کی اس اہمیت کے پیش نظر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ آخر کعبہ کیا چیز ہے جس کی زیارت کی اتنی اہمیت ہے ، اور جو مراسم حج میں ادا کیے جاتے ہیں ان کے پیچھے کون سے تصورات کام کر رہے ہیں ؟

---

۱ *Automatic stabilizer of the economy.*

• یہ حصہ مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب '' اسلام ایک نظر میں '' سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

کعبے کی اہمیت: کعبے کی تعمیر آج سے تقریباً ساڑھے چار ہزار برس پہلے حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اس کی تعمیر کا حکم اور جگہ کا تعین دونوں خدا کی طرف سے تھے۔ یہ دنیا میں پہلا گھر ہے جو خدا کی عبادت کے مرکز کی حیثیت سے بنایا گیا۔ اس گھر کی اہمیت سے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى

اور جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کے لیے مرجع اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔ (البقرۃ - ۱۲۵)

جس وقت اس گھر کی تعمیر شروع ہوئی اس وقت اس کے مقدس معماروں نے خدا کے حضور میں دعا کی تھی کہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

خدایا، ہمارے عمل کو قبول فرما، یقیناً تو سب کچھ سنتا اور جانتا ہے، مالک، ہمیں اپنا سچا فرماں بردار بنا دے اور ہماری اولاد میں سے ایک ایسا گروہ پیدا کر دے جو تیرا فرماں بردار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتلا اور ہم پر کرم کی نظر رکھ، بیشک تو نظر کرم فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ (البقرۃ - ۲۲۷ - ۲۲۸)

اس دعا سے معلوم ہوا کہ جس مقصد کی خاطر اس عمارت کی تعمیر عمل میں آئی ہے اس کی تکمیل ایک ایسے گروہ کے ذریعے سے ہوگی جو انہیں بزرگوں کی یا دوسرے الفاظ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوگا۔ چناں چہ جب کعبے کی تعمیر مکمل ہوگئی تو حضرت اسماعیل علیہ السلام یہیں بس گئے۔ انہیں کی اولاد میں سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے ہاتھوں حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی دعا پوری ہوئی۔ کعبے کی اسی اہمیت کے پیش نظر سے مسلمانوں کا قبلہ، یعنی مرکز، قرار دیا گیا کہ تمام مسلمان اس طرف رخ کرکے نماز پڑھا کریں۔

حج کے مراسم: اب ذرا ان مراسم پر ایک نظر ڈالیے جو حج میں ادا کیے جاتے ہیں۔ جب کوئی شخص حج کے لیے روانہ ہوتا ہے تو مکے سے کافی دور پہلے حج کی باقاعدہ نیت باندھتا ہے جسے "احرام" کہتے ہیں۔ احرام باندھنے

Marfat.com

کی شکل یہ ہوتی ہے وہ غسل کرکے عام کپڑوں کے بدلے ایک تہبند اور چادر پہن لیتا ہے ، خدا کو مخاطب کرکے بلند آواز سے پکارتا ہے -

لبیك اللهم لبیك ، لبیك لاشریك لك لبیك، ان الحمد والنعمة لك والملك، لاشریك لك ،	حاضر ہوں ، میرے اللہ ، میں حاضر ہوں ، میں حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں ، میں حاضر ہوں اس میں کوئی شک نہیں کہ حمد تیری ہی ہے ، نعمتیں تیری ہی ہیں اور بادشاہی تیری ہے اور تیرا کوئی شریک نہیں!

'لبیک' کی یہ صدا اب ورد زبان بن جاتی ہے ، احرام کے بعد عیش و عشرت کی ہر چیز اس پر حرام ہو جاتی ہے، زیب و زینت ممنوع ہو جاتی ہے ، اس حال میں وہ مکے پہنچتا ہے اور وہاں کعبے کا طواف کرتا ہے - ذی الحج کی ۸ ویں تاریخ کو لوگ منیٰ کے مقام کے لیے روانہ ہوتے ہیں ، وہاں سے عرفات جاتے ہیں وہاں سے مزدلفہ اور وہاں سے پھر منیٰ آتے ہیں - ' جمرات ' کو کنکریاں مارتے ہیں ، قربانی کرتے ہیں سر منڈاتے ہیں ، اور کعبے کا بار بار طواف کرتے ہیں -

یہاں ان مراسم کی تفصیل کا موقع نہیں[1] لیکن ان کے پیچھے جو روح کارفرما ہے اس کی طرف اشارہ ضروری ہے -

مناسک حج کی حکمتیں :

(۱) ان مراسم پر گہری نظر ڈالیے تو ہر ایک چیز سے بندگی کی تصویر ابھرتی ہے - احرام کے لباس کو لیجیے - یہ لباس نہیں بلکہ ایک طرف فقیری کے احساس اور دوسری طرف فداکاری کے جذبے کا منہ بولتا نشان ہے - جس وقت ایک فقیر بے نوا اپنی جھولی وا کیے کسی داتا کے دربار میں ، یا ایک جانباز سپاہی اپنی وردی میں میدان جنگ کی طرف جاتا ہے تو اس کے خیالات اور جذبات کو سمجھنے کے لیے الفاظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی بلکہ اس کی ہیئت ہی سب کچھ بتا اور سمجھا دیتی ہے - ٹھیک اسی طرح کعبے کی طرف جانے والے کی ہیئت خود بولتی ہے کہ وہ اللہ ہی کے در کا بھکاری ہے اور اسی کی فوج کا کفن بردوش سپاہی!

(۲) اسی کے ساتھ ساتھ احرام کا یہ لباس ایک اور عظیم حقیقت کا اعلان کر رہا ہوتا ہے - دنیا کی مختلف قوموں کے افراد جب اپنا وطنی لباس اتار کر

۱- مناسک حج کے مطالعے کے لیے فقہ کی کسی بھی اچھی کتاب کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے- ملاحظہ ہو مولانا افتخار احمد بلخی کی کتاب "حج اور اس کے مناسک" یا فیروز سنز کی شائع کردہ "کتاب الحج"- (مرتب)

Marfat.com

ایک ہی قسم کے کپڑے پہن لیتے ہیں اور ایک ہی نعرہ (لبیک) سب کی زبان سے بلند ہو رہا ہوتا ہے تو اسلامی قومیت ایک پیکر اختیار کر لیتی ہے اور اندھے بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اسلام کا رشتہ سارے مادی رشتوں سے زیادہ مضبوط اور درحقیقت انسانوں کو حقیقی طور پر جوڑنے والا واحد رشتہ ہے۔

(۳) جس وقت ہر چہار طرف سے صدائے لبیک (میں حاضر ہوں) بلند ہوتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حج کی جو منادی کی تھی یہ آوازیں اسی کا جواب ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی منادی محض چند رسوم کے پورا کرنے کی نہ تھی بلکہ اپنے آپ کو روح ایمان اور حقیقت اسلام میں ڈھال لینے کی منادی تھی۔ اس اعتبار سے لبیک کا نعرہ اپنے آپ کو مالک کے حوالے کر دینے کی ایک بے چین خواہش کا اظہار ہے۔

(۴) جوں ہی کعبے پر نظر پڑتی ہے، اس کا تاریخی پس منظر اور وہ جذبہ جو اس کی تعمیر میں شامل تھا، نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے اور انسان کو یاد آ جاتا ہے کہ میں بھی اسی کی امت کا ایک فرد ہوں جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور جس کا نام انہوں نے امت مسلمہ رکھا تھا۔

حجر اسود پر جب وہ اپنے ہاتھ رکھتا ہے تو دل پر یہ حقیقت نقش ہوجاتی ہے کہ یہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے رہا ہوں، بندگی و غلامی کا عہد تازہ کر رہا ہوں اور اقرار کر رہا ہوں کہ اس عہد سے کبھی نہ پھروں گا۔

(۵) طواف کیا ہے؟ فقط رضائے الٰہی کی خاطر اپنے آپ کو قربان کر دینے کا والہانہ جذبہ، جب مرد مومن کعبے کے ارد گرد چکر لگاتا ہے تو شمع و پروانہ کا شاعرانہ تخیل ایک واقعہ بن جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بندہ اپنے مولیٰ کے دربار میں آ کر مجسم فدویت اور سراپا کیف و سرمستی بن گیا ہے۔ پھر اس طواف میں کالے اور گورے، عربی و عجمی، سامی و آریائی، غرض کہ ہر نسل، ہر زبان اور ہر قومیت کے لاکھوں لوگ ایک ہی لباس پہنے اور ایک ہی جذبات لیے کعبے کے گرد گھومتے ہیں، تو یہ منظر یقین دلاتا ہے کہ جس طرح اللہ ایک ہے اسی طرح اس کے دین پر ایمان رکھنے والے بھی تمام ظاہری اختلافات کے باوجود ایک ہی ہیں۔ ان کا محور اور مرکز ایک ہے اور ان کی وفاداریاں اور جان نثاریاں ایک ہی ذات حق کے لیے ہیں۔

Marfat.com

(۶) صفا و مروہ کے درمیان کی 'سعی' اس عزم کی مظہر ہے کہ حضرت ابراھیم اور اسماعیل علیہم السلام کا راستہ ھی ھمارا راستہ ھوگا اور اس راستے پر چلنے میں ھم اپنے قدم سست نہ ھونے دیں گے -

(۷) ساتویں ذی الحج سے لے کر دسویں ذی الحجہ تک سارے حاجیوں کا ایک ھی امام کی قیادت میں سفر اور قیام ایک منظم فوجی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ھیں - لاکھوں بندگان خدا کا یہ احرام پوش گروہ کفن بردوش سپاھیوں کا ایک جرار لشکر نظر آتا ھے - یہ صورت حال بتاتی ھے کہ امت مسلمہ کے تصور کے ساتھ منظم اجتماعیت اور فوجی زندگی کا تصور بالکل لازم ھے اور اس گروہ کی ساری سعی و جہد دین کی نصرت کے لیے وقف ھے -

(۸) جمرات کے ستونوں پر کنکریاں مارنا پتھروں کی اس بے پناہ بارش کی یادگار ھے جس نے ابرھہ کے لشکر کو انہی مقامات پر تہس نہس کرکے رکھ دیا تھا - ان مقامات پر کنکریاں مارنا اس عزم کا اظہار ھے کہ جو اللہ کے دین کی طرف ترچھی نظر سے دیکھے گا ھم اس کا منہ پھیر کر رکھ دیں گے -

(۹) قربانی وہ 'ذبح عظیم' ھے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ قرار دیا تھا - اس لیے اللہ کی راہ میں جانور قربان کرنا در حقیقت اپنے آپ کو قربان کرنے کا قایم مقام ھے - یہ اس بات کا خاموش اقرار ھے کہ ھماری جان اللہ کی راہ میں نذر ھو چکی ھے اور وہ جب اسے طلب کرے گا ھم بلا تامل پیش کردیں گے -

مراسم حج کے پیچھے کام کرنے والی ان ساری حقیقتوں کو دیکھیے - بندگی رب کا کونسا جذبہ ھے جو اس میں لھریں نہیں لے رھا ھے - خصوصاً جذبۂ جہاد، جو بندگی کی معراج کمال ھے، وہ تو ان سارے اعمال میں اس طرح سمویا ھوا ھے کہ پورا حج جہاد کی علامتی مشق معلوم ھونے لگتا ھے - یہی وجہ ھے کہ جب عورتوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جہاد کی اجازت چاھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا بہترین جہاد حج ھے!

حج کی شان جامعیت : ان باتوں کے علاوہ اگر حج کے مراسم کو ایک اور پہلو سے دیکھیے تو محسوس ھوگا کہ یہ حج اگرچہ کہنے کو ایک عبادت ھے لیکن فی الواقع اس میں ھر عبادت اور ھر عملی خیر کی روح موجود ھے -

Marfat.com

(۱) وہ نماز بھی ہے ، اس لیے کہ نماز کی حقیقت ذکر یا یاد دھانی ہے ، اور حج میں آدمی مسلسل زبان سے ذکر (لبیک اللہم لبیک) کرتا رہتا ہے اور ساتھ ہی ان مقامات کی زیارت کرتا ہے جو اس کے احساس عبدیت کو ابھار دیتی ہیں۔

(۲) وہ زکواۃ بھی ہے ، اس لیے کہ ہر حج کرنے والے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قربانی کا گوشت غریبوں کو کھلائے ۔ اس کے علاوہ بغیر مالی قربانی کے حج کیا ہی نہیں جا سکتا ، اور زکواۃ کی حقیقت بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی خاطر اپنی دولت صرف کی جائے ۔

(۳) وہ روزہ بھی ہے ، اس لیے کہ جنسی ملاپ روزے میں اگر صرف دن کو ممنوع ہے تو حج کے دوران راتوں میں بھی ممنوع رہتا ہے ۔ رہا کھانے پینے کا معاملہ تو روزے کی طرح اگرچہ حج میں کھانا پینا منع نہیں ہے مگر اس کے بجائے اس میں زیب و زینت وغیرہ کی جو دوسری بہت سی پابندیاں عاید ہوتی ہیں وہ بڑی حد تک اس ممانعت کی قایم مقام بن جاتی ہیں ۔ اس طرح نفس کی خواهشوں کو کنٹرول کرنے کی مشق جس طرح روزے میں ہوتی ہے اسی طرح حج میں بھی ہوتی ہے ۔

* اسلامی عبادات کے اس مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادات کے اس نظام کا اصل مقصد اسلام کا انسان مطلوب تیار کرنا ہے ۔ یہ انسان کو اس ذمہ داری کے لیے تیار کرتی ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سپرد کی ہے ۔ یہ انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی صفات محمودہ انسان میں پیدا کرتی ہیں ، سیرت و کردار کی تعمیر کرتی ہیں اور روحانی ترقی اور اخلاقی بالیدگی کی راہ ہموار کرتی ہیں ۔ عبادات کا اصل مقصد یہ ہے کہ نفس کا تزکیہ ہو ، تقوی کی روح پیدا ہو ، خدا سے تعلق استوار ہو ، اور خدا کی اطاعت ، اس کی بندگی اور اس کی محبت ہر چیز پر غالب آجائے ۔ نفس کی اصلاح کے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں اور نفس کی اصلاح کا اصل اور مؤثر ترین طریقہ وہ عبادات ہیں جو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر کی ہیں ۔

---

* اضافہ از مرتب

Marfat.com

مزید مطالعے کے لیے

مولانا منظور نعمانی ' دین و شریعت (باب چہارم) ۔ مکتبہ' الفرقان ' لکھنؤ ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر ۔
اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ' خطبات (باب ۱۲ تا ۲۸) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ،
لاہور ۔

مولانا سید سلیمان ندوی ' سیرۃ النبی (جلد پنجم) ۔ دارالمصنفین ' اعظم گڑھ ۔

افتخار احمد بلخی ، حج اور اس کے مناسک ۔ المطبوعات ، کراچی ۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ ، '' تزکیہ' نفس '' لاہور ۔

Marfat.com

Marfat.com

حصہ سوم

اسلامی نظام حیات

Marfat.com

Marfat.com

گزشتہ صفحات میں اسلام کی علمی اور فکری بنیادوں اور دور حاضر کے پیدا کردہ مسائل پر گفتگو کی جا چکی ہے۔ اس بحث سے معلوم ہوا کہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت صحت مند نظریۂ حیات ہے۔ مذہب سے انحراف کی جتنی راہیں بھی انسان نے اختیار کی ہیں بالآخر وہ سب غلط اور تباہ کن ثابت ہوئی ہیں۔ عقلی تجزیہ اور تاریخی تجربہ دونوں اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ مذہب کے بغیر انسانی زندگی حقیقی کامیابی، سکون و اطمینان اور امن و امان سے مالامال نہیں ہو سکتی۔ اور وہ مذہب جو اپنی حقیقی شکل میں محفوظ ہے اور جو زندگی کے تمام مسائل کو بحسن و خوبی حل کر سکتا ہے اسلام ہے۔

اسلام کا نقطۂ آغاز نفس انسانی کی اصلاح ہے۔ وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرتا ہے اور خدا، رسول، کتاب اور یوم آخرت پر ایمان کے ذریعے سے کائنات اور اس کی حقیقتوں اور زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا پورا نظام قایم ہے۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو انہی بنیادوں سے وابستہ ہے۔

اسلامی معاشرہ کا مرکز رسول خدا کی شخصیت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کا پیکرمجسم تھے۔ اسی لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پوری انسانیت کے لیے ''اسوۂ حسنہ'' بتایا گیا۔ یہ وہ معیار ہے جس کے مطابق تمام انسانوں کو اپنی زندگیوں کو ڈھالنا ہے۔

اپنے انسان مطلوب کو تیار کرنے کے لیے اس معیار کے ساتھ ساتھ اسلام ایک مفصل تربیتی نظام بھی فراہم کرتا ہے جو اُن صفات کو پیدا کرتا اور پروان چڑھاتا ہے جو پسندیدہ اور مطلوب ہیں اور اُن برائیوں سے انسان کو بچاتا اور پاک کرتا ہے جو اسلام کی نگاہ میں مذموم ہیں۔ یہ تربیتی کورس اسلام کا نظام عبادت ہے۔

Marfat.com

ایک خاص قسم کے انسان کے ساتھ اسلام ایک خاص طرز کا معاشرہ بھی بنانا چاھتا ہے ۔ اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر شعبے اور گوشے کی صورت گری کرنا چاھتا ہے تاکہ زندگی کی تمام وسعتوں میں خدا کا قانون جاری و ساری ہو اور حیات کا ہر گوشہ خدا کے نور سے منور ہو جائے ۔ اس تیسرے حصے میں اسلام کے اجتماعی نظام سے بحث کی گئی ہے ۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اجتماعیت پسند ہے ۔ مہد سے لحد تک اسے انسانوں کے اجتماع سے سابقہ در پیش ہے ۔ وہ اس دنیا میں آتا ہے دو انسانوں کے اجتماعی تعلق سے ۔ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے اور معاشرے میں پرورش پاکر بڑا ہوتا ہے ۔ مدرسہ اور اسکول میں تعلیم پاتا ہے ۔ محلے میں اٹھتا بیٹھتا ہے ۔ بازاروں میں چلتا پھرتا ہے ۔ ہر قدم پر دوسرے انسانوں سے معاملات کرتا ہے ۔ تعلیم کی جد و جہد ہو یا معاش کی تگ و دو ، ہر قدم پر اسے معاشرہ اور ریاست کا سہارا لینا پڑتا ہے ۔ اجتماعیت کا یہ دائرہ اتنا وسیع اور اتنا موثر ہے کہ انسان کی پوری زندگی اس میں گردش کرتے گزر جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی اصلی کامیابی یا ناکامی اسی اجتماعیت کے دائرے میں دیکھی جاتی ہے ۔

اسلام تمام اجتماعی مسائل کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے حل کرنا چاھتا ہے ۔ وہ عائلی مسائل کو بھی لیتا ہے اور معاشرتی پیچیدگیوں کو بھی ، معاشی جدوجہد بھی اس کا موضوع ہے اور سیاسی فکر و عمل بھی ، لیکن ان سب میں اس کا مخصوص زاویہ نظر یہ ہے کہ تمام معاملات خدا کی اطاعت ، اخلاقی اصولوں کی بالا دستی ، احترام انسانیت ، دوسروں کے حقوق کی پاسداری اور آخرت میں جواب دہی کے اصولوں پر طے ہوں ۔ زندگی کے تمام شعبوں کے لیے اسلام بنیادی اور اصولی تعلیمات دیتا ہے اور پھر ان حدود کو واضح کر دیتا ہے جنہیں کسی قیمت پر بھی توڑا نہیں جا سکتا ۔ بنیادی اصولوں کے تعین اور حدود کی تحدید کے بعد وہ انسان کو آزادی دیتا ہے کہ اپنے زمانے کے حالات کے مطابق اپنا راستہ نکالے ۔ اس طرح اسلامی نظام ان بے اعتدالیوں سے بچ جاتا ہے جن کا اغراض پرستی کی وجہ سے انسان مرتکب ہوتا رہا ہے نیز اس حکمت عملی کے نتیجے میں انسانی معاشرہ جمود کا شکار بھی نہیں ہوتا ۔ اس نظام میں ترقی اور ارتقا کے ہر ممکن مواقع موجود رہتے ہیں ۔ اور خدا کی حدود میں رہتے ہوئے انسان کا ہر قدم بلندی اور ترقی کی جانب اٹھتا ہے ۔

زیر نظر حصے میں ہم اسلامی نظام حیات کے مختلف پہلوؤں کو پیش کریں گے ۔

Marfat.com

باب ۱۳ '' شریعت اسلامی کے مآخذ '' کے متعلق ہے اور اس میں کوشش کی گئی ہے کہ ہدایت کے بنیادی سرچشموں—یعنی قرآن اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم- کا ضروری تعارف کرایا جائے اور دلائل اور تاریخی شواہد سے ان کے مقام کو واضح کیا جائے۔

باب ۱۴ '' اسلام کے اخلاقی نظام '' کے متعلق ہے۔ اس باب میں اسلام کے تصور اخلاق کو بیان کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسلام میں اخلاقی زندگی کے مقاصد، اس کے محرکات اور اس کو نافذ کرنے کے ذرائع کیا ہیں۔ نیز ان اخلاقی صفات کو بیان کیا گیا ہے جو پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہیں۔

باب ۱۵ میں ''اسلام کے معاشرتی نظام'' کا ایک مجمل خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ اس میں عائلی زندگی کی بنیادوں اور معاشرت کے اساسی اصولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز یہ بتایا گیا ہے کہ اسلامی معاشرے کے بنیادی ادارے کون کون سے ہیں اور معاشرتی اصلاح کا عمل کن اصولوں پر ہونا چاہیے۔

باب ۱۶ '' اسلامی نظریۂ تعلیم '' کے متعلق ہے۔ اس میں اسلام کے تعلیمی اصول اور مسلمانوں کے نظام تعلیم کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اگر ان تعلیمی اصولوں اور مسلمانوں کی متذکرہ تعلیمی روایت کو نگاہ میں رکھا جائے تو بہ آسانی ہر مسلمان ملک اپنی ضرورت کے مطابق ایک نئے نظام تعلیم کا نقشہ بنا سکتا ہے جو اسلام کے تصور سے ہم آہنگ ہو اور وقت کی ضرورت کو بھی پورا کر دے۔

باب ۱۷ میں اسلام کے معاشی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ طلبا کا اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں سے تعارف کرا دیا جائے اور اسلام کے معاشی نظام اور جدید سرمایہ داری اور اشتراکیت کے نوعی اور مزاجی فرق کو نمایاں کر دیا جائے۔

باب ۱۸ میں ''اسلام کے سیاسی نظام'' سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں اسلامی ریاست کی خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے اور ان پہلوؤں کو واضح کیا گیا ہے جن پر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے۔

اس پوری بحث کے بعد یہ فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی قوت کو کس اعلیٰ مقصد کے لیے استعمال ہونا چاہیے؟ ملت اسلامیہ کا

Marfat.com

اصل مشن کیا ہے ، اور اسلام اپنے ماننے والوں سے کس چیز کا تقاضہ کرتا ہے ؟ ان امور پر آخری باب میں روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کا عنوان "اسلام کے تقاضے" رکھا گیا ہے ۔ اس سے ایک طرف ملت اسلامیہ کے حقیقی نصب العین کی وضاحت ہو جاتی ہے اور دوسری طرف یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ ہر مسلمان کو ملت کے فرد کی حیثیت سے کن مقاصد کے لیے سر گرم عمل ہونا چاہیے تاکہ اسلام کے عالم گیر مشن کی تکمیل میں وہ اپنا حصہ ادا کر سکے اور اس طرح دنیا اور آخرت میں کامیابی سے ہمکنار ہو سکے ۔

ہمیں توقع ہے کہ اس تیسرے حصے کے مطالعے سے قاری کے سامنے اسلامی نظریۂ حیات کی پوری تصویر آجائے گی ۔

(مرتب)

Marfat.com

۱۵

شریعت اسلامی کے ماخذ

اسلامی نظام زندگی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم یہ معلوم کریں کہ اسلامی شریعت کے مآخذ کیا ہیں؟ اسلام زندگی کا جو نقشہ تجویز کرتا ہے وہ محض انسانی عقل اور تجربے کی روشنی میں ترتیب نہیں پاتا ، یہاں ابتدائی اور اولین رہنمائی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے حاصل کی جاتی ہے اور اور پھر اس کی روشنی میں عقل اور تجربے کی مدد سے زندگی کا نظام قایم کیا جاتا ہے ۔ چوں کہ اس نظام زندگی کی بنیادی خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہدایت پر مبنی ہے اس لیے نظام زندگی کے مختلف شعبوں اور ان میں اسلام کے مخصوص مزاج کا مطالعہ کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کی حقیقت، اور اصلاح کے لیے اسلام کے طریق کار کا مطالعہ کر لیا جائے اور قدرے تفصیل سے یہ دیکھ لیا جائے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کر رہے ہیں وہ کتنے قابل اعتماد ہیں ۔ مندرجہ ذیل صفحات میں یہی بحث کی گئی ہے ۔[1]

شریعت : معنی و مفہوم

* شریعت (شرعہ اور شرع) کے لغوی معنی "کھلے ہوئے ، روشن ، سیدھے اور صاف راستہ" کے ہیں ۔ لیکن مذہبی اصطلاح میں اس سے مراد وہ قوانین و احکام ہیں جو ایک رسول ، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ، اس کی بندگی ، اور فرماں برداری

---

۱ اس باب کو متعدد اہل علم کی نگارشات سے مرتب کیا گیا ہے اور اس کی ترتیب میں مولانا افتخار احمد بلخی صاحب نے میری خصوصی معاونت کی ہے ۔ (مرتب)

* یہ حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

کے لیے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا

ہم نے تم میں سے ہر ایک
کے لیے ایک شریعت اور ایک
راہ عمل مقرر کی (المائدہ - ۴۸)

یعنی ، تمام انبیا اور تمام سابقہ کتب الٰہیہ کا دین تو یہی اسلام تھا ، لیکن شریعت ، یعنی عبادت کے طریقے ، معاشرت کے اصول ، باہمی معاملات اور تعلقات کے قوانین ، حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود وغیرہ امور سے متعلق تفصیلات کا جہاں تک تعلق ہے ان میں اختلاف رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے پاس مختلف شریعتیں بھیجی تھیں ، اور جب تک دنیا نے تمدن اور اجتماعی زندگی کے وہ سارے وسائل پیدا نہیں کر لیے کہ ساری دنیا کو ایک رسول اور ایک شریعت پر جمع کیا جا سکے ، اس وقت تک اللہ تعالیٰ الگ الگ قوموں میں رسولوں کو مبعوث فرماتا رہا جو اپنی اپنی قوم کو ، الگ الگ ، شائستگی اور تہذیب و اخلاق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے ۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ بسا اوقات ایک ہی زمانے میں ایک سے زائد انبیا مختلف خطہائے ارضی میں دعوت حق کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں ۔ جب ان انبیا کی تعلیم و تربیت سے قوموں کا اخلاقی شعور بیدار ہو گیا اور انسانی معاشرہ اور تمدن کے مادی وسائل اتنے ترقی کر چکے کہ اب ساری دنیا کے لیے ایک ہی رسول و نبی کی بعثت کا وقت آ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کے ذریعے ساری انسانیت کو وہ مکمل نظام زندگی عطا فرمایا جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات کے مطابق ہے ۔ اب اسی نظام حیات پر عمل پیرا ہو کر خدا کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے ۔

اس طرح اب دین تو وہی ہے جس کی طرف سلسلۂ رسالت کی پہلی کڑی سے ہی انسانوں کو بلایا گیا ، لیکن پرانی شریعتیں منسوخ کر دی گئیں ، اور ان کی جگہ ایسی شریعت قایم کی گئی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے عبادت کے طریقے ، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین اور حلال و حرام کی حدود یکساں ہیں ۔

Marfat.com

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الٰہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انسانوں تک پہونچا ہے، اور اسی لیے شریعت کی اصطلاحی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے:

القانون الالٰہی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم العقائد والاعمال وتہذیب الاخلاق و تدبیر المنزل سیاست المدن	عقیدوں کی تقویم اور اعمال کی درستگی اور اخلاق کی تہذیب اور خاندانی زندگی کی بہتری اور ملکی سیاست کی استواری کے لیے وہ الٰہی قانون جو نبی سے ثابت ہو۔

شریعت کا مقصد اور اس کی ہمہ گیری

* ''اسلام'' تسلیم و اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ اور جو لوگ ''تسلیم و اطاعت'' کا یہ فعل کرتے ہیں اسلام میں داخل ہو جاتے ہیں اور وہ ''مسلم'' کہلاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جنہوں نے خدا کی حاکمیت مان لی، اپنی خود مختاری سے اس کے حق میں دست بردار ہوگئے، اور اس بات کو انہوں نے خود اپنے اوپر لازم کرلیا کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے احکام کے مطابق چلائیں گے۔

ایسے تمام لوگ جنہوں نے تسلیم کا یہ فعل کیا ہو ایک وحدت میں منسلک کیے جاتے ہیں اور ان کے اجتماع سے '' مسلم سوسائٹی '' کی تشکیل و تنظیم ہوتی ہے۔ یہ سوسائٹی ان سوسائٹیوں سے بالکل مختلف ہے جو اتفاقی حوادث کے نتیجے میں بنتی ہیں۔ اس کی تشکیل ایک ارادی فعل سے ہوتی ہے، اور اس کی تنظیم ایسے معاہدے کے ذریعے سے عمل میں آتی ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان شعوری طور پر واقع ہوتا ہے۔ اس معاہدے میں بندے یہ تسلیم کرتے ہیں کہ خدا ان کا حاکم ہے، اس کی ہدایات ان کے لیے دستورِ زندگی ہے، اس کے احکام ان کے لیے قانون ہیں۔ وہ اسی کو خیر مانیں گے جسے خدا خیر بتائے گا، اور اسی کو شر تسلیم کریں گے جسے خدا شر کہے گا۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کا معیار وہ خدا ہی سے لیں گے۔ اور اپنی آزادی کو ان حدود کے اندر محدود رکھیں گے جو خدا ان کے لیے کھینچ دے گا۔ مختصر یہ کہ اس معاہدے کی بنیاد پر جو سوسائٹی بنتی ہے وہ یہ اقرار کرتی ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی میں '' کیا ہونا چاہیے '' کا جواب خود تجویز نہیں کرے گی بلکہ اس جواب کو قبول کرے گی جو خدا کی طرف سے ملے گا۔ اس واضح اقرار کی بنیاد پر جب ایک

* یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب '' اسلامی قانون '' سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

سوسائٹی بن جاتی ہے تو خدا کی طرف سے " الکتاب " اور " الرسول " اسے ایک ضابطۂ زندگی دیتے ہیں جو " شریعت " کہلاتا ہے ۔ اور سوسائٹی پر خود اپنے ہی اقرار کی وجہ سے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے معاملات زندگی کو اس نظام اور اس اسکیم کے مطابق چلائے جو اس شریعت میں تجویز کی گئی ہے ۔

جس زمانے میں جس رسول کی جو شریعت تھی اس کا اصل مقصود معروفات کا پروان چڑھانا اور منکرات کا استیصال تھا ، اور شریعت محمدیہ کا مقصود بھی انسانی زندگی کے نظام کو معروفات پر قایم کرنا اور منکرات سے پاک کرنا ہے ۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں ، خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو جِلا بخشتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے ۔ اور منکرات سے مراد وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر برا جانتا ہے ۔ دوسرے الفاظ میں " معروف " فطرت انسانی سے مناسبت رکھنے والی چیز ہے جو خالق فطرت ہی کی طرف سے اس کی تابناکی کے لیے تجویز کردہ ہے ۔ اور "منکر" اس کے خلاف ہے ۔

" شریعت " ہمارے لیے انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو اس فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں ۔ وہ بھلائیوں اور برائیوں کی محض ایک فہرست ہی بنا کر ہمارے حوالے کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ زندگی کی پوری اسکیم ایسے نقشے پر بناتی ہے کہ اس کی بنیادیں معروف (بھلائیوں) پر قایم ہوں اور معروفات اس میں پروان چڑھ سکیں ۔ اور منکرات کو اس کی تعمیر میں شامل ہونے سے روکا جائے اور نظام زندگی میں ان کے در آنے اور ان کا زہر پھیلنے کے مواقع باقی نہ رہنے دیے جائیں ۔ اس غرض کے لیے وہ معروفات کے ساتھ ان اسباب اور ذرائع کو بھی اپنی اسکیم میں شامل کرتی ہے جن سے وہ قایم ہوسکتے اور پروان چڑھ سکتے ہیں ۔ اور ان موانع کو ہٹانے کا انتظام بھی تجویز کرتی ہے جو معروفات کے قیام اور نشو و نما میں کسی طور پر سدراہ ہو سکتے ہیں ۔ اس طرح اصل معروفات کے ساتھ ان کے قیام و ترقی کے وسائل بھی معروف شمار ہو جاتے ہیں ، اور ان کے موانع منکرات کی فہرست میں شامل کر دیے جاتے ہیں ۔ یہی معاملہ منکرات کے ساتھ بھی ہے ۔ اصل منکرات کے ساتھ وہ چیزیں بھی منکر قرار پاتی ہیں جو کسی منکر کے وقوع یا ظہور یا نشو و نما کا ذریعہ ہیں ۔ معاشرے کے پورے نظام کو

Marfat.com

شریعت اس طرز پر ڈھالتی ہے کہ ایک ایک معروف اپنی حقیقی صورت میں قایم ہو، زندگی کے تمام متعلقہ شعبوں میں اس کا ظہور ہو؛ ہر طرف سے اس کو قایم ہونے اور پروان چڑھنے میں مدد ملے اور ہر وہ رکاوٹ دور کی جائے جو کسی طرح سے اس کی راہ میں حائل ہو سکتی ہو۔ اسی طرح ایک ایک منکر کو چن چن کر زندگی سے نکالا جائے، اس کی پیدائش اور نشو و نما کے اسباب روکے جائیں، جدھر جدھر وہ زندگی میں گھس سکتا ہے اس کا راستہ بند کیا جائے اور اگر وہ سر اٹھا ہی لے تو پھر سختی کے ساتھ اسے دبا دیا جائے۔

معروفات کو شریعت تین قسموں میں تقسیم کرتی ہے

(۱) واجب یا فرض: یعنی وہ معروفات جو مسلم معاشرے پر لازم کیے گئے ہیں۔ ان کے متعلق شریعت صاف صاف اور قطعی احکام دیتی ہے۔

(۲) مندوب یا مطلوب: یعنی وہ معروفات جن کو شریعت چاہتی ہے یا پسند کرتی ہے وہ معاشرے میں قایم اور جاری ہوں۔ ان میں سے بعض کا اشارہ شارع کے ارشادات سے نکلتا ہے۔ بعض کے قیام و نشو و نما کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اور بعض کی صرف سفارش کی گئی ہے تاکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی یا اس کے صالح لوگ ان کی طرف خود توجہ کریں۔

(۳) مباح: شریعت کی زبان میں ہر وہ چیز اور فعل مباح ہے جس کی ممانعت نہ کی گئی ہو۔ اس تعریف کی بنا پر مباحات صرف وہی نہیں ہیں جن کی اجازت کی تصریح ہو یا جن کے معاملے میں ہمیں صاف طور پر اختیار دیا گیا ہو بلکہ ان کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ چند بیان کردہ ممنوعات کو چھوڑ کر، دنیا میں سب کچھ مباح ٹھہرتا ہے۔ یہی مباحات کا وہ دائرہ ہے جس میں شریعت نے ہم کو آزادیٔ عمل دی ہے۔ اور اسی دائرے میں ہم کو اپنی ضرورتوں کے مطابق قوانین و ضوابط اور طریقۂ کار خود تجویز کر لینے کے اختیارات حاصل ہیں۔

منکرات کو شریعت میں دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے

(۱) حرام یعنی قطعی ممنوع: جس سے باز رہنا اور اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس سے پاک رکھنا مسلمانوں

Marfat.com

پر لازم کر دیا گیا ہے۔ اور شریعت میں اس کے متعلق صاف صاف احکام دے دیے گئے ہیں۔

(۲) مکروہ: یعنی اس کے متعلق شارع کسی نہ کسی طور پر صراحتاً یا کنایتاً ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ جس سے بہ آسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس درجے میں ناپسندیدہ ہے۔ بعض مکروہات حرام کے قریب ہیں، اور بعض مباح کی سرحد سے ملے ہوئے ہیں، اور بہت سے ان کے درمیانی مراتب پر ہیں۔ بعض کو روکنے اور بند کرنے کا شریعت کے نظام میں بندوبست کیا گیا ہے، اور بعض کو ناپسندیدہ بتا کر چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ معاشرہ خود یا اس کے صالح عناصر سدباب کریں۔

معروف و منکر کے یہ احکام ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مذہبی عبادات، شخصی کردار، اخلاق و عادات کھانا پینا، پہننا اور اوڑھنا، نشست و برخاست، بات چیت، خاندانی زندگی، معاشرتی تعلقات، معاشی معاملات، ملکی انتظام، شہریت کے حقوق و واجبات، قیام عدل کا نظام، حکومت کے طریقے، صلح و جنگ اور دوسری قوموں کے ساتھ تعلقات، غرض زندگی کا کوئی شعبہ اور پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے ہم پر نیکی اور بدی کے طریقے، بھلائی اور برائی کے راستے اور پاک و ناپاک کے امتیازات واضح نہ کر دیے ہوں۔ وہ ہمیں ایک صالح نظام زندگی کا پورا نقشہ دیتی ہے جس میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ وہ کون سی بھلائیاں ہیں جنہیں ہم کو قایم کرنا، بڑھانا، اور نشو و نما دینا ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن سے ہم کو بچنا اور جن کو دبانا اور مٹانا ہے۔ کن حدود کے اندر ہماری آزادی عمل کو محدود رہنا چاہیے۔ اور عملاً ہمیں کون سے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جن سے ہماری زندگی میں مطلوبہ بھلائیاں پروان چڑھیں اور برائیوں کا استیصال ہو۔

یہ پورا نقشہ زندگی ایک ہی نقشہ زندگی ہے۔ اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قایم نہیں رہ سکتا۔

Marfat.com

شریعت اسلامی کے ماخذ

*شریعت کی اصطلاحی تعریف اوپر گزر چکی ہے ، جس سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ صاحب شریعت رسول ہوتا ہے ، نہ کہ کوئی امام یا مجتہد — دوسرے لفظوں میں یہ کہ اصطلاحاً شریعت موسوی اور شریعت محمدی وغیرہ تو کہہ سکتے ہیں ، لیکن شریعت حنفی اور شریعت مالکی وغیرہ نہیں کہہ سکتے ۔ البتہ فقہ حنفی اور فقہ مالکی وغیرہ کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں کیوں کہ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

حکمة شرعیة فرعیة عملیة — وہ علم جس کا تعلق ایسے امور سے ہو جو عملی ہوں ، فروعی ہوں ، اور شریعت کی طرف منسوب اور اس سے ماخوذ ہوں ۔

جیسا کہ اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ

علم بقواعد یتوسل بها الی کیفیة استنباط المسائل عن دلائلها التفصیلیة — ان قواعد و ضوابط کا علم جو ذریعہ و وسیلہ بنتے ہیں اس بات کے معلوم کرنے کے کہ مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل سے کس طرح مستنبط کیا جانا چاہیے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت اور فقہ (اور اصول فقہ) خالص اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے کے مماثل نہیں ہیں ۔ شریعت اور فقہ کے درمیان فرق ان کی تعریفوں کے الفاظ پر ذرا گہری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے ، کیوں کہ فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے امر و حکم پر مبنی ہوتے ہیں اور شریعت سے ماخوذ و مستنبط ہوتے ہیں (شرعیہ) ۔ دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرۂ بحث میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فروعی ہوتے ہیں (فرعیہ) ، اور جو صرف عملی ہوتے ہیں (عملیہ) ۔ لیکن شریعت کی اصطلاحی تعریف میں ، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا " عقائد و اعمال " دونوں داخل ہیں ۔

یہ تو ہیں شریعت اور فقہ کے اصطلاحی معنی ، لیکن عوامی استعمال کی رو سے فقہ اور شریعت کو مترادف یعنی ایک ہی مفہوم کا خیال کیا جاتا ہے ۔ اس بنا پر جب " شریعت اسلامیہ کے ماخذ " کا فقرہ بولا جاتا ہے تو اس وقت لفظ " شریعت " علمی و فنی اصطلاح میں نہیں بلکہ عوامی استعمال کی حیثیت سے بولا جاتا ہے اور اس کا مطلب دراصل " فقہ اسلامی کے ماخذ " ہوتا ہے ۔

---

* یہ حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

ماخذ اول : الکتاب

شریعت ، یعنی اسلامی قانون کا پہلا ماخذ ، سب سے پہلی دلیل ، سرچشمہ' اول اور ماخذ اساسی '' الکتاب '' یعنی قرآن کریم ہے ، جو خدا کا کلام ہے ۔

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ

یہ کتاب یقیناً خدائے رب العالمین
کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۔
(السجدہ ۔ ۲)

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ

(یہ) کتاب ہے، جسے ہم نے تمہاری طرف
نازل کیا ہے' تاکہ لوگ اس کی آیات
میں تدبر کریں ۔ (ص ۔ ۲۹)

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى

(یہ کتاب) زمین و آسمان کے پیدا کرنے
والے کی نازل کردہ ہے ۔ (طہٰ ۔ ۱۲)

اور یہ اسلامی شریعت و قانون کا اصل الاصول ہے ۔ اس میں شریعت کی بنیادیں بیان کی گئی ہیں ۔ عقائد کے باب میں اس کے اندر پوری تفصیل و وضاحت ہے اور عبادات و حقوق کو اختصار سے بیان کیا گیا ہے ۔

اسلامی شریعت میں اس قرآن کی وہی حیثیت ہے جو ملکی قوانین میں دستور کی ہوتی ہے ۔ یہ قرآن خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم ، اورحضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سارے مسلمانوں کے لیے ، پیشوا ہے ۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

(اے نبی) آپ کہدیں کہ میں تو بس اسی پر چلتا ہوں جو میرے پروردگار کی طرف سے مجھ پر وحی کیا گیا ہے ، یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے سمجھ بوجھ کی باتیں ہیں ۔ اور (یہ) ایماندار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے ۔ (الاعراف ۔ ۲۰۳)

Marfat.com

وَإِنَّهُ لَذِكْرٌ لَكَ وَلِقَوْمِكَ

اور بے شک یہ (قرآن ۔ الکتاب)
تیرے اور تیری قوم کے لیے نصیحت
ہے ۔ (الزخرف ۔ ۴۴)

إِنَّا أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللَّهُ

بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری ہے
تاکہ لوگوں کے درمیان آپ اس طرح فیصلہ کریں جس
طرح اللہ آپ کو دکھائے ۔ (النساء ۔ ۱۰۵)

اس لیے یہ قانون شرعی کا اصل سر چشمہ ہے ۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ

اور بے شک ہم ان کے پاس (ایک) ایسی کتاب لائے ہیں جس
کو ہم نے علم کے ساتھ ایماندار لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت
بنا کر بھیجا ہے اور مفصل بیان کیا ہے ۔ (الاعراف ۔ ۵۲)

إِنَّ هَٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ

بے شک یہ قرآن اس (راہ) کی ہدایت
کرتا ہے جو بہت ہی سیدھی ہے ۔
(بنی اسرائیل ۔ ۹)

اور تمام انسانی معاملات میں اسی قرآن کی حیثیت حکَم کی ہے ۔ یعنی مسلمان وہ ہے جو اس کے حکم کے مطابق اپنے تمام معاملات کا فیصلہ کرتا ہے ۔

وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ

اور جو اس کے مطابق فیصلہ نہ کریں جو ہم نے نازل کیا
ہے تو ایسے ہی لوگ دراصل کافر ہیں ۔ (المائدہ ۔ ۴۴)

اس قرآن کی وہی خصوصیت و صفت ہے جو ایک دستور کی ہوتی ہے ۔ یعنی یہ کہ اس میں مخصوص احکام کا بیان مجملاً ہے ۔ جزئیات و تفاصیل سے اس میں بہت کم بحث کی گئی ہے ۔ اس کا اصل کام یہ ہے کہ بنیادی چیزوں کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کرے۔ وہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے مطابق تفصیلی ضابطے اور قوانین نہیں بتاتا بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ بتا دیتا ہے ۔

Marfat.com

اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑا کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے۔ ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ انہیں مامور ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی سیرت و کردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھادیں جو قرآن کے دیے ہوئے اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔[1]

قرآن: موضوعات، مقصد اور انداز تخاطب[2] عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب کوئی شخص پہلی مرتبہ قرآن کا مطالعہ اس توقع کے ساتھ کرتا ہے کہ "کتاب" ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہو گا پھر اصل مضمون کو ابواب اور حصص میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو لے کر اس کے متعلق بھی احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل برخلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل نا آشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایت، قانونی احکام، دعوت و نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آرہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع ہو جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون بکایک آ جاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں، فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کا ذکر ہے تو منطق و فلسفہ

---

۱ یہ بند ڈاکٹر مصطفیٰ احمد زرقا کے مضمون "اسلامی قانون کے ماخذ" مطبوعہ چراغ راہ، اسلامی قانون نمبر، جلد اول سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

۲ یہ بحث مولانا مودودی کے "مقدمہ تفہیم القرآن" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

کی زبان میں نہیں ، انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو تعلیم طبیعیات کے طریقے پر نہیں ، تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علوم عمرانی کے طرز پر نہیں ، قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف ، چناں چہ یہ کتاب فی الحقیقت تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے ۔ اس کی ترتیب دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے ۔ اپنے موضوع اور مضمون و ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ ایک نرالی چیز ہے[1] ۔

اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطہ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس کے پیش کرنے والے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان کی ہے ۔ اور مختصراً یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقلی و ارادی قوتوں سے مالامال کر کے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے تاکہ وہ خدا ہی کو اپنا حاکم و آقا تسلیم کرے اور اس عطا کردہ اختیارات سے سرمو تجاوز نہ کرے کیوں کہ اس کی زندگی کا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے ۔ اس کے برعکس ہر رویہ غلط اور مختلف ہوگا (جسے اختیار کرنے کے لیے انسان آزاد ہے) ۔ پھر اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی ہے جو ہمیشہ رہے گی اور وہاں ابدی راحت یا ابدی رنج و مصیبت کے علاوہ کچھ نہ ملے گا جس کا مدار اس بات پر ہے کہ انسان دنیا میں کون سا رویہ اختیار کرتا ہے ۔ پھر انسانی فلاح و بہبود اور اس کی ہدایات کے لیے اللہ تعالیٰ نے پیغمبر بھیجے ۔ جن کا کام یہ تھا کہ صحیح رویے کی طرف انسان کو دعوت دیں ، جس ہدایت کو انسانوں نے گم کر دیا ہے یا مسخ کر دیا ہے اسے پھر اصلی صورت میں پیش کریں ۔ پیغمبر ہزار ہا برس تک

۱۔ مدعا ، مرکزی مضمون اور قرآن کے موضوع کو معلوم کرنے کے لیے اس کی اصل کی طرف توجہ ضروری ہے ۔ اس ترتیب کا سبب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب انسان کا شعور کلی ہے اس کا کوئی شعبہ نہیں ہے ،وہ بیک وقت وجدان و عقل پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ ایک عام مصنف اپنے خیالات کو کسی منطقی تقسیم کے ساتھ پیش کرتا ہے تو ابواب قایم کرتا ہے ، وجدان و کیفیات کا ذکر ہوتا ہے تو انداز بیان دوسرا ہوتا ہے اور اس میں منطق کو دخل کم ہوتا ہے اور ترتیب بھی دوسری ہوتی ہے ، افسانہ یا تاریخ لکھتا ہے تو اس میں واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتا ہے ، غرض کتاب کی ترتیب ، کا تعلق نفس مضمون سے ہے ۔ اخلاق کی کتاب میں ابواب داخل کیے جاسکتے ہیں لیکن جو کتاب بیک وقت انسان کی جملہ شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ کسی ایسی تقسیم کو مفید نہیں پا سکتی ۔ اس لیے قرآن کا انداز دوسری کتابوں سے مختلف ہے ، قرآن پڑھنے والے کو قلب و دماغ ، ہوش و وجدان سب کو بیک وقت حاضر رکھنا چاہیے ورنہ وہ پورا فائدہ نہیں اٹھا سکتا ۔ (مرتب)

Marfat.com

دنیا میں آتے رہے اور وہی ایک دعوت اور ایک ہدایت پیش کرتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیا آتے رہے تھے۔ عام انسان اور پچھلے انبیا کی بگڑی ہوئی امتیں سب ان کے مخاطب تھے۔ سب کو صحیح رویے کی دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قایم کرے اور دوسری طرف اصلاح دنیا کی جدوجہد کرے۔ بس اسی دعوت اور اسی ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی اور اس کتاب کے لیے اس نے ایسا انتظام کر دیا کہ نہ یہ گم ہوسکتی ہے اور نہ مسخ کی جا سکتی ہے۔

اس اصل کی وضاحت کے بعد آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے کہ قرآن کا موضوع "انسان" ہے اس اعتبار سے کہ بہ لحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔ اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور حیات دنیوی کے مال و انجام وغیرہ کے متعلق جو نظریات قایم کیے ہیں، اور ان کی بنا پر جو رویے اختیار کیے ہیں، وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے بتادی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جس کی تعلیم اللہ کے برگزیدہ رسول نے دی ہے اور جسے "صراط مستقیم" کہا جاتا ہے۔

ان بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اول سے آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون سے مربوط ہیں۔ خواہ وہ زمین و آسمان کی ساخت، انسان کی خلقت، آثار کائنات کے مشاہدات پیش کرے، خواہ گزری ہوئی قوموں کے واقعات، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر کرے، وہ ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر

Marfat.com

بقدرِ ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے۔

پھر قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہ یک وقت اسے لکھ کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا ہو، نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں تجریدی طریقے پر موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو بلکہ اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا۔ اس کام کے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضامین پر مشتمل تھیں۔ ایک، پیغمبر کو خود اس عظیم الشان کام کی تیاری کے لیے تعلیم۔ دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں غلط فہمیوں کی مجمل تردید۔ تیسرے، "صحیح رویہ" کی طرف دعوت اور ہدایت الہیٰ کے بنیادی اصول اخلاق کا بیان۔ شروع شروع کے یہ پیغامات بہت چھوٹے چھوٹے بولوں پر مشتمل تھے جن کی زبان نہایت شستہ، شیریں، پُراثر، اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے تھی تاکہ دلوں میں یہ بول نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پُرجوش خطبوں کی شکل میں پیغامات بھیجنے شروع کیے، جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ، فضیلت اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دین کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدے کیے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں جد و جہد کرنے پر ابھارا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والے اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو ان پچھلی قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔ پھر ہجرت کے بعد سے تو حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی، پچھلے انبیا کی امتوں سے سابقہ پیش آیا۔ پرانی جاہلیت کے علم برداروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے۔ اور کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخرکار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی

Marfat.com

کہ سارا عرب اس کے زیر نگیں ہو گیا ۔ اور عالم گیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے ۔ اس مرحلے اور ان ادوار کی بھی مخصوص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے پیغامات آئے جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا ، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا ۔ اس میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ریاست و مدنیت صالحہ کی تعمیر ، زندگی کے مختلف شعبوں کے اصول و ضوابط ، کفار ، منافقین ، اہل کتاب سے سلوک ، مسلمانوں کو زندگی کے مختلف معاملات و احوال میں صحیح طرز عمل کی تفصیلی ہدایت دی گئی ۔ غرض ایک طرف عالم گیر دعوت و اصلاح کی اور دوسری طرف جماعت مسلمین کے سردار کی اور تیسری طرف رئیس حکومت کی مختلف حیثیتوں کا تعین کیا گیا ۔

غرض ، اسی طرح دعوت و اصلاح کے ادوار کی ضروریات کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی ۔

۱ ۔ تدوین ، جمع و ترتیب اور حفاظت

* یہ بات صرف قرآن سے ہی مخصوص ہے کہ یہ کتاب جس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ، من و عن بغیر کسی تبدل و تغیر اور تحریف و تقسیم یا ترمیم و تنسیخ کے بالکل اصلی اور محفوظ حالت میں ہمارے پاس موجود ہے ۔ اس پر سب کا اتفاق ہے ، حالاں کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں اب تو اپنی شکل و صورت اور اصلیت بالکل کھو چکی ہیں ۔ قرآن سے پیشتر کی آسمانی کتابوں کے بر عکس اس کتاب (قرآن) کی حفاظت کی ضمانت خود اس کے نازل کرنے والے نے لی ہے ، یہی وجہ ہے کہ اس میں ادنیٰ تغیر و تبدل اور سرمو تفاوت کی بھی کوئی گنجائش نہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو تاریخ کے مطالعے سے بھی ثابت ہوتی ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ

قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے ۔ (حم السجدة ۔ ۴۲)

---

* یہ بند مرتب کا تحریر کردہ ہے ۔

Marfat.com

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ

بلا شبہہ ہم پر قرآن کے جمع
رکھنے کی ذمہ داری ہے۔
(القیامہ - ۱۷)

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝

بے شک ہم نے اس الذکر (قرآن) کو اتارا
ہے۔ اور ہم ہی اس کی قطعاً حفاظت
کرنے والے ہیں (الحجر - ۹)

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۝ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝

بلکہ وہ تو بلند و بالا ، برتر قرآن لوح
محفوظ میں ہے۔ (البروج - ۲۱ - ۲۲)

اور قرآن کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی حفاظت ، جمع و ترتیب اور کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ ہی جاری ہوا اور آخری مرحلے تک جاری رہا ، جب کہ اس سے پہلے کی آسمانی کتابیں ابتداً زبانی یادداشتوں اور گیتوں اور قصوں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلم بند ہوئیں ۔ لیکن قرآن اول تا آخر ابتدائی دور ہی میں لکھ لیا گیا تھا ۔

• اس سلسلے میں سورہ فاتحہ کے بعد قرآن کی پہلی سورۃ (البقرۃ) کی پہلی آیت میں اولین شہادت ہے :

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ

یہ ایک نوشتہ ہے جس میں شک
نہیں ہے ۔ (البقرہ - ۲)

پیش کرنے والا اس کو ابتدا ہی سے نوشتہ اور مکتوبہ (کتاب) شکل میں پیش کرنا چاہتا ہے ۔ اور کتاب یا نوشتہ کا یہ لفظ کچھ اسی ایک مقام پر استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن کی ہر بڑی سورت میں کتاب یا نوشتہ ہونے کا مسلسل ذکر ملتا چلا جائے گا ۔ پھر :

• یہ حصہ مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب "تدوین قرآن" سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ

اس (قرآن) کو صرف پاک لوگ ہی
چھو سکتے ہیں - (الواقعۃ - ۷۹)

کا فقرہ بھی اس بات پر کافی دلیل ہے کہ خود قرآن نے اپنے آپ کو ایک ایسی نوشتہ اور مکتوبہ شکل میں پیش کیا ہے جس کے چھو جانے کا بھی امکان تھا -

پھر اس کی کتابت و حفاظت کا اہتمام دیکھیے کہ دو شنبہ ربیع الاول سنہ ۴ نبوی کو دوسری وحی اور تبلیغ کا حکم ہوا - پنج شنبہ کو خالد بن سعید مشرف بہ اسلام ہوئے - ان سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتابت شروع کرائی - ان کی دختر ام خالد بنت سعد نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ میرے باپ نے لکھی - اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی - اور ایک دو نہیں بہت سے اصحاب سے کتابت وحی کا کام لیا جاتا تھا بلکہ مورخین نے ان کی تعداد ۴۲ تک بتائی ہے (و کتابہ اثنان و اربعون) اور کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرا اس کو انجام دیدے - حتیٰ کہ ایک صحابی حنظلہ بن ربیع رض تمام کاتبوں کے خلیفہ اور سردار تھے اور ان کو حکم یہ تھا کہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو - اس انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلم بند ہو جاتی تھی - حضرت ام سلمہ رض کہتی ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام قرآن مجید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لکھواتے تھے - مزید احتیاط یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف لکھوانے پر ہی قناعت نہ فرماتے تھے بلکہ کاتب جب لکھ لیتے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پڑھوا کر سنتے - اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) درست کراتے - جب یہ سب کام پورا ہوجاتا تب اشاعت عام کا حکم دے دیا جاتا تھا - پھر جو لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے - حضرت زید بن ثابت رض کے الفاظ میں " جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مجھ کو بلاتے تھے - میں تختی اور دوات قلم لے کر حاضر ہوتا - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) لکھاتے ، لکھنا کر پھر سنتے ، اگر کوئی غلطی ہوتی تو صحیح کرا دیتے - " پھر یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ قرآن کی کتابت کے لیے بغایت احتیاط بہترین چیزوں کا انتخاب کیا گیا تھا - جن میں ،

Marfat.com

رقاع[۱]، لحاف[۲]، کتف[۳]، عسیب[۴]، ادیم[۵]، اقتاب[۶]، وغیرہ عام طور پر مستعمل تھیں تاکہ ایک طویل مدت تک آفات و حوادث سے حفاظت رہے۔

* غرض، اس حزم و احتیاط، اور انتظام و انصرام کے ساتھ قرآن کریم اپنی مدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا۔ اور آیات اور سورتوں کی جمع و ترتیب کی تکمیل بہ حکم خداوندی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی اور پورا قرآن موجودہ ترتیب آیات و سور کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر ہدایت و نگرانی قید تحریر میں آ گیا۔ چناں چہ تمام اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ آج تک اسی نبوی جمع و ترتیب کے مطابق ایک نقطہ اور شوشہ کی بھی کمی بیشی کے بغیر قرآن محفوظ و موجود ہے، جیسا کہ مولانا بحرالعلوم "شرح مسلم الثبوت" میں لکھتے ہیں کہ

"قرآن کی یہ ترتیب جس پر وہ آج ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔"

اور مشہور شیعی فاضل علامہ سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں مشہور شیعہ مجتہد علم القرآن علامہ سید مرتضیٰ سے ناقل ہیں کہ

"قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا، اور اسی طرح سے اس وقت پڑھا جاتا تھا، اور اسی طرح سے یاد کیا گیا، اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سامنے پڑھا جاتا اور صحابہ کی بڑی جماعت نے اکثر بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن اسی طرح سنایا، جس سے صاف روشن ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا نہ کہ متفرق و غیر مرتب۔"

---

۱ چمڑا (چرمی قطعات)۔ ۲ پتھر کی سفید پتلی پتلی تختیاں۔ ۳ اونٹ کے مونڈھے کی گول ہڈی (طشتری کی طرح)۔ ۴ کھجور کی شاخوں کی جڑ کا وہ کشادہ اور عریض حصہ جس میں کانٹے والے پتے نہیں ہوتے۔ ۵ باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا تھا (اور عرب میں گوشت خور ملک ہونے کی وجہ سے ان کا کافی ذخیرہ تھا چناں چہ خیمہ بھی صرف ادیم کے چمڑوں سے تیار کیا جاتا تھا)۔ ۶ قتب کی جمع۔ اونٹ کے کجاوہ کے چوڑے اور پتلے تختوں کے ٹکڑے۔

* یہاں سے اس بحث کے اختتام تک کا حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

پھر نہ صرف یہ کہ اس کا صرف ایک ہی نسخہ تھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لکھا گیا تھا ، جس کو سرکاری جلد کہا جا سکتا ہے ، بلکہ بہت سے صحابہ کے پاس بھی پورا قرآن مکتوبہ شکل میں تھا اور بہت سے ایسے صحابہ بھی تھے جن کے پاس اگرچہ مکمل قرآن لکھا ہوا نہ تھا لیکن اس کا بہت بڑا حصہ تحریری شکل میں تھا ، اور یہ سب ایسی تاریخی حقیقتیں ہیں کہ وقت کے بڑے بڑے مستشرقین تک ان کا اعتراف کرتے اور ان کی شہادت دیتے ہیں۔ چناں چہ سر ولیم میور نے لکھا ہے کہ

" اس بات کے ماننے کی زبردست وجوہ ہیں کہ رسول کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہ کے پاس موجود تھے ، اور ان نسخوں میں پورا قرآن یا تقریباً تمام قرآن لکھا ہوا تھا ۔"

اور ڈاکٹر راڈ ویل رقم طراز ہیں کہ

" قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسول میں عام طور پر زیر استعمال تھے ۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس قرآن کے لکھے جانے اور اس کی نشر و اشاعت میں جتنی عظیم الشان وسعت ہوئی ہے اسے علامہ ابن حزم اپنی مشہور کتاب " الفصل بین الملل و النحل " میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

" جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اس وقت کا کل جزیرۂ عرب مسلمان ہوگیا تھا ، جو مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے گزرتا ہوا مشرق میں بحر فارس سے دریائے فرات پر گذرتا ہوا شام کے کنارے کنارے بحر قلزم پر ختم ہوتا ہے اور اس جزیرۂ عرب میں بے شمار شہر اور مواضعات ہیں ، جیسے یمن ، بحرین ، عمان ، نجد ، قبیلۂ طے کے دو پہاڑ (اجا ۔ سلمیٰ) قبائل مضرو ربیعہ و قضاعہ کے قصبات ، طائف ، مکہ ، مدینہ وغیرہ ، غرض یہ تمام جزیرہ مسلمان ہو گیا تھا ، اور اس میں کوئی شہر اور کوئی گاؤں اور کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو ، اور ان تمام مسجدوں میں پانچوں وقت نماز میں قرآن پڑھا جاتا تھا ، اور مسلمان اپنے بچوں اور عورتوں اور مردوں کو قرآن کی تعلیم دیتے تھے ۔ پھر حضرت ابو بکر رض خلیفہ ہوئے اور ڈھائی سال خلیفہ رہے ، فارس اور روم سے جہاد کیا ، یمامہ کو از سر نو فتح کیا اور اب قرآن کو جاننے والے اور زیادہ ہو گئے اور بے شمار

Marfat.com

صحابہ نے جس طرح قرآن کو لکھا تھا اسی طرح بعد میں دیگر بلاد اسلامیہ میں بہت سے لوگ تھے جنھوں نے قرآن لکھا تھا ، اور کوئی شہر مسلمانوں کا ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے ہوئے نہ ہوں ، پھر خلیفہ اول کا انتقال ہوا اور حضرت عمر رض خلیفہ ہوئے اور تمام فارس ، تمام شام ، جزیرہ اور تمام مصر کو فتح کیا ، اور ان تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں اور کوئی شہر ایسا نہ تھا جس میں قرآن کے نسخے لکھے نہ گئے ہوں ، ہر ہر قریہ میں آئمہ نے قرآن سکھایا ، مشرق و مغرب کے بے شمار مکتبوں میں بچوں کو قرآن کی تعلیم دی جاتی - اس طرح لا تعداد قرآن لکھے گئے ، اور بدستور قرآن پڑھایا جاتا رہا ، اور دس سال کچھ مہینے یہی حالت رہی ، اور عہد عمر میں مصر و عراق اور شام و یمن کی وسیع و عریض سرزمین میں ایک لاکھ سے کم نسخے قرآن کے مسلمانوں کے پاس نہ ہوں گے - پھر حضرت عمر رض کا انتقال ہوا اور حضرت عثمان رض خلیفہ ہوئے اور فتوحات اسلام بہت زیادہ ہوئیں اور اسی کے ساتھ قرآنی نسخوں اور مساجد وغیرہ تمام باتوں میں زیادتی ہوئی ، اور اس زمانے میں قرآن کے اس قدر نسخے لکھے گئے اور مسلمانوں کے پاس موجود تھے کہ کوئی اس پر قادر نہیں کہ اس کا شمار بتا سکے اور اس کی تعداد کا اندازہ لگا سکے -"

ماخذ دوم : السنة*

تعریف - معنی : "سنت" کے لغوی معنی طریقے اور راستے کے ہیں - خواہ وہ اچھا ہو یا برا - چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ "جس نے کوئی اچھی سنت قایم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور قیامت تک اس سنت کی پیروی کرنے والے کے عمل کا بھی -" لیکن عرف میں اس لفظ (سنت) سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ اور معلوم طریقہ ہے جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار عمل کیا جس کی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محافظت فرمائی اور جس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم عام طور پر پابند رہے - اور پھر محدثین کی اصطلاح میں آکر اس لفظ (سنت) کے مفہوم کا دائرہ پھیل گیا ، اور اس سے مراد ہوا رسول کا قول ، تقریرا[1] اور آپ کی صفات اور سیرت کے بارے میں جو کچھ بھی بیان کیا گیا ہے - اس اصطلاح کی رو سے "سنت" لفظ "حدیث" کا مترادف ہے -

---

* یہ حصہ مولانا افتخار احمد بلخی کا تحریر کردہ ہے - (مرتب)

۱- وہ کام جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا گیا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے منع نہیں فرمایا ' اصطلاح میں " تقریر " کہلاتا ہے -

Marfat.com

قرآن کے بعد سنت اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ ہے۔ اور قرآن کے بعد اس کا درجہ آتا ہے۔ کیوں کہ سنت اپنی اصل حیثیت سے قرآن کے اجمال کی تفصیل اور اس کے اشکال کی توضیح و تفسیر ہے۔ لیکن قرآن سے مرتبہ میں موخر ہونے کے باوجود ایک جہت سے سنت بجائے خود ایک مستقبل مصدر قانون ہے۔ کیوں کہ سنت میں ایسے احکام بھی وارد ہوئے ہیں جن پر قرآن خاموش ہے۔ مگر اس لحاظ سے مستقل قانون سازی کا منبع ہونے کے باوجود سنت قرآن کے تابع ٹھرتی ہے۔ کیوں کہ وہ قرآن کا بیان و تفسیر ہونے کے علاوہ ان مقامات پر بھی قرآن کے مبادی اور اس کے قواعد عامہ سے متجاوز نہیں ہوتی جہاں قرآن خاموش ہے۔

حجیت حدیث و سنت: حدیث اور سنت دونوں مترادف ہوں، جیسا کہ محدثین کی اصطلاح ہے، یا سنت کو رسول کے طریق عمل کے لیے خاص سمجھا جائے اور حدیث کو قول رسول کے لیے۔ بہ ہر حال حدیث و سنت کی حیثیت دین میں سند اور حجت ہونے کی ہے، اور ہر ثابت شدہ سنت اور ہر وہ ارشاد یا عمل جس کی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف نسبت ہو اور وہ قرآنی معیار اور اصول روایت و درایت کی رو سے بہ ظن غالب بھی صحیح ٹھہرے، تو وہ جمہور امت مسلمہ کے عقیدے میں واجب التسلیم ہے۔ اور یہ بات ایسی نہیں جس کے لیے کسی قسم کی باریک بینی اور علم و بصیرت کی ضرورت ہو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا کو خدا مان لینے کے بعد اس کی فرماں برداری ضروری ہو جاتی ہے، کیوں کہ عقل عام تک اس بات کو جائز اور ممکن نہیں سمجھتی کہ ایمان تو ہو مگر وہ اپنے اندر کسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ نہ رکھتا ہو، اسی طرح رسول کو رسول مان لینے کے بعد رسول کے ہر قول اور ہر عمل کو رضائے الٰہی کی یقینی اور واحد کلید باور کرنا ضروری ہے۔ اور رسول پر ایمان بھی اپنے اندر رسول کی اطاعت و اتباع کا مطالبہ رکھتا ہے، خواہ رسول کا جسمانی وجود بھی ہو یا اس کا صرف ارشاد یا طریق عمل سامنے ہو۔

تاہم حدیث و سنت کی حجیت اور ان کے دینی سند ہونے سے متعلق بنیادی نکات کے طور پر چند دلائل درج ذیل ہیں۔ ان دلائل کو ہم آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(ا) قرآن کی اندرونی شہادت

(ب) خارجی شہادت

Marfat.com

اور پھر خارجی شہادت کے دو شعبے ہوتے ہیں :

(۱) صحابہٴ کرام رضی اللہ عنہم اور صحابہٴ کرام کے بعد علمائے امت کی حدیث و سنت کے حجت ہونے کی شہادت ۔

(۲) عقلی حیثیت سے اس کی حجیت کا ثبوت ۔

اندرونی شہادت

جہاں تک قرآنی تصریحات کا تعلق ہے ، تو اس سلسلے میں ہمارے سامنے قرآن کی بے شمار آیات میں سے چند یہ ہیں :

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ

یقیناً اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان کیا، جب کہ اس نے ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے ، اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے ۔ (آل عمران ۔ ۱۶۴)

اس سے معلوم ہوا کہ فریضہٴ رسالت محض اللہ کی آیات کا دوسروں تک پہونچا دینا ہی نہیں ہے بلکہ جو لوگ ایمان لے آئیں ان کے معاملے میں رسول کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ ان کو ان آیات الٰہی کی تعلیم بھی دیں ۔ اور تعلیم الفاظ کے سنا دینے کا نام نہیں ہے ، بلکہ مشکل مطالب کا حل کرنا اور مجمل و مبہم باتوں کی تفصیل و تشریح کو تعلیم کہتے ہیں ۔ اور تعلیم کبھی صرف زبان سے ہوتی ہے ، کبھی صرف عمل سے ہوتی ہے اور کبھی زبان و عمل دونوں سے ہوتی ہے، اور یہی وہ ”تعلیم کتاب و حکمت“ ہے جو احادیث و سنن کے نام سے مشہور ہے ۔ لہذا اللہ کی جانب سے مامور کیے ہوئے اس معلم الکتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات کو درمیان سے ہٹا کر محض اپنی عقل و فکر کے بل بوتے پر الکتاب (قران) کا کوئی مفہوم متعین کیا جائے گا تو اس کے بارے میں یہ ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ وہ یقیناً خدا کی مراد و منشا کے مطابق ہے ، لیکن رسول کی زبان و عمل سے بیان کیے ہوئے قرآنی مفہوم کے متعلق ایک لمحہ کے لیے بھی یہ شک نہیں کیا جا سکتا کہ وہ خدا کی مراد و منشا کے ٹھیک مطابق نہ ہو کیوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کام وحی کی نگرانی میں کرتے تھے :

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ

(اے محمد) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف بھیجی ہے تاکہ لوگوں کے درمیان تم اس طرح فیصلے کرو، جس طرح اللہ تم کو دکھائے ۔ (النسا ۔ ۱۰۵)

Marfat.com

اس آیت میں " بمآ اراک اللہ " کا جملہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ بمارایت (جیسا کہ تم دیکھو) نہیں کہا گیا ہے، بلکہ بما اراک اللہ (جیسا کہ اللہ تم کو دکھائے) کہا گیا ہے، اراۃ (دکھانا) اور تنزیل (نازل کرنا) استعمال و مفہوم اور معنی کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں، تنزیل کا تعلق اس وحی سے ہے جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو، اور اراءۃ میں وہ الہام و القا داخل ہے جو بذریعۂ الفاظ نہ ہو، اور لفظ وحی لغت اور حقیقت کے لحاظ سے تنزیل اور اراۃ دونوں کو شامل ہے۔ یہی وہ " بما اراک اللہ " ہے جس کو محدثین اور ائمۂ مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وحی خفی" یا "وحی غیر متلو" سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اللہ کی وہ " اراۃ "، (دکھانا) جس کا اظہار و بیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ و اعمال (حدیث و سنت) کے ذریعے و توسط سے کیا، اللہ کی اراۃ تو ہے، مگر الفاظ نہیں جس کی تلاوت کی جائے۔ لہذا کسی بات سے متعلق رسول کی تعلیم، کسی امر سے متعلق رسول کی تفصیل و تشریح اور کسی معاملے سے متعلق رسول کا فیصلہ محض ایک بشر کا فیصلہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کی اراۃ کا نتیجہ اور فراست نبویہ کا وہ فیصلہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسول کا شریک و سہیم نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

پس یہ آیت اس بات پر صراحتاً دلالت کر رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تو تنزیل (انا انزلنا ...) ہوئی، اور اس کا مصداق قرآن ہے، اور دوسری چیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اراۃ الٰہی (بمآ اراک اللہ) عطا ہوئی جو اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے تنزیل سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے، لہذا اس اراءۃ الٰہی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہیے اور وہ یہی حدیث و سنت ہے۔

اور پھر اس "اراءۃ الٰہی" کی شہادت خود قرآن میں بہ کثرت ہے، بہ طور مثال صرف دو آیتیں درج ذیل ہیں:

(۱) سورۃ القیامہ میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ .... ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ ۞

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے ....
.... پھر اس (کے معانی) کا بیان بھی ہمارے ذمہ ہے۔
(القیامۃ - ۱۷ - ۱۸ - ۱۹)

اس آیت میں تین باتیں فرمائی گئیں ہیں، اور ان تینوں کو اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

Marfat.com

(۱) جمع قرآن (۲) قرآن کا پڑھوانا (۳) قرآن کا بیان

جمع و ترتیب قرآن سے متعلق کوئی ایسی آیت نہیں جس سے یہ واضح ہو کہ اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ تنزیل یہ ہدایت دی ہو کہ فلاں فلاں آیت کو فلاں فلاں مقام پر رکھو۔ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تنزیل کے کیا، لیکن کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ رسول کا یہ کام محض نجی حیثیت سے تھا اور اس کو رسالت سے کوئی تعلق نہ تھا، اور یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآن کی آیات اور اس کی سورتوں کو جس ترتیب سے جمع کیا، اس کی نگرانی و رہنمائی خدا نے نہیں کی تھی۔

اس کے برخلاف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام کو اللہ نے اپنی طرف (علینا) منسوب فرمایا۔ اسی طرح قرآن کا بیان اللہ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (ثم ان علینا بیانہ)، اور بیان کہتے ہیں توضیح و تشریح کو۔ مجمل کی تفصیل کو، اس کے منشا کی تعیین کو اور اشارات کی وضاحت کو۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن میں جو اصولی اور مجمل احکام ہیں، اس آیت کی رو سے ان کا بیان اور ان کی تفصیل و تشریح من جانب اللہ ہونی چاہیے یا نہیں؟ ظاہر ہے، جواب اثبات میں ہوگا، کیوں کہ ان کے بیان و تفصیل و تشریح کو اللہ نے اپنی طرف منسوب فرمایا ہے۔ لیکن قرآن ان کی تفصیل اور تشریح سے خاموش ہے، اور حدیث و سنت ان کی تفصیل و تشریح پیش کرتی ہیں۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حدیث و سنت تنزیل نہ ہونے کے باوجود اراعۃ الٰہی اور وحی میں داخل ہے جب ہی قرآن کے مجمل اور اصولی احکام کی تشریح و بیان کی نسبت اللہ کی طرف (ثم ان علینا بیانہ) صحیح ہوگی باوجودیکہ وہ تشریح و بیان حدیث و سنت میں ہے۔

حدیث و سنت کا بیان القرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، مثلاً

وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ

ہم نے آپ کی طرف الذکر (قرآن) نازل کیا ہے،
تاکہ لوگوں کے سامنے آپ اس چیز کی وضاحت
کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔
(النحل - ۴۴)

Marfat.com

وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِی اخْتَلَفُوْا فِیْهِ

اور ہم نے تم پر یہ کتاب محض اس لیے آتاری ہے
کہ تم ان کے سامنے وہ اصل حقیقت کھول دو جس
میں وہ اختلافات کر رہے ہیں - (النحل - ۱۶)

(ب) بنی نضیر جب اپنے مکانات سے نکال دیے گئے اور ان کے کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دیے گئے اور کچھ چھوڑ دیے گئے تو اس واقعے سے متعلق قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰۤى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ

کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا اپنے جڑوں پر
کھڑا رہنے دیا ، سو وہ خدا کے اذن سے تھا - (الحشر - ۵)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موقع پر درختوں کو کاٹ ڈالنے کا حکم دینا از روئے وحی تھا ، مگر قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں جو اس حکم خداوندی پر دلالت کر رہی ہو - معلوم ہوا کہ وہ حکم خداوندی بذریعۂ تنزیل نہ تھا، بلکہ بذریعۂ ارائۃ النبی یا دوسرے لفظوں میں بذریعۂ وحی خفی تھا -

اب اخیر میں سورۂ آل عمران کی وہ آیت بھی پیش نظر رکھنے کی ہے جس میں صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اہل کتاب کے ہتکنڈوں سے ہوشیار کرتے ہوئے ارشاد ہوا کہ

وَكَیْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَیْكُمْ اٰیٰتُ اللّٰهِ وَفِیْكُمْ رَسُوْلُهٗ

اور تم کس طرح کفر کر سکتے ہو جب کہ تم کو اللہ کی
آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کے رسول
موجود ہیں - (آل عمران - ۱۰۱)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں ہیں ، ایک تو اللہ کی آیات اور دوسری خود رسول کا مستقل وجود ، جو اپنی تعلیم و تلقین اور فیض صحبت اور اثر سے لوگوں کو بھٹکنے نہیں دیتا - لہذا آج جب کہ اللہ کی آیات ، یعنی قرآن تو ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا وہ دوسرا سر چشمہ حدیث و سنت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؟

Marfat.com

پس جب حدیث و سنت کا یہ مقام و مرتبہ متعین ہوگیا کہ وہ تعلیم الکتاب ہے، بیان و توضیح کتاب ہے اور اراءۃ الہیٰ کی مصداق ہے، تو اب اس میں کیا شبہہ باقی رہ جاتا ہے کہ حدیث و سنت کی حیثیت محض تاریخی نظائر کی نہیں ہے، بلکہ وہ دینی مقام رکھتی ہیں، دینی سند ہیں اور دین میں حجت ہیں۔

رہا حدیث و سنت کا واجب التسلیم ہونا، تو اگرچہ ان کے دینی سند و حجت کے ثبوت کے بعد اس کی ضرورت نہیں رہتی کہ ان کے واجب التسلیم ہونے کے بھی دلائل ذکر کیے جائیں، پھر بھی چند قرآنی تصریحات درج ذیل ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اس لیے بھیجا
ہے کہ باذن الہیٰ اس کی اطاعت کی جائے۔
(النسا - ٦٤)

اس سے اصولی طور پر معلوم ہوا کہ رسالت اور مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) ہونا لازم و ملزوم ہے، کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب الاطاعت یقین کرنا ہے۔

دوسری بات یہاں یہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ اطاعت کے لیے اصل وسیلے کی حیثیت سے مرکزی اہمیت نبی کی ذات، اس کے اسوۃ اور مثال کو دی جا رہی ہے۔ یعنی یوں نہیں کہا گیا ہے کہ وما انزلنا من کتاب الا لیعمل بہ (ہم نے کسی کتاب کو نہیں نازل کیا مگر اس لیے کہ اس پر عمل کیا جائے۔) بلکہ فرمایا گیا ہے کہ " وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ " ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی کتب واجب الاتباع ہوتی ہیں، اسی طرح انبیا و رسل کی ہستیاں بھی بالاستقلال واجب الاطاعت اور واجب الاتباع ہوتی ہیں، اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اللہ نے کتاب کے بغیر تو انبیا کو مبعوث فرمایا ہے مگر نبی کے بغیر کوئی کتاب نازل نہیں کی گئی ہے، اور ہر نبی، عام ازیں کہ اس پر کتاب نازل کی گئی ہو یا بغیر کتاب کے اس کی بعثت ہوئی ہو، چوں کہ وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے، اس لیے فرمایا کہ " وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔"

Marfat.com

اس کے علاوہ قرآن میں متعدد مقامات پر " اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول " اور ''اطیعوا اللہ و رسولہ'' جیسے جملوں کے ذریعے سے اطاعت الہیٰ کے ساتھ ساتھ اطاعت رسول کا بھی حکم ہے ، لہذا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر الرسول اور رسولہ کا اطلاق ہوگا ، جتنے لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کی تصدیق کریں گے ، ان پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت واجب ہوگی ۔ اور اطاعت رسول کے الفاظ بولیں ، یا حدیث و سنت پر عمل کہیں ، بات ایک ہی محض لفظی تعبیر کا فرق ہے ۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ

اور کسی مومن مرد اور مومنہ عورت کے لیے یہ گنجائش نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کسی امر کا فیصلہ کر دیں تو ان لوگوں کو اپنے معاملے میں (اس فیصلے کے قبول و عدم قبول کا) کوئی اختیار باقی رہے ۔ (الاحزاب ۔ ۳۶)

یہ آیت اس امر کے لیے نص ہے کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسولہ (اللہ کا رسول) کا اطلاق ہوگا ، (اور قیامت تک ہوگا) اس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر اس بات کا بے چون و چرا تسلیم کرنا لازم ہے جس پر ''ماقضیٰ رسولہ'' (جو اللہ کا رسول فیصلہ کردے) صادق آتا ہے ، اور کسی مومن اور مومنہ کو حق استرداد حاصل نہیں ، اور حدیث و سنت یہی ماقضیٰ رسولہ ہی تو ہے ۔

نہ صرف رسول کی اطاعت کا حکم ہے ، بلکہ رسول کے اتباع [1] کا بھی حکم ہے :

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(مسلمانو!) تمہاری پیروی کے لیے رسول اللہ کی ذات میں بہترین اسوہ ہے ۔ (الاحزاب ۔ ۲۱)

---

۱ اطاعت ، حکم کی تعمیل کرنے اور سر تسلیم خم کر دینے کو کہتے ہیں ۔ اور اتباع کے معنیٰ ہیں کسی کے پیچھے پیچھے چلنا ، نہ صرف کسی کے عمل کی طرح عمل کرنا بلکہ اس لیے اس کے عمل کی طرح عمل کرنا کہ اس نے وہ عمل کیا ہے ۔ اتباع رسول کا مفہوم یہ ہوا کہ رسول کے عمل کی طرح اس لیے عمل کیا جائے کہ رسول نے وہ عمل کیا ہے ۔

Marfat.com

اور یہ تاکید اس لیے کی گئی کہ قرآن پر پوری طرح عمل کرکے ہی خدا کی فرماں برداری کا حق ادا کیا جا سکتا ہے ، اور خدا کی فرماں برداری ہی کر کے کوئی شخص خدا کا محبوب بندہ بن سکتا ہے - اور خدا کا محبوب بندہ بننے کے لیے اتباع رسول کو شرط لازم ٹھہرایا گیا ہے :

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(اے نبی) کہدو ، کہ اگر تم حقیقت میں اللہ
سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو
تب اللہ تم کو اپنی محبت سے نوازے گا -
(آل عمران - ۳۱)

لہذا اس کا واضح نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خدا کی اطاعت کی واحد شکل اتباع رسول ، یعنی سنت رسول کی پیروی ہے -

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ

پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر جو خدا اور
اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کا اتباع کرو -
(الاعراف - ۱۵۸)

اس آیت میں اللہ پر ایمان کا مطالبہ ہے اور رسول کے اتباع کا حکم ہے ، اس میں باریک نکتہ یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد آپ سے آپ اطاعت الہیٰ لازم ٹھیر جاتی ہے ، تو اس اطاعت الہیٰ کے باب میں بتایا کہ اس کی واحد شکل اتباع رسول ہے -

صرف یہی نہیں ، بلکہ قرآن نے جس طرح اللہ کی معصیت کو ضلالت کہا ہے اور اس کے مرتکب کو وعید سنائی ہے اسی طرح رسول کی معصیت کے ارتکاب کو بھی ضلالت قرار دیا ہے اور ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب ٹھیرایا ہے :

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا

اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی
نافرمانی کرے ، وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہوگیا -
(الاحزاب - ۳۶)

Marfat.com

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝

اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی
کرے گا تو ایسے شخص کے لیے نار جہنم ہے ،
جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے ۔ (الجن ۔ ۲۳)

يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ

اس (قیامت کے) دن وہ سب لوگ جو رسول سے سرکشی
کرتے ہوئے رسول کی نافرمانی کرتے ہیں، تمنا کریں گے کہ
کاش زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائیں ۔
(النسا ۔ ۴۲)

ان آیات ، خصوصاً آخرالذکر آیت ، سے صراحتاً معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح قرآن سے انحراف ضلالت اور باعث سزا ہے ، اسی طرح حدیث و سنت سے بے نیازی اور اعراض بھی ضلالت ہے اور اس سے سرکشی کا نتیجہ دردناک عذاب اور آخرت میں رسوائی ہے ۔

خارجی شہادت

* قرآن کی اندرونی شہادت کے بعد خارجی شہادت کے " تاریخی شواہد " والے شعبے پر بھی اس لیے طائرانہ نظر ڈال لینی مناسب ہے کہ قرآن نے یہ اعلان کیا ہے کہ

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ

جو شخص رسول کی مخالفت پر کمر بستہ ہو حالانکہ اس پر راہ راست واضح ہو چکی
اور مومنین کی روش کے سوا کسی اور روش پر چلے تو اس کو ہم اسی طرف چلائیں گے
جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے ۔ (النسا ۔ ۱۱۵)

صحابۂ کرام رض اور ان کے بعد دینی روش پر چلنے والے علما و صلحا نے حدیث و سنت کو دینی حجت و سند باور کیا اور چوں کہ حدیث و سنت کا دین میں سند و حجت باور کرنا بھی ایک " سبیل المومنین " ہے ، اور چوں کہ

---

* ماخوذ از مولانا مودودی ، " تفہیمات " ، افتخار احمد بلخی " انکار حدیث کا منظر و پس منظر " جلد ۳ ، مولانا سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی جلد ۲ ۔

Marfat.com

صحابہ اور ان کے بعد جمہور علما ، حدیث و سنت کو سرمایہ دین سمجھتے تھے تو پھر حدیث و سنت کی حجت سے انکار کرنا " سبیل المومنین " سے رو گردانی کرنے کے مترادف ہوگا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے رویے کو دیکھیے۔ صحابہ ہر معاملے میں یہ دیکھتے تھے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا رویہ کیا رہا ہے اور ہر موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے اسوہ کی پیروی کرتے تھے اور انسانیت کے یہ گلہائے سرسبد جس کو صاحب امر بناتے تھے وہ پہلی بات یہ کہتا تھا کہ " میری اطاعت کرو اگر میں خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کروں اور اگر میں خدا کے احکام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے سر مو بھی انحراف کروں تو نہ میری اطاعت ہے اور نہ تقلید۔ "

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بعد ہر دور کی معتبر و معتمد تاریخ کا ناطق فیصلہ ہے کہ محدثین و فقہا اور ائمہ مجتہدین نے حدیث و سنت کو دینی سند تسلیم کیا ہے اور وہ حدیث و سنت کو قرآن کے بعد اسلامی قانون کا ایک مستقل ماخذ قرار دیتے رہے ہیں ، چناں چہ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں ملتا جس نے بجائے خود حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

اب رہ جاتا ہے عقلی ثبوت ، تو جیسا کہ ابتدا میں اشارہ کیا جا چکا ہے ، عقل عام تک کا تقاضا اور فیصلہ یہ ہے کہ حدیث و سنت کو حجت اور سند کا مرتبہ حاصل ہو۔ اور محض تاریخی یا علمی نظائر کی حد تک اس پر توجہ نہ دی جائے ، کیوں کہ سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن اور اس سے پہلے تمام آسمانی کتابوں کو رسولوں کے واسطے سے کیوں نازل کیا ؟ کیا خدا اس پر قادر نہ تھا کہ مطبوعہ کتابیں یکایک زمین پر اتار دیتا اور ان کا ایک ایک نسخہ نوع بشری کے ہر فرد کے پاس آپ سے آپ پہنچ جاتا ؟— یقیناً وہ اس پر قادر تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس نے نشر و اشاعت کا یہ ذریعہ کیوں نہ اختیار کیا ؟ کیوں کہ یہ تو بہ ظاہر ہدایت کا یقینی ذریعہ ہوسکتا تھا۔ چناں چہ اس کا جواب خود کلام اللہ دیتا ہے کہ خدا نے جتنے رسول بھیجے ہیں ان کی بعثت کا مقصد یہ رہا ہے کہ وہ فرامین خداوندی کے مطابق حکم دیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ وہ الٰہی قوانین کے مطابق زندگی

Marfat.com

بسر کریں اور لوگ انہی کے نمونے کو دیکھ کر اس کا اتباع کریں۔[۱]

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ

(یعنی) ہم نے جو رسول بھی بھیجا اسی
لیے بھیجا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت
کی جائے۔ (النساء۔ ۶۴)

اگر محض کتاب اللہ اتار دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ آیات کے معانی میں اختلاف کرتے اور کوئی اس کا فیصلہ کرنے والا نہ ہوتا، لوگ احکام کے منشا سمجھنے میں غلطیاں کرتے اور کوئی ان کو صحیح منشا بتانے والا نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنہا کتاب اللہ کافی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابل انقطاع ہے۔ اور احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح خود کتاب اللہ کے احکام کی اطاعت فرض ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ ہم صرف کتاب اللہ کو لیں گے اور حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ لیں گے وہ در اصل رسالت سے اپنا تعلق منقطع کرتا ہے اور وہ اس واسطے کو کاٹتا ہے جسے خود اللہ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطے کے طور پر قایم فرمایا ہے۔ وہ گویا یہ کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لیے کافی تھی مگر خدا نے بلا ضرورت یہ فعل عبث کیا کہ (معاذ اللہ) کتاب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے نازل فرمایا۔

کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لازمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب اس سوال پر غور کیجیے کہ آیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی اطاعت اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی صرف ان کی حیات جسمانی تک تھی؟ اگر ایسا ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت صرف اسی عہد کے لیے تھی جس میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے جسم مبارک کے ساتھ زندہ تھے، اور (آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کے رحلت فرماتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رسالت کا تعلق عملاً دنیا سے منقطع ہو گیا۔ اس صورت میں رسالت کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام اگر محض ایک نامہ بر کی طرح کتاب اللہ کو پہنچا دینا تھا، اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ اس صورت میں

۱ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو باب ۱۱ "رسالت"۔ (مرتب)

Marfat.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ضرورت ہی نہ تھی - یہ کام کوئی فرشتہ کرسکتا تھا، بلکہ بلا واسطہ بھی ممکن تھا -

لیکن ، اگر کتاب پہنچا دینے کے علاوہ بھی کسی شے کی ضرورت تھی اور اسی کے لیے اتباع کے احکام دیے گئے تھے ، اور اگر ہدایت نوع بشری کے لیے قرآن کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور سیرت نبوی کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر یہ سب صرف تیئیس یا چوبیس سال کے لیے ہونا کیا معنی رکھتا ہے - محض ایک صدی کے چوتھائی حصے کے لیے ایک رسول مبعوث کرنا اور اتنی سی مدت کے لیے رسالت کا اتنا بڑا منصب قائم کرنا اور ایک چیز کو جو ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم و جان کا تعلق منقطع ہوتے ہی دنیا کے لیے غیر ضروری ہو جانے والی تھی ، اتنی شد و مد کے ساتھ ذریعے ہدایت قرار دینا ، یہ سب کچھ بچوں کا کھیل معلوم ہوتا ہے جو (معاذ اللہ) خدائے حکیم و دانا کے ہرگز شایان شان نہیں ہے - اور جب ایسا ہے (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت ہمیشہ کے لیے ہے) تو وہ تمام آیات اور احکام بھی ہمیشہ کے لیے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات کو اسوۂ حسنہ بتایا گیا ہے - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اتباع کو رضائے الٰہی کے حصول کا واحد ذریعہ کہا گیا ہے - اور ہدایت کا دامن آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے - (وان تطیعوہ تھتدوا) - تو رضائے الٰہی حاصل کرنے اور ہدایت پانے کی ضرورت ظاہر ہے کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عہد لوگوں کو تھی اسی طرح آج کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک جو لوگ آئیں گے ان سب کو بھی رہے گی -

کتنی موٹی سی بات ہے کہ اگر قرآن کے علاوہ دین میں کوئی چیز حجت اور سند نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قول دینی حیثیت سے کوئی مقام نہیں رکھتا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن کے بارے میں یہ کہنا بھی قاعدے سے حجت نہ ہونا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے - پس جب قرآن کے علاوہ نبی کا ایک قول بھی حجت بن گیا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیگر اقوال کی حجت کا کس طرح انکار کیا جا سکتا ہے ؟ حجت کا دروازہ ایک قول کے لیے کھلتا ہے تو سب کے لیے کھلے گا اور بند ہوگا تو ہر قول کے لیے بند ہو جائے گا - اور یہ بات تو بالکل قطعی ہے ، جس کا بار بار اعادہ کیا گیا

Marfat.com

ہے کہ حدیث و سنت کے بغیر تو در اصل قرآن سے بھی اکتساب ہدایت ممکن نہیں ہے ۔ احادیث و آثار اور روایات کے بغیر تو خود آیات کا مفہوم و مطلب مبہم اور بڑی حد تک تشنہ رہ جائے گا ۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی جس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صاف تاکید ہے کہ " میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں ، جب تک تم انہیں تھامے رہو گے گمراہ نہ ہو گے ۔ کتاب اللہ اور میری سنت ۔" حضرت ابن عباس کے واسطے سے یہ فرمان نبوی قابل غور ہے ۔ جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کچھ رکھا جائے تو وہ واجب التعمیل ہے ۔ اس کے ترک میں کسی کے لیے عذر جائز نہیں ، اگر کوئی چیز کتاب اللہ سے نہ ہو لیکن نبی کی سنت سے ہو تو وہ بھی ویسی ہی واجب التعمیل ہے ۔" ایک روز صبح کی نماز کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا ۔ پس تم میری سنت اور میرے راست رو ہدایت یافتہ خلفا کے طریقے پر جمے رہنا اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیوں کہ ہر بدعت گمراہی ہے ۔"

ان تفصیلات سے یہ بات اپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ نے جب اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی تاکید فرمائی ۔ جب اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا محبوب بندہ بننے کے لیے شرط لازم قرار دیا ، جب معصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وعید سنائی ، جب اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دیا ، جب حدیث و سنت کو بیان القرآن اور تعلیم الکتاب قرار دیا تو ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث و سنت کو محفوظ ہونا چاہیے ، ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع اور تعلیم و تشریح قرآن پر عمل ایک ناقابل عمل حکم ہو کر رہ جائے گا ، چناں چہ خدا نے اس کی حفاظت کے سامان بھی فراہم کر دیے اور وہ آج تک محفوظ ہے ۔ یہ (سنت) قرآن میں محفوظ ہے ، امت کے تعامل کی شکل میں محفوظ ہے ، تواتر کی صورت میں محفوظ ہے ، اور ان روایات و آثار کے اندر محفوظ ہے جو قرآنی معیار اور روایت و درایت کے مسلمہ اصول پر پوری اتریں ۔

Marfat.com

کتابت، حفاظت، تدوین: * اوپر کی تفصیل سے یہ بات تو واضح ہو گئی ہوگی کہ حدیث کا تعلق براہ راست ایک خاص تخلیقی وجود یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہے اور صرف ایک واحد شخص کی زندگی کے واقعات کا بیان اس کا اصل دائرے کار ہے۔ جب کہ عام تاریخی ذخیروں کا تعلق کسی حکومت، کسی عظیم الشان جنگ وغیرہ یا اسی قسم کی اور منتشر اور پراگندہ چیزوں سے ہے جن کا احاطہ احادیث کے برخلاف آسان نہیں ہے۔

یہ بات بھی بالکل روشن ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مورخین یعنی صحابہؓ کرام کا باھمی تعلق ایک عینی شاھد کا تھا جس کی بنیادیں عشق و سرمستی، والہانہ محبت، اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ھر چیز سے دست بردار ہوکر صرف اس کی آواز میں گم ہونے کا آخری اور قطعی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیان کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں، ہر جگہ ملتے تھے اسی لیے اس تاریخ (حدیث) کے ہر ہر واقعہ اور جزو کو، اور ایک ایک خط و خال کو انہوں نے محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو اسی طرح دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ ہر حاضر غائب کو اور ہر پہلا پچھلوں کو بتلاتا تھا۔ کیوں کہ منیٰ کے میدان میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) خود اعلان فرما چکے تھے ''اللہ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک انہیں پہنچا دیا۔'' پھر حکم تھا '' الافلیبلغ الشاھد الغائب '' (تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچاتا جائے) اور '' ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ھیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہنا '' کیوں کہ '' تم مجھ سے سن رہے ہو، تم سے بھی سنا جائے گا اور جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے '' (حدیث)۔ چناں چہ صحابہؓ کرام جن حقائق و تعلیمات (حدیث) کی نشر و اشاعت کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اس کا چھپانا وہ گناہ خیال کرتے تھے۔ کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد انہیں یاد تھا کہ '' جس کسی سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور اسے وہ چھپائے تو قیامت کے دن آگ کی لگام اسے پہنائی جائے گی '' اور اسی کا نتیجہ تھا کہ

---

* ماخوذ از مولانا مناظر احسن گیلانی۔ ''تدوین حدیث'' ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، ''سنت رسول'' اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ '' مقدمہ صحیفہ ھمام بن منبہ ''۔ (مرتب)

Marfat.com

سکرات میں مبتلا ہیں لیکن بعض سے یہ مروی ہے کہ اس وقت بھی محض اس خیال سے کہ " علم چھپانے " کا الزام ان پر نہ رہ جائے حدیث بیان کرتے جاتے تھے (صحاح) - لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ جس ذات گرامی کے ہر قول کو وہ خدا کی بات اور خدا کا حکم سمجھتے تھے اس نے بار بار بہ کثرت ان کی فطرت میں یہ تہدیدی خوف اس طرح راسخ کر دیا تھا کہ " جو مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا ، اس کا ٹھکانا آگ (جہنم) میں ہوگا " اور عقل بھی تقاضا کرتی ہے کہ جس قسم کے ایمان و ایقان کی دولت سے یہ لوگ سرفراز تھے اس کی موجودگی میں خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے کی جرأت ان کو نہیں ہو سکتی تھی - اور جس اعلیٰ کردار کے وہ مالک تھے - اس سے غلط بیانی کی توقع کون کر سکتا تھا جب کہ قرآن نے بھی مفتری علی اللہ (خدا پر جھوٹ باندھنے والے) کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے - اس لیے بعض صحابہ اپنی اس نازک تاریخی ذمہ داری کا احساس اس طرح کرتے کہ ذخیرۂ حدیث کے سب سے بڑے راوی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ دوامی قاعدہ تھا کہ حدیث جس وقت بیان کرنی شروع کرتے تو کہتے " فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا ، چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے -" پھر جو کچھ بیان کرنا چاہتے بیان فرماتے -

جن مورخین کا تعلق اپنے تاریخ سے اس قدر ہو اور جن لوگوں کا تعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس قسم کا ہو انہوں نے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی نگہداشت میں ، جس کے خدا کی طرف سے بھی وہ محافظ اور مبلغ قرار دیے گئے تھے ، کس اہتمام و انہماک اور توجہ سے کام لیا ہوگا - ایک ایک " موئے مبارک " جن کے نزدیک دنیا و مافیہا سے زیادہ محبوب تھا ان کے نزدیک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اقوال و افعال کی کیا قیمت ہوگی -

ان حقایق کی روشنی میں تاریخی ذخیرے کیسے غیر معتبر نظر آتے ہیں جن کی بنیاد صرف پرانی قبروں کے کتبوں ، سکّوں کے ٹھپوں ، کھنڈرات ، سنگی یا برنجی تختیوں یا خود نوشت سوانح عمریوں پر قایم کی گئی ہے ، جن کے سند کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا بلکہ روایت اس قسم کی بھی پائی جاتی ہے کہ " یہ پرانی تختی کچھ دن ہوئے گاڑ دی گئی تھی " پھر اس سے قطع نظر

Marfat.com

معاملہ ایک شخصی بیان سے آگے نہیں بڑھتا - عینی شاھدوں کا تو سوال ھی پیچیدہ ھے !

لیکن مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ "حدیث" ایک امتیازی شان رکھتا ھے جس کو قدرتی عوامل نے تدوین و تحفظ میں پوری مدد دی تھی - اس کے چشم دید گواھوں اور اس کے مورخین کی تعداد ایک لاکھ سے تجاوز کرتی ھے جس میں مرد اور عورت دونوں کا حصہ ھے - جو زندگی کے ھر پہلو پر محیط ھے اور با سورتھ اسمتھ کے الفاظ میں "یہاں پورے دن کی روشنی ھے جو ھر چیز پر پڑ رھی ھے اور ھر ایک تک وہ پہنچ سکتی ھے -"

جہاں تک حدیث کی کتابت کا تعلق ھے ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ھے کہ حدیث کی تدوین و ترتیب دو ڈھائی سو سال بعد صحاح ستہ[1] کے زمانے سے ھوئی یا بہت آگے بڑھایا تو ابن شہاب زھری سے سلسلہ ملا دیا جاتا ھے - لیکن یہ بات جتنی مشہور ھے اتنی ھی غلط ھے - حدیث کی تدوین ، جیسا کہ اوپر کے مختصر سے جائزے سے معلوم ھو گیا ھوگا ، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ھی شروع ھو چکی تھی اور بعد کی پیداوار بالکل نہیں ھے -

صحابہ٭ کرام ، جن کا تعلق اوپر بتایا جا چکا ھے ، کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قسم کا تھا ، حدیث کے زندہ نسخے تھے اور تدوین حدیث کی پہلی صورت وھی قرار پاتے ھیں - اور حدیث کا بہت بڑا ذخیرہ در اصل ان ھی کی حفاظت و روایت کا مرھون منت ھے - اگر کتابی صورت میں احادیث کا ذخیرہ محفوظ نہ کیا جاتا تو یہ ذریعہ بھی در اصل بہت کافی تھا - ھمارے یہاں حدیث کا بڑا حصہ تواتر ھی کے ذریعے سے پہنچا ھے -

حفاظت حدیث کے اس ذریعے کے علاوہ دوسرا ذریعہ٭ حفاظت کتابی شکل میں تدوین ھے - اس سلسلے میں ذیل کی چند شہادتیں کافی ھوں گی :

ھجرت مدینہ کے فوراً بعد ھی " پہلا تحریری دستور مملکت " کتابت حدیث کا پہلا ثبوت ھے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ریاست مدینہ میں نافذ

---

۱ صحاح ستہ سے مراد حدیث کی چھ صحیح ترین اور قابل اعتماد کتابیں ھیں جو اپنے مولفین کے نام سے جانی جاتی ھیں یعنی بخاری ، مسلم ، ترمذی ، ابو داؤد ، نسائی اور ابن ماجہ - (مرتب)

Marfat.com

فرمایا اور جس میں قریش ، مدینہ کے مسلمانوں اور انصار و یہود کے حقوق کا تعین ہے[1] - اسی طرح ہجرت کے ابتدائی زمانے میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مردم شماری کرائی - آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ ہیں '' مجھے ان لوگوں کے نام لکھ دو جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں ۔'' سرکاری دستاویزوں اور معاهدوں ، پروانوں وغیرہ کا آغاز تو ہجرت سے پہلے ہی ہو چکا تھا - چناں چہ تمیم داری کو فلسطین کا شہر حبرون بہ ذریعۂ پروانہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جاگیر میں دیا تھا - یا سفر ہجرت میں سراقہ بن مالک کو پروانۂ امن عطا فرمایا - اس سے قطع نظر سنہ ۱ ہجری میں قبیلۂ جہینہ سے حلیفی کا معاہدہ ، اور بنی ضمرہ سے معاہدہ کا مخطوطہ اب تک ملتا ہے ، یہ معاہدوں کا سلسلہ زندگی بھر جاری رہا - سنہ۵ ہجری میں خندق کے زمانے میں بنی فزارہ اور غطفان سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ایک توثیق طلب یا مسودہ معاہدہ کیا تھا جسے بعد میں محو کر دیا گیا - یا سنہ ۶ ہجری کا صلح نامہ حدیبیہ اور اس کے بعض الفاظ پر آپس کا بحث مباحثہ مشہور ہے - سنہ ۹ ہجری میں آل اکیدر دومۃ الجندل سے اطاعت کا معاہدہ ، اور قیصر و کسریٰ ، مقوقس و نجاشی وغیرہ حکمرانوں کو تبلیغی خطوط کی روانگی روشن چیزیں ہیں - کسریٰ نے نامۂ مبارک کو جو تحریری صورت میں تھا ، چاک کر دیا تھا - انتظامی ضرورتوں سے اکثر مواقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرہ نمائے عرب کے اطراف و اکناف میں اپنے ہر جگہ کے گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کو وقتاً فوقتاً جو ہدایات و فرامین تحریری صورت میں روانہ کیے، تاریخ میں محفوظ ہیں - خطوط پر ثبت کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مہر تیار کرانا بھی معروف واقعہ ہے - غرض ایسی سیاسی و غیر سیاسی دستاویزوں وغیرہ میں تحریری حدیثوں کو اکٹھا کرنے کی کوششوں کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد صحابہ ہی میں شروع ہو چکا تھا -

عہد نبوی میں ان مندرجہ بالا سرکاری طور پر لکھی ہوئی احادیث کے علاوہ نجی طور پر اور اتفاقی حیثیت سے مرتب شدہ احادیث کے نسخوں کی بھی بہ کثرت شہادتیں ملتی ہیں - مثلاً فتح مکہ کے موقع پر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جو اہم خطبہ دیا تھا ایک یمنی شخص ابو شاہ کی درخواست پر انہیں لکھوا کر دے دیا -

---

۱ یہ وثیقہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی مرتب کردہ کتاب '' سیاسی وثیقے '' مطبوعہ ادارۂ ترقی ادب لاہور ، میں دیکھا جا سکتا ہے - نیز موصوف کی کتب '' دور نبوی کا نظام حکمرانی (The Muslim Conduct of State) میں بھی اس پر گفتگو کی گئی ہے - (مرتب)

Marfat.com

یا عتبان بن مالک انصاری کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک خطبے کی بات بڑی اچھی لگی انہوں نے اسے لکھ لیا ۔

اگرچہ چند ایسی روایتیں بھی ملتی ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کو قرآن کے سوا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے سنی ہوئی کسی چیز کے لکھنے کی ممانعت فرمائی ، جس پر لکھی ہوئی چیزیں مٹادی گئیں بلکہ ایک مرتبہ تو کہتے ہیں کہ خاصی تعداد میں جلا بھی دی گئیں ۔ لیکن غور سے چھان بین کرنے پر نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق یا تو ابتدائے اسلام سے تھا یا ایسے لوگوں کے متعلق تھا جو تازہ مسلمان ہوئے تھے اور قرآن و حدیث میں فرق نہ کر سکتے تھے ۔ جنہیں قرآن خوب یاد تھا اور جن کی صلاحیتوں پر اطمینان تھا تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حدیث لکھنے کی نہ صرف اجازت دی بلکہ ترغیب بھی دی ہے ۔ مثلاً ایک انصاری نے اپنے حافظے کی کمزوری کی شکایت کی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا " اپنے داھنے ھاتھ سے مدد لو" (لکھ لو) ۔ اسی طرح عبداللہ بن عمرو بن العاص رض حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے ملفوظات نبوی لکھا کرتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ لیں؛ لوگوں نے انہیں منع کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بشر ہیں کبھی خوشی اور کبھی خفگی کی حالت میں ہوتے ہیں ، اس لیے بلا امتیاز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات کو لکھ لینا مناسب نہیں ہے ۔ عبداللہ بن عمرو نے اس پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا " کیا رضامندی اور غضب ہر حالت میں جو آپ کہیں لکھ لیا کروں ؟" تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا " ہاں ، بخدا اس سے (منہ سے) جو کچھ بھی نکلتا ہے حق ہی ہوتا ہے ۔" چناں چہ حضرت عبداللہ بن عمرو نے ایک ہزار حدیثوں کا مجموعہ مرتب کیا جس کا نام "صادقہ" رکھا ۔ اسی طرح حضرت علی ، حضرت انس بن مالک ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، حضرت سعد بن عبادہ ، حضرت ابو ہریرہ ، حضرت سعد بن ربیع ، حضرت سمرۃ بن جندب ، حضرت عبداللہ بن ربیعہ اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہم وغیرہ نے حدیثیں جمع کیں اور مجموعے مرتب کیے ۔ وھب بن منبہ شاگرد حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، ھمام بن منبہ شاگرد حضرت ابو ھریرہ رض ، سلمان بن قیس شاگرد جابر رض وغیرہ کے مجموعے مشہور و معروف ھیں ۔ ام المومنین حضرت عایشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو پڑھنا تو آتا تھا مگر خود لکھتی نہ تھیں چناں چہ ان کے بھانجے عروۃ بن زبیر نے ان کے علاوہ دیگر صحابہ کی حدیثیں بھی لکھی تھیں جو جنگ حرہ میں تلف ہوگئیں جن کا انہیں ساری عمر غم رہا ۔ حضرت عائشہ رض کے دوسرے شاگرد عمرۃ بنت عبدالرحمان اور قاسم بن محمد تھے ۔ ان کے پاس بھی

Marfat.com

احادیث کا ذخیرہ تھا ۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کوئی پانچ سو احادیث کا مجموعہ تیار کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر تلف کر دیا کہ کہیں سہو سے کوئی غلط لفظ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب نہ ہو گیا ہو ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی احادیث نبویہ کو حکومت کی جانب سے جمع کرنے کا اہتمام کیا اور صحابہ کرام نے اس کی حمایت میں مشورہ بھی دیا لیکن پھر آپ نے یہ ارادہ منسوخ کر دیا ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تو وفات کے بعد ایک بار شتر تالیفات کا چھوڑا تھا ۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع املا لکھا کرتے تھے ۔

غرض حدیث کی کتابت ، اس کی حفاظت ، اور جمع و تدوین کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں شروع ہو چکا تھا جسے صحابہؓ کرام نے وسعت دی اور تابعین نے اضافے کیے لیکن صحاح ستہ کے مرتبین نے اسے بام عروج پر پہنچا دیا اور آج خدا کی کتاب کے بعد انسانی ذخیرۂ علم میں جو چیز سب سے زیادہ معتبر اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے ۔

ماخذ سوم : " اجتہاد "

* اسلامی شریعت کے اصل ماخذ قرآن و سنت ہی ہیں ۔ اجتہاد کی حیثیت ایک ضمنی ماخذ کی ہے جو اول الذکر دونوں ماخذ کے تابع اور ان کی بتائی ہوئی حدود کے اندر ہماری رہنمائی کرتا ہے اور جس کی مدد سے ہر دور میں شریعت کے حقیقی منشا کو سمجھنے اور متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

تعریف : " اجتہاد " کے لغوی معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس سے مراد وہ کوشش ہے جو احکام کا علم شرعی دلائل سے حاصل کرنے کے لیے کی جائے ۔ یعنی دین کے سر چشموں سے احکام استنباط کرنے کی سعی کرنا[1] ۔

علامہ آمدی اپنی مشہور کتاب " الاحکام فی اصول الاحکام " میں اجتہاد کی تعریف اس طرح کرتے ہیں :

" ارباب اصول کی اصطلاح میں لفظ اجتہاد مخصوص ہے اس انتہائی کوشش

---

* از مرتب
۱ صبحی محمصانی " فلسفہ شریعت اسلام " ۔

Marfat.com

کوشش کے لیے جو کسی امر شرعی کے بارے میں یہ گمان غالب حاصل کرنے کے لیے صرف کی جائے کہ یہ شریعت کے موافق ہے۔"

(جلد ۴، صفحہ ۲۱۸)

امام شاطبی "الموافقات" میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں:

"اجتہاد نام ہے شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لیے انتہائی کوشش کرنے کا۔"

(جلد ۴، صفحہ ۸۹)

اجتہاد قانون و شریعت اسلامی کا تیسرا ماخذ ہے اور اجتہاد کی صورت میں چوں کہ براہ راست کتاب و سنت کے نصوص سے حکم معلوم کرنے کے بجائے کوشش کر کے کتاب یا سنت کے اشارات سے ایک حکم معین کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے اس کو کتاب یا سنت کے الفاظ کے بجائے اجتہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

* شرعی اصطلاح میں اجتہاد چوں کہ اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کتاب و سنت کے اشارات و مضمرات سے کوئی حکم معلوم کرنے کے لیے کی جاتی ہے اس لیے کوشش کے باب میں پہلی چیز جس کی طرف خود لفظ اجتہاد اشارہ کر رہا ہے یہ ہے کہ یہ کوشش سہل انگارانہ یا نیم دلانہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ پورے دل و جان سے ہونی چاہیے اور تحقیق و تلاش کے سارے وسائل جو اس کار عظیم کے لیے مطلوب ہیں وہ سب استعمال ہونے چاہئیں۔ حضرت معاذ بن جبل رض والی مشہور حدیث کے یہ جملے قابل غور ہیں: "اگر کتاب و سنت سے واضح احکام میں کوئی رہنمائی نہ ملی تو میں کوشش کر کے اپنی رائے متعین کرنے کی کوشش (اجتہاد) کروں گا اور اس کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔" یعنی یہ نہیں کروں گا کہ جو خیال ذہن میں آ جائے اس کے مطابق معاملات کا فیصلہ کردوں بلکہ اپنے امکان کے حدود تک جستجوئے حق کروں گا۔ حضرت معاذ رض کے یہ الفاظ ان لوگوں کے لیے ایک تنبیہ ہیں جو قرآن و حدیث تو درکنار سرے سے عربی زبان سے ہی کوئی مس نہیں رکھتے لیکن اس کے باوجود جو وسوسہ دل میں گذر جاتا ہے اس کو مجتہدانہ شان کے ساتھ پیش کرنے میں ذرا بھی باک نہیں کرتے۔

۱ یہاں سے باب کے اختتام تک کی بحث مولانا امین احسن اصلاحی کے ایک مضمون "اجتہاد" سے ماخوذ ہے جو ماہنامہ چراغ راہ کراچی (اسلامی قانون نمبر) میں شائع ہوا تھا۔ (مرتب)

Marfat.com

شرائط: اجتہاد ایک نہایت اہم اور مشکل کام ہے ۔ اس کے لیے شریعت کا گہرا علم بھی ضروری ہے اور ان حالات کے ' مالہ و ما علیہ ' سے بھی اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کرنا ہے ۔ قانون بجائے خود بھی ایک مشکل چیز ہے ۔ اس کے اندر حروف و الفاظ تو درکنار رموز و اوقات (جیسے کاما (،) اور ڈیش (–)) تک کی بڑی اہمیت ہوتی ہے ۔ اس وجہ سے جب تک کسی شخص کو شریعت کے براہ راست سمجھنے کا علم حاصل نہ ہو وہ قانون کی عام چیزوں کے سمجھنے کا حق بھی ادا نہیں کرسکتا چہ جائے کہ وہ اجتہاد کرسکے ۔ اجتہاد میں معاملہ صرف قانون کی واضح دفعات کے سمجھ لینے کا ہی نہیں ہوتا بلکہ شریعت کے مضمرات و اشارات اور کتاب و سنت کے لوازم و مقتضیات کی روشنی میں نئے پیش آمدہ حالات کا شرعی حکم متعین کرنا ہوتا ہے ۔ اس کام کے لیے ظاہر ہے کہ نہایت اعلیٰ فنی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے اور صرف فنی قابلیت ہی کی نہیں بلکہ ذوق سلیم بھی ضروری ہے ۔ شریعت کے اعلیٰ علم اور اس کے فہم کے اعلیٰ ذوق کے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہوسکتا ۔ اس وجہ سے یہ بات تو صحیح ہے کہ اسلام میں اجتہاد کسی خاص طبقے یا گروہ کا اجارہ نہیں ہے لیکن یہ بات بالکل غلط ہے کہ اسلام میں ہر شخص اجتہاد کا کا مجاز ہے ۔ جس کام کے لیے قابلیت کا ہونا بالکل بدیہی امر ہے اس کا مجاز ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے ۔ پھر اجتہاد میں اس قابلیت کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑی آخروی ذمہ داری کا بھی سوال ہے ۔ جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ صرف لوگوں کی دنیا ہی کے معاملات میں دخل نہیں دیتا بلکہ ان کے دین اور ان کی آخرت کے معاملے میں بھی ذمہ دار ٹھہرتا ہے ۔ اس وجہ سے اگر وہ نا اہلیت کے باوجود اجتہاد کی جسارت کرتا ہے تو صرف اپنی ہی آخرت برباد نہیں کرتا بلکہ دوسرے بہت سے لوگوں کی آخرت بھی خطرے میں ڈالتا ہے ۔

اجتہاد کی اس علمی و اخلاقی اہمیت کے سبب اس کے لیے اصول فقہ کی کتابوں میں جو شرائط بیان کی گئی ہیں ان کا خلاصہ تین شرطوں اور سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ

(۱) اجتہاد کا اہل وہ شخص ہے جس کو کتاب و سنت پر پورا پورا عبور حاصل ہو ۔

Marfat.com

(۲) وہ پیش آمدہ حالات و وسائل کی تہ تک پہنچنے والا اور ان کے "مالہ و ما علیہ" کو اچھی طرح سمجھنے والا ہو۔

(۳) وہ اخلاق و سیرت کے لحاظ سے ایک قابل اعتماد آدمی ہو تاکہ لوگ اپنے دین کے معاملہ میں اس پر اعتماد کر سکیں۔

ضرورت: اجتہاد کی ضرورت انسانی زندگی میں مسلم ہے کیوں کہ زندگی برابر نت نئے مسائل سے دو چار رہتی ہے۔ ان مسائل کا حل اگر شریعت سے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے ٹوٹ جائے گا اور اس کو کوئی مسلمان اسلام پر قایم رہتے ہوئے گوارا نہیں کر سکتا۔ ہماری روحانی و ایمانی حیات کے لیے اس سے کہیں زیادہ ضرورت اجتہاد کی ہے جتنی ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لیے ہوا اور پانی کی ضرورت ہے۔

ہمارے سامنے جو مسائل اور حالات پیش آئیں اگر ہم ان کے بارے میں شریعت کا حکم معلوم کیے بغیر اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیں تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں نکلے گا کہ ان حالات کی حد تک ہماری زندگی غیر اسلامی ہو جائے گی بلکہ اس امر کا بھی اندیشہ ہے کہ ان حالات کا دباؤ ہمیں اپنی زندگی کے بقیہ حصے میں بھی اسلامی روش سے ہٹنے پر مجبور کر دے، حالاں کہ مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ زندگی میں جو قدم بھی اٹھائے اسلام کے حکم اور اس کے اشارے کے مطابق اٹھائے۔ زندگی جن حالات و تغیرات سے گزرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی مسلمان کے لیے ایسا نہیں آتا جس میں وہ اسلام سے استغنا کا محتاج نہ رہتا ہو۔ اپنی اس خصوصیت کے سبب مسلمان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اجتہاد کے بغیر اپنی اسلامیت کو برقرار رکھ سکے۔

مزید مطالعے کے لیے

خورشید احمد (مرتب)، چراغ راہ، "اسلامی قانون نمبر"، جلد اول و دوئم۔ مکتبہ چراغ راہ۔ کراچی

مولانا محمد تقی الدین امینی، **فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر**۔ ٹونٹیتھ سینچری اسلامک اسٹڈی سرکل لاھور۔

Marfat.com

صبحی محمصانی ، فلسفہ شریعت اسلامی - مجلس ترقی ادب ، لاہور -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلامی قانون - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی ، سنت رسول - مکتبہ چراغ راہ ، کراچی -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، حدیث اور قرآن - مکتبہ چراغ راہ ، کراچی -

افتخار احمد بلخی ، افکار حدیث کا منظر و پس منظر - جلد سوم ، باب " حجیت حدیث و سنت " - مکتبہ چراغ راہ ، کراچی -

مولانا مناظر احسن گیلانی ، تدوین حدیث - مجلس علمی ، کراچی -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، سنت کی آئینی حیثیت - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

ڈاکٹر محمد حمیداللہ ، صحیفہ ہمام بن منبہ - حیدرآباد دکن -

مولانا امین احسن اصلاحی ، اسلامی قانون کی تدوین - لاہور -

عبدالرحیم ، اصول شرعی محمدی - دارالمعارف ، حیدرآباد -

Marfat.com

۱۶

اسلامی نظام اخلاق

* جو علم بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے ، انسانوں کو آپس میں کس طرح معاملہ کرنا چاہیے ، اس کو بیان کرے ، لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے ، اس کو واضح کرے ، نیز مفید اور کارآمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے ، بلکہ مختصر الفاظ میں جو فضائل و رذائل کا علم بخشے اور یہ بتائے کہ انسان کس طرح فضائل سے مزین اور رذایل سے محفوظ رہ سکتا ہے اس کو " علم اخلاق " کہتے ہیں ۔

لیکن بہ ادنیٰ غور یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام انسانی اعمال اس قسم کے نہیں ہیں کہ ان کے اچھے یا برے ہونے کا حکم دیا جا سکے ۔ مثلاً سانس لینا ، دل کا حرکت کرنا ، تاریکی سے روشنی میں اچانک آجانے سے پلک جھپکنا وغیرہ ایسے اعمال ہیں جو انسان سے غیر ارادی طور پر صادر ہوتے ہیں اس لیے ان امور کے پیش نظر انسان کو نہ نیکوکار کہہ سکتے ہیں اور نہ غلطکار ۔ اور نہ اس سلسلے میں اس سے کوئی محاسبہ کیا جا سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں یہ اعمال علم اخلاق کا موضوع نہیں ہو سکتے ۔ البتہ انسان سے جو اعمال ارادی طور پر انجام پاتے ہیں اور وہ ان کو ان کے نتائج و ثمرات پر غور کرنے کے بعد کرتا ہے ، مثلاً شفاخانے کی تعمیر یا اپنے دشمن کے قتل کا ارادہ اور اس کی تدابیر میں کامیابی وغیرہ ۔ چوں کہ یہ " ارادی اعمال " ہیں اس لیے ان پر ہی اچھے یا برے ہونے کا حکم لگایا جاسکتا ہے ۔ انسان اس قسم کے اعمال

---

* یہ حصہ مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کی کتاب "اخلاق اور فلسفۂ اخلاق" کے ان مباحث کی تلخیص ہے جو کتاب مذکور میں صفحات ۱۴ تا ۲۰ پر پیش کیے گئے ہیں ۔ (مرتب)

Marfat.com

کے لیے خدا اور مخلوق کے سامنے جواب دہ ہے، اور یہی علم اخلاق کا موضوع قرار پاتے ہیں۔

ہر ایک علم کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے اندر شغف رکھنے والے کو ان امور کے بارے میں جن پر اس علم میں بحث ہوتی ہے ناقدانہ نظر عطا کرتا ہے۔ چناں چہ علم اخلاق کی بھی یہی شان ہے کہ جو شخص اس کے ساتھ شغف رکھتا ہے یہ اس کو اعمال کے کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدرت عطا کرتا ہے۔ اور ان کی صحیح اور پائدار تقویم پر اسے ایسا حاوی کردیتا ہے کہ ان کے متعلق حکم نافذ کرنے میں وہ لوگوں کے رجحانات اور تقلیدات کے زیر اثر نہیں رہتا بلکہ اپنے فیصلے میں علم الاخلاق کے نظریات، قواعد و قانون اور قیاسات سے مدد حاصل کرتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ علم اخلاق کی غرض صرف نظریوں اور قاعدوں کی معرفت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اس کے مقاصد عظمیٰ میں یہ بھی شامل ہے کہ ہمارے ارادے میں تاثیر اور ہدایت کار فرما ہو، کہ یہی تاثیر ارادے کو عمل خیر پر آمادہ کرتی ہے۔ اور ہم میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ہم اپنی حیات کی تشکیل کریں، اپنے اعمال کو پاک اور عمدہ بنائیں، اور حیات انسانی کے لیے ایک اعلیٰ مثال قایم کر دیں، یعنی اپنے اندر حسن عمل، حسن کمال، اور اخوت و مواسات عامہ جیسے فضائل پیدا کریں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ "تاثیر" کو ہر موقع پر کامیابی حاصل نہیں ہوتی اور فطرت انسانی اس سے متاثر نہیں ہوتی۔

علم اخلاق کا اصل وظیفہ یہ ہے کہ وہ انسان کے سامنے خیر و شر اور نیکی و بدی کو واضح کر دیتا ہے اور اس طرح نیکی اور سچائی کی راہ کو آسان کر دیتا ہے۔ اس کا کام جبری طور پر صالح بنا دینا نہیں، انسان کو صالحیت کی راہ دکھانا ہے جس پر چلنے یا نہ چلنے کا انحصار فرد کے ارادے پر ہے۔ یہ علم ایک طبیب کی طرح انسان کو اچھے اور برے میں امتیاز کرا دیتا ہے اور اس کی چشم عبرت و بصیرت کو کھول دیتا ہے تاکہ انسان خیر و شر اور اس کے آثار و لوازم کو جان لے۔ اب آگے اس کی قوت ارادی کا کام ہے جو علم اخلاق کے اوامر (احکام) کے اختیار اور اس کے نواہی (ممنوعات) سے پرہیز پر آمادہ کر سکے۔

Marfat.com

اسلام کا نظریہ* اخلاق

* انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جس کی بنا پر انسان بعض صفات کو پسند اور بعض کو نا پسند کرتا ہے ۔ یہ انفرادی طور پر انسانوں میں کم و بیش ہو سکتی ہے لیکن ہما ا مشاہدہ ہے کہ مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے ۔ سچائی ، انصاف ، پاس عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا اور کبھی کوئی اسا دور نہیں گذرا جب جھوٹ ، ظلم ، بد عہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو ۔ ہمدردی ، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی اور خود غرضی ، سنگ دلی ، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا ۔ صبر و تحمل ، استقلال و بردباری ، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری ، چھچھورا پن ، تلون مزاجی ، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفریں کے پھول نہیں برسائے گئے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات در اصل وہ عالم گیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آرہے ہیں ۔ نیکی اور بدی کوئی ڈھکی چھپی چیزیں نہیں ہیں کہ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکالنے کی ضرورت ہو ۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو ''معروف'' اور بدی کو ''منکر'' کہتا ہے ۔ یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا ۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے کہ فالھمھا فجورھا و تقواھا (سورۃ الشمس) ، یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اگر برائی اور بھلائی جانی اور پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں مختلف اخلاقی نظام اور نظریے کیوں ہیں ؟ اور اخلاق کے

---

* یہ حصہ مولانا مودودی صاحب کی کتاب '' اسلام کا اخلاقی نقطہ* نظر '' اور ان کی نشری تقریر '' اسلام کا اخلاقی نظام '' سے ماخوذ ہے ۔ (مرتب)

Marfat.com

معاملے میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے ۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے ، اور ان کی حد ، ان کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے اور ان کے درمیان تناسب قایم کرنے میں ، یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں ۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دراصل وہ اخلاق حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوت نافذہ کون سی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں ۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کا کھوج لگاتے ہیں تو آخرکار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان کائنات کے تصور ، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اسی اختلاف نے جڑ سے لے کر شاخوں تک ان کی روح ، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دوسرے سے مختلف کر دیا ہے ۔

کائنات کے متعلق اسلام کا تصور[1] یہ ہے کہ اس دنیا کا ایک خالق و ناظم ہے ۔ وہی ہم سب انسانوں کا آقا ہے ۔ وہ حکیم ہے ، قادر مطلق ہے ، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے ، سبوح و قدوس[2] ہے ، اور اس کی خدائی ایسے طریقے پر قایم ہے جس میں ٹیڑھ نہیں ہے ۔ انسان اس کا بندہ اور نائب ہے لہٰذا انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام خدا کے بتائے ہوئے اصولوں کے مطابق ڈھالے ۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور اسے یہ جواب دہی اپنی مکمل ترین شکل میں آخرت میں کرنی ہے ۔ چناں چہ انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جواب دہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو ۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل

۱- تفصیل بیان کے لیے ملاحظہ ہو باب ۷ " اسلام کا تصور زندگی " ۔ (مرتب)
۲- یعنی بہت پاک ، بے حد برکت والا اور لائق تعریف ۔ (مرتب)

Marfat.com

امتحان کی مہلت ہے ۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے ۔ زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے ۔ پوری کائنات میں جس چیز سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے ، اس کی بے لاگ جانچ ہونی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا ۔ اور جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے کائنات کی ہر چیز کو انسان کی خدمت گذاری کے لیے مسخر کر دیا ہے اور جس نے خود انسان کو اُس کے دل و دماغ پر اور دست و پا پر اختیار بخشا ہے اور اُس ہستی کو انسان کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں ، اُس کے خیالات اور ارادوں تک کا پورا پورا علم ہے اور ان کی ہر تفصیل اُس ہستی کے پاس محفوظ ہے ۔

مقصد : یہ تصور کائنات و انسان اُس اصلی بھلائی کو متعین کرتا ہے جس کا حصول انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیے اور وہ ہے خدا کی رضا ۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرز عمل کو پرکھ کے فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر ۔ اس کے تعین سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں ۔ اس کی بنا پر انسان کے سامنے ایک مرکزی مقصد آ جاتا ہے ۔ جس کی روشنی میں زندگی میں اخلاقی صفات کی مناسب حدیں ، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں اور ہمیں وہ مستقل اقدار ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ قایم رہ سکیں ۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غایت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقا کے امکانات لا متناہی ہو سکتے ہیں ۔ اور کسی مرحلے پر بھی اغراض پرستوں کی آلائشیں اس کو ملوث نہیں کر سکتیں ۔

مآخذ : معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصور کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے ۔ اس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل یا خواہشات یا تجربے یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائیداری نصیب ہی نہ ہو سکے ، بلکہ وہ ہمیں ایک معین ماخذ دیتا ہے ۔ یعنی خدا کی کتاب اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کی سنت ، جن سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں ۔ اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاسیت کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں ۔ ان کے اندر معاملات زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وسیع ترین انطباق پایا جاتا ہے جو کسی مرحلے پر کسی دوسرے ذریعے علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا ۔

قوت نافذہ : پھر اسلام کے اسی تصور کائنات و انسان میں وہ قوت نافذہ بھی موجود ہے جس کا قانون اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے ، اور وہ ہے خدا کا خوف ، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ ۔ اگرچہ اسلام ایک طاقتور رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصول اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے ، لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے ۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت ، ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے ۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا ۔ دنیا بھر کو دھوکہ دے سکتا ہے مگر اسے دھوکہ نہیں دے سکتا ، دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا ۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے ۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو چاہے کچھ کرے بہر حال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں تجھے حاضر ہونا ہے جہاں وکالت ، رشوت ، سفارش ، جھوٹی شہادت ، دھوکہ اور فریب کچھ نہ چل سکے گا ۔ اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا ۔ یہ عقیدہ دل میں جاگزیں کرکے اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے ۔ خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس ، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو ۔ اسلام کے قانون اخلاق کی پشت پر اصل قوت یہی ہے جو اسے نافذ کراتی ہے ۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نور علیٰ نور ، ورنہ تنہا

Marfat.com

یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے ، بشرطے کہ واقعی ایمان دلوں میں جا گزیں ہو ۔

محرکات : اسلام کا یہ تصور کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانون اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں ۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپناخدا مانے اور اس کی بندگی کو اپنی زندگی کا طریقہ بنائے اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی ٹھیرائے ، یہ اس بات کے لیے کافی محرک ہے کہ وہ ان احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ خدا کے احکام ہیں ۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لیے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے ، خواہ دنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات ، نقصانات اور تکلیفوں سے دو چار ہونا پڑے ۔ اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا ، اسے ابدی سزا بھگتنا پڑے گی ، چاہے دنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لوٹ لے ۔ یہ امید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوت محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر ابھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا ہوا نظر آتا ہے ۔ اور ان مواقع پر بھی بدی سے دور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پر لطف اور نفع بخش دکھائی دے ۔

اس بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصور کائنات ، اپنا معیار خیر و شر ، اپنا ماخذ علم اخلاق ، اپنی قوت نافذہ اور اپنی قوت محرکہ الگ رکھتا ہے ۔ ان ہی چیزوں کے ذریعے سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے ۔ اسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے ۔

اسلامی تصور کی امتیازی خصوصیات : اس نظام کی امتیازی خصوصیات یوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے نمایاں ہیں جنہیں اس کا خاص عطیہ کہا جا سکتا ہے ۔

Marfat.com

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ رضائے الہیٰ کو مقصود بنا کر اخلاق کے لیے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاق ارتقا کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی - پھر ایک ماخذ علم مقرر کرکے اخلاق کو وہ پائیداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلون اور بے ربطگی کی گنجائش نہیں ہے - نیز خوف خدا کے ذریعے سے اخلاق کو وہ قوت نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدے سے وہ قوت محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بہ خود قانون اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے -

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اپج سے کام لے کر نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو بلا وجہ گھٹانے اور بعض کو بلا سبب بڑھانے کی کوشش کرتا ہے - وہ ان ہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں ، جن کو انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول کیا ہے اور ان میں سے بھی محض چند کو نہیں ، بلکہ سب کو لیتا ہے - پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل ، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار ، خانگی معاشرت ، شہری زندگی ، ملکی سیاست ، معاشی کاروبار ، بازار ، مدرسہ ، عدالت ، پولس لائن ، چھاونی ، میدان جنگ ، صلح کانفرنس ، بین الاقوامی معاملات ، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے ، ہر جگہ ، ہر شعبۂ زندگی میں وہ اخلاق کو حکم راں بناتا ہے اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملات زندگی کی باگیں خواہشات ، اغراض اور مصلحتوں کی بجائے اصول اخلاق کے ہاتھوں میں ہوں -

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظام زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قایم اور منکر سے پاک ہو ، اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے انہیں قایم کرے اور پروان چڑھائے ، اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے اس کی بیخ کنی کرے - اس دعوت پر جنہوں نے لبیک کہا ان کو جمع کرکے اس نے ایک امت بنائی جس کا نام امت مسلمہ ہے -

Marfat.com

اور ان کو ایک امت بنانے کی واحد غرض یہی ہے کہ وہ معروف کو جاری و قایم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لیے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی امت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قایم ہونے لگے تو یہ ماتم کا مقام ہے، خود اس امت کے لیے بھی اور ساری دنیا کے لیے بھی۔

اخلاقی صفات

* ویسے تو ہر عمل صالح، اگر وہ خالص خدا کی رضا کے لیے کیا جائے اسلام کے نزدیک عبادت کا درجہ رکھتا ہے، اور عبادت ہی کہلانے کا مستحق ہے۔ لیکن مسلمان مفکرین نے عوام کے لیے بات کو آسان اور قابل فہم بنانے کے لیے عبادت کا لفظ صرف ان اعمال صالحہ کے لیے مخصوص کر دیا ہے جن کے ذریعے سے بندہ اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی معبودیت کا اعتراف کرتے ہوئے، اس کے سامنے اپنی بندگی اور اپنے عجز و نیاز کا اظہار کرتا ہے۔

اعمال صالحہ کی دوسری قسم وہ ہے جس سے پیغمبرانہ دعوت و اصلاح کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی ایسے اعمال جو در اصل انبیا علیہم السلام کے ہیں اور دوسرے لوگ ان کو انبیا ہی کے مقصد کو پھیلانے کے لیے کرتے ہیں جیسے تبلیغ دین اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کو قایم کرنا اور برائی سے روکنا)۔

اعمال صالحہ کی تیسری قسم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نیابت کا رنگ ہے۔ ایسے ہی اعمال فنی اصطلاح میں اخلاق کہلاتے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب انسان اپنے ہم جنسوں اور دوسری مخلوقات سے پیش آئے تو اس حیثیت سے کہ وہ کائنات کے مالک و آقا کا نمایندہ ہے۔ اور ایک نمایندہ کا چوں کہ یہ فرض ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اپنے کو اسی رنگ میں پیش کرے جو خود مالک کا رنگ ہے، اس لیے انسان کو وہ تمام صفات اپنے اندر پیدا کرنی چاہئیں جو خدا کی صفات ہیں۔ مثلاً رحم ایک صفت ہے جو در اصل اللہ تعالیٰ میں ہے، اور وہ اس کی وجہ سے رحمان اور رحیم ہے۔ پھر بندوں کو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنے اندر رحم کی صفت پیدا کریں اور ہر قابل رحم مخلوق

---

* یہ حصہ مولانا محمد منظور نعمانی صاحب کی کتاب "قرآن آپ سے کیا کہتا ہے" اور "دین و شریعت" سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

کے ساتھ رحم کا معاملہ کریں ۔ اسی طرح خطا اور قصور معاف کرنا ، اور دوسروں کے عیب چھپانا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور بندوں کو بھی حکم ہے کہ وہ بھی اپنے اندر یہ صفت پیدا کریں ۔[1]

اخلاق کی تعریف سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اخلاق کا تعلق خدا اور بندے کے باھمی رشتے سے نہیں بلکہ ان تعلقات سے ہے جو انسانوں اور انسانوں کے درمیان قایم ہوتے ھیں ۔ معاشی لین دین ہو یا سیاسی معاملات ، سماجی برتاؤ ہو یا افراد خاندان سے سلوک ، اسلام سب کو اخلاقی اصولوں کے مطابق انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے ۔ قرآن و سنت میں معاملات و معاشرت سے متعلق بالتفصیل ان صفات کا ذکر ہے جو خدا کو پسند یا نا پسند ھیں ۔ ان سب کا احاطہ کرنا اس مختصر باب میں مشکل ہے ، اس لیے صرف چند اہم صفات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

پسندیدہ صفات

صبر : اسلام کو جو انفرادی اور اجتماعی نیکیاں انسانوں میں مطلوب ھین ان میں ایک صبر ہے ۔ اردو میں صبر کے معنیٰ بہت محدود ھیں ۔ سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا مطلب بس یہ ہے کہ موت ، بیماری اور فقر و تنگ دستی جیسی مصیبتوں کو اس طرح برداشت کر لیا جائے کہ شور و فغاں اور شکوہ و شکایت کا اظہار نہ ہو اور کوئی ظالم اگر ظلم کرے تو اس کا انتقام نہ لیا جائے اور نہ نالہ و فریاد کی جائے ، مگر قرآن کی زبان میں صبر کے معنیٰ اس سے بہت زیادہ وسیع و عمیق ھیں ۔ مختصر الفاظ میں اس حقیقت کو کچھ اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے کہ کسی نیک کام کے لیے صدموں ، تکلیفوں اور ناگواریوں کو برداشت کرنا اور ناموافق حالات میں بھی حق اور سچائی پر مضبوطی سے جمے رہنا اور نیکی کے راستے پر چلتے رہنا صبر ہے ، قرآن پاک نے صبر کو ایک ذریعۂ قوت قرار دیا ہے ۔ چناں چہ ارشاد ہوا کہ " اے ایمان والو ! (مشکلوں اور تکلیفوں میں) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو ۔"

---

۱ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بندہ اپنے میں خدا کی تمام صفات کا پرتو نہ پیدا کرسکتا ہے اور نہ ہی اس کا پیدا کرنا ضروری ہے ۔ کچھ صفات وہ ھیں کہ جن کے تقاضوں کو پیدا کرنا ہوگا مثلاً خدا معبود ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے میں عبدیت پیدا کرے ۔ اس لیے جو بات یہاں کہی گئی ہے وہ عمومی نوعیت کی ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ہر ہر صفت خداوندی کا رنگ بندہ پیدا کرے ، کہیں ان صفات کو پرورش دینی ہوگی اور کہیں ان کے تقاضوں کو ۔ (مرتب)

Marfat.com

سچائی اور راست بازی : قرآن مجید سے جن اخلاقی صفات کی بہت زیادہ اہمیت و فضلیت معلوم ہوتی ہے ان میں ایک سچائی اور راست بازی بھی ہے - سچائی کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ زبان سے غلط اور خلاف واقعہ بات نہ کہی جائے ، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے - اس میں دل کی سچائی اور عمل کی سچائی بھی شامل ہے - دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی قسم کا نفاق اور کوئی دغا اور فریب نہ ہو - اور عمل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو عقیدہ اور قول ہو وہی عمل بھی ہو اور ظاہر و باطن میں پوری یکسانیت ہو - جن بندوں کا حال یہ ہو وہی قرآن کی اصطلاح میں ''صادق'' ہیں - قرآن و سنت میں صدق کو مومن اور منافق کے درمیان وجہ امتیاز قرار دیا گیا ہے -

عدل و انصاف : جن اخلاقی اور معاشرتی امور پر اسلام نے سب سے زیادہ زور دیا ہے ان میں سے ایک عدل و انصاف بھی ہے - یہ در اصل سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل ہے - اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے ساتھ بلا رو رعایت وہ معاملہ کیا جائے اور اس کے بارے میں وہ خدا لگتی بات کہی جائے جس کا وہ مستحق ہے - اس عدل و انصاف پر دنیا کا نظام قایم ہے - جس قوم اور جس سماج میں عدل و انصاف نہ ہو وہ خدا کی رحمت سے محروم رہے گا اور دنیا میں اس کا انجام بہت ہی برا ہوگا - قرآن پاک ، کتاب و نبوت کا مقصد ہی یہ بتاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان میزان قایم ہو - اور میزان سے مراد عدل و انصاف ہی کے قوانین ہیں - چناں چہ قرآن پاک میں ہدایت کی گئی ہے کہ معاملات میں عدل و انصاف کو اور سچی خدا لگتی بات کہنے کو اپنا اصول اور نصب العین بنالو - اور پوری دیانت داری اور خدا ترسی کے ساتھ اس فرض کو ادا کرو خواہ اس سے تم کو یا تمہارے اعزا و اقربا کو کتنا ہی نقصان پہنچے ، لیکن حق و انصاف کے معاملہ میں کسی کی جانب داری نہ کرو اور نہ کسی غریب کی غربت و ناداری پر ترس کھا کر اس کی بے جا حمایت کرو - انصاف اور سچائی سب سے مقدم ہے - غریبوں کی غربت بھی اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ دیکھنے والا ہے اور وہی سب کا حقیقی والی ہے ، حتیٰ کہ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف سے معاملہ کرو ، محض ان کی دشمنی کی بنا پر ان سے بے انصافی کا معاملہ روا نہ رکھا جائے اور ان کے

Marfat.com

حقوق پامال نہ کیے جائیں کیوں کہ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا ۔ اپنوں سے انصاف کی تلقین تو سب نے کی ہے لیکن یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل و انصاف کی تاکید کرتا ہے ۔

امانت : سچائی اور راست بازی ہی کی ایک شکل امانت بھی ہے ۔ امانت سے مراد محض اس قدر نہیں کہ کسی نے جو چیز کسی کے پاس رکھ دی ہو وہ مطالبے پر جوں کی توں واپس کردی جائے ، بلکہ تمام حقوق و فرائض کا دیانت داری کے ساتھ ادا کرنا اور ہر قابل لحاظ بات کا لحاظ رکھنا بھی امانت کے مفہوم میں شامل ہے ۔ یہاں تک کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مشورہ لے تو پوری خیر خواہی سے مشورہ دینا اور اس سے متعلق تمام رازوں کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہی ہے ۔ قرآن پاک میں امانت کے وصف کو اختیار کرنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے ۔

عفو و درگزر : مسلمان کو عفو و درگزر کی بھی تعلیم دی گئی ہے ۔ عفو سے مراد یہ ہے کہ دوسرے کی خطا اور قصور کو معاف کر دیا جائے اور انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی بخش دیا جائے ۔ لیکن اس کے معنیٰ یہ نہیں کہ ایک گال پر تھپڑ کھانے کے بعد دوسرا گال بھی پیش کر دیا جائے ۔ اس سے تو شر پسند عناصر کی اور بھی ہمت افزائی ہوتی ہے ۔ عفو صرف اس صورت میں مناسب ہے جب کہ غلطی کرنے والا کسی حد تک اپنی غلطی پر نادم ہو ۔ بعض لوگ عفو و درگزر کو اپنے رعب و عزت کی کمی کا باعث تصور کرتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انتقام سے فوری دھاک تو بیٹھ سکتی ہے مگر پائیدار عزت عفو و درگزر سے ہی حاصل ہوتی ہے ۔

رواداری : عفو و درگزر ہی سے ملتی جلتی ایک صفت رواداری ہے ۔ رواداری سے مراد یہ ہے کہ باہمی تعلقات میں خیر خواہی سے کام لیا جائے اور دوسرے کی معمولی غلطیوں اور خطاؤں پر گرفت نہ کی جائے ۔ رواداری کی بنا پر معاشرے میں اخوت اور بھائی چارہ کے جذبات پرورش پاتے ہیں ۔

احسان : اپنی نوعیت کے لحاظ سے عفو اور رواداری دراصل احسان کی مختلف شکلیں ہیں ۔ احسان کے معنیٰ یہ ہیں کہ کسی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے جو اس کے لیے فائدہ مند ہو اور یہ برتاؤ عقلاً اور شرعاً صحیح ہو ۔ احسان کی

Marfat.com

بے شمار صورتیں ہیں ۔ مثلاً ضرورت مندوں اور رشتہ داروں کی مالی امداد کرنا ، کسی کو مصیبت سے نجات دلانا ، کسی کے حق کو خوبی اور سخاوت سے ادا کرنا ، احسان کی یہ شکل فضل کہلاتی ہے ، یعنی کسی کے حق کو نہ صرف پورا کرنا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ادا کرنا یا کسی سے اپنا حق وصول کرتے ہوئے رعایت کرنا یا اس کو بالکل چھوڑ دینا ۔ پھر احسان صرف حقوق العباد کے ادا کرنے ہی میں محدود نہیں ہے ، بلکہ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی یہ مطلوب ہے ۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ احسان اسے کہتے ہیں کہ سارے حقوق و فرائض اس طرح ادا کیے جائیں جیسا کہ اُن کے ادا کرنے کا حق ہے ۔

مساوات : معاشرتی محاسن میں مساوات کا بڑی بڑا اونچا مقام ہے ۔ اسلام میں مساوات سے دو باتیں مراد ہیں ۔ ایک قانونی مساوات اور دوسرے معاشرتی مساوات ۔ قانونی مساوات کے تحت تمام افراد ملت کے لیے ایک ہی قانون ہے ۔ غلام ہو یا آقا ، امیر ہو یا غریب ، عالم ہو یا جاہل سب کے لیے قانون کی پابندی یکساں ضروری ہے ، کسی کو کسی بنا پر کوئی برتری اور فوقیت حاصل نہیں ۔ پھر اسی قانونی مساوات سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر ایک کو ترقی کے ، خواہ وہ معاشی ہو یا علمی یا معاشرتی ، یکساں مواقع حاصل ہوں ۔ معاشرتی مساوات سے مراد یہ ہے کہ نشست و برخاست میں ، عبادت میں ، سماجی تقریبات میں یا عام اجتماعی زندگی میں کسی کو اولیت و فضیلت حاصل نہیں ۔ امیر و غریب مسجد میں شانہ بہ شانہ کھڑے ہوں گے ' تقریبات میں ایک دوسرے کے قریب بیٹھیں گے ، دعوتوں میں ایک ہی پلیٹ سے کھائیں گے ، اسلام میں نہ اونچ نیچ ہے ، نہ برتری و کمتری ۔

اخوت : پھر اسلام صرف اسی پر بس نہیں کرتا کہ اونچ نیچ کے امتیازات کو صرف منفی انداز سے ختم کرے ، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایجابی طور پر اس بات کی تعلیم بھی دیتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اس لحاظ سے ان کے تعلقات ایسے ہونے چاہئیں جیسے بھائیوں بھائیوں کے ہوتے ہیں ۔ یعنی یہ کہ ان میں باہم شفقت اور ترحم ہو اور آپس میں ان کا معاملہ نرمی اور فروتنی کا ہو ، ہر ایک دوسرے کا خیر خواہ ، خدمت گذار ، اور نیاز مند ہو ۔ اور جو چیزیں تعلقات کو خراب کرنے والی اور دلوں میں کدورت

Marfat.com

پیدا کرنے والی ہو سکتی ہیں مسلمان ان سب سے اجتناب کریں ۔ اخوت کے یہ تعلقات ایک جانب تو ملت اسلامیہ کو بہ حیثیت ایک قوم کے مستحکم کرتے ہیں اور دوسری جانب ایک پر امن اور صالح معاشرہ کے ضامن ہیں ۔

تقویٰ : اخلاقی محاسن جن میں سے جن چند کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسلام کے نزدیک صرف اس صورت میں قابل ستائش ہیں جب ان سے خدا کی رضا مقصود ہو ۔ اگر اس کے علاوہ کوئی اور مقصود ہے تو ان محاسن کے بہتر معاشرتی اور سماجی نتائج تو یقیناً قوانین نفسیات و عمرانیات کے تحت نکلیں گے ، لیکن آخرت میں ان سے کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ اسلامی اخلاقیات کی بنیاد خوف خدا ہے ۔ یہی خوف خدا جب انسان اپنی پوری زندگی پر محیط کر لیتا ہے ، اور جب وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ کہیں یہ خدا کو نا پسند تو نہیں تو اس کا یہ وصف تقویٰ کہلاتا ہے ۔ تقویٰ کے دو لوازم ہیں ۔ ایک تو ہر شعبۂ زندگی میں خدا کی مکمل اطاعت اور دوسرے اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے ہوئے مزید نیکی کرنے کی مسلسل کوشش ۔ قرآن پاک میں جہاں تقویٰ و نیکی کی تعلیم دی گئی ہے وہیں متقی لوگوں کے لیے آخرت کی زندگی میں فوز و فلاح کی بشارت بھی سنا دی گئی ہے ۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جو خدا کی نافرمانی کرتے ہیں ان کے لیے جہنم کی وعید ہے ۔

قرآن و سنت میں جہاں پسندیدہ اخلاق کا ذکر ہے وہاں نا پسندیدہ اوصاف بھی گنا دیے گئے ہیں تاکہ انسان ان سے بچ کر اپنی آخرت کی زندگی بہتر بنا سکے ۔

صفات مذمومہ

صفات محمودہ کی طرح صفات مذمومہ کی بھی ایک طویل فہرست ہے ، جن میں غرور و تکبر ، بخل ، عیب جوئی ، چغل خوری ، خیانت ، جھوٹ ، فحش کلامی ، خود پسندی ، شہرت طلبی ، تنگ نظری ، تنگ ظرفی ، حرص و طمع ، تصنع اور نقالی ، اسراف و تکلف ، مایوسی اور پست ہمتی ، غیبت ، کینہ ، حسد ، وعدہ خلافی ، رشوت ، فساد و نفاق ، ذخیرہ اندوزی ، حیلہ سازی ، گروہی اور قبائلی عصبیت ، احسان فراموشی اور غضب و چیرہ دستی وغیرہ شامل ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان سب پر سیر حاصل بحث اس مختصر باب میں ممکن نہیں ، صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

Marfat.com

حرص*: حرص کی تین قسمیں ہیں۔ (۱) دولت کی حرص (۲) منصب و ریاست کی حرص اور (۳) شہرت کی حرص — اور ان سب میں دولت کا لالچ ایک عجیب بلا اور حیرت ناک بیماری ہے جو نفس انسانی کو ہر آرام و راحت سے محروم کر دیتی ہے۔ اعصاب اور جسم (اور روح) تھک جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "اور مال" اور "اور دولت" کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک انسان اور اُس کی خواہشوں کے درمیان قبر کی مٹی حائل نہیں ہو جاتی۔

دولت کی حرص آنے والی نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ آنے والے معاشی خوش حالی کی وجہ سے جد و جہد ترک کر دیتے ہیں اور اگر وہ نا اہل ہوئے تو خون جگر اور محنت و مشقت سے حاصل کردہ دولت کو ایسے کاموں میں صرف کرتے ہیں جن سے باپ دادا کا نام بدنام ہوتا ہے۔

حکومت و ریاست کی حرص کی راہ میں کتنے انسانوں کا خون بہایا گیا ہے اور کتنی عزتیں اس راہ میں روندی گئی ہیں اور کتنی آبادیاں ویران ہوئی ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے آج تک بیشتر بڑی جنگیں حکومت و ریاست کے حصول کے لیے لڑی گئی ہیں اور اس حرص کی کوئی حد اور انتہا نہیں ہے۔ انسان جو کچھ حاصل کر لیتا ہے، ہر بار اس سے بلند تر منصب ریاست کے حصول کے لیے "جائز و ناجائز" کی تمیز کو ترک کر کے قدم اٹھاتا ہے۔ کوئی عہدہ — پھر وزارت — پھر کسی مملکت کی فرماں روائی اور اس کے بعد ساری دنیا پر تصرف کی خواہش اور پھر معاذاللہ خدائی کی تمنا — "فرعونیت" اس کے سوا اور کیا ہے؟ — ہر قسم کے ظلم، خون ریزی، تکبر، نخوت اور ایسے ہی دوسرے عمل جو دین اور دیانت کی ضد ہیں، حرص ریاست سے پیدا ہوتے ہیں — اسی سے زمین پر فساد پیدا ہوتا ہے اور فساد پیدا کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ جنت انہی کو ملے گی جو حرص ریاست میں مبتلا ہو کر اللہ کی زمین کو فساد کا گہوارہ نہیں بناتے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا

آخرت کا وہ گھر ہم انہی لوگوں کے لیے خاص رکھیں گے جو زمین میں نہ اپنا اقتدار اور اپنی کبریائی چاہیں گے اور نہ فساد۔
(القصص - ۸۳)

یہاں سے اس باب کے اختتام تک کی پوری بحث آقا سید محمد تقی شیرازی کی فارسی کتاب "سموم تتالہ" جلد اول سے ماخوذ ہے (ترجمہ سید ابو الخیر کشفی)۔ (مرتب)

Marfat.com

ظلم : " ظلم " ایک قبیح فعل ہے اور اس کی بنیاد انسانوں کو تکلیف دینے کا مذموم جذبہ ہے ۔ دوسروں کو بلا سبب شرعی (یعنی قصاص ، حد اور تعزیر کے جواز اور محل کے بغیر) قتل کرنا ، مارنا اور قید کرنا ہی ظلم نہیں ہے بلکہ ہر وہ فعل جس سے دوسروں کے حقوق پامال ہوں اور ان کو بلا سبب صدمہ یا تکلیف پہنچے ظلم ہے — ظلم نے کتنے ہی گھروں کو ویران کیا ہے ، کتنے ہی خاندانوں اور ناسیوں کے نام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ عادل مطلق ہے اور اس کے انصاف کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ وہ خود ظلم نہ کرے بلکہ اس کے انصاف بے کراں کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ہر ظالم کو اپنے " قانون مکافات عمل " کے تحت سزا دے اور ہر مظلوم کو ظالم سے نجات دلائے ، چناں چہ فرمایا ہے :

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ ؕ

اے پیغمبر ، یہ نہ سمجھیے کہ اللہ ظالموں
کے عمل سے غافل ہے ۔ (سورۂ ابراهیم - ۴۲)

وہ ظلم کو فراموش نہیں کرتا اور نہ غفلت برتتا ہے ، کوئی ظلم اس کے علم کی حد سے باہر نہیں ہے ۔

ظلم وہی لوگ کرتے ہیں جو قدرت ، قوت ، ثروت ، امارت اور ریاست حاصل کرنے کے بعد خدا اور اس کے قانون کو بھلا دیتے ہیں — لیکن جو لوگ خدا کو پہچانتے ہیں ، اس کے قہر اور انتقام سے ڈرتے ہیں ، اس کے قانون مکافات کو تسلیم کرتے ہیں ، اسے ہمیشہ حاضر و ناظر جانتے ہیں ، وہ کبھی ظلم و تعدّی نہیں کر سکتے — کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ بندگان خدا کے ساتھ چھوٹے سے چھوٹے ظلم (حتیٰ کہ کلمۂ بد) کو بھی خدا معاف نہیں کرتا ۔

دروغ گوئی: جھوٹ بولنا گناہ کبیرہ ہے جو دروغ گو کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل و خوار ، بے منزلت اور بے اعتبار بناتا ہے ۔ جھوٹے کی گفتگو اور کردار پر کوئی اعتماد نہیں کرتا — احادیث میں جھوٹ کی بار بار اور شدت کے ساتھ مذمت کی گئی ہے اور اس سے بڑی سختی کے ساتھ روکا گیا ہے ۔ اور جھوٹ کو کفر کے کنبہ کا ایک فرد قرار دیا گیا ہے ۔

Marfat.com

جھوٹ کا سلسلہ بہت طویل ہے ، دوکان دار جھوٹ بولتا ہے ، خریدار جھوٹ بولتا ہے ، تعمیرات کا کام کرنے والے ٹھیکیدار جھوٹ بولتے ھیں اور خدا کے نام پر ، خدا کی جھوٹی قسمیں کھا کر دروغ بیانی سے کام لیتے ھیں — جب تک جھوٹ کو اس کی تمام شکلوں میں اور بالکل جڑ سے ختم نہ کر دیا جائے ، معاشرے میں امن اور نیکی کا چلن نہیں ہو سکتا ۔

غیبت : غیبت اصطلاح شرع میں یہ ہے کہ ''کسی مسلمان کے بارے میں اس کے پیٹھ پیچھے ایسی بات کہی جائے جسے اگر وہ سنتا تو آزردہ ہوتا اور اسے برا معلوم ہوتا ۔''

جو آیات اور بہت سی احادیث غیبت کے بارے میں آئی ھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ غیبت ایک بڑا گناہ ہے اور اس کا عذاب بہت شدید ہوگا ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ

ہر ایسے شخص کے لیے بڑی خرابی
ہے جو (پس پشت) عیب نکالنے والا
ہو اور (روبرو) طعنہ دینے والا ہو ۔
(الھمزہ ۔ ۱)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے کہ ''ھمّاز مشّاء بنمیم ۔'' ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے :

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ

(یعنی) جو لوگ ایمان لانے والوں کے کسی برے کام کو فاش کرنے کو عزیز رکھتے ھیں اور اسے بیان کرتے ھیں ان کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو ۔ (النور ۔ ۱۹)

ان کے علاوہ اس ضمن کی دوسری آیات اور احادیث انسان کو اس گناہ کی اھمیت اور برائی سے آگاہ کرتی ھیں ۔ ایک حدیث ہے کہ

الغیبة اشدّ من الزنا — غیبت زنا سے زیادہ سخت گناہ ہے ۔

ہر مسلمان اور صاحب ایمان کا فرض ہے کہ اس گناہ کی شدت کے پیش نظر خود بھی غیبت سے بچے اور دوسروں کو بھی اس سے روکے ۔ چنانچہ

Marfat.com

صاحب معراج السعادۃ نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کی غیبت سنتا ہے اور (اس کی پیٹھ پیچھے) اس کی حمایت نہیں کرتا تو خدا اسے دنیا اور آخرت میں ذلیل کرے گا۔

ناپسندیدہ اخلاقی صفات کے اس بیان کے بعد ہم اپنی بحث کو ان چند حقوق و فرائض کے ذکر پر ختم کرتے ہیں جو اجتماعی اخلاق کے نقطۂ نظر سے بڑے اہم ہیں۔

حقوق و فرائض : ہمسایہ کے حق کی اسلام میں اس قدر تاکید ہے کہ صادق مخبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ " وہ ہم میں سے نہیں ہے جو اپنے ہمسائے کے ساتھ نیکی نہ کرے۔" اس روایت کی مراد اور مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ مسلمان اپنے ہمسائے کے ساتھ برائی نہ کرے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس کے ساتھ نیکی کرے۔ اگر وہ غریب ہے تو مالی مدد دے، اگر مظلوم ہے تو اس کا ساتھ دے، اگر حاجت مند ہے تو اس کی ضرورت پوری کرے اور اگر بیمار ہے تو اس کی عیادت کرے۔ اگر ہمسایہ کوئی برائی کرے تو چشم پوشی کرے اور اسے معاف کردے اور اگر ہمسائے کا کوئی عیب معلوم ہو جائے تو اس کی تشہیر نہ کرے۔ علاوہ بریں اگر ہمسائے کو کسی چیز کی ضرورت پڑے اور اس کی استطاعت میں ہو تو اسے دے۔

والدین پر اولاد کے حق ہیں۔ ان میں سے سب سے اہم حق اسلام کے دستور اور آئین کے مطابق بچوں کی تربیت ہے۔ اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ سات سال کی عمر سے انہیں ادائیگی نماز کی طرف متوجہ کریں اور نماز (اور دین) کے اہم مسائل سے مختصر طور پر (آسان زبان میں) روشناس کرائیں۔ بچوں کو جھوٹ، چوری، گالی اور بد زبانی سے (بہ طریق احسن) روکیں اور ایسے اسکولوں میں داخل کرائیں جہاں اسلامی روح اور فضا موجود ہو اور ایسے اسکولوں میں ہرگز نہ بھیجیں جہاں آئین اسلام کے خلاف عمل ہوتا ہو [1]۔ بچپن اور لڑکپن کے نقوش بڑے گہرے ہوتے ہیں اور نتیجے کے طور پر بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایسے مدرسوں سے مسلمان زادے ذہنی طور پر کافر ہو جاتے ہیں اور ماں باپ بھی اولاد کے صالح ہونے کی تمنا کا خون ہوتا دیکھتے ہیں اور

---

۱ آج پاکستان کے نونہالوں کا مستقبل غیر مسلم اور مشنری اسکولوں میں جیسا کچھ بنایا جا رہا ہے، اس کی داستان بڑی دردناک ہے، پس چہ باید کرد ؟ سوچیے۔

Marfat.com

صالح اولاد کے اچھے نتائج سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بھی اپنی اولاد کے گناہوں کے شریک سمجھے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ایسے غیر دینی ماحول میں اولاد راست گوئی، امانت اور عفت سے دور ہو جائے گی اور دیانت و دین داری ان تینوں صفات کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ایسے ہی غیر دینی مدرسوں کے طالب علم بڑے ہوکر اپنی قدرت اور اثر کو لوگوں کی دیانت سلب کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات آج ہم آئے دن اپنے معاشرے میں دیکھتے ہیں۔

ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارہ کے لیے خدائے عز و جل نے حکم دیا ہے اور اس سلسلے میں قرآن حکیم میں فرمایا ہے کہ

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ

مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، لہذا
اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح و صلاح
کا رویہ رکھو۔ (الحجرات - ۱۰)

آپس میں محبت اس برادری کی بنیاد ہے۔ "اصول کافی" میں ہے کہ مخبر صادق محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "مومن، دوسرے مومن کا بھائی ہے، اس کی آنکھ ہے، اس کا راہ نما ہے۔ مومن، مومن کے ساتھ خیانت نہیں کرتا، ظلم نہیں کرتا، جھوٹا وعدہ نہیں کرتا۔ اس کی کسی جائز خواہش کو رد نہیں کرتا۔" "اصول کافی" کی ایک اور روایت کے مطابق "مومن، مومن کا بھائی ہے اور مسلمان تن واحد اور روح واحد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مومن کی پہچان یہ ہے کہ اگر دوسرا مسلمان بھوکا ہو تو وہ کھانا نہ کھائے۔"

اسلام کے اخلاقی نظام کے جو اہم گوشے اس باب میں پیش کیے گئے، ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام کے اخلاقی ضابطے ایک طرف تو افراد کی زندگی کو "خیر" کے قالب میں ڈھالتے ہیں اور دوسری طرف یہ افراد ایسے معاشرے کو جنم دیتے ہیں جس کے اخلاقی معیار اضافی نہیں بلکہ غیر متبدل ہیں۔

انسانی ذہن اخلاق کے جو معیار وضع کرتا رہا ہے وہ ادوار کے ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انسان کے بنائے ہوئے ضابطۂ اخلاق پر سب کا متفق ہونا ممکن نہیں۔ اسلام نے اپنے اخلاقی نظام کے ذریعے اسی مسئلے کو انسانیت کے لیے سہل بنا دیا ہے۔

Marfat.com

مزید مطالعے کے لیے

مولانا سید سلیمان ندوی ، سیرۃ النبی (جلد ششم) - دارالمصنفین ، اعظم گڑھ -

مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی ، اخلاق اور فلسفۂ اخلاق - ندوۃ المصنفین ، دہلی -

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور -

امام غزالی ، اسلامی آداب و اخلاق - (ترجمہ : سعد حسن یوسفی) - کتب خانہ دین و دانش ، حیدرآباد -

محمدالغزالی ، خلق مسلم - لاہور -

مولانا محمد منظور نعمانی ، دین و شریعت - مکتبہ الفرقان ، لکھنؤ -

Marfat.com

۱۷

اسلام کا معاشرتی نظام

* انسان ایک معاشرتی حیوان ہے ، یا یوں کہیے کہ ہمیشہ سے مدنی الطبع ہے اور اپنی فطرت میں جماعتی زندگی کا محتاج ہے ۔ بغیر اجتماعیت کے اس کی زندگی ناممکن ہے ۔ انسان اپنی پیدائش سے لے کو موت تک معاشرے کا محتاج ہے ۔ اس کا جسم ، عقل اور خُلق جیسے اہم عطیات بھی 'خالق کائنات' جماعتی علائق ہی کے لیے عطا فرماتا ہے ۔ دنیا میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اپنی پرورش کے لیے دوسرے لوگوں (ماں ، باپ ، بھائی بہن یا رشتہ داروں) کا، محتاج ہوتا ہے ۔ پھر ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے ، ایک برادری سے ایک بستی سے ، ایک قوم سے ، ایک نظام تمدن اور نظام معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے ۔ نیز ' فرد ' یا ' انسان ' اپنی ہر متعلقہ شے مثلاً خوراک ، لباس ، مکان اور زندگی کے دوسرے ہر شعبے میں جماعت کا ' دست نگر ' ہے ۔ اور اگر اس سے وہ تمام علائق حذف کر دیے جائیں جو جماعت کی بدولت اس کو حاصل ہوتے ہیں تو پھر اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے ۔ انسان کے اعمال ، اغراض ، اور عادات کی جماعتی زندگی کے بغیر کوئی قیمت نہیں ہے ۔

تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر ایک فرد یا انسان دوسروں کی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے اور ان سے متاثر بھی ہوتا ہے اور اس لیے اس کو فطری طور پر مدنی الطبع تسلیم کر لینا بے دلیل نہیں ہے ۔ چناں چہ

• اس بحث کا بڑا حصہ مولانا حفظ الرحمن سیوھاروی کی کتاب "اخلاق اور فلسفہ' اخلاق" سے ماخوذ ہے ۔ بحث کو مربوط رکھنے کے لیے جگہ جگہ اضافے کیے گئے ہیں ۔ (مرتب)

Marfat.com

جماعت کا وجود افراد جماعت پر موقوف ہے اور افراد جماعت میں سے ہر فرد کا نفع و نقصان جماعت کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کے سہارے قایم ہیں - چھوٹی جماعتوں سے لے کر بڑی جماعتوں تک ہر جگہ یہ تعلق موجود ہے - مثلاً سب سے چھوٹی جماعت خاندان اور کنبہ ہے جو والدین ، اولاد اور قریبی اعزہ سے بنتی ہے اور جن میں باہمی اعتماد اور خدمت گذاری کا معاملہ رہتا ہے - اس کی حیثیت بالکل انسانی جسم کی طرح ہے کہ اگر ایک عضو کو مضرت پہنچ جاتی ہے تو تمام اعضا تکلیف محسوس کرتے ہیں - مثلاً ایک لڑکا بد طینت ہو جائے تو وہ سارے کنبے کو سعادت و خوش بختی سے محروم کر دیتا ہے یا اگر باپ شرابی یا جواری ہو تو اس کی یہ خصلت بد پورے کنبے کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے ، اور تمام کنبے کی معاشرت کو تنگ اور گھر کے پورے مالی و انتظامی نظام اور ماحول کو درہم برہم کر دیتی ہے - پھر کنبے سے بڑی جماعتوں میں بھی صورت حال مختلف نہیں ہے - مثلاً ' مدرسہ ' جہاں طلبہ ، مدرسین ، اور عملہ ایک ' جسم واحد ' ہیں - ان میں ہر شخص اپنے شخصی عمل سے مدرسے کی عظمت و پستی کا باعث بن سکتا ہے - یہی حال ایک بڑی جماعت یا گروہ کا ہے کہ ایک فرد کا کوئی نمایاں کام ساری 'جماعت' یا ' جرگہ ' کی قدر و قیمت کو بڑھا دیتا ہے ، اور ایک شخص کی ہی دناءت سے پوری جماعت یا جرگہ کی ذلت و رسوائی ہو جاتی ہے - مثل مشہور ہے '' ایک مردہ مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے -'' پھر ان اجتماعی علاقوں میں ملت یا قوم ایک بڑا علاقہ ہے جو دین یا زبان یا تمدن کے ذریعے وحدت کا داعی ہے ، اور اس راہ سے تمام افراد پر ایک ہی قانون عائد کرتا ہے ، اور اس کے تمام افراد نفع و نقصان میں مشترک ہوتے ہیں - اور '' ملت '' جو جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور دین کے رشتے سے انسانوں میں اخوت عام کے تعلق کو استوار کرتی ہے ، اس کی وحدت اجتماعی تو اس قدر دور رس ہے کہ اگر حقیقی وحدت اسی کو کہا جائے تو بجا ہے - جس طرح جسم کو اس کا کوئی عضو فائدہ یا نقصان پہنچاتا ہے اسی طرح قوم اور امت کو بھی اپنے افراد سے نفع و نقصان حاصل ہوتا ہے - طلبہ ، مدرسین ، تاجر ، کاشت کار ، صنعت کار ، بڑھئی وغیرہ سب قوم کے اجزا ہیں جو اس کا جسم سنوارتے اور بناتے ہیں اور اس کے نفع و نقصان پر اثر انداز ہوتے ہیں - اور یہ اثر انسان کے اچھے اور برے اعمال کے مختلف درجات کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے اور قوم کی ترقی کا پیمانہ اس کے افراد کے مجموعۂ اعمال کے اعتبار سے ہی بنتا ہے - اب اس

Marfat.com

سے آگے بڑھیے - '' تمام عالم انسانی '' جنس ، رنگ روپ ، بول چال ، اور مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک ہی جسم '' انسانیت '' کے افراد و اعضا ہیں - اسی لیے ہر قوم دوسری اقوام پر اثر ڈالتی ہے اور صنعت و حرفت، تجارت، معارف و علوم اور اخلاق میں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہتی ہے - اور اقوام کے درمیان خصائل و عادات کا طبعی اختلاف فی الحقیقت ان کے درمیان الفت و محبت پیدا کرنے سے مانع نہیں ہے ، جس طرح ایک کنبے کے افراد میں مرد و عورت کا تند و نرم ہونا ان کی یکتائی اور ان کے جسم واحد ہونے کے منافی نہیں ہے -

غرض معاشرے کے یہ بے شمار روابط ہیں جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں - ان ہی کی درستی پر ، ایک ایک انسان کی ، ایک ایک معاشرے کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے - اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسانوں کو ان روابط کے لیے صحیح اور منصفانہ اور پائیدار اصول اور حدود بتاتا ہے - جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہوکر خود مختار بنا اور اس نے بزعم خود انصاف کرنا چاہا تو پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف و راستی - اس لیے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد نفسانی خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لیے رجوع کر سکے - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینیت یا مذہب سے انحراف کے اصولوں پر قایم ہوتا ہے ، اس کے اصول غیر مستقل ہوتے ہیں اور روز بنتے یا ٹوٹتے رہتے ہیں - انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم ، نا انصافی ، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی پیدا ہونے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے - تمام انسانی معاملات میں انفرادی، طبقاتی ، قومی اور نسلی خود غرضیاں اور انتشار رونما ہو جاتا ہے اور دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہتا جس میں کجی نہ آجاتی ہو -

اسلام کا نظام معاشرت

* اسلام اپنا ایک مضبوط اور پائیدار نظام معاشرت رکھتا ہے جس کے

• یہ بحث مصر کے مصنف سید قطب شہید رح کی کتاب '' اسلام کا نظام عدل '' ڈاکٹر سعید رمضان کی کتاب '' ہم کیا چاہتے ہیں '' (انگریزی) اور خورشید احمد کے مضمون ''اسلامی آئیڈیولوجی'' (چراغ راہ' نظریہ پاکستان نمبر ۱۹۶۰ء) سے ماخوذ ہے - (مرتب)

Marfat.com

اصول و ضوابط مستقل و محکم ہیں ، جس کا پورا مزاج عدل و انصاف سے مرکب ہے ، اور جس کے تمام اجزا باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں۔ یہ نظام ایسا جامع و ہمہ گیر ہے کہ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرے میں آجاتی ہیں ۔ یہ انسان کے قلب و ضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر محیط ہے اور اپنی ہدایات اور قانون سازی میں، دین اور دنیا دونوں پر حاوی ہے ۔ معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے ۔ اس لیے اسلام جہاں جماعتی اور معاشرتی اصلاح کرتا ہے وہیں فرد کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اس کی اصلاح کو نقطۂ آغاز قرار دیتا ہے کیوں کہ وہ معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اس کی اصلاح معاشرے کا سدھار ہے ۔ اس لیے اس کی نظر میں فرد اور سماج دونوں کی اصلاح و تربیت یکساں اہمیت رکھتی ہے ۔

اسلام ہر فرد کی جداگانہ شخصیت کا قائل ہے ۔ وہ انسان کو محض نظام اجتماعی کا ایک بے جان اور معطل پرزہ یا ماحول کا ایک پرتو محض نہیں سمجھتا بلکہ اسے معاشرے کا انتہائی اہم جزو اور اصلی '' تاریخ ساز '' قرار دیتا ہے ۔ وہ ایک طرف تو اس میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار اور اپنی پوری زندگی کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے ۔ خدا کے سامنے ہر فرد کی ذمہ داری انفرادی ہے ۔ اور اس طرح خود معاشرے میں بھی ہر فرد کی شخصیت کے تحفظ اور نشو و ارتقا کا پورا پورا موقع ہونا چاہیے:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا

جس کسی نے نیک کام کیا تو اپنے لیے
کیا اور جس کسی نے برائی کی تو خود
اس کے آگے آئے گی ۔ (حم سجدہ ۴۶)

ایک حدیث میں انسان کی زندگی کو اس طرح ذمہ دار بنایا گیا:

کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ (بخاری)

تم میں سے سب گلہ بان (ذمہ دار اور نگراں)
ہیں اور ہر ایک گلہ بان سے اس کے گلہ
(ذمہ داری) کے بارے میں باز پرس ہوگی ۔

اور اس احساس ذمہ داری کے پیدا کرنے کے بعد دوسری طرف ضرورت اس امر کی ہے کہ بندے کا ایمان خدا ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، اور

Marfat.com

خرت پر برابر تازہ کیا جاتا رہے ۔ اس سلسلے میں علم دین سے واقفیت سب
ے اہم ہے ۔ چناں چہ اسلام حصول علم کو بڑی اہمیت دیتا ہے ۔ حضور
ملی اللہ علیہ وسلم کو تو یہ دعا مستقل طور پر سکھائی گئی کہ

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا

اور کہیے (دعا کیجیے) کہ پروردگار !
میرے علم میں زیادتی فرما ۔ (طٰہٰ - ۱۱۴)

ور خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمة علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت
(ابن ماجة) پر فرض ہے۔

چناں چہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ دین کا اتنا علم کہ اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی معاملات کیا ہیں فرض عین کا درجہ رکھتا ہے ۔ پھر علم دین کے ساتھ ساتھ اس علم کا حصول بھی واجب ہے جو زندگی کے قیام اور تمدن کے فروغ کے لیے ضروری ہے ۔ گویا اسلام ایک فرد کو ایسے خطوط پر چلانا چاہتا ہے جس پر اس کے استحکام اور عملی زندگی کی تعمیر کا انحصار ہے ۔

علم دین کا ایک بڑا مقصد عملی زندگی کی اصلاح ہے ۔ اس لیے اسلام ہر فرد میں جذبۂ عمل بیدار کرتا ہے ، اور سعی و جدوجہد کی اہمیت اس کے ذہن پر نقش کرتا ہے :

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی
وہ کوشش کرتا ہے ۔
(النجم - ۳۹)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " جو کوشش کرے گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ملے گا اور ہر کوشش کرنے والے کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے ۔" ایک حدیث میں ارشاد ہے ۔ " کوشش کرو ، اس لیے کہ اللہ نے تم پر کوشش فرض کی ہے ۔" جذبۂ عمل کو بیدار کر کے اسلام فرد میں یہ احساس بھی پیدا کرتا ہے کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اچھے

Marfat.com

اعمال کرے، کیوں کہ وہ ایمان جس کے نتیجے میں اچھے اعمال (اعمال صالحہ) رونما نہ ہوں اس بیج کی طرح ہے جو بار آور نہ ہو سکے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے ''ایمان، دل سے تصدیق، زبان سے اقرار اور اعضا سے عمل کا نام ہے'' اور '' اللہ ایمان کو بغیر عمل قبول نہیں کرتا اور عمل کو بغیر ایمان قبول نہیں کرتا۔'' گویا ایمان و عمل لازم و ملزوم ہیں۔

فرد کی اصلاح کا ایک موثر ترین ذریعہ اور اس کی تربیت کا ایک مستقل نظام اسلامی عبادات ہیں جس کا اسلام نے ایک مفصل پروگرام دیا ہے اور جس میں کسی کمی بیشی کی ضرورت نہیں کیوں کہ افراط و تفریط سے بچانا بھی اسلام کا ایک خاصہ ہے۔ اس کے نزدیک فرد کو نہ صرف دنیا کا ہو کر رہ جانا چاہیے اور نہ ہی راہب بن جانا چاہیے۔ دنیا داری اور دنیا سے اجتناب، دونوں سے بچنا ضروری ہے۔ اس لیے اعتدال کی راہ سب سے بہتر ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں '' ہر ایک کام میں اوسط درجہ (اعتدال کی راہ) بہتر ہے۔'' اسلام ہر فرد میں میانہ روی کی صفت دیکھنا چاہتا ہے۔

پھر اسلام کی نظر میں چوں کہ امت مسلمہ کی حیثیت '' امۃ وسط '' اور '' خیر امت '' کی ہے اس لیے وہ ہر فرد پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ وہ اقامت دین کی جدوجہد کرے، اور اپنی زندگی کو دنیا کمانے کے بجائے دین کو قایم کرنے کے لیے وقف کردے اور اس راہ میں جس قربانی کی بھی ضرورت پڑے اسے پیش کرنے سے بالکل دریغ نہ کرے۔

سورۂ توبہ رکوع ۶ میں مومنوں کو حکم دیا گیا ہے کہ دین کی دعوت اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے

انْفِرُوا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ

گھروں سے نکلو اور چل پڑو خواہ تم ہلکے ہو یا بھاری
ہو، اور اللہ کی راہ میں جان اور مال سے کوشش کرو
(جہاد کرو)۔ (توبہ۔ آیت ۴۱)

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ دین اسلام کے قیام سے دنیا میں بھی فلاح حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں اعتدال اور زندگی کی ضروریات کی پوری رعایت موجود ہے۔

Marfat.com

یہ وہ موٹی موٹی باتیں ہیں جو ایک فرد کی اصلاح کے لیے اسلام کو مطلوب ہیں -

معاشرتی اصلاح

* جیسا کہ پہلے کہا گیا ، اسلام انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کی تعمیر و تشکیل کے لیے بھی واضح ہدایت اور سوچا سمجھا منصوبہ دیتا ہے - اس کے نزدیک معاشرے کی اصلاح اتنی ہی ضروری ہے جتنی خود فرد کی اصلاح - اس کے برعکس جدید مغربی تحریکات کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ محض خارج میں تبدیلی کرکے نظام زندگی میں انقلاب لانا چاہتی ہیں - انہوں نے فرد کو نظرانداز کیا - نتیجتاً ان کا اصلاحی پروگرام کامیاب نہ ہو سکا - دوسری طرف مشرق کے مذہبی نظاموں نے صرف فرد کی اصلاح کی اور اس کی روح کو جلا بخشنے کے پروگرام بنائے لیکن اجتماعی زندگی کی درستگی سے بالکل صرفِ نظر کیا ، اور نتائج کے اعتبار سے یہ نظام بھی ناکام رہے - لیکن اسلام دونوں کو یکساں اہمیت دیتا ہے -

عمومی طور پر اسلام ایک ایسے معاشرے کا طالب ہے جو ہمہ گیر ، مصنوعی اختلافات سے پاک ، تعصبات و مکروہات سے منزہ ، نسل ، رنگ ، وطن اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافیائی سرحدوں سے پرے ، مساوات ، اجتماعی عدل و انصاف اور ایک عالم گیر برادری کی بنیاد پر قایم ہو اور ایک فکری ، اخلاقی ، نیز اصولی معاشرہ ہو جس کے افراد میں باہم ہمدردی ، انسانیت ، اور مواساۃ کا رشتہ ہو - اس سلسلے میں وہ حسب ذیل بنیادیں فراہم کرتا ہے -

نظام معاشرت کی بنیادیں

۱ - مساوات : اسلامی معاشرے کی سب سے پہلی اور سب سے اہم خصوصیت اور اس کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ سب انسان ایک نسل سے ہیں - پوری انسانیت آدم کی اولاد ہے - رنگ ، زبان ، نسل ، قبیلہ ، برادری ، سلک ، قوم کی نطری تقسیم باہمی تعارف کے لیے ہے - لیکن ان اختلافات کی وجہ سے

• اس بحث کا بڑا حصہ خورشید احمد کے مضمون " اسلامی آئیڈیولوجی " (چراغ راہ نظریہ پاکستان نمبر) سے ماخوذ ہے - چند اقتباسات سید قطب کی کتاب "اسلام کا نظام عدل" سے بھی لیے گئے ہیں - (مرتب)

Marfat.com

تعصب یا تفریق یا امتیاز اور اونچ نیچ پیدا کرنا غلط ہے ؛ کیوں کہ اسلام مساوات انسانی اور وحدت انسانی کی بنیاد پر اپنے تمام معاشرتی تعلقات استوار کرتا ہے ۔ قرآن میں ہے :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ

لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا پھر تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کی شناخت کر سکو ، تم میں سب سے زیادہ با عزت اور فضیلت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے ۔ (الحجرات ۔ ۱۳)

ایک دوسری جگہ ہے :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَاۗءً ۚ

لوگو ! اپنے رب سے ڈرو ، وہ رب جس نے تم کو اکیلی جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا پھر ان دونوں کی نسل سے مردوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد دنیا میں پھیلا دی ۔ (النساء ۔ ۱)

ایک حدیث میں ہے '' لوگو ! بے شک تمہارا رب ایک ہے ۔ اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ۔ اور ہاں ! عربی کو عجمی پر ، عجمی کو عربی پر ، سفید کو سیاہ پر اور سیاہ کو سفید پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے ۔ مگر (بجز) تقویٰ کے'' (کہ وہی وجہ امتیاز ہے) ۔ ایک دفعہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ارشاد فرمایا '' لوگو ! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے ۔''

نظریہ توحید صرف نظام کائنات میں وحدت اور ایک خدا ہی کا تصور پیش نہیں کرتا بلکہ وحدت انسان کا تصور بھی اس کا لازمی نتیجہ ہے ۔ شان وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادے کا فیض ہے ۔ انسان اسی کائنات کا ایک جزو ہے جو دوسرے اجزا سے مربوط ہے ۔ فرداً فرداً نظام کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افراد انسانی باہم بھی ہم آہنگ اور مربوط ہو کر رہیں ۔ اس بنا پر اسلام وحدت انسانیت کے نظریے کا قائل ہے کہ اس وحدت کے اگر اجزا مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر ، اور متفرق ہیں تو اسی لیے کہ مجتمع ہو سکیں ۔ مختلف راہیں اختیار کر کے ایک دوسرے سے تعاون سب کی منزل مقصود ہے ۔ غرض ، انسان بہ حیثیت ایک نوع بھی وحدت ہے اور بہ حیثیت فرد بھی ۔

Marfat.com

اسلام کے اس تصور انسانیت کے ہوتے ہوئے ظاہر ہے کہ تمام انسان صاحب عز و شرف ہیں اور سب کا سلسلہ ایک ہی ماں باپ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس لیے نہ تو یہ جائز ہے کہ کسی کو ہدف تعریض بنایا جائے، نہ کسی قسم کا لونی، نسلی، وطنی، لسانی امتیاز کوئی حیثیت رکھتا ہے۔ شاہانہ خون کا دعویٰ آپ سے آپ باطل ہو جاتا ہے۔ ہر قسم کی عصبیت خود بہ خود ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں آدمی کو بزرگی صرف اس وجہ سے حاصل ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

۲۔ **اخوت**: تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ دین کا رشتہ تمام مسلمانوں کو ایک وحدت میں جوڑ دیتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ

وہ لوگ جو مومن (اللہ پر ایمان رکھنے والے) ہیں
آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ (الحجرات۔ ۱۰)

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے
رہو اور جدا جدا نہ ہو جاؤ (آل عمران - ۱۰۳)

ایک حدیث میں ہے۔ "ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسے دیوار (یا بنیاد) کہ ہر جزو (اینٹ) دوسرے جزو کو تقویت پہنچاتا ہے۔" "تو اللہ پر ایمان رکھنے والوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا کہ جیسے بدن۔ (کہ) ایک عضو (بدن کا) مریض ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور درد و کرب کے ساتھ شب بیداری میں اس کے شریک (مبتلا) ہو جاتے ہیں۔"

اس طرح ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرنے والے اسلامی معاشرہ تعمیر کرتے ہیں جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد ہی یہ عقیدہ و ضابطہ ہوتی ہے۔ جو انہیں تسلیم کرے تو وہ خواہ کسی نسل، کسی ملک، کسی رنگ، کسی وطن کا ہو اس معاشرے میں شامل ہوگا جس میں سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے۔ یہ معاشرہ جغرافیائی

Marfat.com

سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر ایک عالم گیر برادری قایم ہو سکتی ہے - اس کے برعکس جو لوگ اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں یہ معاشرہ انہیں اپنے دائرے میں نہیں لیتا مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قایم کرنے اور انسانیت کے حقوق انہیں دینے میں اسے کوئی تکلیف نہیں - ان کا علیحدہ معاشرہ بن جاتا ہے -

۳- **رشتہ نکاح :** عورت اور مرد معاشرت کے دو ستون ہیں - دونوں کی اپنی اپنی شخصیت ہے اور دونوں سماج کے معمار ہیں - عورتوں اور مردوں میں قانونی مساوات ہے - اور دونوں کے ایک دوسرے پر کچھ حقوق و ذمہ داریاں ہیں - اور خاندان کے نظام میں مرد کی حیثیت قوام اور نگران کی ہے - عورت اور مرد کا عام رشتہ بھائی اور بہن کا رشتہ ہے ، اور وہ ایک دوسرے کے لیے اس طرح حرام ہیں جس طرح سگے بھائی بہن - لیکن نکاح وہ طریقہ (یا معاہدہ) ہے جس سے یہ ایک دوسرے کے شریک زندگی ہو سکتے ہیں - اور یہی وہ جائز اور صحت مند رشتہ ہے جس کے ذریعے یہ ایک دوسرے کے لیے حلال ہو سکتے ہیں - اس رشتے سے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے-

۴- **خیر خواہانہ فضا :** معاشرے کی عام فضا خیر خواہی ، تعاون ، امداد ، اشتراک عمل ، مواساۃ ، ایثار اور بھائی چارہ کی ہونی چاہیے - لوگ جب آپس میں ملیں تو ایک دوسرے پر سلامتی بھیجیں - ہر شخص اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے جو وہ اپنے لیے چاہتا ہے - ظلم ، غیبت ، چغل خوری ، کنبہ پروری ، سوءظن ، دھوکہ دھی ، برا نام رکھنے ، رشک ، حسد ، بغض ، تجسس ، الزام تراشی ، بے حرمتی و بے عزتی کرنے اور بے جا حرف گیری وغیرہ سے سب پرہیز کریں - نیکیوں میں ایک دوسرے سے تعاون کریں بلکہ سبقت لے جانے کی کوشش کریں اور برائیوں سے ایک دوسرے کو روکیں - چناں چہ قرآن کا حکم ہے کہ

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

بھلائی اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرو
اور ظلم اور گناہ کی باتوں میں ہرگز باہمی امداد و تعاون
نہ کرو - (المائدہ - ۲)

Marfat.com

اور سورۃ قصص رکوع ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ

لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو جس طرح اللہ
نے تم پر احسان کیا ہے اور زمین میں
طالب فساد نہ ہو ۔ (القصص ۔ ۷۷)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسَىٰ أَن يَكُونُوا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَن يَكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ

مومنو ! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اڑائے ممکن ہے وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں، ممکن ہے وہ ان سے اچھی ہوں اور (اپنے مومن بھائی کو) عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو (الحجرات ۔ ۱۱)

آگے ارشاد ہوا ہے کہ :

وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب بَّعْضُكُم بَعْضًا

اور ایک دوسرے کے بھید نہ ٹٹولو اور نہ کوئی
کسی کی غیبت کرے ۔ (الحجرات ۔ ۱۲)

اسی طرح حدیث میں ہے کہ " الدین نصیحۃ " (دین تو خیر خواہی کا نام ہے) ۔ " مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں " (نقصان نہ اٹھائیں) ۔ " مسلمان کبھی طعنہ دینے والا ، بکنے والا نہیں ہو سکتا " وغیرہ ۔ گویا اسلام معاشرے کی عام فضا کو حسنات سے بھر دینا چاہتا ہے ۔ اور اس کی نظر میں زندگی تعاون ، ہمدردی اور مواساۃ کا نام ہے ۔

۵ ۔ ذمہ داری کا تصور : جس طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو انفرادی طور پر انجام دینا ضروری قرار دیا گیا ہے ، اسی طرح اسلام ان میں اجتماعی ذمہ داری کا تصور بھی پیدا کرتا ہے اور پورے معاشرے میں یہ احساس بیدار کرتا ہے کہ وہ نیکیوں کو قایم کرنے والا ، برائیوں کو روکنے والا اور ایک دوسرے کی مدد کرنے والا ہو ۔ ایسی انفرادیت جس میں دوسروں کے حقوق کا خیال نہ رکھا جائے اور جو اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے نا آشنا بھی ہو ، اسلام کو مطلوب نہیں ۔

Marfat.com

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ''وہ مسلمان جو لوگوں میں گھل مل کر رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر کرتا رہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے (الگ تھلگ) گھل مل کر نہ رہے اور ان کی اذیتوں پر صبر نہ کرے۔''

'' تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم میں سے ہر ایک شخص سے اس کی رعیت کے متعلق سوال کیا جائے گا۔ پس امام حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔ اور ہر شخص اپنے اہل و عیال کا حاکم ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق دریافت کیا جائے گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔ اور غلام اپنے مالک کے مال کا محافظ ہے اور اس سے اس کی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔''

ان عمومی ہدایات کے بعد اسلام نے انسانوں کے باہمی حقوق و فرائض کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے۔ جس میں بھائی بھائی کے حقوق، اہل خانہ کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، اہل محلہ کے حقوق نیز غیر مسلموں اور عام انسانوں کے حقوق، حتیٰ کہ جانوروں اور درختوں کے حقوق تک کو واضح اور متعین کر دیا گیا ہے، تاکہ انسان محض جذبات کی رو میں بہہ کر ناانصافی کا مرتکب نہ ہو اور معاشرہ صحت مند بنیادوں پر قایم رہے اور ارتقا کے مدارج طے کرتا رہے۔

اسلامی نظام معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد مختصراً یہ دیکھنا ہے کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے معاشرے میں یگانگت اور ہم رنگی پیدا کرنے اور انسانی اجتماع کی مختلف صورتوں کو ترقی دینے کے لیے مقرر کیے ہیں۔ اس سلسلے میں اسلام نے کچھ مستقل ادارے قایم کیے ہیں جن کا اجمالی خاکہ درج ذیل ہے۔

(۱) خاندان۔ یہ انسانی معاشرت کا اولین اور بنیادی ادارہ ہے، اس لیے اسلام کے معاشرتی نظام میں خاندان کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ خاندان کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے اور ان ہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کی یہ مستقل رفاقت ایک کھلے ہوئے مستحکم معاہدے (نکاح) کے ذریعے سے

Marfat.com

وجود میں آتی ہے ۔ یہ نکاح ایک ایسا باحرمت رشتہ ہے جو دونوں کی مرضی سے اور پورے اعلان کے ساتھ جوڑا جاتا ہے ۔ نکاح کے بغیر مرد و زن کا تعلق بد ترین معصیت اور ایک ایسا جرم ہے جس کی سخت ترین سزا مقرر ہے ۔ معاہدۂ نکاح کے ذریعے سے دونوں (مرد عورت) اپنے اپنے اوپر بھاری ذمہ داریاں عائد کر لیتے ھیں اور ہمیشہ کے لیے ان کے پابند ہو جاتے ھیں ۔ اس رشتے کی وجہ سے جو ایک چھوٹی سی وحدت بنتی ہے ، مرد اس کا نگران اور ناظم اعلیٰ ہوتا ہے اور اس حیثیت سے وہ اپنے اہل و عیال کی دنیوی ضرورتوں اور آخروی فلاح دونوں کا خیال رکھنے والا ہے جس کے لیے وہ جواب دہ ہے ۔ اور بیوی اس کے زیر ہدایت گھر کا نظم و نسق چلاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ نہ صرف گھر کے اندرونی نظم و نسق کو سنبھالے بلکہ شوہر کی حقیقی رفاقت کرکے اور اپنی عفت کو پوری طرح محفوظ رکھے ۔

عورت اور مرد کے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے ۔ اس سے رشتے ، کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ھیں اور بالآخر یہی رشتے پھیلتے پھیلتے ایک معاشرے تک جا پہنچتے ھیں ۔ نیز خاندان ھی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لیے نہایت محبت ، ایثار ، دل سوزی اور خیر خواھی کے ساتھ تیار کرتی ہے ۔ گویا یہ ادارہ وہ تربیت گاہ ہے جہاں سے اسلام اچھے انسان تیار کرنا چاھتا ہے ۔ اور اخلاق حسنہ کی ابتدائی تربیت اسی مقام پر دیتا ہے تاکہ شروع ھی سے بچے میں اسلام کا احترام پیدا ہو اور اس کی سیرت اسلامی سانچے میں ڈھل جائے ۔

(ب) قرابت ۔ خاندان کے بعد رشتہ داری کی سرحد ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے ۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں ، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد ، مددگار اور غم گسار دیکھنا چاھتا ہے ۔ قرآن میں جگہ جگہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے اور حدیث میں صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے ۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ اسلام کے خلاف یا ناجائز کاموں میں تعاون کیا جائے اور رشتے یا قبیلے کی عصبیت یا بے جا طرف داری سے کام لیا جائے ۔ خون کے رشتوں کو اسلام نے قایم رکھا ہے ۔ اور وراثت کے قانون کے ذریعے انہیں ایک مستقل مقام دے کر صحت مند و فطری احساسات کو دوام عطا کیا ہے ۔

Marfat.com

(ج) **محلہ** ۔ رشتہ داری (قرابت) کے بعد ہمسائیگی ہے ۔ قرآن کی رو سے ہمسایوں کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رشتہ دار ہمسایہ ، دوسرا اجنبی ہمسایہ اور تیسرا عارضی ہمسایہ ، جس کے پاس بیٹھنے یا ساتھ چلنے کا آدمی کو اتفاق ہو۔ یہ سب اسلامی احکام کی رو سے رفاقت ، ہمدردی اور نیک سلوک کے مستحق ہیں ، اس باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں ، مثلاً " مجھے ہمسایہ کے حقوق کی اتنی تاکید کی گئی کہ میں خیال کرنے لگا کہ شاید اب اسے (بھی) وراثت میں حصہ دار بنا دیا جائے گا ۔" " وہ شخص مومن نہیں ہے جس کا ہمسایہ اس کی شرارتوں سے امن میں نہ ہو ۔" " وہ شخص ایمان نہیں رکھتا جو خود پیٹ بھر کر کھالے اور اس کا ہمسایہ اس کے پہلو میں بھوکا رہ جائے ۔" غرض ، اسلام ان سب لوگوں کو جو ایک دوسرے کے پڑوسی ہوں آپس میں ہمدرد ، مددگار ، اور شریک رنج و راحت دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کے درمیان ایسے تعلقات قایم کرنا چاہتا ہے کہ وہ سب ایک دوسرے پر بھروسہ کر سکیں ، اور ایک دوسرے کے پہلو میں اپنی جان و مال اور آبرو کو محفوظ سمجھیں ۔ اور ایسی معاشرت جس میں ایک دیوار بیچ رہنے والے دو آدمی برسوں ایک دوسرے سے نا آشنا رہیں اور جس میں ایک محلے کے رہنے والے باہم کوئی دلچسپی ، کوئی ہمدردی اور کوئی اعتماد نہ رکھتے ہوں ، اسلام کو مطلوب نہیں ، وہ ہر محلے کو معاشرے کا ایک فعال اور موثر جزو مانتا ہے ۔

(د) **مسجد** ۔ معاشرتی تعلقات کو استوار کرنے کے لیے مسجد کی حیثیت ایک مستقل ادارے کی سی ہے ، اور اسلام کا معاشرتی پروگرام مسجد ھی کے ذریعے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں مسجدوں کی صحیح تنظیم کو بڑی اھمیت حاصل ہے تاکہ مطلوبہ نتائج پوری طرح حاصل ہو سکیں ۔

(ہ) **احترام روایات** ۔ مسلم معاشرے کی روایات صحیحہ (عُرف) کا احترام اور ان کا استحکام بھی معاشرتی پالیسی کا ایک جزو ہے ، کیوں کہ اس کے ذریعے مسلم معاشرہ کبھی بھی اپنے ماضی سے نہیں کٹتا ۔ اس کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ روایات میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔ زندگی کے ہمہ گیر تقاضوں کی بنا پر ان میں تبدیلی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ تبدیلی مستقل اور خاموش ارتقا کے ذریعے سے ہوتی ہے ۔ کسی ہیجانی اور غیر معمولی بغاوت یا ماضی سے انقطاع کے ذریعے سے نہیں ۔

Marfat.com

(و) **نظام تعلیم** ۔ معاشرے کے سدھار، اس میں اسلامی اقدار کے تحفظ اور اپنے نظام زندگی کو نئی نسلوں کی طرف منتقل کرنے میں نظام تعلیم بنیادی اھمیت کا حامل ھے اور اسلامی معاشرت کا ایک بہت بڑا ستون ھے ۔

(ز) **حدود و تعزیرات** ۔ معاشرے کی اصلاح کے تمام ذرائع اختیار کرنے کے بعد حدود تعزیرات کا بھی ایک مکمل نظام رکھا گیا ھے جن کے ذریعے معاشرے کو ان افراد سے محفوظ کیا جاتا ھے جو تعلیمی، ترغیبی، اور اخلاقی ذریعے سے اصلاح نہ قبول کریں اور معاشرے کے قانون کی خلاف ورزی کریں ۔ ایسے لوگوں کو اسلام قرار واقعی سزا دیتا ہے تاکہ معاشرہ ان کی فتنہ انگیزیوں سے امن میں رہے اور اس میں فساد رونما نہ ھونے پائے؛ نیز سماجی جرائم کا انسداد کیا جا سکے ۔ گو کہ ایک اسلامی معاشرے میں یہ جرائم غیر معمولی طور پر بہت کم ھوں گے اس لیے ان سزاؤں کا نفاذ بھی شاذ و نادر ھی ھوگا، لیکن بہ ھرحال قانون کی گرفت اسلام میں نا قابل شکست ہے ۔ اسلام کی نظر میں قانون سے بالاتر کوئی نہیں ھوتا ۔ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ھے ۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ حکم ران وقت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ھے جس طرح ایک بے کس فقیر ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالا دستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا تعالیٰ بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ھاتھ کاٹ دیتا ۔" (بخاری)

مزید مطالعے کے لیے

سید قطب، **اسلام کا نظام عدل** ۔ (ترجمہ نجات اللہ صدیقی) ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاھور ۔

چراغ راہ (نظریہ پاکستان نمبر) مرتبہ خورشید احمد ۔ مکتبہ چراغ راہ، کراچی ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، **اسلام کا نظام حیات** ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاھور ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، **تعلیمات** ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاھور

مولانا مناظر احسن گیلانی، **اسلام کا نظام تعلیم و تربیت** ۔ ندوۃ المصنفین، دھلی ۔

مولانا محمد ظفیر الدین، **اسلام کا نظام مساجد** ۔ ندوۃ المصنفین ۔ دھلی ۔

Dr. Saeed Ramadhan, *What We Stand For.*

Marfat.com

۱۸

اسلام کا نظریۂ تعلیم*

اسلام میں تعلیم کی اہمیت مسلم ہے ۔ تاریخ انسانیت میں یہ منفرد مقام اسلام ھی کو حاصل ہے کہ وہ سراپا علم بن کر آیا اور تعلیمی دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب کا پیامبر ثابت ہوا ۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانیت نے اپنے سفر کا آغاز تاریکی اور جہالت سے نہیں بلکہ علم اور روشنی سے کیا ہے ۔ تخلیق آدم کے بعد خالق نے انسانِ اول کو سب سے پہلے جس چیز سے سرفراز فرمایا وہ علمِ اشیا تھا ۔ یہ اشیا کا علم ھی ہے جو انسان کو باقی مخلوق سے ممیز کرتا ہے اور جو قرآن حکیم کے فرمان کے مطابق تمام دوسری مخلوقات پر اس کی برتری قایم کرتا ہے[۱] ۔ علم تہذیب کا ایک خاصہ[۲] اور ان اہم ترین عوامل میں سے ہے جو کسی تہذیب کے صحت مند ارتقا اور نشو و نما کے لیے ضروری ہوتے ھیں[۳] ۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں دنیا کے دوسرے نظاموں نے تعلیم کو زیادہ سے زیادہ بہت سی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت سمجھا وہاں اسلام نے اسے اولین ضرورت قرار دیا ۔

اسلام کے سوا دنیا کا کوئی مذہب یا تمدن (Culture) ایسا نہیں ہے جس نے تمام انسانوں کی تعلیم کو ایک بنیادی ضرورت قرار دیا ہو ۔ یونان اور چین نے غیر معمولی علمی اور تمدنی ترقی کی ، لیکن وہ بھی تمام انسانوں کی تعلیم کے قائل نہ تھے ، بلکہ اھل علم کے ایک طبقے پر ھی قانع ہوگئے تھے ۔ افلاطون اپنی '' جمہوریہ '' (*Republic*) میں جو اونچے سے اونچا خواب دیکھ سکا

---

* یہ باب مرتب کے قلم سے ہے اور اس کتاب کے لیے خاص طور سے تیار کیا گیا ہے ۔

۱ قرآن حکیم ، البقرة ۔ ۳۰

۲ قرآن حکیم ، البقرة ۔ ۲۴۷

۳ Will Durant, *The Story of Civilization, Vol. I.*

Marfat.com

اس میں بھی فلاسفہ اور اہل نظر کے ایک مخصوص طبقے ہی کو اس امتیاز سے نوازا گیا ہے۔ اسلام وہ واحد مذہب ہے جس نے تمام انسانوں پر تعلیم کو فرض قرار دیا[1] اور اس فرض کی انجام دہی کو معاشرے کی ایک ذمہ داری بنایا۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کے مقام اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں تعلیم و تعلم کی ضرورت و اہمیت ہی کو واضح نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع تعلیم — پڑھنا اور لکھنا — کی طرف بھی واضح اشارات موجود ہیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَۚ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍۚ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُۙ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِۙ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْؕ۝

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا - انسان کو خون سے پیدا کیا - پڑھ اور تیرا رب کریم ہے - وہ جس نے قلم سے تعلیم دی - انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا - (سورہ علق، ۱-۵)

قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کی جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور آپ کے جو وظائف مقرر کیے گئے ہیں ان میں تلاوت کتاب، تعلیم کتاب و حکمت، تبین احکام و آیات، تزکیہ نفوس اور تبلیغ و دعوت کو ایک مرکزی مقام حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا:

انما بعثت معلما (میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں)

(۲)

تعلیم کیا ہے؟

علم اور تعلیم کی اسی مسلمہ اہمیت کے پیش نظر یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہم تعلیم کی نوعیت اور اس کے اساسی اصول کا صحیح فہم حاصل کریں۔

تعلیم صرف تدریس عام ہی کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعے سے ایک قوم خود آگہی حاصل کرتی ہے، اور یہ عمل اس قوم کو تشکیل دینے والے افراد کے احساس و شعور کو نکھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ نئی نسل کی وہ تعلیم و تربیت ہے جو اسے زندگی گزارنے کے طریقوں کا شعور دیتی ہے اور اس میں زندگی کے مقاصد و فرائض کا احساس پیدا کرتی ہے۔ تعلیم

---

۱ طلب العلم فریضة علیٰ کل مسلم و مسلمه (حدیث نبوی)۔

Marfat.com

ہی سے ایک قوم اپنے ثقافتی ذہنی اور ذہنی ورثے کو آیندہ نسلوں تک پہنچاتی ہے اور ان میں زندگی کے ان مقاصد سے لگاؤ پیدا کرتی ہے جنہیں اس نے اختیار کیا ہے۔ تعلیم ایک ذہنی، جسمانی اور اخلاقی تربیت ہے اور اس کا مقصد اونچے درجے کے ایسے تہذیب یافتہ مرد اور عورتیں پیدا کرنا ہے جو اچھے انسانوں کی حیثیت سے اور کسی ریاست کے ذمہ دار شہریوں کی حیثیت سے اپنے فرائض کو انجام دینے کے اہل ہوں۔ ہر دور کے ممتاز ماہرینِ تعلیم کے نظریات کا مطالعہ اسی تصورِ تعلیم کا پتہ دیتا ہے۔

لغت کے اعتبار سے تعلیم کا مادہ علم (ع ل م) ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کا ادراک کرنا۔ اس سے باب تفعیل میں "تعلیم" آتا ہے۔ تعلیم کے معنی بار بار اور کثرت کے ساتھ خبر دینے کے ہیں۔ حتیٰ کہ متعلم کے ذہن میں اس کا اثر پیدا ہو جائے۔

انگریزی زبان کا لفظ Education لاطینی لفظ Edex بہ معنی نکالنا اور Ducer-Duc بہ معنی رہنمائی سے ماخوذ ہے[1]۔ لفظی طور پر اس کے معنی "معلومات کا جمع کر دینا" اور "مخفی صلاحیتوں کو نکھارنا" ہیں۔ بہ ہر نوع اصلاً یہ لفظ معلومات فراہم کرنے اور متعلم کی مخفی صلاحیتوں کو نکھارنے کے مفہوم میں آتا ہے۔

جان اسٹورٹ مل مغرب کے ان مشاہیر میں سے ہے جنہوں نے تعلیم کے مفہوم کو وسعت دینے کی کوشش کی ہے وہ کہتا ہے:

> "تعلیم صرف ان باتوں ہی کا احاطہ نہیں کرتی جو ہم اپنی فطرت کے کمال سے قریب تر ہونے کی بنا پر، وضع مقصد کی خاطر اپنے لیے کرتے ہیں یا دوسرے ہمارے لیے کرتے ہیں۔ اپنے وسیع تر مفہوم میں اس کی حدود بہت زیادہ ہیں۔ انسانی کردار اور صلاحیت پر پڑنے والے ان چیزوں کے بالواسطہ اثرات بھی اس کے دائرہ کار میں شامل ہیں جن کے فوری مقاصد بالکل ہی دوسرے ہوتے ہیں[2]۔"

---

۱ Shipley, Joseph T, *Dictionary of Word Origins*, Ames, Iowa, P. 114.

۲ *Inaugural Address* as Rector of St Andrew's University, 1867, vide W.O. Lester Smith, *Education*, Pelican, 1958, p. 9.

Marfat.com

جان ملٹن تعلیم کی تعریف یوں کرتا ہے :

"میرے نزدیک مکمل اور شریفانہ تعلیم وہ ہے جو انسان کو بحالت جنگ و امن اپنی اجتماعی و نجی زندگی کے فرائض دیانت و مہارت اور عظمت کے ساتھ ادا کرنے کے لیے تیار کرتی ہے[۱]۔"

تعلیم کا یہ وسیع ترین تصوّر ہے -

امریکی فلسفی جان ڈیوی کے نزدیک تعلیم افراد اور فطرت سے متعلق بنیادی طور پر عقلی اور جذباتی رویّوں کے تشکیل پانے کا عمل ہے[۲]۔ ڈاکٹر پارک کا خیال ہے کہ تعلیم رهنمائی یا مطالعے سے علم حاصل کرنے اور عادات اختیار کرنے کا عمل یا فن ہے[۳]۔ پس تعلیم وہ مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے سے نئی نسلوں کی اخلاق ، ذهنی اور جسمانی نشو و نما بھی ہوتی ہے اور وہ اپنے عقاید و تصورات اور تہذیب و ثقافت کی اقدار بھی اس سے اخذ کرتے ہیں - ماہرین تعلیم اس لفظ سے دو مفہوم لیتے ہیں -

وسیع تر مفہوم میں یہ ان تمام طبیعی و حیاتیاتی ، اخلاق و سماجی اثرات کا احاطہ کرتا ہے جو فرد اور قوم کے طرز زندگی کی تشکیل کرتے ہیں اور محدود مفہوم میں یہ صرف ان اثرات پر حاوی ہے جو اساتذہ کے ذریعے سے اسکولوں کالجوں اور دوسری درس گاہوں میں مرتب ہوتے ہیں -

بہ ہر کیف تعلیم ایک همہ گیر عمل ہے اور شاگرد کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس کا گہرا اثر ہے - حقیقت تو یہ ہے کہ ایک قوم کی زندگی کا انحصار ھی اس کی تعلیم پر ہے - ایک چینی کہاوت اس بات کی کتنی صحیح عکاسی کرتی ہے :

"تمہارا منصوبہ اگر سال بھر کے لیے ہے تو فصل کاشت کرو ، دس سال کے لیے ہے تو درخت اگاو ، دائمی ہے تو مناسب افراد پیدا کرو -"

---

۱ Milton, John, *A Reopagitica and other Prose Works*, Everyman's Library, p. 46.

۲ Dewey, John, *Democracy and Education*, quoted by Hughes, A.G. and Hughes, E G, *Education: Some Fundamental Problems* Longmans, London, 1960, p. 81.

۳ Park. Dr. Joe, "Introduction", *Selected Readings, in the Philosophy of Education*, Macmillan, New York, 1958, p. 3.

Marfat.com

اور تعلیم ہی وہ عمل ہے جس سے افراد کی تعمیر ممکن ہے ۔

(۳)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

تعلیم کسی قوم کے سماجی نظریات اور ثقافت سے گہرے طور پر مربوط ہوتی ہے ۔ بنا بریں کسی قوم کا نظام تعلیم اپنے مزاج ، مواد اور موضوعات کے اعتبار سے نہ تو نظریاتی رنگ سے خالی ہو سکتا ہے اور نہ اس میں اتنی معروضیت (Objectivity) ممکن ہے کہ اسے اقدار کی گرفت سے آزاد قرار دیا جا سکے ۔ لیکن عہد جدید میں لبرلزم (Liberalism) اور انفرادیت پسندی (Individualism) کے علم برداروں نے تعلیمی دنیا میں اس غلط فہمی کو بڑے زور و شور سے رائج کرنے کی کوشش کی ہے کہ تعلیم تہذیبی اقدار اور معیارات خیر و شر کے سلسلے میں بالکل اسی طرح غیر جانب دار ہو سکتی ہے جس طرح طبیعی علوم ۔ اس غلط تصور کی بنا پر تعلیم کو مذہب اور اخلاقی اقدار سے الگ کر دیا گیا اور یہ کہا جانے لگا کہ طالب علم کو اپنی صلاحیت کے مطابق نشو و نما پانے کے لیے پوری آزادی ملنی چاہیے اور اس کی فکر یا کردار کو کسی مخصوص سانچے میں ڈھالنے کے لیے کوئی بیرونی دباؤ نہیں ہونا چاہیے ۔ یہ طریق تعلیم ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نہایت مقبول ہوا اور اس نے دوسرے یورپی ممالک میں بھی خاصی شہرت حاصل کی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہیں ہیں ۔

بے عقیدہ تعلیم کے نتائج

اگر ہم آزاد اور بے عقیدہ تعلیم کے نتائج کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل چیزیں سامنے آتی ہیں ۔

(۱) ” بے عقیدہ “ تعلیم طلبہ میں اجتماعی تصورات پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے ۔ اور جب کوئی قوم ان اجتماعی تصورات کے شعور سے بے بہرہ ہو جائے جو اسے عمل اور قربانی پر ابھارتے ہیں تو تاریخ پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے ۔ ایسی اقوام جو کسی اجتماعی نظریے کے زندہ شعور سے عاری ہو جائیں اور جنہوں نے کسی اعلیٰ اور برتر نصب العین کے لیے جینا اور مرنا نہ سیکھا ہو وہ تاریخ عالم میں کوئی بڑا کارنامہ تو کیا انجام دیں گی ، اپنے وجود تک کو برقرار نہیں رکھ سکتیں ۔ تاریخ میں ایسی مثالوں کی کمی نہیں

Marfat.com

ہے کہ جب کسی قوم نے اپنی منزل کا شعور کھو دیا تو وہ نقش پا کی طرح مٹادی گئی - اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

مرگِ فرد از خشکی رود حیات
مرگِ قوم از ترک مقصود حیات

(ب) بے عقیدہ تعلیم نئی نسل کے قلب و روح میں اخلاقی اقدار کو اجاگر کرنے میں ناکام رہتی ہے - اس کا تعلق صرف دماغ کے مطالبات سے ہوتا ہے - روح کے مطالبات سے یہ بیگانہ‌وار ہی گزر جاتی ہے - دونوں کی نشو و نما دو متضاد سمتوں میں ہوتی ہے جس کا نتیجہ ایک زبردست قومی نقصان کی صورت میں نکلتا ہے - حقیقت یہ ہے کہ علم اس وقت حقیقی دوست اور رہنما کا کام کر سکتا ہے جب اس کا محور دل ہو ورنہ صرف تن پرستی کے چکر میں یہ انسان کے لیے سانپ جیسا خطرناک بھی ہو سکتا ہے -

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

(ج) تعلیم کے بارے میں اسی رجحان کا نتیجہ لا مرکزیت اور علم کی شعبہ جاتی جزو پرستی کی صورت میں نکلا ہے - بے عقیدہ تعلیم علم کو ایک ہی محور پر مرتکز یا منظم کرنے میں ناکام رہی ہے - طلبہ اپنی زندگی اور ارد گرد کی دنیا کو چھوٹی چھوٹی غیر مربوط جزئیات کی شکل میں دیکھتے ہیں - وہ علم کی وحدت اور زندگی کی یک رنگی اور مرکزیت کے احساس سے محروم ہی رہ جاتے ہیں -

(د) اور آخری بات یہ ہے کہ بے عقیدہ تعلیم ایسے افراد پیدا کرتی ہے جو زندگی کے بنیادی ، حقیقی ، واقعی اور زندہ مسائل پر کوئی عبور نہیں رکھتے - عملی زندگی کے بارے میں ان کا علم اس قدر سطحی سا رہ جاتا ہے کہ اس کی کوئی ٹھوس افادیت باقی نہیں رہتی - قومی نقطہ نظر سے بھی یہ تعلیم مفید نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے - ڈاکٹر فرینک ایڈیلوٹ نے امریکی تعلیم کے بارے میں کہا ہے :

"مقاصد کے بجائے تکنیک اور ذرائع سے وابستگی ادب ، فلسفہ ، تاریخ اور مذہب کے مطالعے کو حقیقی آزادی سے محروم کر رہی ہے [۱] -"

۱- Adylote, Frank, "*Breaking the Academic Lock Step*", Harper and Brothers, New York, 1944, p. 7.

Marfat.com

مشہور اہل قلم والٹر لپ مین نے " اس مضطرب دنیا میں تعلیم کی کیفیت" کے موضوع پر ایک تقریر میں کہا تھا :

" اسکول اور کالج دنیا میں ایسے افراد بھیجتے رہے ہیں جو اس معاشرے کے تخلیقی اصولوں کو نہیں سمجھ پاتے جس میں انہیں رہنا ہے ۔ اپنی ثقافتی روایت سے محروم نئے تعلیم یافتہ مغربی افراد اپنے ذہن و جذبات میں مغربی تہذیب کے تصورات ، اصول اور بنیادوں کا اور اس کی منطق و استدلال کا کوئی احساس و شعور نہیں رکھتے ۔ اگر یہی نہج رہی تو موجودہ تعلیم آخرکار مغربی تہذیب کو تباہ کر دے گی ۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تباہ کر رہی ہے[1] ۔"

امریکی تعلیم پر راک فیلر کی رپورٹ بھی اسی خامی کی نشان دہی کرتی ہے :

" طلبہ اپنی زندگی کا کوئی مقصد و مفہوم چاہتے ہیں ۔ اگر ان کا زمانہ ، ان کی ثقافت اور جب ان کے رہنما انہیں کوئی عظیم مفہوم ، مقاصد و تصورات نہ دیں تو پھر وہ اپنے لیے حقیر اور فرومایہ مقاصد متعین کر لیتے ہیں[2] ۔"

سر والٹر موبرلے نے اپنی کتاب " یونیورسٹی میں بحران " میں : جو برطانیہ کے تعلیمی حالات کے مطالعے پر مشتمل ہے ، لکھا ہے :

" ہم جس الجھن میں گرفتار ہیں وہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹی میں زیادہ تر طلبہ تعلیم سے فارغ ہو جاتے ہیں مگر اس کا کوئی موقعہ نہیں آتا ہے کہ وہ حقیقی اہمیت کے عظیم مسائل پر اپنا ذہن استعمال کریں ۔ تعلیمی غیر جانب‌داری کے زیر اثر وہ موجودہ سیاسی اور سماجی ماحول کے آگے سپر ڈال دینے اور سوچ بچار کی زحمت نہ اٹھانے کے عادی ہو جاتے ہیں ۔ اسی طرح وہ لا دینیت کو بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور یہ اس لیے کہ تعلیم کے مختلف اجزا میں منقسم ہونے کی موجودہ صورت حال کی وجہ سے انہیں

---

۱ Lipman, Walter, *The State of Education in this Troubled World*, Vital Speeches for the Day, Jan. 15, 1941, p. 200.

۲ بحوالہ *Current History*, Sept., 1958, p. 174.

Marfat.com

ذمہ دارانہ حیثیت میں مقصد زندگی کو متعین کرنے کا چیلنج ہی نہیں ملتا ـ ساری تعلیم کے بعد بھی وہ بنیادی طور پر غیر تعلیم یافتہ ہی رہتے ہیں[1] ـ''

تعلیم کے پس منظر کے مکمل جائزے کے بعد پروفیسر ہیرلڈ ایچ ـ ٹیٹس لکھتے ہیں :

''تعلیم نے اپنے آپ کو ماضی کے روحانی ورثے سے الگ کر لیا ہے مگر اس کا کوئی مناسب متبادل دینے میں ناکام رہی ہے ـ نتیجتاً پڑھے لکھے افراد بھی ایقان و ایمان سے ، زندگی کی اقدار کے صحیح احساس سے ، اور دنیا کے بارے میں کسی ناقابل شکست ہمہ گیر نقطہ نظر سے عاری ہیں[2] ـ''

ان نئے خیالات سے پتہ چلتا ہے کہ مغرب میں بھی بے عقیدہ اور غیر جانبدارانہ تعلیم کا نظریہ دم توڑ رہا ہے اور مغرب کے اکثر ماہرین تعلیم اور علمائے عمرانیات یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اور ثقافت کے تحفظ کی راہ میں یہ نظریہ کس قدر نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے ـ

(۳)

تعلیم کے اسلامی اصول

(ا) تصور علم ـ اسلام نے جو تصور علم دیا ہے اس میں سب سے بنیادی چیز یہ ہے کہ علم کا سر چشمہ ذات باری تعالیٰ ہے ـ علم اشیا اسی کا دیا ہوا ہے اور انسان کی ہدایت کا علم بھی اسی کی طرف سے ہے ـ حواس اور عقل و تجربہ بڑے اہم ذرائع علم ہیں لیکن وحی سب سے اعلیٰ ذریعہ علم ہے ـ نیز یہ کہ علم کا تعلق محض لوازمات حیات ہی سے نہیں ، مقاصد حیات سے بھی ہے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے تابع ہونا چاہیے ـ یہی وہ تصور ہے جس سے ہمارے نظام تعلیم کا پورا مزاج بنتا ہے ـ

---

۱ Moberly, Sir Walter, *The Crisis in the University*, London, 1949, p. 70

۲ Titus, Harold H, *Living Issues in Philosphy*, New York, 1953, pp. 420—421.

Marfat.com

اسلام نے علم کا جو تصور دیا ہے اس میں علم اور تربیت دونوں کو یکساں اہمیت دی گئی ہے اور ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس دونوں کو ساتھ ساتھ انجام دینا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے مخصوص نظام تعلیم میں تعلیم اور سیرت سازی ایک ہی حقیقت کے دو پہلو رہے ہیں اور اس کا اظہار علم و فضل کی اصطلاح سے بھی ہوتا ہے جو علم اور نیکی اور اخلاق حسنہ میں بڑھے ہوئے ہونے کے مفہوم کو ادا کرتی ہے۔

(ب) مقصد تعلیم ـ تعلیم بجائے خود منزل نہیں، منزل کے حصول کے لیے ایک ذریعہ ہے — حقیقی منزل ان لوگوں کا نظریہ حیات اور تمدن و ثقافت ہے جن کی خدمت اسے کرنی ہے۔ اے۔ این۔ وایٹ ہیڈ نے یہ کہہ کر اس نکتے پر بہت زور دیا ہے کہ ”تعلیم کی روح یہ ہے کہ وہ مذہبی ہو۔“ اقبال کا خیال بھی یہی تھا کہ اسلام ہماری زندگی اور تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے۔ انہوں نے خواجہ غلام السیّدین کو ایک خط میں لکھا تھا:

> ”علم سے میری مراد وہ علم ہے جس کا دارو مدار حواس پر ہو۔ عام طور پر میں نے علم کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس علم سے وہ طبعی قوت ہاتھ آتی ہے جس کو دین کے ماتحت رہنا چاہیے۔ اگر یہ دین کے تحت نہ رہے تو محض شیطنت ہے۔ مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو مسلمان کرے۔
>
> بولہب را حیدر کرار کن
>
> اگر یہ بولہب حیدر کرار بن جائے یا یوں کہیے کہ اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لیے سراپا رحمت ہے[1]۔“

پس تعلیم کا اولین مقصد یہ ہونا چاہیے کہ طلبہ میں ان کے مذہب اور نظریہ حیات کی تفہیم و آگہی پیدا کرے۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی کا مفہوم اور مقصد، دنیا میں انسان کی حیثیت، توحید، رسالت، آخرت اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ان کے اثرات، اخلاقیات کے اسلامی اصول، اسلامی ثقافت کی نوعیت اور ایک مسلمان کے فرائض اور اس کا مشن انہیں سمجھایا جائے۔

۱ Saiyidain, K. G., *Iqbal's Educational Philosophy*, Lahore, 1942, p. 99.

Marfat.com

انہیں بتایا جانا چاہیے کہ وہ کس طرح اعلیٰ مقاصد کے لیے دنیا کی تمام قوتوں کو استعمال کریں - تعلیم کو ایسے افراد پیدا کرنے چاہئیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں اسلامی نظریات پر بھرپور یقین کے حامل ہوں۔ اور اسے ان کے اندر ایک ایسا اسلامی نقطہ نظر پیدا کرنا چاہیے کہ وہ زندگی کے ہر میدان میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اپنا راستہ خود بنا سکیں -

قرآن حکیم کا فرمان ہے کہ اہل علم حق اور سچائی کے گواہ ہیں - وہ تعلیم جس کا مقصد اہل علم پیدا کرنا ہو اسے اولین طور پر اسلام کا علم پیش نظر رکھنا چاہیے - قرآن میں فرمایا گیا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ

خدا خود شاہد ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتے اور صاحبان علم بھی (اس حقیقت کے) شاہد ہیں - (آل عمران - ۱۸)-

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"لوگوں میں سے درجہ نبوت کے قریب تر اہل علم اور اہل جہاد ہیں - اہل علم اس وجہ سے کہ انہوں نے لوگوں کو وہ باتیں بتائیں جو رسول لائے تھے اور اہل جہاد اس وجہ سے کہ انہوں نے پیغمبروں کی لائی ہوئی شریعت پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا ۱ـ"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سا مشن ہے جس کے لیے انبیا معبوث کیے گئے ہیں - ایک ایسا مشن جو صاحبان علم کو مقام نبوت سے قریب کرتا ہے قرآن حکیم کے مطابق اسلام کے پیغام کی اشاعت و تبلیغ اور ایک عادلانہ اور صحت مند اجتماعی نظام کا قیام ہے - قرآن کہتا ہے:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۗ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ

وہ (خدا) وہی تو ہے جس نے امیوں میں ان ہی میں سے (محمد صلی اللہ علیہ و سلم کو) پیغمبر بنا کر بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (خدا کی) کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں - اور اس سے پہلے تو یہ لوگ صریح گمراہی میں مبتلا تھے - (جمعہ - ۲)

---

۱ احیاء العلوم ' جلد اول ' باب ' علم کے بیان میں ' -

Marfat.com

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ

هم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا اور ہم نے
ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) نازل کی تاکہ لوگ اعتدال
پر قایم رہیں - (الحدید - ۲۵)

پس اسلامی تہذیب و ثقافت کے پس منظر میں تعلیم کا بنیادی مقصد ان پیغمبرانہ فرائض کی بجا آوری اور انسانوں کو اس مشن اور مقصد کی تعلیم دینا، ان میں اس مذہب کی سچی روح پیدا کرنا اور انہیں ایک مکمل اور صحت مند زندگی کے لیے تیار کرنا ہے -

یہ مقصد تعلیم کے ہر گوشے میں اسلامی نظریہ حیات کی روح جاری و ساری کرنے سے حاصل ہوگا - نئی کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی اسی نقطہ نظر سے کی جانی ہوگی - اس کے لیے تمام تعلیمی سرگرمیوں کی تشکیل نو اور ایک ایسے ماحول کی تخلیق بھی کرنا ہوگی جو ان مقاصد کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہو -

(ج) انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن - تعلیم کا ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ طالب علم کی انفرادیت کے ارتقا کو کیا اہمیت دی جائے - اس پر ہمارے سامنے متضاد نظریات ہیں - بعض کے نزدیک فرد کا ارتقا بنیادی قدر ہے - وہ اجتماعی یا مشترک ذمہ داری کے تصور کو کوئی اہمیت نہیں دیتے - اس کے برعکس ایسے نظریات بھی ہیں جن میں معاشرے کے معیارات سے مطابقت کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے اور فرد کی اپنی شخصیت کے نشو و نما پر کوئی زور نہیں دیا گیا - یہ دونوں حدیں غلط اور غیر حقیقت پسندانہ ہیں - اسلام کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ انفرادیت اور اجتماعیت میں ایک توازن پیدا کرتا ہے - اسلام فرد کی اپنی ذاتی شخصیت میں یقین رکھتا ہے اور ذاتی طور پر ہی ہر ایک کو خدا کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ٹھیراتا ہے - اسلام فرد کے بنیادی حقوق کی ضمانت دیتا ہے اور کسی کو ان میں مداخلت کی اجازت نہیں دیتا - اس کی تعلیمی پالیسی میں فرد کی شخصیت کا مناسب ارتقا اہم ترین مقاصد میں سے ایک ہے - یہ اس خیال کا حامی نہیں کہ فرد کو اجتماع یا ریاست میں اپنی انفرادیت کھو دینی

Marfat.com

چاہیے ۔ قرآن کریم کے مطابق

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ
کوشش کرتا ہے ۔ (النجم ۔ ۳۹)

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ

بیشک اللہ کسی قوم کی (اچھی) حالت بدل نہیں دیتا جب
تک وہ لوگ خود اپنے میں تبدیلی نہیں کر لیتے ۔
(الرعد ۔ ۱۱)

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ

اللہ کسی متنفس پر اس کی مقدرت سے بڑھ کر ذمہ داری کا
بوجھ نہیں ڈالتا ۔ ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا
پھل اس کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اس کا وبال
اسی پر ہے ۔ (البقرہ ۔ ۲۸۶)

وَلَنَا اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ

اور ہم کو ہمارے اعمال (کا بدلہ ملے گا) اور تم کو
تمہارے اعمال (کا) ۔ (البقرہ ۔ ۱۳۹)

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ایک طالب علم کی انفرادی شخصیت کو نشو و ارتقا دینا چاہتا ہے اور اس کی تمام خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا چاہتا ہے ۔ اور دوسری طرف اسے معاشرے کا ایک ذمہ دار فرد بنانا چاہتا ہے تاکہ وہ اجتماعی زندگی کے وظائف کو بہ حسن و خوبی انجام دے سکے ۔

(د) علم کی وحدت اور ہم آہنگی ۔ تعلیم کا ایک اور اصول یہ ہے کہ طالب علم کو متوازن اور ہم آہنگ تعلیم حاصل ہو ۔ اس میں اتنی قابلیت پیدا ہو جانی چاہیے کہ وہ دنیا کی رنگا رنگ بوقلمونیوں کے درمیان زندگی اور کائنات کی وحدت کو دیکھ سکے ۔ اسلام راہ وسط کا داعی ہے اور اس کا نصب العین متوازن شخصیت کی تعمیر و ارتقا ہے ۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق فکر اور عمل کا توازن نبوت کی خصوصیات میں سے ایک ہے ۔ اس لیے تعلیم میں یہ بات لازماً پیش نظر رہنا چاہیے کہ اختصاص کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے طالب علم کو علم کے وسیع پس منظر سے واقفیت حاصل

Marfat.com

ہو جائے اور زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں وہ ایک متوازن رویہ متعین کرلے۔

اسلام کی نظر میں علم ایک ہم آہنگ اور باہم مربوط کُل ہے۔ یہ اس حقیقت سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ قرآن تمام علوم کا سر چشمہ ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو علم کے ہر متلاشی کا ذہن تشکیل کرے گی اور اس کا سوچنے کا انداز متعین کرے گی خواہ ان کے حصولِ علم کا میدان کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہ چیز قدرتاً ہم آہنگ علم کے تصور کی طرف لے جاتی ہے۔ اس بنیادی نقطے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمان نفس علم کو چھوٹے چھوٹے غیر مربوط جزئیات میں تقسیم نہیں کریں گے، بلکہ کثرت میں وحدت کا رنگ رونما ہو جائے گا۔ اس سے جزو پرستی اور حد سے بڑی ہوئی شعبہ جاتیت کی خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔ اغلباً یہ تصور تعلیم کے اعلیٰ مرحلے پر ہی اختصاصی تعلیم شروع کرنے کے نقطۂ نظر سے زیادہ قریب ہے۔ ابتدائی مرحلوں میں تعلیم کو غیر اختصاصی رہنا چاہیے۔ یہ طریقہ نوجوانوں میں وسعت نظر اور علمی دیانت و رواداری کی خوبیاں پیدا کرنے میں بہت اہم حصہ ادا کرے گا۔

(ہ) تعمیر کردار۔ تعلیم میں سب سے زیادہ اہمیت طالب علم کے کردار کی تشکیل کو حاصل ہونا چاہیے۔ تعلیم جب تک اچھے کردار تعمیر نہ کرے گی، اپنا حقیقی مقصد کبھی حاصل نہ کر پائے گی۔ اسلام میں نیک اعمال اولین اہمیت کے حامل ہیں۔ قرآن پاک میں ایمان اور عمل صالح کی بہ یک وقت تلقین کی گئی ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بنیادی مشن میں تزکیہ، یعنی انسانی زندگی اور روح کی تطہیر، شامل ہے، اور اسے اولیت حاصل ہے۔

یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ کردار کے بنیادی رجحانات کی اساس زندگی کے ابتدائی دور ہی میں پڑ جاتی ہے اور اسکول اور کالج ایک انسان کے کردار کی تعمیر میں اہم حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ کام تعلیم کا ہے کہ وہ انسانی کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دے۔ امام غزالی لکھتے ہیں:

> "تعلیم کا مقصد یہی نہیں ہونا چاہیے کہ نوجوان ذہن کے علم کی پیاس بجھا دے بلکہ اس کے ساتھ ہی اسے اخلاق کردار اور اجتماعی زندگی کے اوصاف نکھارنے کا احساس بھی پیدا کرنا چاہیے[1]۔"

---

۱ احیاء العلوم

Marfat.com

ہمارے سامنے انسانی زندگی کا مثالی نمونہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک ہے جیسا کہ قرآن کریمؐ میں بھی ہے:

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

رسول اللہ کا ایک عمدہ نمونہ موجود ہے
تمہارے لیے - (الاحزاب - ۲۱)

تعلیم کے تمام مراحل پر طلبہ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کی مثالی زندگیاں پڑھائی جانی چاہئیں - استاد کو خود اپنی زندگی اور اپنے کردار اور عمل سے طالب علم میں ایک نیک زندگی اختیار کرنے کا جذبہ پیدا کرنا چاہیے اور درس گاہوں کا ماحول بھی ایسا ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں ممد و معاون ہو سکے -

(و) تکمیل حیات - اسلام زندگی اور اس کی مسرتوں کو ترک کرنے کا نام نہیں بلکہ وہ ان کی تکمیل کا داعی ہے - اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہماریٔ تعلیم کو ہمارے نوجوانوں کی زندگی اور اس کے مطالبات کی تکمیل کے لیے تیار کرنا چاہیے - انہیں زندگی گزارنے کے طریقوں کی تربیت دینی چاہیے اور معاشرے کی گوناگوں ضروریات کو پورا کرنے کے لائق بنانا چاہیے -

اسلام رہبانیت کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ انسان زندگی کی کشاکش کے درمیان حق و انصاف کے ساتھ اپنی زندگی گزار دے - قرآن ہمیں دنیا اور آخرت دونوں کے بہترین حصول کی تعلیم دیتا ہے[1] - قرآن کریم میں ان لوگوں کو سختی سے خبردار کیا گیا ہے جو اس کی عنایات سے لطف اندوز ہونے سے انکار کرتے ہیں:

"ان سے کہو کہ کس کے حکم سے تم نے ان نعمتوں سے منہ پھیرا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے تخلیق کی ہیں - کھانے پینے کی اور استعمال کی ان چیزوں سے جو اس نے ان کے لیے بنائیں[2]-"

اسلام کا رویہ اس قرآنی آیت سے بالکل ظاہر ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا

کھاؤ پیو مگر حد سے زیادہ اسراف
نہ کرو - (الاعراف - ۳۱)

---

۱ البقرہ - ۲۰۹
۲ الاعراف - ۳۲

Marfat.com

اسلام کی نظر میں انسانی محنت اور مشقت نہایت ہی قابل قدر ہے ۔ اسلام ہر فرد کو اپنی روزی خود کمانے کے قابل بناتا ہے ۔ پس تعلیم کو دیانت دارانہ ، منصفانہ اور معقول معاش کے حصول میں مدد و معاون ہونا چاہیے ۔ علاوہ ازیں تعلیم کو معاشرے کی اقتصادی ، سماجی ، سائنسی اور فنی ضروریات پوری کرنی چاہئیں ۔ ان ضروریات کو نہ صرف یہ کہ نظر انداز نہیں کرنا چاہیے بلکہ تعلیم کو ان کی تکمیل کے لیے مثبت طور پر کام کرنا چاہیے ۔ پھر تعلیم میں اتنا عملی عنصر ضرور ہونا چاہیے کہ ہر فرد معاشی استحکام حاصل کر سکے ۔

ان مقاصد سے ہم آہنگ نظام تعلیم اسلامی آورشوں کا ترجمان ہوگا اور بنی آدم کے لیے رحمت ثابت ہوگا ۔

(۵)

تعلیم کی تاریخی روایت

ہم نے مندرجہ بالا صفحات میں علم اور تعلیم کے بارے میں اسلام کے بنیادی نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے ۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں مسلمانوں کا پورا نظام تعلیم اپنی بنیادی اقدار کے حصول کی جد و جہد سے عبارت ہے ۔ طریقے مختلف رہے ہیں ۔ اصول تنظیم میں بھی تنوع نظر آتا ہے ۔ اداروں کی ہئیت بھی بدلتی رہی ہے ۔ لیکن بنیادی مقاصد اور مزاج ایک ہی رہا ہے ۔

دور نبوی میں تعلیمی روایت

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ملت اسلامیہ کے سب سے پہلے معلم تھے ۔ آپ ہی نے پہلی منظم تعلیم گاہ مدینہ منورہ میں قایم فرمائی ۔ صفہ نامی چبوترہ پہلا مدرسہ تھا اور اصحاب صفہ اس کے متعلم تھے ۔ اس مدرسے میں ۷۰ اور ۸۰ تک طالب علم تھے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے صحابۂ کبار بھی یہاں معلم کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے تھے ۔ اصحاب صفحہ میں سے ایک یعنی حضرت معاذ بن جبل مالی امور کے نگران تھے اور عطیات کی تقسیم کا کام ان ہی کے سپرد تھا ۔ ان متعلمین میں سے مختلف افراد اسلامی حکومت کی مختلف خدمات کے لیے مامور کر دیے جاتے تھے ۔ اور تعلیم و تبلیغ کے لیے تو خصوصیت سے انہیں اصحاب کو بھیجا جاتا تھا ۔ اپنی مالی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے یہ طلبہ خود بھی محنت کرتے اور کماتے ۔ دوسرے اہل ثروت

Marfat.com

مسلمان بھی ان طلبہ اور ان کے متعلمین کی مقدور بھر مدد کرتے اور خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی براہ راست ان کی مدد فرماتے۔ اس مدرسے نے اسلامی قلمرو میں تعلیم کی نہج قایم کی اور جو روایت اس میں پڑی وہ ھی ھماری تعلیمی روایت بن گئی اور وہ روایت یہ تھی :

(ا) اولین چیز دینی تعلیم ہے۔ قرآن اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو نصاب تعلیم کا مرکز و محور ہونا چاہیے۔

(ب) تعلیم کا مقصد (۱) اچھا مسلمان اور داعی الی الحق بنانا (۲) اور مسلم معاشرے کی ھمہ ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

(ج) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم اور مسجد کا تعلق قایم کیا۔ مسجد دینی محور، سیاسی مرکز اور تعلیم گاہ بنی اور اس کے ذریعے سے طالب علم ایک مخصوص ثقافتی ورثے کے امین بنے۔

(د) متعلمین کے لیے اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے خود محنت مزدوری کرنا، اور مختلف حرفتوں کو سیکھنا اور ان سے وابستہ ہونا اچھا اور پسندیدہ قرار پایا۔

(ہ) تعلیم کی آخری ذمہ داری مسلمان معاشرے اور اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے اور اسے اس مقصد کے لیے اپنے وسائل استعمال کرنے چاہئیں۔ مسلمانوں کی قومی آمدنی اور بیت المال پر اولین حق زیر تعلیم طلبہ اور ان پر ہونے والے جملہ مصارف کا ہے۔

ادوار مابعد

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ بنیادی نہج پڑی اور ان ھی خطوط پر بعد میں ارتقا ہوا۔ مساجد تعلیم کا مرکز بن گئیں۔ ہر جگہ حلقہ ہائے درس قرآن و حدیث قایم ہوئے۔ ایک ایک مسجد میں کئی کئی حلقے بنے اور ایک ایک حلقے میں ہزاروں طلبہ شریک ہونے لگے۔ جو اساتذہ متمول تھے وہ اپنی کفالت آپ کرتے لیکن جو ضرورت مند تھے ان کی کفالت بیت المال کرتا۔ خلفائے راشدین نے باقاعدہ تنخواہیں اور وظیفے مقرر فرمائے اور ہر مسجد ایک مکتب اور ہر میدان ایک تعلیم گاہ بن گیا۔ پہلی چار صدیوں میں تعلیم کا یہی نظام رائج تھا۔ اصطلاحی مدارس نہ ہونے کے باوجود یہ نظام اتنا مستحکم اور ھمہ گیر تھا کہ گھر گھر تعلیم پھیل رہی تھی اور ایک قسم کی ھمہ رس اور

Marfat.com

همہ گیر تعلیم موجود تھی ۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں اس دور کے ۵ لاکھ علما کے مفصل حالات ملتے ہیں ۔ اس زمانے کے تعلیمی اداروں میں مرکزی حیثیت مساجد ہی کو حاصل تھی ۔ اور مساجد کے فن تعمیر پر ان کے اس تعلیمی رول کا خاصا اثر پڑا ہے ۔ تینوں سمتوں میں دالانوں کا ہونا اور بڑی تعداد میں حجروں کی موجودگی اس کا ثبوت ہیں ۔ اس دور کی اہم تعلیم گاہوں میں سے جو قابل ذکر ہیں اور جو آج بھی موجود ہیں وہ تیونس کی جامع زیتون اور مصر کی جامعہ ازہر ہیں ۔ مساجد کے علاوہ خانقاہیں ، علما کے مکانات اور کھلے میدان بھی تعلیم گاہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر علاقے میں لاکھوں طلبہ کو مفت تعلیم دی جاتی تھی ۔

یہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام کا پہلا دور ہے ۔ دوسرے دور کا آغاز پانچویں صدی کے اوائل سے ہوتا ہے ۔ اس میں مساجد کے علاوہ باقاعدہ مدارس بھی قایم ہوئے اور بڑے وسیع پیمانے پر ہوئے ۔ غالباً سب سے پہلا مدرسہ جس کی اپنی عمارت ، سرکاری گرانٹ اور وقف املاک برائے عام اخراجات اور مرتبہ نصاب تعلیم وغیرہ تھے ، سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایہ تخت غزنی میں سنہ ۴۱۰ھ (بہ مطابق سنہ ۱۰۱۹ء) میں قایم کیا ۔ بہ قول ابوالقاسم فرشتہ " مسجد سے ملحق ایک عظیم الشان مدرسہ قایم کیا اور اس کے کتب خانے کو نادر الوجود کتب سے آراستہ کیا اور مسجد و مدرسے کے اخراجات کے لیے بہت سے دیہات وقف کیے[۱] ۔" محمود غزنوی نے اپنی پوری مملکت میں بے شمار مدرسے قایم کیے اور اس کے زیر اثر دوسرے اُمرا اور ارکان دولت نے بھی یہ خدمت انجام دی ۔ تاریخ نے محمود غزنوی کو اس کے عسکری حملوں کی وجہ سے تو یاد رکھا ہے لیکن علم کی دنیا میں جو انقلاب آفرین اقدام اس نے کیے اس کا قرار واقعی اعتراف نہیں کیا گیا ۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے ۔

دوسرا اہم مدرسہ جس نے تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا دولت سلجوقیہ کے مشہور وزیر اعظم نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) کا قایم کردہ مدرسہ نظامیہ بغداد ہے جسے امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جیسے صدر مدرسین حاصل ہوئے اور جس نے تاریخ پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ۔

اس کے بعد مدارس کی ایک رو چل پڑی اور ساری اسلامی قلمرو میں ان کا

---

۱ تاریخ فرشتہ ، جلد ۱ ، حالات سلطان محمود غزنوی ۔

Marfat.com

جال بچھ گیا ۔ ان میں ایسے ایسے عظیم الشان مدارس بھی تھے جن کے تحت متعدد مدارس کام کرتے تھے ۔ اور ان کی حیثیت آج کی اصطلاح میں یونیورسٹی کی سی تھی ۔ ان تمام مدارس میں وہی اصول کارفرما تھے جن کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں ۔ مفت عوامی تعلیم کا یہ ایک ایسا نظام تھا جس کی نظیر کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی ۔

برعظیم میں تعلیمی روایت کا ارتقا

برعظیم پاک و ہند میں اسلام کی دعوت دور رسالت اور عہد خلافت راشدہ میں پہنچ چکی تھی ۔ پھر بنو امیہ کے دور میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں ایک بڑا علاقہ فتح ہوا اور اسلامی ریاست قایم ہوئی ۔ اس زمانے میں علوم کو بڑا فروغ حاصل ہوا ۔ اس دور کے انمٹ اثرات یہاں کی تاریخ اور تمدن پر پڑے ۔ لیکن بد قسمتی سے دولت اسلامیہ کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا ۔ پھر محمود غزنوی کے حملوں نے خیبر سے سومنات تک ایک بار پھر اسلام کا غلغلہ بلند کر دیا ۔ لیکن مسلمانوں کی حکومت کا باقاعدہ آغاز معزالدین محمد بن سام کے ہاتھوں ہوا ۔ قطب الدین سے بہادر شاہ ظفر تک تقریباً ساڑھے سات سو سال مسلمان یہاں حکم راں رہے ۔ اور اس زمانے میں مسلمانوں نے اپنے نظام تعلیم کو نشو و نما دینے کی پوری کوشش کی ۔ اس دور کے تعلیمی نظام اور علمی سرگرمیوں کے مطالعے سے جو اہم چیزیں سامنے آتی ہیں ہم یہاں ان کا مختصر تذکرہ کریں گے ۔

(۱) تعلیم کا جو مزاج قرون اول میں تشکیل پایا تھا یہاں بھی اس کو بڑی حد تک قایم رکھا گیا ۔ تعلیم کا مرکز دین اسلام رہا اور تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی محور کے گرد گھومتی رہیں ۔ تعلیم کو ایک عبادت تصور کیا گیا ، اور اہل علم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی باقاعدہ مدرسے سے وابستہ ہوں یا نہ ہوں ، علم کی اشاعت کے ذریعے اس کی ”زکواۃ“ برابر نکالتے رہے ۔

(۲) برعظیم میں شروع ہی سے باقاعدہ مدارس کا نظام قایم ہوا ، لیکن تعلیم کا ذریعہ صرف مدارس ہی نہ تھے ۔ ابتدائی تعلیم گھروں پر ہوتی تھی ۔ لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام بھی گھروں پر ہی تھا ۔ پھر قدیم اسلامی روایت کے مطابق مساجد تعلیم کا بہت بڑا مرکز رہیں ۔ اہل علم کے مکانات بھی مستقل تعلیمی مراکز کی حیثیت رکھتے تھے ۔ کتب خانے محض لائبریری کی حیثیت نہ

Marfat.com

رکھتے تھے بلکہ اعلیٰ تعلیم کا ایک اہم مرکز تھے - بڑے پیمانے پر تعلیمی مجالس کا ذکر بھی تذکروں اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے -

(۳) ایک اور بڑی اہم چیز یہ ہے کہ گو دینی تعلیم پورے نظام کا مرکز و محور تھی لیکن دوسری ضرورتوں سے کسی زمانے میں بھی اور کسی سطح پر بھی صرف نظر نہیں کیا گیا - صنعتی تعلیم کا انتظام کارخانوں میں تھا - تجارتی تعلیم کے لیے مہاجنی اسکول تھے جہاں تجارتی ہندسہ اور تجارت کے اصولوں کی ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی - فنون سپہ گری کی تعلیم کے لیے بے شمار ادارے اور اکیڈیمیاں تھیں - کتابت ، خطاطی ، طغریٰ نویسی ، فن کوزہ گری ، فن تعمیر ، غرض ہر ایک اہل فن کے گرد طالبان علم کا ھجوم رہتا اور وہ اپنے اپنے فن میں یکتائے روزگار فن‌کار تیار کرتے - ان کے لیے باقاعدہ مدارس اور اکیڈیمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے - اس سے نظام تعلیم کی وسعت اور ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے -

تعلیم کے اس ہمہ گیر تصور اور انتظام کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ مدارس میں جو نظام تعلیم رائج تھا ، اور جس پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے ، اس میں اگر ایک طرف قرآن ، فقہ ، منطق ، اور کلام کو اہمیت دی گئی تھی تو دوسری طرف تاریخ اور طبیعیات اور علم ہندسہ اور جغرافیہ کو ایک بنیادی مقام دیا گیا تھا - مولانا مناظر احسن گیلانی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ اس نصاب کا مقصد مسلمان حکومت کی سول سروس تیار کرنا تھا ، خصوصیت سے قضاء و عدالت کی ضروریات کی تکمیل - مسلمان اپنے نظام تعلیم کے مسائل پر جس ذہن سے غور کرتے تھے اس میں جہاں یہ فکر تھی کہ ہر چیز دین کے رنگ میں رنگی ہوئی ہو وہاں انہیں اس کا بھی خیال تھا کہ اپنے زمانے کے تقاضوں کو وہ پورا کر رہی ہو اور جس کام کے لیے جو علم و مہارت درکار ہے وہ فراہم کر رہی ہو - اس کا اندازہ اورنگ زیب عالم گیر کی اس گفتگو سے ہو سکتا ہے جس میں مخاطب مُلا صالح تھے جو شاہی خاندان کی تعلیم پر مامور تھے :

" کیا میرے معلم کا یہ فرض نہ تھا کہ وہ مجھے روئے زمین کی ہر قوم کے امتیازی خصائص سے روشناس کراتا - مجھے علم ہونا چاہیے کہ ان اقوام کے وسائل اور ان کی طاقت کیا ہے ، ان کے

Marfat.com

آداب و اطوار ، مذاهب و طرز حکومت ، طریق جنگ وغیرہ کیا ھیں اور وہ کون سے امور ھیں جن میں یہ دلچسپی رکھتی ھیں - اور پھر یہ بھی ضروری ھے کہ باقاعدہ تعلیمی نصاب کے ذریعے بتایا جائے کہ ریاست کا آغاز کیسے ھوا ، قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کیا ھیں ، اور وہ کون کون سے اسباب و عوامل اور حوادث ھیں جن کی بنا پر عظیم تبدیلیاں اور مہتم بالشان انقلابات رونما ہوتے رہے ھیں[1] -"

(۴) اس دور میں جس پیمانے پر تعلیم پھیلی ھوئی تھی آج اس کا اندازہ کرنا بھی ھمارے لیے مشکل ھے - ابھی مسلمانوں کو ھندوستان میں آئے ھوئے ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اس ملک میں جس میں تعلیم صرف پنڈتوں کا اجارہ تھی اور جہاں اگر شودر کے کان میں مذھبی کتب کے الفاظ پڑ جاتے تو اس کی پاداش میں ان کانوں میں پگھلا ھوا گرم سیسہ ڈالا جاتا تھا ، ھر طرف تعلیم و تعلّم کا چرچا تھا اور پورا ملک علوم و فنون کا گہوارہ بن گیا تھا - سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ تا سنہ ۷۵۲ھ بمطابق ۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۱ء) کے زمانے کے بارے میں مقریزی کی روایت ھے:

"سلطان محمد تغلق کے عہد میں دھلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قایم تھے جن میں شوافع کا بھی ایک مدرسہ تھا - مدرسین کے لیے شاھی خزانے سے تنخواھیں مقرر تھیں - تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ھوتیں - مدارس میں علوم دینیہ کے ساتھ معقولات اور ریاضی کی تعلیم بھی دی جاتی تھی[2] -"

صبح الاعشیٰ کا مصنف بھی اس کی شہادت دیتا ھے کہ ھندوستان کے پایہ تخت دھلی میں اس وقت ایک ہزار مدارس جاری تھے[3]- پھر یہ مدارس معمولی قسم کے مدارس نہ تھے ، بلکہ ان میں ایسے ایسے مدارس بھی تھے جو

---

۱ بہ حوالہ " برنیر کے سفر " (*Bernier's Travels*) صفحہ ۱۵۶ -

۲ "کتاب الخطط مقریزی" جلد ۲، صفحہ ۹۳۲ (ھم اس مواد کے لیے مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب " مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت " اور مولانا ابوالحسنات صاحب کی کتاب " ھندوستان میں قدیم اسلامی درس گاھیں " کے مرہون منت ھیں) -

۳ " صبح الاعشیٰ " از قلقشندی ، جلد ۵ ، صفحہ ۶۹ -

Marfat.com

آج کی یونیورسٹیوں سے بھی زیادہ عظیم‌الشان تھے - مدرسہ فیروز شاہی کے بارے میں مشہور مورخ ضیاء الدین برنی کا یہ قول قابل نقل ہے کہ

"دہلی کا یہ مدرسہ اپنی شان و شوکت، خوبی عمارت، محل وقوع، حسن انتظام اور تعلیم کی عمدگی کے لحاظ سے اپنی نظیر نہیں رکھتا - مصارف کے لیے شاہی وظائف مقرر ہیں - پایہ تخت دہلی کی کوئی عمارت حسن تعمیر اور موقع و محل کے لحاظ سے مدرسہ فیروز شاہی کا مقابلہ نہیں کرسکتی - مدرسے کی عمارت بہت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارے واقع ہے- ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علما و فضلا یہاں موجود رہتے ہیں - طلبہ و اساتذہ کے مکانات بنے ہوئے ہیں - باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں ۱-"

عہد عالم گیری کا مشہور مغربی کپتان الگزنڈر ہملٹن اپنے سفر نامہ سندھ میں صرف ایک شہر ٹھٹھہ کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں مختلف علوم و فنون کے چار سو مدرسے تھے - یہ کیفیت ایک شہر کی نہیں، ہر شہر کی تھی، ایک علاقے کی نہیں ہر علاقے کی تھی، اور ایک دور کی نہیں مسلمانوں کے پورے دور حکمرانی کی تھی - مسلمانوں کے پورے دور حکومت میں خواندگی ہی نہیں تعلیم کا معیار بھی بہت بلند تھا - اس کی سہولتیں شہر شہر، قصبہ، قصبہ دیہات دیہات، محلہ محلہ، گھر گھر پہنچی ہوئی تھیں - اور اس سے بدرجہا بہتر حالت تھی جسے آج کے ماہرین ہمہ رس تعلیم (Universal Education) کہتے ہیں -

(۵) مسلمانوں کے نظام تعلیم کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ وہ خالص عوامی تھا - حکومتیں تعلیم کے فروغ کے لیے کثیر روپیہ خرچ کرتی تھیں اور ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرتی تھیں لیکن کسی زمانے میں بھی تعلیم کا نظام حکومت کے تابع نہ تھا - کوئی ایک محکمہ ایسا نہ تھا جو تعلیمی اداروں پر حکومت کی طرف سے نگرانی رکھتا ہو - سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے دور میں "صدرالصدور" کے ایک عہدے کا نام ضرور ملتا ہے - اس کا کام تعلیمی اور اخلاقی امور کی نگرانی تھا لیکن صرف اس حد تک کہ تعلیمی ضروریات پوری ہوں - مدرسوں

---

۱ بحوالہ "ہندوستان میں قدیم اسلامی درس گاہیں"

Marfat.com

کی آزاد فضا پر اس کا کوئی اثر نہ تھا اور نہ یہ نصاب تعلیم کو اپنی گرفت میں رکھتا تھا ۔ اس شعبے کا ایک کام یہ بھی تھا کہ جو اچھے باصلاحیت نوجوان نظر آئیں ان کو فتاوی اور قضا کی ذمہ داریوں کے لیے منتخب کرے ۔ مسلمانوں نے پورے دور حکومت میں کبھی بھی نصاب تعلیم کو حکومت کے تابع نہیں کیا ۔ ہر مدرسہ اپنا نظام چلانے کے لیے آزاد تھا ، حتیٰ کہ وہ مدارس جو صرف سرکاری خزانے سے قایم ہوتے تھے وہاں بھی اساتذہ آزاد تھے ۔ اگر کسی بڑے عالم نے نصاب میں کوئی تبدیلی کی تو آسے اس کی صحت اور علمی برتری کی بنا پر تو قبول عام حاصل ہوا لیکن ریاست کی قوت کے ذریعے اسے مسلط نہیں کیا گیا ۔ تعجب یہ ہے کہ اس کے بغیر بھی پورے نظام میں غیر معمولی ہم آہنگی اور مطابقت پائی جاتی ہے جو اس کا ثبوت ہے کہ ہماری ثقافتی قوتوں کی گرفت معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ بالکل فطری انداز میں تعلیم میں یگانگت اور یک رنگی پیدا ہوئی ۔ اس آزادی کے باوجود اس طرح کی فطری یگانگت کی مثال بھی دنیا کے کسی دوسرے تمدن میں نہیں ملتی ۔

یونانیوں میں آزادی تھی مگر انہوں نے تعلیم کو ایک ذہنی ورزش بنا دیا تھا ۔ چین میں تعلیم پرخاندان اور حکومت دونوں کی گرفت بہت مضبوط تھی ۔ هندو تہذیب میں عمومی تعلیم کا تصور ہی نہ تھا ۔ لیکن مسلمانوں نے ریاست کی طرف سے تعلیم کی حوصلہ افزائی اور غیر معمولی مالی اعانت کے باوجود ایک بالکل آزاد تعلیمی نظام قایم کیا ، جس میں تعلیم کا محور استاد تھا اور نظم و ضبط کو قایم رکھنے والی قوت اخلاق کی قوت تھی ۔ یہ ایک عجیب و غریب تجربہ تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ۔ ہماری نگاہ میں اس کی وجہ اسلام کا مخصوص مزاج ، اکرام انسانیت اور فرد کی آزادی کا اسلامی تصور ، آخرت کی جواب دہی کا احساس اور اسلام کی قایم کردہ معاشرتی جمہوریت ہے جس سے دنیا کے دوسرے نظام نا آشنا نہیں ۔

(٦) ایک طرف یہ آزادی تھی اور دوسری طرف حکومت کی سرپرستی کا عالم یہ تھا کہ وہ تعلیم کو اپنے تمام کاموں سے زیادہ اہم سمجھتی تھی ۔ اس کا اندازہ اس ایک جملے سے کیجیے جو نظام الملک طوسی نے ملک شاہ سلجوق کے جواب میں کہا تھا ۔ ہوا یوں کہ شاہ کو ایک موقعہ پر تعلیم پر غیر معمولی اخراجات سے کچھ تشویش ہوئی اس نے کہا کہ اس زر کثیر سے تو ایک لشکر جرار تیار ہو سکتا ہے ۔ نظام الملک نے کہا کہ " اے بادشاہ تیری

Marfat.com

فوج کے تیر تو فقط چند قدم پر کام دے سکتے ہیں لیکن میں جو فوج تیار کر رہا ہوں اس کے تیر زمین کے سارے طول و عرض میں موثر ہیں اور اس کی دعاؤں اور حسنات کے تیر تو آسمان کی سیر سے بھی نہیں روک سکتے ۔'' ارباب حکومت تعلیم کو ایک تجارت نہ سمجھتے تھے اور نہ خزانے پر اسے ایک بار تصور کرتے تھے بلکہ انہیں یقین تھا کہ یہ دنیا و آخرت دونوں کو بنانے کے لیے ایک موثر ترین ذریعہ ہے ۔

قطب الدین ایبک سے بلبن تک جو حکمران گزرے ہیں انہوں نے بڑے پیمانے پر مدارس قایم کیے اور مساجد تعمیر کرائیں ۔ فیروز تغلق کے بجٹ میں ۱۳۶ لاکھ تنکہ (جو روپے کے برابر تھا[1]) وظائف وغیرہ کے لیے تھا لیکن اس کا تقریباً ۲۵ فیصد یعنی ۳۶ لاکھ تنکہ صرف تعلیم کے فروغ کے لیے استعمال ہوتا تھا اس نے ۳۰ کالج اور ایک یونیورسٹی دہلی میں قایم کی جس کا سارا خرچہ سرکاری خزانے سے پورا کیا جاتا تھا[2] ۔

بہمنی اور دکن کی حکومتیں بھی تعلیم پر کثیر رقوم خرچ کر رہی تھیں ۔ مغل بادشاہوں میں علم کی سرپرستی میں ایک سے ایک بڑھا ہوا تھا ۔ جہانگیر کا ذوق اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بہ قول مصنف تاریخ جان جہان '' اس نے ان مدارس کو از سر نو تعمیر کروایا جو تیس تیس سال سے بند پڑے تھے اور پرندوں اور جانوروں کی رہائش بن چکے تھے ۔ اور ان کو دوبارہ طلبہ اور اساتذہ سے بھر دیا ۔'' جہانگیر نے تعلیم پر دل کھول کر خرچ کیا اور بقول ایچ ۔ جی کین (H. G. Keane) '' اس نے لا تعداد اسکول اور کالج قایم کیے ۔'' محمد شاہ بھی جسے تاریخ '' رنگیلا '' کے نام سے جانتی ہے تعلیم پر بے دریغ خرچ کرتا تھا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا مشہور دارالعلوم اسی کی علمی فیاضیوں کا مرہون منت تھا[3] ۔

یہ تھا مسلمان حکومتوں کا حال ۔ اسی روش پر مسلمان امرا ، اعیان حکومت زمیندار ، جاگیردار اور دوسرے اہل ثروت عمل کرتے تھے ۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی صوبہ اودھ کا حال لکھتے ہوئے رقم طراز ہیں :

---

۱ واضح رہے کہ اس زمانے کے تنکہ کی قوت خرید موجودہ روپیہ کی قوت خرید سے تقریباً تیس گنا بلکہ اس سے بھی زیادہ تھی ۔

۲ Law, N. N. I., *Promotion of Learning in India by Muhammadans*, p. 51

۳ حوالہ مذکورہ بالا

Marfat.com

"پورے صوبہ اودھ اور صوبہ الہ آباد کے بڑے حصے میں پانچ پانچ کوس، زیادہ سے زیادہ دس دس کوس کے فاصلہ پر شرفا اور عالی خاندان لوگوں کی آبادی ہے جو سلاطین و حکام کی طرف سے تنخواہ و جاگیر مدد معاش کے طور پر رکھتے ہیں۔ انہوں نے مساجد، مدارس اور خانقاہیں تعمیر کر رکھی ہیں۔ اور اساتذہ و مدرسین ہر جگہ علمی فیض رسانی میں مشغول ہیں اور انہوں نے طلب علم کا ایک جذبہ و ولولہ پیدا کر رکھا ہے۔ طلبہ گروہ در گروہ اور فوج در فوج ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہے ہیں اور جہاں موقعہ دیکھتے ہیں تحصیل علم میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ ہر بستی کے اہل توفیق ان طلبہ کا خیال رکھتے ہیں اور اس جماعت کی خدمت کو سعادت عظمیٰ شمار کرتے ہیں۔ صاحب قرآن ثانی شاہ جہاں انار اللہ برہانہ کا قول تھا کہ "پورب شیراز مملکت ماست"[1]۔"

(۷) ایک اور قابل ذکر چیز یہ ہے کہ تعلیم ہمیشہ مفت رہی۔ پاک و ہند کے نظام تعلیم میں نہ صرف یہ کہ تعلیم مفت تھی بلکہ طلبہ کے بود و باش اور خورد و نوش کا بھی پورا انتظام کیا جاتا تھا اور جیب خرچ کے لیے غریب طلبہ کو سرکاری ذریعے سے اور امرا کی طرف سے وظائف دیے جاتے تھے۔ کچھ مدرسے تو ایسے تھے جو نہایت شان و شوکت کے ساتھ یہ ضروریات پوری کرتے تھے۔ مدرسوں اور مساجد میں بڑی تعداد میں حجرے ہوتے تھے جو طالب علموں کی رہائش کے کام آتے تھے۔

(۸) اس نظام کی ایک اور خصوصیت استاد و شاگرد کا قلبی تعلق تھا۔ تعلیم کے محور استاد تھے اور شاگرد کی حیثیت معلم اور مربّی کی تھی۔ اساتذہ کا کردار مثالی ہوتا تھا۔ ان کے ایثار و قربانی اور اخلاص اور تعلیمی انہماک کا حال پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کیسے کیسے نمونے تیار کر سکتا ہے اور کتنی کثیر تعداد میں کر سکتا ہے۔ اساتذہ کا تعلق اپنے شاگردوں سے کیسا تھا اس کا اندازہ مشہور مدرس حکیم علی گیلانی کے بارے میں "تذکرہ علمائے ہند" کے اس فقرہ سے کیجیے:

---

۱ "ماثر الکرام"، ترجمہ ملا نظام الدین سہاروی، مطبع مفید عام، صفحہ ۲۲۳۔

Marfat.com

" پیوستہ طلبہ را درس گفتے و بے ایشان طعام نہ خوردے [۱]"

(ہمیشہ طلبہ کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا نہ کھاتے -)

اپنے طلبہ کا ان کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جب ملک العلما مولانا عبدالعلی بحر العلوم کو منشی صدرالدین نے بہار (بردوان) آنے کی تکلیف دی اور گراں قدر تنخواہ کی پیش کش کی تو مولانا نے عذر فرمایا کہ میرے ساتھ ۱۰۰ طلبہ ہیں جب تک ان کے قیام و طعام کا انتظام نہ ہو میں نہیں آ سکتا[۲] - پھر طلبہ کا حال بھی یہ تھا کہ اپنے اساتذہ سے بے حد محبت کرتے تھے اور سعادت مندی ، روحانی انبساط اور قلبی وابستگی کی آخری حدوں کو چھو جاتے تھے -

(۹) اس نظام میں صرف استاد اور شاگرد میں قلبی تعلق ہی نہ تھا بلکہ استاد طلبہ کے تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کی فکر بھی کرتے تھے - اور انہیں ہر وقت یہ خیال دامن گیر رہتا تھا کہ طلبہ کا معیار علم ہی بلند نہ ہو، ان کا معیار اخلاق بھی بلند ہو اور وہ اچھے انسان اور اچھے مسلمان بن کر نکلیں - اگر اس معاشرے میں تقویٰ ، ایفائے عہد ، عصمت و عفت ، ایثار و قربانی ، صلۂ رحمی ، اخلاق و مروت اور ہمدردی و اخوت کا دور دورہ تھا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ تعلیم ایک اخلاق ساز قوت کا کردار ادا کرتی تھی -

(۱۰) اس دور کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی نظام میں جمود نہ تھا - یہ نظام نئی نئی پیدا ہونے والی ضرورتوں کو پورا کر رہا تھا اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نظام کے تیار کردہ افراد محض حجروں کی زینت نہ تھے ، بلکہ نظام حکومت کو بھی چلا رہے تھے اور حکمت و دانش مندی کے ساتھ چلا رہے تھے - اگر درخت کو اس کے پھل سے پہچانا جاتا ہے تو اس نظام کو ان شخصیات سے پرکھا جا سکتا ہے جنہیں اس نے تیار کیا اور جنہوں نے زندگی کے ہر شعبے میں نام پیدا کیا -

---

۱ منتخب التواریخ ' صفحہ ۸ -

۲ " ہندوستانی مسلمان " از مولانا ابوالحسن علی ندوی ، صفحہ ۱۰۸ -

Marfat.com

مزید مطالعے کے لیے

ضیاء الدین احمد، **مفکرین تعلیم** (باب اول تا سوم) - اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی -

محمد حسین خان زبیری، **مشاہیر کے تعلیمی نظریے** - (باب اول تا ششم) اکیڈیمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، **تعلیمات** (باب اول تا ہفتم) - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور -

ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، **مسئلہ تعلیم** - حیدرآباد دکن -

تعلیم کا مسئلہ - ادارۂ مطبوعات طلبہ، کراچی -

مولانا مناظر احسن گیلانی، **مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت** - ندوۃ المصنفین، دہلی -

Dr. Muhammad Rafiuddin, *First Principle of Education*' Iqbal Academy, Karachi.

Marfat.com

۱۹

اسلام کے معاشی اصول*

آج کی دنیا میں معاشیات کی اہمیت ناقابل انکار ہے۔ یہ اہمیت صرف اس احساس کی پیداوار نہیں ہے کہ ایک فرد کے لیے معاشی آزادی کے بغیر سیاسی اور معاشرتی آزادی بے معنی ہو جاتی ہے، معاشرے کے لیے معاشی انصاف کے بغیر سکون، سلامتی اور یک جہتی کا حصول ناممکن رہتا ہے اور قوموں کے لیے معاشی استحکام کے بغیر سیاسی آزادی کو بھی برقرار رکھنا محال ہو جاتا ہے، بلکہ انسان اس حقیقت کے شعور پر بھی بے چین اور مضطرب ہے کہ دنیا میں دولت کی فراوانی، وسائل پیداوار محیر العقول ترقی اور بے مثال معاشی ارتقا کے باوجود غربت، افلاس، بے روزگاری اور معاشی اور معاشرتی ظلم کا دور دورہ ہے۔ آج بھی انسانی آبادی کا ساٹھ فیصدی حصہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ افلاس و نکبت اس کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اس کے پاس نہ پیٹ بھرنے کو روٹی ہے نہ بدن چھپانے کو لباس، اور نہ سر ڈھانپنے کو معقول مسکن![1] ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اور تمام ترقی کے باوجود ہم مجموعی خوش حالی سے کیوں محروم ہیں؟ معاشی ترقی حقیقی انسان فوز و فلاح کا باعث کیوں نہیں ہوئی؟ جب ہم ان مسائل پر غور کرتے ہیں تو ہمیں لازماً معاشی نظام کے مسئلے پر اور ان اصولوں پر، جن کی بنیاد پر معاشی زندگی کو مرتب کیا جاتا ہے، غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ مسئلہ ہمیں بہ حیثیت ایک ملک کے در پیش ہے، مسلمانوں کو پوری دنیا میں بہ حیثیت ایک ملت کے بھی اس سے سابقہ ہے اور پھر پوری

---

* یہ باب اس کتاب کے لیے مرتب نے خاص طور پر تیار کیا ہے۔

۱ Castro, Josue De, D. *Geography of Hungery*, Victor Gollancz Ltd., London, 1952.

Marfat.com

انسانیت بھی اس مسئلے سے دو چار ہے۔ اس لیے ہم مسلمان دنیا کی، جو معاشی اعتبار سے پس ماندہ ہے، مثال کو سامنے رکھ کر پہلے تو نوعیت مسئلہ کو واضح کریں گے اور پھر اسلام کے اصولوں پر گفتگو کریں گے۔

(۲)

اصل مسئلہ

یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آج کے انسان کا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی کا حصول یا پیداوار میں اضافہ ہے۔ بلا شبہ صنعتی ترقی اور معاشی پیداوار میں اضافہ بڑی ضروری چیزیں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری مسئلہ پورے معاشی نظام کا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ خود معاشی ترقی کا انحصار بھی اس مجموعی نظام پر ہے جس کی آغوش میں یہ پروان چڑھتی ہے۔ نظام سے ہٹ کر ترقی کا کوئی تصور مشکل ہے۔

معاشی خوش حالی کا تصور

معاشی ترقی اور خوش حالی کا مفہوم ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ محض پیداوار میں اضافہ ہو جائے۔ معاشی خوش حالی کا اصل مفہوم ایک بہتر اور خوش حال معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے۔ پروفیسر وی۔ اے۔ ڈیمنٹ کے الفاظ میں "صنعتی ترقی اسی معاشرے کی خوش حالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں، بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو۔ اس کے باوجود ایک خاص مرحلے سے آگے بڑھ کر خوش حالی کی رو ماند پڑ جاتی ہے، افراد کے فطری تعلقات میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور معیار زندگی بڑھنے کے بجائے گھٹنے لگتا ہے [1]۔" ایک صحت مند نظام کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشی سرگرمیوں کو مناسب حدود اور تعمیری انداز میں رو بہ عمل آنے کا موقع دے لیکن اس امر پر بھی نگاہ رکھے کہ یہ سرگرمیاں زندگی کے اعلیٰ مقاصد اور اقدار کے لیے نقصان دہ نہ بننے پائیں۔

یہ بات ہمیشہ سامنے رہنی چاہیے کہ "حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو، انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات

---

۱ Prof. V. A. Demant, *Religion and the Decline of Capitalism*, New York, (1952) p. 147

Marfat.com

اس طور پر نئے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لگتے ہیں — اور ان میں سے کئی سرگرمیاں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کسی بھی معاشی یا مالی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے[1] ۔" اور نہ ہی انہیں پیداوار کے اعداد و شمار سے ظاہر کیا جا سکتا ہے ۔ پس ہمارا اصل کام یہ نہیں ہے کہ ہم چند جزوی اور نامکمل تبدیلیاں عمل میں لے آئیں ؛ ہمارا اصل کام پورے نظام کی اصلاح و تبدیلی ہے ۔ اس مسئلے کے بارے میں ہمارا رویہ حقیقت پسندانہ ، انقلابی اور تخلیقی ہونا چاہیے — اور اسی طرح ہم کامیاب بھی ہو سکتے ہیں ۔ ای ۔ ڈی ۔ ڈومر کے الفاظ ہیں " معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے اور ترقی کے کسی بھی تشریحی نظریے کو اپنے اندر معاشرے کے طبعی ماحول ، سیاسی ڈھانچے ، ترغیبات ، تعلیمی نظام اور قانونی نظام کو جگہ دینی چاہیے نیز اس کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ اس معاشرے کے افراد کا سائنس ، معاشرتی تبدیلیوں اور ارتکاز دولت کے بارے میں رویہ کیا ہے[2] ؟"

یہ سمجھنا کسی پہلو سے بھی دانش مندانہ نہیں ہے کہ ہمارا اصل مسئلہ محض صنعتی ترقی یا اس طرح کی کوئی اور چیز ہے — اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسی معاشی ترقی حاصل کی جائے جو صحیح سمت میں ہو تیز رفتار ہو ، صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور صحیح نتائج بھی نکالے ۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ پورے نظام میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں نہ لائی جائیں ، سامراجی دور کے فرسودہ معاشرتی اور اخلاقی تصورات کے مقابلے میں صحت مند تصورات ملک کے سامنے نہ رکھے جائیں ، معاشی پالیسیوں کو بنیادی انسانی اقدار کی اساس پر استوار نہ کیا جائے ، آجر اور مستاجر ، محنت اور سرمائے ، اور زمین دار اور کاشت کار کے درمیان ان اقدار کی روشنی میں از سر نو تعلقات قایم نہ کیے جائیں جو ہمارے بنیادی نظریۂ حیات کا عطیہ ہیں ۔ مندرجۂ بالا تجربے سے جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

(ا) معاشی ترقی صرف بہتر معاشی نظام ہی میں ممکن ہے ۔

(ب) پس ماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور ترقی کا باعث بننے کے

۱ S. H. Frankel: *The Economic Impact on Underdeveloped Countries*, Oxford, (1953), p. 78.

۲ E. D. Domar, "Economic Growth: An Economic Approach" *American Economic Review*, Vol XVII, No. 2, May 1952, p 481.

Marfat.com

بجائے ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے - اس لیے جب تک اسے تبدیل نہ کیا جائے حقیقی معاشی ترقی کی توقع عبث ہے -

(ج) اس طرح ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس معاشی نظام کو تبدیل کر کے ایک ایسے نظام کی بنا ڈالیں جو ہماری ضروریات کو پورا کرسکے اور جو ہمارے تمدن، ہماری اقدار حیات اور ہمارے نظریہ٘ زندگی کے مطابق ہو - اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نیا نظام کیسا ہو؟ ہماری یہ ضرورت اسلامی نظام معیشت ہی پوری کر سکتا ہے اور ہم آیندہ صفحات میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کریں گے - اور یہ بتائیں گے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے کیا اصول دیے ہیں - ہم نے کوشش کی ہے کہ ان اصولوں کو عام فہم انداز میں بیان کریں - ان کو معاشیات کی اصطلاحی زبان میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے لیکن عام قارئین کی سہولت کے لیے اصطلاحی زبان کے مقابلے میں عام انداز اختیار کیا گیا ہے -

(۳)

اسلام کے معاشی اصول

اسلام جو معاشی نظام پیش کرتا ہے وہ مختصراً مندرجہ ذیل اصولوں پر مشتمل ہے -

۱- معاشیات اور اخلاق و مذہب- سب سے پہلے وہ فرد اور جماعت دونوں کے ذہن سے اس باطل نظریے کو ختم کرتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کا تعلق معاشی زندگی سے نہیں اور " تجارت تو بس تجارت ہے! " قرآن پاک بڑے بلیغ انداز میں معیشت اور اخلاق کا تعلق بیان کرتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

مسلمانو! جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو تم اللہ کی یاد کی طرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو — اگر تم جانتے ہو تو یہی تمہارے لیے بہتر ہے - پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کا ذکر کثرت) کے ساتھ کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ - (الجمعۃ - ۹ - ۱۰)

Marfat.com

قرآن پاک میں متعدد مقامات پر معاش کو " فضل اللہ " کہا گیا ہے اور اس سے ذہن میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ یہ سب خدا کی عنایت سے ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ معاشی زندگی کو بھی انسان اسی طرح خدا کی حدود کا پابند بنائے جس طرح باقی تمام زندگی کو اور ان مقاصد کی تحصیل کے لیے استعمال کرے جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ مسلمان اپنی معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کا پابند اور ان اخلاقی ضابطوں کا احترام کرنے والا ہوتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عاید کیے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ

وہ لوگ جنہیں خرید و فروخت اور
تجارت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی
(النور - ۳۷)

خدا کے ذکر کا بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں وہ خدا کو یاد رکھتے ہیں اور اس کی رضا جوئی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ اسی طرح معاہدہ لکھنے اور صحیح گواہی دینے کو تقویٰ قرار دیا گیا اور ناپ تول میں کمی کو ایسا عظیم گناہ کہ اس کی وجہ سے ایک پوری قوم کا تختہ الٹ دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نقطۂ نظر ہے جو اسلام دیتا ہے اور جس کی بنیاد معاشیات اور اخلاق کی ہم آہنگی پر ہے۔ اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز (Approach) اخلاقیاتی اور قدر شناسانہ (Normative) ہے۔

۲۔ معاشی جد و جہد اور اس کا مقام و مقاصد۔ اسلام نے ساری زمین بلکہ پوری کائنات کو انسان کے لیے میدان عمل قرار دیا ہے اور انسان کو ترغیب دی ہے کہ وہ اپنی معاش کے حصول اور خلق خدا کے لیے فارغ البالی کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ جدوجہد کرے۔ معاشیات کی اصطلاح میں اسے پیداوار کو بڑھانے (Maximisation of Production) کی پالیسی کہہ سکتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں اصل اہمیت نفع کی تکثیر کو حاصل ہوتی ہے جب کہ اسلامی معاشیات میں کل پیداوار کی تکثیر اور خدا کے بندوں کے لیے سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی کا حصول بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

وَ لَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ

اور بے شک ہم ہی نے تم کو زمین پر رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمارے لیے سامان معاش پیدا کیے ۔ (الاعراف ـ ۱۰)

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور اس نے تم پر اپنی ظاهری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ھیں ۔ (لقمان ـ ۲۰)

اس بنیادی حقیقت کے اظہار کے بعد اسلام نے انسانوں کو مختلف طریقوں سے محنت ، معاشی جد وجہد اور حصول رزق کی کوشش پر اکسایا ہے اور اس طرح ہر شخص کو فروغ پیداوار کے لیے سرگرم عمل کردیا ہے ۔

(ا) بے عملی ، بے روزگاری اور گداگری کو نا پسندیدہ قرار دیا گیا اور اس پر سخت وعید سنائی گئی ۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو زیب نہیں دیتا کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے ، اور رزق کی تلاش نہ کرے اور یہ کہتا رہے کہ " اللہ مجھے رزق عطا فرما " ـ تم کو (دعا کے ساتھ) اس کے لیے جد و جہد بھی کرنی چاہیے کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان تو سونا چاندی برساتا نہیں ـ
(المدنیہ والاسلام بہ حوالہ اساس تہذیب)

ایک اور حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے لیے کام کرنا بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تم اپنے چہرے پر سوال کا داغ لیے ہوئے آؤ ـ (ابو داؤد)

(ب) پھر مثبت طور پر رزق کی جدوجہد کی ترغیب دی اور اسے ہر مسلمان پر فرض کیا ـ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنی روزی کی تلاش سے غافل ہوکر سوتے نہ رہو (کنز العمال) ـ ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت غنا اور فراغ دستی ہے اور آخرت کی شرافت تقویٰ و پرہیزگاری ہے (کنوز الحقائق)

Marfat.com

اور خود قرآن پاک میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :

وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا

اور دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے
اسے بھول نہ جاؤ ۔ (القصص ۔ ۷۷)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''کسب حلال'' کو ''فریضۃ بعدالفریضہ'' یعنی نماز کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا ہے ۔ اسلام کے نقطۂ نظر پر ایک واقعے سے بڑی روشنی پڑتی ہے ۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو دیکھا جو خستہ حال تھے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اُن سے پوچھا تمہارے پاس کچھ ہے ؟ اُنہوں نے بتایا دو درہم ہیں ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان میں سے ایک درہم کی کلہاڑی خرید دی اور لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا ۔ اس طرح آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے محنت کے پیدآور استعمال کی ترغیب دی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

''صنعت و حرفت کے ذریعے سے روزی کی تکمیل انسان پر فرض (کفایہ) ہے''
'' بعض گناہوں کا کفارہ روزی کمانے میں مغموم و متفکر رہنا ہے ۔''

اور پھر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا :

'' جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا ہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو قیامت کے دن جب وہ اٹھے گا تو اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن ہوگا ۔'' (ابو نعیم فی الحلیہ بحوالہ اساس تہذیب)

ان آیات و احادیث سے محنت اور معاشی جدوجہد کی اہمیت ہمارے سامنے آتی ہے اور انہی کی روشنی میں پیداوار کو بڑھانے اور معیشت کو تقویت دینے کی پالیسی اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم جزو قرار پاتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی فقہ میں معاشی جد وجہد کو فرض عین اور پیداوار کو فروغ دینے کی کوشش کو فرض کفایہ (ایسا فرض جو لازم تو ہر شخص پر ہو البتہ اگر کچھ لوگ اسے ادا کردیں تو سب پر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے) اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے تو مواخذہ ہر فرد سے ہوگا) ۔

Marfat.com

قرار دیا ہے۔ رد المختار[1] میں ہے کہ:

ومن فروض الکفایة الصناعة المحتاج الیها

ضروری صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے۔

اسی طرح المنہاج[2] میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ

ومن فروض الکفایة الحرف والصنائع وما یتم بہ المعاش

فرض کفایہ میں صنعت و حرفت اور وہ تمام چیزیں جو معاش کی تکمیل کے لیے درکار ہیں شامل ہیں

امام ابن تیمیہ رحمۃ علیہ اور اس سلسلے میں مختلف فقہا نے جو نقطۂ نظر بیان کیا ہے اس کا خلاصہ الحسبۃ فی الاسلام میں اس طرح بیان کیا ہے کہ

قال غیر واحد من الفقہاء ومن اصحاب الشافعی و احمد بن حنبل وغیرھم کابی حامد الغزالی وابی الفرج الجوزی وغیرھم ان ھذہ الصناعات فرض علی الکفایة فانہ لایتم المعاش الابھا کما ان الجھاد فرض علی الکفایة

بہت سے فقہا نے جن کا تعلق شافعی، حنبلی فکر سے ہے نیز دوسرے فقہا جیسے امام غزالی اور امام جوزی وغیرہ نے اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ان صنعتوں کا قیام فرض کفایہ میں سے ہے اس لیے کہ معاش کی تکمیل ان کے بغیر ممکن نہیں ہے اس (فرض کفایہ) کی حیثیت (ایسی ہی ہے جیسے) جہاد کی جو فرض کفایہ ہے۔

امام ابن تیمیہ کی دی ہوئی یہ مثال بڑی اہم ہے۔ معاش کی تکمیل انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے اور جس طرح انسانیت کی روحانی اور اخلاقی ضرورتوں کو پورا کرنے اور اسے منکر سے بچانے، طاغوت کے غلبے سے نجات دلانے اور حقیقی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع فراہم کرنے کے لیے — یعنی انسانیت کی تکمیل کے لیے — ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اسی طرح انسانیت کی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صنعت و حرفت کا قیام اور وسائل معاش کی فراہمی ضروری ہے — اور ان دونوں کی حیثیت فرض کفایہ کی ہے۔

یہ وہ اہمیت ہے جو اسلام معاشی جد و جہد کو دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تمام انسانوں کے لیے معاشی

---

۱ ردالمختار علی الدر المختار، جلد ۱، صحفہ ۳۲۔
۲ المنہاج، جلد ۲، صفحہ ۱۹۲۔

Marfat.com

سہولتیں فراہم کی جائیں، قدرت نے جو وسائل ودیعت کیے ہیں ان کو ترقی دی جائے، پیداوار کو امکانی حد تک بڑھایا جائے اور رزق کے خزانوں کو چند ہاتھوں میں اس طرح مرکوز نہ ہونے دیا جائے کہ دوسروں پر اس کے دروازے بند ہو جائیں۔ اسے علم معاشیات کی اصطلاح میں پیداوار کی تکثیر اور وسائل پیداوار کی بہترین تقسیم کہا جا سکتا ہے۔

غربت کے انسداد کا مسئلہ بھی اسلام کی معاشی پالیسی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلام کے معاشی نظام کے مثبت معاشی مقاصد میں غربت کا انسداد اور تمام انسانوں کو معاشی جد وجہد کے مساوی مواقع فراہم کرنا بھی شامل ہے۔ اسلام کا سب سے اہم مقصد کفر کا استیصال ہے اور چوں کہ فقر و فاقہ انسان کو کفر کی طرف لے جاتے رہیں اس لیے اسلام ان کو اپنا بنیادی ہدف سمجھتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> "ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو جس میں وہ رہ سکے، کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے، اور کھانے کے لیے روٹی۔اور پینے کے لیے پانی ہو۔ (ترمذی)

اسلام اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ سب کو حصول رزق کے مواقع دے اور پھر مثبت طور پر ایسی پالیسیاں بنائے جن سے غربت و افلاس ختم ہوں اور انسانوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں لازماً حاصل ہوں۔

اسلام تنگی کو دور کرنے کا طریقہ حصول رزق کی کوشش اور پیداوار بڑھانے کے ذرائع کی طرف رجوع قرار دیتا ہے اور محض غربت، افلاس، معیار زندگی کے گرنے کے خطرے اور قلت وسائل کے واویلے سے انسان کشی اور نسل کشی کی پالیسی کی اجازت نہیں دیتا۔ معاشی مسئلے کا اصل حل معیشت کو فروغ دینا ہے، انسان کی قطع و برید نہیں۔ قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

اور تم اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم ہی ان کو رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ ان کو مار ڈالنا بڑی خطا ہے۔ (بنی اسرائیل - ۳۱)

Marfat.com

اسلام آبادی کے حقیقی مسئلے کا حل اضافۂ پیداوار کی شکل میں تجویز کرتا ہے۔
حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"رزق کا دروازہ عرش تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معیشت غیر محدود ہیں۔" (کنوز الحقائق)

"عورت کو گھر میں خالی بیٹھے رہنے کی جگہ چرخہ کاتنا اچھی کمائی کا مشغلہ ہے۔" (کنوز الحقائق)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مال داروں کو حکم دیا کہ بکریاں پالیں اور غریبوں کو حکم دیا کہ مرغیاں پالیں تاکہ فراغی حاصل کریں۔" (ابن ماجہ)

اس طرح اسلام ہر فرد اور پوری قوم کی توجہ کو معاشی وسائل کی ترقی اور پیداواری امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے پر مرکوز کرتا ہے۔ وہ ایک طرف معاشرے میں انصاف اور آزادی کو قایم کرتا ہے اور دوسری طرف غربت و افلاس کا خاتمہ کرکے بہتر معاشی زندگی کا قیام ممکن بناتا ہے۔ یہاں بھی اس کا مزاج مغرب کی تمام معاشی تحریکات سے مختلف ہے۔

۳۔ حلال و حرام کی تمیز۔ اسلام پیداوار کے اضافے اور معیشت کے ہمہ جہتی فروغ کی پالیسی اختیار کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی شرط بھی لگاتا ہے کہ آمدنی جائز ذرائع سے حاصل کی جائے گی۔ ہر نفع کو جو حرام ذرائع سے حاصل ہو وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے وہ اس امر کو ثابت کرتی ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز اور حلال رزق کے فروغ کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا کلی انسداد کیا جائے گا جو حرام ہیں اور جن کو شریعت ناروا اور ناجائز قرار دیتی ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ كُلُوا۟ مِمَّا فِى ٱلْأَرْضِ حَلَٰلًا طَيِّبًا

اے لوگو! جو چیزیں زمین میں موجود ہیں ان میں سے حلال اور پاک چیزیں کھاؤ۔ (البقرہ - ۱۶۸)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے۔" (المدنیۃ والاسلام)

Marfat.com

"حلال روزی کا طلب کرنا ایسا ہے جیسے خدا کی راہ میں بہادروں سے لڑنا اور جو شخص حلال روزی حاصل کرنے کی کوشش کرکے تھک کر رات کو سو جائے تو خدا اس سے راضی ہے۔"

(المدنیة والاسلام)

اور حرام سے کمائی ہوئی روزی کے متعلق فرمایا :

"حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت اس کا زیادہ مستحق ہے کہ آگ میں ڈالا جائے۔"

یہ ایک ایسا اصول ہے جس سے آج کے دور کی معاشیات بالکل نا آشنا ہے۔ چوں کہ اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کی فراوانی نہیں بلکہ ان کا منصفانہ اور مصلحانہ استعمال ہے اس لیے اس نے معاشی جد و جہد کو حلال و حرام کا پابند کیا ہے۔ خالص معاشی نقطۂ نظر سے یہ وہ چیز ہے جو معاشیات کو محض افادی سطح سے بلند کرکے اصلاحی اور فلاحی سطح پر لے آتی ہے اور اس طرح ایک کی معاشی جد و جہد دوسرے کے لیے معاشی تکلیف یا معاشرہ کے لیے ظلم فساد کا ذریعہ نہیں بن پاتی۔ اسلام نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے اگر ان کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ وہ چیزیں ہیں جو یا تو فرد یا معاشرے کی جسمانی اور اخلاقی زندگی کو مجروح کرتی ہیں اور یا انسانوں کے درمیان حقیقی معاشی تعاون، مساوات، آزادی جد و جہد، عدل و انصاف اور قسط و توازن کا قیام مشکل کردیتی ہیں۔ خالص معاشی اصطلاح میں اس کا فائدہ یہ ہے کہ اسلامی معیشت میں صرف کی تکثیر (Maximisation of consumption) کی جگہ اس کی انسب سطح کا حصول (Optimisation) پیش نظر رہتا ہے اور ایک حقیقی فلاحی معیشت ظہور میں آتی ہے۔

۴۔ **حرمت سود**۔ اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں سے ایک حرمت سود ہے۔ جو معاشی ظلم کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے سود کو اس کی ہر شکل میں حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد ہو یا مرکب، ذاتی قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی اور پیداواری قرضوں پر، حرام ہے، اور اس کے لینے والے کو خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے :

Marfat.com

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔

اے ایمان والو ! سود کے کئی کئی حصے بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ ۔ (آل عمران - ۱۳۰)

ایک حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے پر، سود کا کاغذ لکھنے والے پر اور سود کے گواہوں پر لعنت بھیجی ہے اور ان سب کو برابر قرار دیا ہے ۔ (صحیح مسلم) اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاق بنیادوں ھی پر نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی ، سماجی اور سیاسی مضمرات کی بنا پر بھی ہے ۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباھی کا باعث بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رھی ہے ۔ اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ھو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جد و جہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدم استحکام کا باعث ھوتا ہے ۔

۵ ۔ تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ ۔ اسلام نے تجارت اخلاقیات کا ایک ضابطہ پیش کیا ہے تاکہ اھل تجارت اس کا اتباع کریں ۔ یہ ضابطۂ اخلاق تجارتی لین دین میں دیانت داری اور خدا ترسی کے جذبات کو فروغ دیتا ہے تجارت کے معاملے میں قرآن کی اصولی ھدایت یہ ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ

اے ایمان والو ! اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باھمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو ۔ (النساء - ۲۹)

اس آیت ربانی کے ذریعے سے قرآن کریم نے معیشت کے ان تمام ذرائع کو ممنوع کر دیا ہے جو ظلم و زیادتی اور دوسروں کی حق تلفی پر مبنی ھوں ۔ معیشت اور تجارت کا دائرہ وہ دائرہ ہے جس میں انسان نے نت نئے ظلم کیے ھیں اور خصوصیت سے اھل سرمایہ اور اھل قوت نے دوسرے فریق پر جو کمزور اور غریب ھو، اکثر اپنی مرضی مسلط کی ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے انتفاع (Exploitation) کے یہ سارے دروازے بند کر دیے اور فرمایا کہ معاشی معاملات کی بنیاد باھمی رضامندی اور تجارت کے حصول پر ھونی چاھیے ۔ تجارت میں امانت و دیانت کی اھمیت واضح کرتے ھوئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

Marfat.com

"امانت دار تاجروں کا حشر صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔" (ترمذی)

مختصراً اسلام کے اصول تجارت حسب ذیل ہیں :

(ا) باہمی رضامندی : تجارت باہمی رضامندی سے ہونی چاہیے - دونوں فریق اپنی آزاد مرضی سے کسی جبر یا زبردستی کے بغیر اپنے معاملات کو طے کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں تجارت کی بنیاد " تعاون باہمی " پر ہے اور تجارت کی وہ تمام شکلیں جن میں دوسرے فریق کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر کچھ خاص شرائط یا معاملات اس پر تھوپ دیے جاتے ہیں ، وہ ناجائز ہیں - اس سے یہ بھی مستنبط ہو سکتا ہے کہ ایسی اشتہار بازی یا نفسیاتی حربوں کا ایسا استعمال جو عقل و فکر کو معطل کر دے اور ایک شخص اپنی مرضی کے خلاف محض نفسیاتی شعبدہ بازی کی وجہ سے کسی چیز کی خرید پر مجبور ہوجائے ، اسلام کے مطابق نہیں - اسی طرح آزاد منڈی کو کمزور یا مفلوج کرنے والی وہ تمام قوتیں بھی اسلامی معیشت میں کوئی راہ نہیں پاتیں جن کی وجہ سے جدید دنیا کا منڈی کا نظام درہم برہم ہے اور شدید قسم کی دقتوں اور خامیوں میں مبتلا ہو گیا ہے -

(ب) دیانت : دوسرا اصول یہ ہے کہ تجارت دیانت کے ساتھ ہو۔ اس میں کسی قسم کا دھوکہ یا بد معاملگی نہ ہو- مال کی اصل کیفیت لوگوں کے سامنے رکھ دی جائے - اور ان کو غلط فہمی میں رکھ کر خرید پر مجبور نہ کیا جائے - اسی طرح جان بوجھ کر دوسرے کو نقصان پہونچانا ، معاملے پر معاملہ کرنا ، خیانت یا وعدہ خلافی کرنا ، یہ سب اسلام کی نگاہ میں ممنوع ہیں - اسی طرح ناپ تول میں درست ہونا تجارتی دیانت کا ایک اہم پہلو ہے -

(ج) جائز اور مباح کی تجارت : تیسرا اصول یہ ہے کہ تجارت صرف ان اشیا میں کی جائے جو جائز یا مباح ہوں - وہ تمام اشیا جن کا استعمال معصیت کی تعریف میں آتا ہے ، یعنی شراب ، بت ، اصنام ، خنزیر ، وغیرہ ، ان کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے -

(د) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت : پھر اسلام میں اس بات کی بھی ممانعت ہے کہ ضروریات زندگی کو روک رکھا جائے تاکہ ان کے دام بڑھ جائیں اور اس طرح سے منافع میں اضافہ ہو - ذخیرہ اندوزی اور احتکار کو اسلام نے

Marfat.com

سختی سے منع کیا ہے اور ایسا کرنے والے پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے ۔

(ہ) ۔ جوا اور سٹہ وغیرہ کی ممانعت : اسلام نے تجارت کی وہ تمام شکلیں بھی بند کر دی ہیں جن میں کسی دوسرے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہو یا جن میں مناسب محنت کیے بغیر دولت ہاتھ آ رہی ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ سٹہ ، لاٹری ، اور جوئے کی ساری صورتیں اسلام میں ممنوع ہیں ۔

(و) ۔ اہل تجارت کا ذاتی اخلاق : اسلام کی تمام تعلیمات کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اہل تجارت میں اعلیٰ اخلاقی کردار ہونا چاہیے تاکہ وہ تجارت کا حق ادا کر سکیں اور اسلام کے سچے سفیر بن سکیں ۔ ان میں خصوصیت سے دیانت اور خوش اخلاق ہونی چاہیے تاکہ یہ کیفیت نہ ہو کہ

کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

اُنہیں قوم اور خصوصیت سے اپنے صارفین کی خدمت کے جذبے سے کام کرنا چاہیے اور اپنے کاروبار میں پوری محنت اور دل جمعی سے کام کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی قوتوں کو زیادہ سے زیادہ مفید مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں ۔ پھر سب سے بڑھ کر وہ مستقل مزاجی اور اعتدال کے ساتھ کام کریں اور بہت جلدی دولت جمع کرنے کی ہوس سے بچے رہیں ۔

معاش اور اخلاق میں یہی وہ حسین توازن ہے جو اسلام کے معاشی نظام کا امتیاز ہے ۔

٦ ۔ اسراف کی بندش ۔ طلب حلال کے ساتھ ساتھ اسلام انسان کو جائز مصارف پر دولت خرچ کرنے کی ترغیب بھی دیتا ہے لیکن اسراف سے روکتا ہے اس وجہ سے دولت کا بے جا استعمال اور اس کا ضیاع رک جاتا ہے اور وہ تعمیری اور پیداواری مقاصد میں استعمال ہونے لگتی ہے :

كُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا

کھاؤ اور پیو مگر اسراف
نہ کرو ۔ (الاعراف ۔ ۳۱)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان دکھانے کے لیے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے ۔

Marfat.com

۷ - ارتکاز دولت کی ممانعت - پھر اسلام نے دولت کے ارتکاز (ایک یا چند مقامات پر اس کا جمع ہونا) کو بھی پسند نہیں کیا ہے اور اس بات کا انتظام کیا ہے کہ مختلف معاشرتی، اداراتی، قانونی اور اخلاقی تدابیر سے دولت کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو اور پورے معاشرے میں گردش کرے

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ

ایسا نہ ہو کہ یہ (مال و دولت) تمہارے
دولت مندوں ہی میں گردش کرتا رہے۔
(الحشر - ۷)

حضور کا ارشاد ہے کہ

اقسموا المال بین الفرائض علیٰ کتاب اللہ

اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مطابق اچھا مال ان لوگوں میں تقسیم کرو جن کا حق مقرر کیا گیا ہے۔ (ابو داؤد)

دولت کی تقسیم کے لیے مندرجۂ ذیل صورتیں تجویز کی گئی ہیں :

(ا) زکواۃ : زکواۃ ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقرا و مساکین کا "حق" ہے۔

زکواۃ جہاں حُبِّ مال کو کم کرتی اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور مال قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے وہیں معاشی نقطۂ نظر سے یہ سماجی فلاح کی ایک ہمہ گیر اسکیم ہے۔ جس کے ذریعے سے ملک و ملت کے غریب اور نادار افراد کی مدد کی جاتی ہے اور انہیں زندگی کی جدوجہد میں برابر کی شرکت کے لائق بنایا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ ذہنیت یہ بات پیدا کرتی ہے کہ ہر شخص کی دولت صرف اس ہی کے لیے ہے اور معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اور جو گر جائے اسے فنا ہو جانا چاہیے۔ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا حق صرف اس کو ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اسلام اس ذہنیت کی نفی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو کچھ دولت تم کماتے ہو وہ صرف تمہاری محنتوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس میں فطرت کی بے شمار قوتیں شریک کار ہیں نیز پورا معاشرہ ہزاروں طریقے سے تمہارا معاون و مددگار ہے۔ اس لیے تمہارے مال میں تمہارے علاوہ دوسروں کا بھی حق ہے۔ اہل ثروت کی ذمہ داری ہے کہ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اسے سہارا دیں اور آگے بڑھائیں۔ جو معاشرہ

Marfat.com

کمزوروں کی مدد نہ کرے ، ناداروں کو سہارا نہ دے اور گرتوں کو تھام نہ لے وہ انسانی معاشرہ کہے جانے کا مستحق نہیں - اسلام نظام زکواۃ کے ذریعے سے معیشت کو صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے - اور اس میں امداد باھمی کی روح کو جاری و ساری کر دیتا ہے -

جدید علم معیشت میں سماجی فلاح کا تصور بہت نیا ہے - لیکن اسلام نے پہلے ہی دن سے فلاحی اور خدمتی ریاست کا تصور پیش کیا اور زکواۃ کی شکل میں معاشرے کے کمزور اور مجبور انسانوں کی ضروریات کی فراھمی کی ضمانت دی - اسلامی حکومت نے ابتدا ھی سے اس نظام کو عملاً قایم کیا ، آبادی کی مردم شماری کی ، ناداروں کے رجسٹر بنائے ، ضرورت مندوں کو سرکاری وظیفے دیے اور تھوڑے ھی عرصے میں یہ حال ہو گیا کہ بقول مورخ طبری زکواۃ دینے والے تو سینکڑوں تھے مگر زکواۃ لینے والے نہ ملتے تھے -

پھر زکواۃ دولت کی تقسیم میں غیر فطری عدم مساوات کو ختم کرنے کا ایک ذریعہ ہے - اس کے ذریعے سے امیروں کی دولت غریبوں کی طرف منتقل ھوتی ہے - معاشی بحران کے جس چکر میں سرمایہ دارانہ دنیا گرفتار ہے اس کو دور کرنے میں بھی زکواۃ بڑی مفید و معاون ہو سکتی ہے - تجارتی چکر ، سرمایہ کاری اور قوت صرفہ میں عدم توازن کی بنا پر رونما ھوتا ہے لیکن زکواۃ جہاں ایک طرف پیداواری عمل کو تیز کرتی ہے وہیں دوسری طرف عوام میں قوت خرید کا اضافہ بھی کرتی ہے اس طرح یہ معیشت میں معاشی توازن قایم کرنے کا آلہ بن جاتی ہے -

(ب) **صدقات واجبہ:** بہت سے ایسے صدقات مقرر کیے گئے ھیں جو مختلف مواقع پر ہر صاحب حیثیت مسلمان کو ادا کرنے ھوتے ھیں جیسے صدقہ فطر وغیرہ - یہ بھی مندرجہ بالا مقصد پورا کرتے ھیں -

(ج) **انفاق:** اسلام ہر مسلمان میں انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے ، مال سے محبت کو کم کرتا ہے اور خدا کی راہ میں خرچ کرکے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کرنے کی ترغیب دیتا ہے -

(د) **قانون وراثت:** اسلام نے وراثت کا جو قانون تجویز کیا ہے وہ اس طرح کا ہے کہ متوفی کا ترکہ پورے خاندان میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ

Marfat.com

تقسیم ہو جاتا ہے اور ساری جائداد مغربی ممالک کی طرح کسی ایک وارث کو نہیں ملتی - اس طرح دولت کے ارتکاز کے بجائے اس کی منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے -

(ز) حق سوی الزکواۃ : زکواۃ اور صدقات واجبہ کے علاوہ بھی اگر ضرورت محسوس ہو تو حکومت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ لوگوں سے مزید مال بہ طور ٹیکس لے اور اسے استحکام ریاست ، قیام انصاف اور فلاح عامہ کے لیے صرف کرے - حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " بے شک مال میں زکواۃ کے سوا اور بھی حق ہے -" (ترمذی)

(ح) العفو : اسلام نے انسان کو صرف انفاق ہی کی ترغیب نہیں دی بلکہ اس میں یہ جذبہ بھی پیدا کیا کہ اس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ جو بھی ہو اسے خدا کی راہ میں اور دوسروں کی بہتری کے لیے خرچ کردے -

وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۥ قُلِ الْعَفْوَ

وہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا خرچ کریں
کہہ دیجیے العفو (یعنی جو اپنی ضرورت
سے زیادہ ہو) - (البقرہ - ۲۱۹)

اس طرح اسلام پورے معاشرے میں دولت کی منصفانہ تقسیم رو بہ عمل لاتا ہے - اس کی پالیسی کے دو بنیادی اصول فروغ پیداوار اور دولت کی منصفانہ تقسیم ہیں - وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز نہیں کرتا -

۸ - ملکیت و تصرف کا حق - اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو اصلاً خدا کی دین اور اس کی ملکیت قرار دیتا ہے - اس کے ساتھ ساتھ تمام معاشی معاملات میں انسان کو اس عظیم تر ملکیت کے تصور کے تحت ، انفرادی ملکیت و تصرف کا حق دیتا ہے - یہی وہ شکل ہے جس میں انسان کی معاشی آزادی محفوظ رہ سکتی ہے اور اچھے اخلاق پروان چڑھ سکتے ہیں - لیکن یہ حق غیر محدود نہیں ہے یعنی اگر ملکیت آلۂ ظلم بن جائے یا دوسروں کے حقوق پر اس کا غلط اثر پڑ رہا ہو تو ریاست کو مداخلت کا بھی حق ہے - دراصل اسلام ملکیت کے اس محدود حق کو ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے اختیار کو بہت سی قانونی اور اخلاقی پابندیوں سے محدود کرتا ہے -

Marfat.com

۹ ۔ عدل اجتماعی کی ضمانت ۔ اسلام ریاست کے معاشی وظائف کا بھی ایک مثبت تصور پیش کرتا ہے اور سماجی فلاح اور معاشی انصاف کے قیام کو اس کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے ۔ زکواۃ سماجی فلاح کی ایک اسکیم ہے جس کے نظام کو ریاست کے ہاتھوں قایم کیا جاتا ہے ، معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعہ ریاست عدل اجتماعی قایم کرتی ہے ۔ جس کا کوئی وارث نہیں اس کی ریاست وارث ہے اور جس کا کوئی ولی نہیں ، اس کی ریاست ولی ہے ۔ ناداروں ، اپاھجوں اور محتاجوں کی مدد ریاست کا فرض ہے اور یہ بھی اس کی ذمہ داری ہے کہ تمام شہریوں کو ان کی بنیادی ضرورتیں فراہم کرے ۔

السلطان ولی من لا ولی له — حکومت ہر اس شخص کی ولی (دست گیر و مددگار) ہے جس کا کوئی ولی نہ ہو ۔ (بخاری)

ایک اور حدیث میں ہے : من ترك كلا فالينا (بخاری ، مسلم)

یعنی جس مرنے والے نے ذمہ داریوں کا کوئی بار (مثلاً قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا ہو وہ ہمارے ذمے ہے ۔

ایک خلیفۂ راشد نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی ہے :

”خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صفا کی پہاڑیوں میں جو چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے اس کو اس مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اس کے لیے اس کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی ۔“

اور یہ کہا :

”خدا کی قسم اگر اہل عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لیے زندہ رہ گیا تو ان کو اس حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد ان کو کسی اور امر کی مدد کی احتیاج باقی نہ رہے گی ۔“

حضرت علی رض نے اس بات کو اس طرح ادا کیا ہے :

”اللہ تعالیٰ نے دولت مند لوگوں پر ان کے اموال میں اتنی مقدار مقرر کی ہے جو غربا کے لیے کافی ہو سکے ۔ اس کے باوجود اگر وہ بھوکے ، ننگے اور تنگ دست ہوں تو یہ صرف دولت مندوں کی عدم توجہی اور بخل کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ضروری قرار دیا ہے کہ ان امرا سے قیامت کے دن محاسبہ کرے گا ۔“

Marfat.com

ان احکام کے مطابق جو نظام قایم ہوتا ہے اس میں زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے اور آسمان اپنی نعمتوں کی بارش کرنے لگتا ہے اور افلاس و تنگ دستی ختم ہو جاتی ہے ۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> ''اے لوگو! صدقہ دو کیوں کہ تم پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ آدمی صدقہ لیے لیے پھرے گا مگر وہ کسی ایسے شخص کو نہ پائے گا جو اسے قبول کرے ۔'' (یعنی اس کا حاجت مند ہو) ۔

یہ ہے اسلام کا معاشی نظام — اور در حقیقت انسانیت کی نجات انہی اصولوں میں مضمر ہے ۔ اس کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی اور اخلاقی فلاح ہے — وہ معاشی ترقی کو اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ سماجی انصاف ، آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے اس کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے مقصد اپنے مزاج اور اپنے اصولوں کے اعتبار سے مختلف ہے اور ہر حیثیت سے ان سے اعلیٰ اور برتر ہے ۔

مزید مطالعے کے لیے

ڈاکٹر یوسف الدین احمد ، **اسلام کے معاشی نظریے** ۔ حیدرآباد دکن ، ۱۹۵۱ ۔

ڈاکٹر انور اقبال قریشی ، **اسلام اور سود** - حیدرآباد دکن ۔

امام ابو یوسف ، **اسلام کا نظام محاصل** (ترجمہ نجات اللہ صدیقی) ۔ مکتبۂ چراغ راہ ، کراچی ، ۱۹۶۷ ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، **اسلام اور جدید معاشی نظریات** ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، **سود** ۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ، **اسلام کا تصور ملکیت** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور ۔

Marfat.com

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ، غیر سودی بنکاری - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ' لاہور -

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی ' مضاربت کے شرعی اصول - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ' لاہور -

ڈاکٹر عبدالطیف ' اساس تہذیب - حیدرآباد دکن -

Shaikh Mahmud Ahmed, *Economics of Islam*, M. Ashraf, Lahore.

Dr. M. Umar Chapra, *Economic System of Islam*, Karachi University, Karachi.

Dr. Nijatullah Siddiqui, *Some Aspects of Islamic Economy*, Islamic Publications Ltd., Lahore.

Marfat.com

۲۰

اسلام کا سیاسی نظام*

انسان نے اپنی اجتماعی زندگی کی ترتیب و تہذیب کے لیے جو ادارے قایم کیے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ سب سے زیادہ اہم اور بنیادی ہے۔ ریاست وہ ہیئت سیاسی ہے جس کے ذریعے سے ایک ملک کے باشندے ایک باقاعدہ حکومت کی شکل میں اپنا اجتماعی نظام قایم کرتے ہیں اور اسے قوت قاہرہ اور قوت نافذہ کا امین قرار دیتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں:

> ''ریاست ایک منظم سماج کا نام ہے۔ یہ اس وقت وجود پذیر ہوتی ہے جب کہ ایک طرف افراد پر اقتدار قایم کرنے اور دوسری طرف افراد کی جانب سے اطاعت کرنے کا دو گونہ رابطہ عمل میں آجائے۔ اطاعت کے امر واقع کا ہونا اس بات کو کافی ہے کہ ریاست موجود ہو گئی[۱]۔''

اجتماعی زندگی کے لیے ریاست کا وجود ناگزیر ہے۔ انسان جب دوسروں سے معاملات کرتا ہے تو ان معاملات کی ضابطہ بندی کے لیے قانون کی اور اس قانون کو نافذ کرنے والے ادارے کی ضرورت پہلے ہی قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ ریاست وہ ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات، معاشی لین دین اور تمدنی معاملات کی استواری کا نگراں و محافظ ہے۔ فرد کو اپنے نشو و ارتقا کے لیے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں ایک طرف امن و امان قایم ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کردے جو وہ خود حاصل نہیں کرسکتا۔ دفاع، قیام نظم و قانون، حصول عدل، تعلیم وہ چیزیں ہیں جو ریاست کے ذریعے سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔

* یہ باب مرتب نے اس کتاب کے لیے بہ طور خاص تحریر کیا ہے۔

۱ مبادی علم السیاست از اسٹیفن لی کاک۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ انسانی زندگی کی تشکیل میں ریاست کا حصہ بڑا اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے اپنی تہذیبی زندگی کے آغاز سفر ہی میں اس ادارے کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور پوری انسانی تاریخ ریاست کے استحکام، اس کی تنظیم و تہذیب اور اس کے فروغ و ارتقا کی تاریخ ہے۔ اور دور جدید میں عملی طریقوں کی ترقی اور اجتماعی زندگی میں نت نئی پیچیدگیوں کے راہ پا جانے کی وجہ سے ریاست کا دائرۂ کار برابر بڑھ رہا ہے، اس کے اثر و نفوذ میں اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی قوت اور وسائل میں ترقی ہو رہی ہے۔ دنیا کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ریاست کا کام محض امن و امان اور نظم و ضبط قایم رکھنا ہی نہیں بلکہ اجتماعی عدل اور سماجی فلاح کا قیام بھی ہے۔ ریاست کا ادارہ ایک مثبت ادارہ ہے جو زندگی کے سب ہی شعبوں کو متاثر کرتا ہے، اس کے قیام و ارتقا میں انسان کی اخلاقی حس اور تصور عدل کا غیر معمولی دخل رہا ہے۔ انصاف وہ محور ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر پرزہ حرکت کرتا ہے۔ چناں چہ ریاست اگر معاشی تعلقات کو ترتیب دیتی ہے تو اس لیے کہ عدل قایم ہو، قوانین بناتی یا بدلتی ہے تو اس لیے کہ وہ اصول انصاف سے زیادہ مطابقت اختیار کر سکیں۔ اخلاقی احساس کا غلبہ اس درجہ ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے مفاد کی بنا پر قانون بناتے ہیں تو ان پر بھی اصول اخلاق و انصاف ہی کا جامہ پہنا کر قوم کے سامنے پیش کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی آئین مملکت نے کوئی ایسی شکل اختیار کی ہے جو قوم کی چشم اخلاق میں کھٹکتی ہو تو جلد یا بادیر انقلاب واقع ہوا اور ریاست کی بنیاد ہل گئی، نیز یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ استحکام اور صحت مند ارتقا اس وقت حاصل ہوا ہے جب آئین و قانون قوم کے اصول اخلاق اور ان کے اجتماعی ضمیر کے مطابق تھے۔

اسلام اخلاق و سیاست کے اس فطری تعلق کو ایک بنیادی حقیقت کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ اس کے نظام فکر و عمل میں اس جاہلانہ تصور کے لیے کوئی گنجائش نہیں کہ دین و سیاست دو جدا چیزیں ہیں۔ ریاست کا مقصد انصاف قایم کرنا ہے اور یہ کام دین کا ہے کہ وہ ان اصول انصاف اور ضابطۂ اخلاق کو فراہم کرے جسے ریاست قایم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے اور وہ حیات انسانی کے ہر پہلو کے لیے ہدایت دیتا ہے۔ اس ہمہ گیر ہدایت کا نام شریعت ہے۔ قرآن میں ہمیں

Marfat.com

حکم دیا گیا ہے کہ ہم پوری شریعت کا اتباع کریں اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ (البقرہ - ۲۰۸)

اہل کتاب جن احکام خداوندی کو اپنی خواہش و پسند کے مطابق پاتے، ان پر تو عمل پیرا ہوجاتے لیکن جو احکام الٰہی ان کی خواہش و پسند کے مطابق نہ ہوتے ان سے کنی کترا جاتے، اس بنا پر ان کو خدا کی جانب سے تہدید کی گئی کہ

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ

کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور بعض کا انکار کرتے ہو؟ (البقرہ - ۸۵)

پھر اس روش کی بابت اس ہلاکت خیز سزا کا اعلان فرمایا:

فَمَا جَزَاءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰ أَشَدِّ الْعَذَابِ

پس تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و نامرادی کے اور کیا ہو سکتی ہے اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ (البقرہ - ۸۵)

ان احکام کے بعد زندگی کے کسی بھی حصے کو اسلام کے دائرے سے باہر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، انبیائے کرام وقت کی اجتماعی قوت کو اسلام کے تابع کرنے کی جد و جہد کرتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی تخیل ہی یہ تھا کہ اقتدار خدا اور صرف خدا کے لیے ہو جائے اور شرک اپنی ہر جلی اور خفی شکل میں ختم کر دیا جائے۔ ان میں سے ہر ایک کی پکار یہی تھی۔

يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ

اے برادران قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔ (الاعراف - ۶۵)

Marfat.com

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ

(سن رکھو) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کے
لیے نہیں ۔ (یوسف ۔ ۴۰)

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ

خبردار! تخلیق (کی کارفرمائی) اسی کی ہے اور
حکم بھی اسی کے لیے ہے ۔ (الاعراف۔ ۵۴)

اور ان میں سے ہر ایک نے خدا کی حاکمیت کے نمائندے کی حیثیت سے اپنی قوم سے مطالبہ کیا:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ

اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔
(الشعراء ۔ ۱۶۳)

خدا کے ان فرستادہ بندوں نے زندگی کے ہر شعبے کی اصلاح کی جد و جہد کی تاکہ خدا کی زمین پر خدا کا دین اور اسی کا قانون جاری و ساری ہو۔ ان کی یہ جد و جہد پوری زندگی کی اصلاح کے لیے تھی اور ریاست و سیاست کی اصلاح اس کے ذرائع میں سے ایک اہم ترین ذریعہ تھی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، اور حضرت سلیمان علیہ السلام اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قایم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خود خالق ارض و سماوات اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھاتا ہے کہ:

وَقُلْ رَّبِّ أَدْخِلْنِي مُدْخَلَ صِدْقٍ وَأَخْرِجْنِي مُخْرَجَ صِدْقٍ وَاجْعَل لِّي مِن لَّدُنكَ سُلْطَانًا نَّصِيرًا

اور (اے نبی) دعا کرو! اے پروردگار، مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا، اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔ (بنی اسرائیل ۔ ۸۰)

یہ آیت ہجرت نبوی سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اے اللہ! یا تو مجھے خود اقتدار عطا کر یا کسی حکومت کو میرا مددگار بنا دے تاکہ

Marfat.com

اس طاقت سے میں دنیا کے بگاڑ کو درست کر سکوں ، برائیوں کے سیلاب کو روک سکوں ، نیکیوں کو قایم کرسکوں اور تیرے قانون عدل کو جاری کر سکوں۔ اس آیت کی یہی تفسیر حسن بصری اور قتادہ نے کی ہے اور اسی کو ابن جریر اور ابن کثیر جیسے جلیل القدر مفسرین نے اختیار کیا ہے ۔ اس کی تائید ان احادیث سے بھی ہوتی ہے :

ان اللہ لیزع بالسلطان مالا یزع بالقرآن (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدباب کر دیتا ہے جن کا سد باب قرآن سے نہیں کرتا ۔

الاسلام والسلطان اخوان تو امان لا یصلح واحد منہما الا لصاحب فالاسلام اسس والسلطان حارس ومالا اسس لہ لیہدم ومالا حارس لہ ضائع۔ (کنز العمال)

اسلام اور حکومت و ریاست دو جڑواں بھائی ہیں ۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا ۔ پس اسلام کی مثال ایک عمارت کی ہے اور حکومت گویا اس کی نگہبان ہے ۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے اور جس کا نگہبان نہ ہو وہ لوٹ لیا جاتا ہے ۔

اسلام ایک قانون شہادت دیتا ہے ۔ اس کا اپنا فوجداری اور دیوانی قانون ہے وہ تجارت اور معاملات کے لیے قانونی ہدایت دیتا ہے ۔ وہ نکاح و طلاق ، وراثت و وصیت ، بیع و ہبہ کے لیے قوانین دیتا ہے ۔ اگر حکومت و اقتدار اس کو حاصل نہ ہو تو اس کی شریعت کا ایک حصہ معطل ، بے کار اور ناقابل عمل ہو جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام اور حکومت دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔

*خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں ایک بہت بڑا کام اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت کا ایک اہم مقصد حکومت الٰہی کا قایم کرنا اور دنیا میں آسمانی نظام سیاست و اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا ۔ یہ نکتہ اچھی طرح سمجھنے کے لائق ہے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی نظام و قوانین و حدود کے اجرا اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی سب کوششیں کوہ کندن وکاہ بر آوردن ثابت ہوں گی ۔ صرف چند خاص لوگوں کی اصلاح ہوگی ، لیکن ضرورت فضا بدلنے اور جڑ مضبوط کرنے کی ہے ۔ یہی وہ نقشہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ

* یہ اقتباس مولانا سید ابوالحسن صاحب ندوی کی کتاب "سیرت سید احمد شہید" سے ماخوذ ہے ۔ ملاحظہ ہو صفحات ۲۲ - ۲۵ : (مرتب)

Marfat.com

علیہ وسلم نے کام کیا اور تجربہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ اور پائدار کامیابی اسی کو ہوئی اور قیامت تک اسلام کی ترقی کا ضامن یہی نظام عمل ہو سکتا ہے ۔

اسلام صرف خواص کا مذہب نہیں اور چند منتخب لوگوں کا اس پر عمل کرنا کافی نہیں ، اسی طرح اسلام اکثر مذاہب کی طرح چند عقاید و رسوم کا نام نہیں ۔ وہ زندگی کا نظام ہے ۔ وہ زمانے کی فضا ، طبیعت بشری کا مذاق اور سواد اعظم کا رنگ بدلنا چاھتا ہے اور عقاید کے ساتھ ساتھ اخلاق و معاشرت ، زندگی کے مقصد و معیار ، زاویہ نظر اور انسانی ذہنیت کو بھی اپنے قالب میں ڈھالنا چاھتا ہے ۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ اس کو مادی و سیاسی اقتدار حاصل ہو ، صرف اسی کو قانون سازی اور تنقید کا حق ہو ، اسی کے صحیح نمایندے دنیا کے لیے نمونہ ہوں ۔ اسلام کے مادی اقتدار کا لازمی نتیجہ اس کا روحانی اقتدار اور صاحب اقتدار جماعت کے اخلاق و اعمال کی اشاعت ہے ۔ اس حقیقت کو قرآن نے اس طرح بیان کیا ہے :

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ

یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا (یعنی ان کا حکم چلنے لگا) تو وہ نماز قایم کریں گے ، ادائے زکواۃ میں سرگرم ہوں گے ، نیکیوں کا حکم دیں گے ، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے ۔ (الحج ۔ ۴۱)

امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام میں جس قدر اہم فریضہ ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد یہی بتایا گیا کہ

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے ، تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو ۔ (آل عمران ۔ ۱۱۰)

اور قیامت تک کے لیے مسلمانوں کا یہی فرض قرار دیا گیا ہے :

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دے ، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے ۔ (آل عمران ۔ ۱۰۴)

لیکن یہ یاد رہے کہ اس کے لیے امر (حکم) اور نہی (ممانعت) کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ۔ اہل علم جانتے ہیں کہ امر و نہی کے لفظ میں اقتدار

Marfat.com

اور تحکیم کی شان ہے ۔ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ بھلائی اختیار کرنے کی درخواست و عرض کریں گے اور برائی سے باز رہنے کی التجا کریں گے ۔ پس امر و نہی کے لیے سیاسی اقتدار اور مادی قوت کی ضرورت ہے اور امت کا فریضہ ہے کہ وہ اس کا انتظام کرے ۔ صحیحین[1] کی مشہور حدیث ہے :

من رأی منکم منکراً فلیغیرہ بیدہ فان لم یستطع، فبلسانہ ، فان لم یستطع فبقلبہ و ذالک اضعف الایمان ۔

تم میں (سے جو شخص کوئی بدی دیکھے ، اس کو ہاتھ سے (نیکی سے) بدل دے، اگر ایسا نہ کرسکے، تو زبان سے روکے، اگر زبان سے بھی نہ روک سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ (آخری درجہ) ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے ۔

ظاہر ہے کہ " تغیر بالید " (ہاتھ سے بدل دینے اور عملی اصلاح) کے لیے قوت و اختیار کی ضرورت ہے ۔ زبان سے روکنے کے لیے بھی کچھ قدرت اور آزادی کی ضرورت ہے ۔ اگر یہ کچھ نہیں تو تیسرے درجے پر قناعت کرنی پڑے گی جو ایمان کا آخری درجہ ہے اور جس کے بعد ، بعض روایات کے مطابق "ایک ذرہ برابر بھی ایمان نہیں رہ جاتا ۔" مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ غلامی میں بدی کو دل سے برا سمجھنا اور زشت و نیک کا احساس بھی جاتا رہتا ہے ۔

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر!

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی فطرت اس بات کا مطالبہ کرتی ہے اور قرآن و حدیث کے نصوص اس امر کا تقاضا کرتے ہیں کہ اسلام کی سر بلندی کے لیے آزاد فضا حاصل کی جائے اور ریاست اور حکومت کو دین کے فروغ اور اسلام کے بتائے ہوئے مقاصد حیات کے لیے ان حدود میں رہ کر استعمال کیا جائے جو قرآن و سنت نے متعین کر دی ہیں ۔ جو ریاست ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشش کرے وہ اسلامی ریاست ہے اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نا مکمل رہے گا ۔ خود پاکستان کے قیام کی جد و جہد بھی مسلمانوں کے اسی احساس کا نتیجہ تھی کہ ان کی ایسی ریاست ہونی چاہیے جہاں وہ اپنے عقاید و تصورات اور اپنے قانون حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزار سکیں ۔

فقہ کے ایک بنیادی مسئلے سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے ۔ اسلامی فکر کے تمام مکاتیب خیال اس امر پر متفق ہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے نصب امامت

---

۱ یعنی بخاری اور مسلم ۔ (مرتب)

Marfat.com

لازمی ہے ، خلیفہ اور امام کا تقرر واجب ہے کیوں کہ نظم ملت ، قیام امن ، حصول نفع و دفع ضرر اور نفاذ احکام شریعت ، امامت و خلافت کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ۔ علامہ ابن حزم اپنی کتاب "الفصل بین الملل و النحل" میں لکھتے ہیں :

انفق جمیع اہل السنہ و جمیع المرجئة وجمیع الشیعة و جمیع الخوارج علی وجوب الامامة وان الامة واجب علیها الانقیاد لامام عادل یقیم احکام اللہ ویسوسهم باحکام الشریعة التی اتی بها رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم[1]

کل اہل سنت ، مرجئہ ، شیعہ ، خوارج سب کا اتفاق ہے کہ نصب امام واجب ہے اور یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قایم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قایم کرے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں ۔

اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ رقم طراز ہیں :

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لیے ہے[2] ۔"

یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر پوری امت کا اجماع ہے ۔ تمام فرقے اس پر متفق ہیں ۔ اختلاف اگر ہے تو تقرر و انتخاب کی تفاصیل و جزئیات میں یا اس کے طریق و شرائط میں ہے لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں ۔ یہ سب کی نگاہ میں لازمی اور ضروری ہے ۔

ہماری اب تک کی بحث سے یہ نتائج نکلتے ہیں :

(۱) ریاست کا ادارہ انسانی سماج کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔

(۲) اسلام انسان کی پوری زندگی کے لیے ہدایت ہے اور اس نے اجتماعی زندگی کے لیے بھی واضح رہنمائی دی ہے ۔

(۳) اسلام دین و سیاست میں کسی تفریق کا روا دار نہیں ۔ وہ پوری زندگی کو خدا کے قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے سیاست کو

---

۱ ابن حزم ، المحلی ، جلد چہارم ، صفحہ ۸۷
۲ شاہ ولی اللہ ، ازالۃ الخفاء ، مقصد اول ، فصل اول ۔

Marfat.com

بھی اسلامی اصولوں پر مرتب کرتا ہے اور ریاست کو اسلام کے قیام اور اس کے استحکام کے لیے استعمال کرتا ہے ۔

(۴) یہ روش دنیا و آخرت دونوں میں عتاب الٰہی کی موجب ہے کہ کچھ احکام الٰہی کو تسلیم کر کے اس پر عمل کیا جائے اور کچھ دوسرے اسلامی احکام سے صرف نظر اور روگردانی اختیار کی جائے ، خواہ خواہش و نفس کی اندرونی وحشت کی بنا پر یا کسی بیرونی دباؤ یا مرعوبیت کی بنا پر ۔

(۵) اسلام اور ریاست و حکومت کا اتنا قریبی تعلق ہے اور یہ ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ اگر ریاست و حکومت اسلام کے بغیر ہوں تو وہ ظلم اور بے انصافی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور ان کے نتیجے میں ''چنگیزی'' رونما ہوتی ہے[1] ۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کے ایک حصے پر عمل ہی ممکن نہیں رہتا ۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریاست کو اسلامی بنیادوں پر قایم کیا جائے اور حکومت اسلام کی پابند ہو اور اس کے قیام کے لیے سرگرم عمل رہے ۔

آئیے اب یہ دیکھیں کہ اسلام جو ریاست قایم کرتا ہے اس کی خصوصیات کیا ہیں اور دنیا کے دوسرے سیاسی نظاموں سے کس حد تک مختلف ہے ۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

(۱) اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلامی ریاست کی سب سے پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے ۔ اس ریاست کی بنیاد نہ نسل پر ہے اور نہ رنگ پر ، نہ زبان پر ہے اور نہ وطن پر ، نہ محض معاشی مفاد کا اشتراک اس کی اساس ہے اور نہ محض سیاسی الحاق ۔ اس ریاست کی اصل بنیاد یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی علم بردار ، اس کی تابع اور اس کو قایم کرنے والی ہے ۔ جو ریاست خدا کی سیاسی حاکمیت کا اعلان کرے اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والی بنے وہ اسلامی ریاست ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ہر ریاست کی طرح اسلامی ریاست کے لیے بھی ایک متعین علاقہ اور آبادی ہونا ضروری ہے ، اور اس سرزمین کی حفاظت اور

---

۱ جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
(اقبال)

Marfat.com

اس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود ہر لمحہ اس کے سامنے رہتی ہے لیکن اسلامی ریاست کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے اور ایک ایسے اصول کی داعی ہے جو تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے -

سورهٔ حج کی وہ آیت گذر چکی ہے ، جس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ

> یہ مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیا تو وہ نماز قایم کریں گے ، ادائے زکواۃ میں سرگرم رہیں گے ، نیکیوں کا حکم دیں گے ، برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہے (الحج - ۴۱)

اور ایک دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے کہ

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ

ہم نے اپنے رسول واضح نشانیاں دے کر بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان (عدل) اتاری ، تاکہ انسان انصاف پر قایم رہیں اور ہم نے اتارا لوہا (ریاست کی قوت و جبروت) جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کے لیے بہت فواھد بھی ہیں - تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس (کے دین) کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے -
(الحدید - ۲۵)

اسی طرح سورۃ النور میں ارشاد ہوا ہے کہ

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـــًٔا ۭ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

تم میں جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس دین کو اس نے ان کے لیے پسند کیا ہے اس کو ان کے لیے قوت دے گا اور خوف و ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا - وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ کریں گے ، اور جو اس کے بعد نافرمانی کے روش اختیار کریں گے وہ فاسق ہیں ، اور (اے مسلمانو) نماز قایم کرو اور زکواۃ کی ادائیگی کرتے رہو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے - (النور - ۵۵ - ۵۶)

Marfat.com

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قایم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق انصاف قایم کرنا، نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے - یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سر بلندی ہے جسے قایم کرنے کے لیے یہ وجود میں لائی جاتی ہے -

اسلام میں قانون حکومت و ریاست پر فوقیت رکھتا ہے اور خود حکومت خدا کے قانون کی پابند اور اس کے تابع ہوتی ہے - ریاست کلّی اختیارات کی حامل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے اور اس کی پابند و ماتحت ہے - اس میں اصول اطاعت یہ ہے کہ خدا اور اس کے رسول کی اطاعت ہر اطاعت سے بلند و بالا ہے - ہر شخص کی بنیادی وفاداری شریعت سے ہے - ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کی وفادار ہے اور اگر وہ ان کی بے وفائی کرے تو مسلمان ہر گز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ اس اصول کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے -

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی، اور اطاعت کرو رسول کی، اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں، پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیردو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔
(النساء - ۵۹)

اس آیت ربانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ـ

۱- اصل اطاعت اللہ اور اس کے رسول کی ہے - مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مرکز و محور خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری اور وفاداری ہے - دوسری اطاعتیں صرف اس صورت میں قابل قبول ہوں گی جب وہ خدا اور رسول کی اطاعت کے تحت اور تابع ہوں - خدا اور رسول کے احکام کے علی الرغم کسی کی اطاعت جائز نہیں - اسی حقیقت کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح واضح فرمایا ہے کہ :

لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق۔ خالق کی نا فرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں-

Marfat.com

۲۔ مسلمانوں کے اولی الامر ، یعنی وہ اصحاب اقتدار جنہیں فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں ، مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں ۔ "منکم" (تم میں سے) کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے ۔ اس لیے اسلامی ریاست کے کلیدی مناصب انہی افراد کے پاس ہونے چاہئیں جو مسلمان ہیں[1]۔

۳۔ اولی الامر کی اطاعت اور ان کی فرماں برداری مسلمانوں کے لیے ضروری کی گئی ہے تاکہ زندگی کا نظام بہ حسن و خوبی چلے اور بے وجہ اس میں اختلال واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی یہ اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہے ۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> "مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ۔ تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے ۔ اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے اور نہ ماننا چاہیے"
>
> (بخاری و مسلم)

---

۱ اس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس طرح تو ہم غیر مسلموں کے ساتھ امتیاز برتیں گے ۔ لیکن یہ اعتراض اس حقیقت کو نہ سمجھنے پر ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی و نظریاتی ریاست ہے اور اس کا مقابلہ محض قومی ریاست سے نہیں کیا جا سکتا ۔ کوئی اصولی ریاست اپنا سربراہ اس شخص کو نہیں بنا سکتی جو اس اصولوں پر ایمان ہی نہ رکھتا ہو۔ یہ بات اتنی صاف اور واضح ہے کہ آج کی مغربی دنیا بھی اسے محسوس کر رہی ہے ۔ ایک اشتراکی ریاست کا سربراہ ایک غیر اشتراکی نہیں ہو سکتا ۔ ایک فاشسٹ ریاست کا صدر ایک اشتراکی نہیں بن سکتا حتیٰ کہ جمہوری ممالک بھی سوچ رہے ہیں کہ کیا ان حضرات کو جو جمہوریت پر یقین نہ رکھتے ہوں برسر اقتدار لایا جا سکتا ہے ؟ کینیا میں الیکشن کے ذریعے سے اشتراکیوں کی کامیابی نے اس مسئلہ کو پیدا کیا اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ سے لے کر سیاسی مفکرین تک یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ جمہوریت اس کو گوارا نہیں کر سکتی ۔ (ملاحظہ ہو برٹرینڈ رسل کا مضمون در "مانچسٹر گارڈین" ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۳) ڈیلی ٹیلیگراف لندن کا سیاسی مبصر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے : " ہم اشتراکی پارٹی کو اقتدار کے لیے جدوجہد کی آزادی اس لیے دیتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ۔ اگر اس کی کامیابی کا کوئی بھی امکان پیدا ہو جائے تو ہماری سیاسی جبلت ہمیں فوراً یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ ہم اپنے جمہوری مفروضوں کو بدلیں ۔ اشتراکیت امریکی و برطانوی جمہوری روایت کو اس بری طرح تہ و بالا کر دیتی ہے کہ اشتراکیوں کی انتخابی فتح کو بھی

(باقی صفحہ ۴۷۸ پر)

Marfat.com

۴۔ اولی الامر سے بحث و مذاکرہ ، ان سے اختلاف اور ان پر تنقید و محاسبہ کی اجازت اور ضمانت بھی یہ آیت دیتی ہے ، ہمیں حق دیا گیا ہے کہ ان سے اختلاف کریں اور بالاخر فیصلہ صرف خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق ہو۔ لیکن یہ تنقید اور اختلاف حدود قانون میں رہتے ہوئے ہونا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

> ''تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضگی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا'' (مسلم)

یہ اصول وفاداری اس بات کو بالکل واضح کر دیتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریے کو سربلند کرنا ہے اور اس میں اطاعت ایک اصول کی ہے محض اقتدار کی نہیں۔

اسلامی ریاست کے اصولی اور نظریاتی ہونے سے چند امور پر مزید روشنی پڑتی ہے :

(بقیہ صفحہ ۴۷۷)

جمہوری قرار دینا نہایت کھلے کھلے ارتداد کے مترادف ہوگا۔ (ملاحظہ ہو پیریگرین ورس تھارن کا مضمون ''جمہوریت بنام آزادی''، مطبوعہ اینکاونٹر، لندن، جنوری۔ سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۳

مغربی ممالک کے دساتیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج بھی وہ خود مذہبی اور دوسری بنیادوں پر شہریوں کے درمیان امتیاز کرتے ہیں اور اسے جمہوریت کے منافی نہیں سمجھتے۔ انگلستان میں سربراہ ملک کے لیے پروٹسٹنٹ فرقہ میں بھی انگریزی کلیسا کا عیسائی ہونا ضروری ہے ، آئر لینڈ میں صدر کے لیے کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ ارجنٹائن کے دستور کی رو سے صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک عیسائی ہو سکتا ہے۔ ڈنمارک میں بادشاہ کے لیے صرف عیسائی ہی نہیں بلکہ ایونجلیکل چرچ (ایک خاص فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ ناروے میں بھی بادشاہ کے لیے ایونجلیکل ہونا ضروری ہے۔ یہی قانون سویڈن کا ہے جہاں بادشاہ کے ساتھ اسٹیٹ کونسل کے ارکان کے لیے بھی ایونجلیکل ہونا ضروری ہے۔ یونان میں بادشاہ کے لیے مشرقی مسیحی کلیسا کا پیرو ہونا ضروری ہے۔ اسپین میں صدر مملکت کے لیے رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور میں صراحت ہے کہ اس کا سربراہ لازماً بدھ مت پیرو ہو۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ریاستیں جو بہ ظاہر نظریاتی ریاستیں نہیں ہیں اور اپنے کو لا مذہبی (سیکولر) کہتی ہیں اولی الامر کے لیے ایک خاص مذہب (حتیٰ کہ فرقہ) کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو ہے ہی ایک نظریاتی ریاست اور اس بات کا صاف اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ ایک اصولی ریاست ہے ، یہ کیسے گوارہ کر سکتی ہے کہ اس کے کلیدی مناصب ان افراد کے ہاتھوں میں ہوں جو اصول ہی کو نہیں مانتے۔

Marfat.com

(ا) اسلام میں ریاست خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے - اس طرح یہ فاشست ریاست سے بالکل مختلف ہے جہاں ریاست خود مقصد بن جاتی ہے اور فرد کی کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رہتی - اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو وہ مواقع فراہم کرنا ہے جن کے ذریعے سے وہ خدا اور اس کے رسول کے احکام کو پورا کر سکیں - یہ ریاست خود اس بالاتر قانون کی تابع ہے یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "انا اول المسلمین" (میں اطاعت الہیٰ کرنے والوں میں سب سے پہلا ہوں) اور اسلام کا قانون سربراہ مملکت پر بھی اسی طرح لاگو ہوتا ہے جس طرح ایک عام شہری پر -

(ب) اسلامی ریاست ایک لا دینی قومی ریاست سے بنیادی طور پر مختلف ہے - لا دینی ریاست وہ ریاست ہے جو اپنے معاملات اور مسلک کو مذہب اور الہامی ہدایت پر مبنی کرنے کے بجائے محض عقل و مصلحت سے اپنا کام چلاتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی - ایسی ریاست مذہب کے معاملے میں غیر جانب دار بھی ہو سکتی ہے اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالف بھی - ایسی ریاست اسلام کی بالکل ضد ہے - اسلام دنیاوی معاملات کی اصلاح چاہتا ہے لیکن خدا کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر نہیں بلکہ اس کی روشنی میں -

اسلام اور لادینی ریاست

آج چوں کہ لا دینی ریاست کا چلن ہے اس لیے اس کے بارے میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے -

مغرب میں لادینی ریاست کا تخیل ایک خاص پس منظر کی پیداوار ہے - وہاں پاپائی نظام نے جو شکل اختیار کر لی تھی اور مذہب کے نام پر بادشاہوں سے گٹھ جوڑ کے ذریعے سے جن مظالم کو سند جواز دی گئی تھی انہوں نے ایک رد عمل پیدا کیا - عیسائیت کی مخالفت میں اتنی بے اعتدالی پیدا ہوئی کہ خود مذہب ہی کے خلاف بغاوت کر دی گئی اور اس بغاوت کا سیاسی مظہر لادینی ریاست تھی -

Marfat.com

سیکولرزم کی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۱۸۳۲ء میں ہوا جب جیکب ہولیک نے سیاست کو مذہب سے پاک رکھنے کی یہ تحریک قایم کی ۔ اس تحریک کی سربراھی اہل فکر و سیاست کے ھاتھوں میں رھی اور بہت جلد اس مسلک کو سیاسی قبولیت حاصل ہو گئی ۔ مختصراً اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ مذہب کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود رھنا چاھیے اور اسے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرنی چاھیے ۔ شروع میں بات صرف مذہب کے معاملے میں غیر جانب داری اور فرد کی کامل آزادی کی تھی لیکن بعد میں اس تحریک کا ایک حصہ مذہب کی مخالفت اور جارحانہ مادیت یا اشتراکیت کا داعی بن گیا ۔

مغرب میں لادینیت کے جو اثرات رونما ہوئے ھیں وہ یہ ھیں:

(۱) سیکولرزم نے تشکیک اور ذھنی پراگندگی پیدا کی ھے ۔ کوئی ایک نصب العین انسان کے سامنے نہیں رھا اور ایک قسم کی بے عقیدگی انسان میں پھیل گئی ھے ۔ یہ اسی ذھنی انتشار اور فکری تشتت ھی کا نتیجہ ھے کہ اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں نے جنم لیا اور انسان کو مادہ پرستی کی انتہا کی طرف لے گئیں ۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد آر ۔ این ۔ کربوھنٹ لکھتا ھے :

" اشتراکیت غربت و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ھے ۔ اس لیے کہ اس کی اصلی کشش نچلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلے میں اچھی تنخواہ والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کے لیے ھے ۔ یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ھے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی خباثتوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ھے اور نہ ھی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ھے ۔ حقیقت یہ ھے اور آخری تجزیہ ھمیں اسی نتیجہ تک لاتا ھے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعے کا نام ھے جنہوں نے ھماری زندگی کے اس خلا کو پر کیا ھے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبے کا لازمی نتیجہ تھا ۔ اور اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ھے تو ایک دوسرے ھمہ گیر نظام حیات ھی سے کیا جا سکتا ھے جو کچھ دوسرے اصولوں کا علم بردار ہو [۱]۔"

---

۱ R. N. Crew-Hunt, *Theory and Practice of Communism*, London, 1951, p. 6.

Marfat.com

اور جو حضرات اشتراکیت کی طرف نہیں گئے وہ ذہنی بے اطمینانی ، روحانی ضطراب ، جذباتی تلون اور بے عقیدگی کا شکار ہوئے ہیں -

(۲) فرد کے سامنے نیا نصب العین صرف ذاتی اغراض و خواہشات کی تکمیل رہ گیا اور قومی پیمانے پر مصلحت اور موقع پرستی نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ظلم سے بھر دیا اور کوئی مستقل ضابطہ' اخلاق ملکی اور قومی زندگی کے لیے باقی نہ رہا - نتیجتاً اس صدی نے دو ایسی ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد انسانیت کی پوری تاریخ کی تمام جنگوں کے مجموعی مقتولین و مجروحین کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے -

(۳) اس کے عام اخلاقی اثرات بھی تباہ کن تھے - مستقل مزاجی ، ہامردی ، جراٴت اور سب سے بڑھ کر نیکی اور بدی میں تمیز کا مادہ ختم ہونے لگا اور مفاد پرستی ، مصلحت بینی اور ابن‌الوقتی انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد بن گئے - اس کے نتیجے میں ہزاروں سماجی اور معاشرتی برائیاں رونما ہوئیں جو ماشرے کو سکون و اطمینان سے محروم کئے ہوئے ہیں -

(۴) تجربے نے بتایا ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ پیش نظر ہو اور کوئی اعلیٰ اخلاقی اور روحانی نظام موجود نہ ہو ، تو محض مادی فائدہ بھی انسان کو حاصل نہیں ہوتا ہے ، آرنلڈ ٹائن بی سیکولرزم کے نتائج کا جائزہ لے کر کھلے الفاظ میں اس کی ناکامی کا اعتراف کرتا ہے :

> ”یہ اب واضح ہوگیا ہے کہ اگر صرف دنیاوی خوشی کو مقصد زیست بنا دیا جائے گا تو اس میں فرد کی مادی خوشحالی اور دنیاوی سکون کا حصول بھی ناممکن ہے ، ہاں یہ قابل فہم ہے کہ اگر سیکولرزم سے بلند و بالا کوئی روحانی مقصد سامنے رکھا جائے تو ایک ضمنی نتیجے کی حیثیت سے انسان کو دنیاوی خوشی بھی حاصل ہو جائے[1] -“

(۵) پھر حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم عملاً ناکام ہی نہیں ہوا ہے بلکہ تاریخ اب سیکولرزم سے بہت آگے نکل چکی ہے - اگر گہری نگاہ سے دیکھا جائے تو

---

۱ Arnold J. Toynbee, *Christianity among the Religions of the World*, p. 56.

Marfat.com

سیکولرزم آج ایک دقیانوسی اور ازکار رفتہ تصور ہے اور گردش ایام کے اس کی طرف لوٹنے کا کوئی امکان نہیں ، سیکولرزم کچھ خاص تاریخی عوامل کی پیداوار تھا اور ایک مخصوص فضا ہی میں وہ کام کر سکتا ہے ۔ اگر وہ عوامل موجود نہ ہوں تو اس کا قائم رہنا ممکن نہیں ہے ۔

سیکولرزم ، جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ، اس نظام کو کہتے ہیں جس میں سیاسی اور ریاستی معاملات میں مذہب کو کوئی دخل نہ ہو ۔ لیکن اگر مزید تجزیہ کیا جائے تو بات یہاں آجاتی ہے کہ یہ مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کا داعی ہے ۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیکولرزم ، انفرادیت ، قومیت ، معاشی امور میں مکمل آزادی اور ریاست کی عدم مداخلت سیاست کے بنیادی تصورات تھے ۔ اور یہ تمام تصورات ایک دوسرے سے مربوط ہیں ۔ سیکولرزم اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب ریاست صرف ایک دفاعی ادارہ (پولیس اسٹیٹ) ہو یعنی اس کی ذمہ داری محض نظم و نسق کو قایم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملے اور اندرونی بدامنی سے بچانا ہو ۔ ایسے ہی نظام ریاست میں فرد کو پوری پوری آزادی دی جا سکتی ہے کہ وہ جس طرح چاہے زندگی گذارے اور صرف اسی صورت میں حکومت (کم از کم نظری حد تک) مذہبی اور نظریاتی غیر جانبداری کو روا رکھ سکتی ہے ۔ اور یہی تصور انیسویں صدی میں تھا ، لیکن آج ریاست کا تصور بدل گیا ہے ۔ آج ریاست محض ایک عظیم الشان بت نہیں ، آج یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک خاص دائرے کو چھوڑ کر ملک میں جو کچھ بھی ہوتا رہے ریاست عدم مداخلت پر کاربند رہے گی ۔ آج اس کے وظائف نہایت عظیم اور اس کا دائرۂ کار نہایت وسیع ہے ۔ وہ زندگی کے ہر شعبے کی صورت گری کرتی ہے اور اپنی پالیسی کے ذریعے سے اس کی ضابطہ بندی کرتی ہے ۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ جہالت کو ختم کرے اور علم کی شمعیں روشن کرے ، غربت کو ختم کرے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کی کوشش کرے ، سماجی برائیوں کا قلع قمع کرے اور شہریوں کی اخلاقی اور معاشرتی تعلیم کا بندوبست کرے ۔ بیماریوں کا علاج ، مظلوموں کی داد رسی ، مجبوروں کی مدد و استعانت کا اہتمام کرے ۔ مختصراً ، آج کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ نظریاتی غیر جانب داری برت سکے ۔ اسے تو کچھ نہ کچھ اقدار کو ماننا ہوگا ، کسی نہ کسی نظریے کو قبول کرنا ہوگا ، خیر و شر اور فلاح و خسران کے کسی نہ کسی معیار کو اختیار کرنا ہوگا اور

Marfat.com

اس کی روشنی میں اپنی پوری پالیسی کو ترتیب دینا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی ریاست ایک نظریاتی ریاست بنتی جا رہی ہے اور وہ بنیادیں جن پر سیکولرزم کا نظام فکر قایم تھا تاریخی یادوں کی حیثیت سے تو ضرور موجود ہیں لیکن دنیائے حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں۔ جن بنیادوں پر یہ قلعہ تعمیر ہوا تھا وہ گر چکی ہیں اور محض تمناؤں کے ذریعے اس خلا کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ آج دنیا میں سیکولرزم کے لیے کوئی گنجائش نہیں، تاریخ اسے بہت پیچھے چھوڑ آئی ہے آج کی ضرورت نظریاتی ریاست ہے جو سیکولرزم کی عین ضد ہے اور جسے اسلام قایم کرنے کا داعی ہے۔

(ج) اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ اس کی بنیاد محض قوم پر نہیں نظریہ اور اصول پر ہے۔ اور پھر خود اس کا تصور قومیت بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ اسلام ایک بالکل نئی طرز کی قومیت — نظریاتی قومیت — کا تصور پیش کرتا ہے اور اسلامی ریاست اس نئے تصور کی علم بردار ہوتی ہے۔ اس ریاست کے لیے جغرافیائی حدود تو ناگزیر ہیں لیکن اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ انسانیت رنگ، نسل، زبان، اور محدود وطنیت کی مصنوعی پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پر ایک عالم گیر ریاست قایم کرے۔ جب تک یہ نصب العین حاصل ہو جغرافیائی حد بندیوں کو گوارا کرنا ہوگا لیکن پوری امت کی وحدت یا کم از کم اس کی ایک دولت مشترکہ کا قیام ایسی ریاست کے پیش نظر رہے گا۔ اس طرح یہ ان ریاستوں سے بھی مختلف ہوگی جو محض جغرافیائی قومیت پر مبنی ہیں اور جن کے پاس کوئی نظریہ اور دعوت نہیں۔

(د) اسلامی ریاست بلا شبہہ حکومت الٰہیہ کی داعی ہے لیکن یہ پاپائی ریاست اور تھیاکریسی سے قطعاً مختلف ہے۔

اسلام اور تھیاکریسی

تھیاکریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں حکم رانی کے اختیارات خدا کو ہوں اور مذہبی پروہتوں کا طبقہ اس کے نمایندے کی حیثیت سے یہ کام انجام دے۔

Marfat.com

روائسٹون پائک ''مذہب اور مذاہب کی قاموس'' میں اس کی یہ تعریف کرتا ہے:

> '' حکومت کی ایک ایسی قسم جس میں اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جائے ، حقیقی حکم ران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور قوانین کو احکام خداوندی سمجھا جائے [۱]۔

تاریخی حیثیت سے اس کی مثالیں یہودیوں ، عیسائیوں اور برھمنوں وغیرہ میں ملتی ہیں ۔

اسلامی ریاست خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہے لیکن یہ تھیاکریسی سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور وجوہ اختلاف مختصراً یہ ہیں:

(۱) تھیاکریسی میں حاکمیت کے عملی اختیارات ایک مخصوص مذہبی طبقے کے ھاتھوں میں ہوتے ہیں جو سیاہ و سفید کا مالک ہوتا ہے ، جس کی رائے قانون ہوتی ہے ، جس پر کوئی تنقید نہیں کر سکتا ، جو خدا کے نام پر سارے اختیارات بلا روک ٹوک استعمال کرتا ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا۔ اسلام میں ایسے کسی مستقل طبقے کا کوئی وجود نہیں ۔ بندے اور خدا کے تعلق کو استوار کرنے کے لیے یہاں پروہتوں کے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی تعلیمات نہ صرف ہر مسلمان کے لیے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہیں بلکہ ان سے واقفیت ہر مسلمان کا فرض بھی ہے ۔ سیاست میں بھی نظام حکومت چلانے والے خدا اور اُمت دونوں کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں اسلامی ریاست کے اصحاب امر کے لیے کوئی شرط ہے تو وہ علم اور تقویٰ کی ہے اور ان کے حصول کے دروازے سب کے لیے کھلے ہوئے ہیں ۔

(۲) اسلامی تاریخ میں ہمیں کبھی اس قسم کی پاپائیت نظر نہیں آتی جیسی یورپ یا ھندوستان ، جاپان اور تبت میں ملتی ہے ۔ ہمارے یہاں علما ، حق کے علم بردار اور آزادی کے محافظ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں ۔ وہ خود ظلم و ستم اور استبداد کا نشانہ بنے ہیں ، ان کا ذریعہ نہیں۔ آزادی کی جد و جہد کے سرخیل علما رہے ہیں اور عالم بننے کا راستہ ہر شخص کے لیے کھلا رہا ہے ۔ نیز عام سیاسی تاریخ میں بھی کوئی مثال ایسی نہیں ملتی کہ حکومت یورپ کے ''مذہبی دیوانوں'' کی طرح عوام کو نشانۂ ستم بناتی ہو ۔ اس کا اعتراف خود مغربی مورخین کرتے ہیں

---

۱ E. Royston Pike, *Encyclaepedia of Religion and Religions*, Meridion Library, 1958. p. 347.

Marfat.com

کہ مذہبی حکومت کے سلسلے میں یورپ کا تجربہ اور عالم اسلامی کا تجربہ ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہے ۔ رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے :

> " مشرق (مراد ہے عالم اسلام) میں تھیا کریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی ۔ ہم یہاں ظلمت پسندی ، خیالات پر قد غن ، اور علم پر پابندی کی کوئی ایسی مثال نہیں پاتے جس کے لیے مغربی دنیا یونان اور روم سمیت مشہور ہے [۱] ۔"

(۳) دوسرے مذاہب اور تہذیبوں میں تھیا کریسی میں نام تو خدا کا تھا لیکن چوں کہ ان کے پاس زندگی کے ہمہ جہتی مسائل کے لیے کوئی واضح الہامی ہدایت موجود نہ تھی اس لیے پادریوں اور پروہتوں نے خدا کے نام پر اپنی رائے پیش کی اور خدا کے قانون کے بجائے اپنا قانون چلایا جو ان تمام کمزوریوں اور خامیوں سے آلودہ تھا جن سے انسانی قانون ، خصوصیت سے جب وہ ایک طبقے کے مفاد کا محافظ بھی ہو ، ہوا کرتا ہے ، اسی لیے مذہبی طبقے کو تنقید سے بالا قرار دیا گیا تاکہ اس کی ہر بات بے چون و چرا تسلیم کرلی جائے خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو ۔ اسلام کا سیاسی نظام اس نظام سے بالکل مختلف ہے ۔ یہاں واضح الہامی ہدایت موجود ہے جو اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں ایک شوشے کا تغیر بھی واقع نہیں ہوا ہے اور نہیں کیا جا سکتا ۔ اولی الامر سے اختلاف کی پوری پوری گنجائش ہے بلکہ ان پر تنقید اور محاسبہ فرض کیے گئے ہیں ۔ تاکہ وہ راہ صواب سے نہ ہٹیں ۔ ہر شخص کو اپنی دلیل خدا کے کلام سے لانی ہے جو کسی کا اجارہ نہیں اور جس تک ہر شخص کی رسائی ہے ۔ ضرورت صرف علم کی ہے ۔ یہ چیز اسلامی نظام کو تھیا کریسی سے بالکل مختلف کر دیتی ہے ۔

(۴) تھیا کریسی اور اسلام کے مزاج میں ایک اور بھی بڑا لطیف لیکن بے حد اہم فرق پایا جاتا ہے ۔ تھیا کریسی کا ایک بنیادی تصور یہ رہا ہے کہ یہ دنیا ایک بُری چیز ہے ، اس کی زندگی ہمیں گناہ کی پاداش میں اختیار کرنی پڑی ہے ، اس کی حیثیت ایک " دارالعذاب " کی سی ہے اور تمام انسانوں کو اس سزا کو برداشت کرنا چاہیے ۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست کی

---

۱ Robert Briffault, *The Making Humanity*, p. 113.

Marfat.com

اصلاح اور درستگی اور اس کے مظالم کے خلاف آواز بلند کرنا یا جد و جہد کرنا ایک غیر مطلوب شے بن جاتے ہیں اور انسان "تسلیم و رضا" کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اسلام کا نقطۂ نظر بالکل مختلف ہے۔ انسان خدا کا خلیفہ بنایا گیا ہے۔ زندگی کی نعمتیں اس کے لیے فراہم کی گئی ہیں اور ریاست کا مقصد زندگی کو نیکیوں اور اچھائیوں سے بھرنا اور ایک فلاحی معاشرہ قایم کرنا ہے۔ ضرورت صرف علم کی ہے۔ اس طرح جو نفسیاتی رویہ یہاں پیدا ہوتا ہے وہ تھیا کریسی کی بالکل ضد ہے۔

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا نظام تھیا کریسی سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری یہ بحث ہمیں اس نتیجے پر لاتی ہے کہ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی، مقصدی اور نظریاتی ریاست ہے۔

۲ - شورائی اور جمہوری ریاست

اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست ہے، اس میں تمام انسان برابر ہیں اور رنگ نسل، نسب کسی کی بنیاد پر کسی خاص گروہ کو کوئی تفوق حاصل نہیں۔ وحدت آدم اور انسانی مساوات اس کے بنیادی اصول ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو پوری ملت کے معتمد علیہ ہوں۔ ارباب امر تمام امور سلطنت میں بنیادی پالیسی باہم مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ نیز تمام شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کی ذمہ داریاں متعین ہیں۔ حکومت خدا اور اس کے رسول کی طرف سے ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے اور ان میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتی۔ اسلامی ریاست کا مزاج نہ آمریت کو گوارا کر سکتا ہے اور نہ موروثی شہنشاہیت کو۔ اس کا مزاج خالص جمہوری اور شورائی مزاج ہے۔

اسلامی جمہوریت کی پہلی بنیاد انسانی مساوات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً

خدا نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا۔ (النساء - ۱)

Marfat.com

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

لوگو ! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ و قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ ۔ مگر در حقیقت معزز تو تم میں وہی ہیں جو زیادہ پرہیزگار ہے (الحجرات ۔ ۱۳)

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ

اور ہم نے اولاد آدم کو صاحب عزت بنایا ۔ (بنی اسرائیل ۔ ۸۰)

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اللھم ربنا و رب کل شیء انا شھید ان العباد کلھم اخوۃ
(احمد اور ابو داؤد)

اے ہمارے اور ہر چیز کے رب ! میں گواہی دیتا ہوں کہ سارے انسان بھائی ہیں ۔

فتح مکہ کے بعد جو خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ، وہ یہ تھا :

" خوب سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ ، خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے ۔ اے اہل قریش! اللہ نے تمہاری جاہلیت و نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کرایا۔ اے لوگو! تم سب آدم (علیہ السلام) سے ہو اور آدم مٹی سے تھے ۔ نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے ۔ عربی کو عجمی پر عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے ۔"

قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں اور حاکم اور محکوم ، صاحب امر اور مامور میں اسلام کوئی تمیز نہیں کرتا ۔ قانون سب کے لیے ایک ہی ہے ۔ ایک بار ایک معزز خاتون کو چوری کی سزا میں قطع ید کی سزا دی جانے والی تھی کچھ صحابہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سفارش کی ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سفارش کو غصہ سے رد کر دیا اور فرمایا :

والذی نفس محمد بیدہ لو سرقت فاطمۃ بنت محمد لقطعت یدھا ۔ (مسلم)

اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اگر فاطمہ بنت محمد نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ ضرور کاٹ دیتا ۔

یہ ہے وہ معیاری قانون اور معاشرتی مساوات جس کا تصور کیا جا سکتا ہے ۔

Marfat.com

اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد ارباب اختیار کا معتمد علیہ ہونا ہے۔ یعنی یہ کہ ریاست کی ذمہ داریاں ان کو سونپی جائیں جو اس کام کے اہل ہوں اور جن پر لوگوں کو اعتماد ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تمہارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں اور تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم نا پسند کرتے ہو اور وہ تم کو نا پسند کرتے ہوں اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔" (مسلم)

ارباب امر کے معتمد علیہ ہونے پر مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر متفق ہیں، البتہ ان کا انتخاب کیوں کر ہو، خصوصیت سے امیر یا خلیفہ کا، اس پر اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ شیعی نظریہ خلافت یہ ہے کہ خاندان نبوت کے سوا کوئی شخص خلافت کا اہل نہیں اور امامت و خلافت اللہ کی طرف سے مخصوص ہوتی ہیں اس لیے انتخاب کا سوال نہیں۔ فرقہ زیدیہ انتخاب کے اصول کو مانتا ہے لیکن دائرۂ استحقاق کو محدود رکھتا ہے۔ خوارج کا خیال تھا کہ ہر پاک سیرت مسلمان خلافت کا اہل ہے البتہ عام حالات میں خلیفہ کو معزول کرنا جائز نہیں۔ معتزلہ ہر فرد کو خلافت کا اہل سمجھتے تھے۔ اہل سنت عمومی خلافت کے قائل ہیں البتہ خلیفہ کے لیے علم و اجتہاد، اخلاق فاضلہ، سیاسی تدبیر، فنون حرب میں مہارت وغیرہ کی شرائط مقرر کرتے ہیں[1]۔ طریق انتخاب پر اختلاف کے باوجود تمام مکاتیب فکر کے سیاسی نظریات میں ارباب امر کا معتمد علیہ ہونا مشترک نظر آتا ہے۔

اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے۔ یعنی مسلمانوں کے یہ معتمد علیہ افراد تمام امور سلطنت کو خدا اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورے کی روشنی میں طے کریں، اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے فرماتا ہے:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اور ان سے معاملات میں مشورہ کرو۔ (آل عمران۔ ۱۵۹)

---

۱ یہ بحث الماوردی کی کتاب "الاحکام السلطانیہ" اور حکیم حیدر زمان صدیقی کی تصنیف "اسلامی نظریہ سیاست" سے ماخوذ ہے۔

Marfat.com

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ

ما رأیت احداً اکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم - (بخاری و ترمذی)

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھا -

عام اولی الامر کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ

اور ان کے امور آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں - (الشوریٰ ۳۸)

خطیب بغدادی حضرت علی رض سے یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ:

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لیے رکھ دو، اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو -" (روح المعانی)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرے کی صحیح حالت کا نقشہ اس طرح بیان فرمایا گیا ہے :

"جب تمہارے حکام تم میں نیک اور صالح ہوں، تمہارے اہل ثروت تم میں فیاض ہوں اور تمہارے امور باہم مشورے سے طے ہوں -" (صحاح)

اس لیے علمائے قانون نے یہ کہا ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی روح اور اس کا ایک لازمی جزو ہے - چھٹی صدی ھجری کے مشہور عالم قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں:

ان الشوریٰ ھی من قواعد الشرعیۃ وعزائم الاحکام . (بستانی . جلد اول)

شوریٰ شریعت کے قوانین اور محکم احکام میں سے ہے -

مشاورت کا یہ حکم ہر اہم معاملے اور اس کی ہر منزل کے لیے ہے - اس کی شکل کیا ہو؟ اس کا تعین ہر زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا - لیکن

Marfat.com

اس کی روح یہ ہے کہ مشورہ ان لوگوں سے کیا جائے جو اہل حل و عقد ہوں، فہم و بصیرت رکھتے ہوں اور لوگوں کے معتمد علیہ ہوں۔ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام مشورے سے طے ہوں اور کوئی شخص اپنی من مانی نہ کرے، کوئی اجتماعی کام جتنے لوگوں سے متعلق ہو مشورہ میں ان سب کو یا ان کے نمایندوں کو شریک کیا جائے اور مشورہ آزادانہ، بے لاگ اور مخلصانہ ہو، اگر یہ چیزیں موجود ہوں تو شوریٰ کا حق ادا ہو جاتا ہے خواہ اس کی شکل کوئی بھی تجویز کی جائے۔

اسلامی جمہوریت کی آخری بنیاد شہریوں کے حقوق و فرائض کا تعین ہے اور ان حقوق میں در اندازی کا حق کسی کو نہیں ہے۔ یہ تمام حقوق خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عطا کردہ ہیں اور کسی شرعی دلیل یا حق کے بغیر ان میں سے کسی پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی یا ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی دو قسمیں کرتی ہے: مسلمان شہری اور غیر مسلم شہری۔ غیر مسلم شہریوں کو تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں، انہیں مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے، البتہ انہیں یہ حق حاصل نہیں کہ نظریاتی مملکت کے کلیدی مناصب پر فایز ہو سکیں۔ اور اسی کی مناسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی کم ہیں۔

اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں:

(۱) جان و مال اور ناموس کی حفاظت۔ یعنی ریاست ضمانت دیتی ہے کہ اپنے شہریوں کے جان و مال اور ناموس پر نہ خود ہاتھ ڈالے گی اور نہ کسی اور کو ڈالنے دے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

فذا لك المسلم الذی له ذمته الله و رسوله فلا تخفروا الله فی ذمته. (بخاری)	پس یہ وہ مسلم ہے جس کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لیا ہے۔ تو خبردار، اللہ کے ساتھ اس کی دی ہوئی ضمانت میں غداری نہ کرو۔
کل المسلم علی المسلم حرام دمه وماله و عرضه (مسلم)	مسلمان کی ہر چیز مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون بھی، اس کا مال بھی اور اس کی آبرو بھی۔

Marfat.com

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کے باب میں بھی اصول یہ ہے : " جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہوں گے[1] ۔"

اسی طرح تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کی ضمانت دی گئی ہے اور یہ قول قاضی ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ اصول یہ ہے کہ

ولیس للامام ان یخرج شیئاً من احد الا بحق ثابت معروف (کتاب الخراج ۔ صفحہ ۳۷)	امام (حکومت) کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی ثابت شدہ قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضے سے اس کی کوئی شے نکالے ۔

(۲) شخصی آزادی ۔ ہر شخص کی انفرادی آزادی محفوظ ہوگی اور اسے یہ ضمانت اس وقت تک حاصل رہے گی جب تک وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی کے سلب کرنے یا جماعت کے کسی حقیقی مفاد کو نقصان پہنچانے یا خطرے میں ڈالنے کے لیے استعمال نہیں کرتا ۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے دوران ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبہے کی بنا پر گرفتار کرلیے گئے تھے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دو مرتبہ سوال سن کر سکوت فرمایا تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے اور جب کوئی چیز سامنے نہ آئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا :

خلوا له جيرانه ۔ (ابو داؤد)	اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو ۔

اسلام کا یہ اصول ہے کہ

لا یوسر رجل في الاسلام بغير عدل (موطا)	اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا ۔

(۳) رائے اور مسلک کی آزادی ۔ اسلام ہر شخص کو اپنی آزاد رائے رکھنے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ وہ اختلاف رائے کو خون ریزی اور فتنہ و فساد کا ذریعہ نہ بنالے ۔ اس کی بہترین مثال وہ رویہ ہے جو حضرت علیؓ نے خوارج کے مقابلے میں اختیار فرمایا جو ریاست کے وجود ہی کی نفی کرتے تھے ۔

---

۱ حضرت علیؓ

Marfat.com

حضرت علی رض نے ان کو پیغام بھیجا کہ :

"تم جہاں چاہو رہو ، اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی نہ اختیار کرو اور ظلم سے باز رہو" (نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۰ -)

اسلام ہرگز پسند نہیں کرتا کہ دین کے معاملے میں جبر و اکراہ سے کام لیا جائے -

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں - (البقرہ - ۲۵۶)

(۴) **قانونی مساوات** - یعنی تمام شہری خواہ امیر ہوں یا غریب ، سیاہ ہوں یا سفید ، صاحب امر ہوں یا مامور ، قانون کی نگاہ میں برابر ہوں گے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہوگا -

(۵) **معاشرتی مساوات** - یعنی خون ، رنگ ، نسب ، زبان ، پیشہ ، معاشی مقام وغیرہ کی بنا پر شہریوں کے درمیان کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا - سب برابر ہیں - عزت و شرف اگر ہے تو صرف علم و تقویٰ کی بنا پر -

(۶) **بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف** - یعنی اسلامی ریاست ہر شہری کو ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے بچانے کی اور حصول انصاف کا انتظام بلا کسی معاوضہ کے کرے گی -

(۷) **فریاد ، اعتراض اور تنقید کا حق** - تمام شہریوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ اپنی بات ارباب اختیار تک پہنچائیں ، اپنی مجبوریاں اور مسائل ان کو بتائیں ان کی پالیسیوں پر اعتراض اور تنقید کریں - ان کی بات سنیں اور انہیں اپنی بات سنائیں -

(۸) **اجتماع ، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی** - انہیں یہ حق بھی حاصل ہوگا کہ منظم و مجتمع ہو کر کام کریں اور بلا روک ٹوک ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوں -

ان حقوق کے مقابلے میں شہریوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ہر صحیح بات کو قبول کریں اور اطاعت کریں - معروف میں عدم اطاعت کی روش اسلامی ریاست

Marfat.com

کے مزاج کے منافی ہے ۔ اسی طرح ان پر ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کی خیرخواہی کریں ۔ یعنی دیدہ و دانستہ ایسا کام نہ کریں جو ریاست کو نقصان پہنچانے والا ہو ۔ تخریبی سرگرمیوں سے خود بھی کلی طور پر محترز رہیں اور دوسروں کو بھی نہ کرنے دیں ۔ نیز یہ بھی خیر خواہی ہی کا ایک پہلو ہے کہ امور ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت یا اس کے کارکنوں کو خدا کے راستے سے ہٹنے نہ دیں ؛ اور اگر کوئی انحراف واقع ہو تو اس کو روکیں ، ہاتھ اور زبان دونوں سے ۔ اسلامی ریاست کا شہریوں پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس سے تعاون کریں اور اس کی خاطر مالی اور اگر ضرورت ہو تو خود جان کی قربانی پیش کریں ۔

مندرجۂ بالا چار بنیادوں پر اسلام کا جمہوری نظام قایم ہے ۔

اسلام ، اشتراکیت اور جمہوریت

اس بحث کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام اشتراکی آمریت اور مغربی طرز کی جمہوریت دونوں سے مختلف ہے ۔

۱۔ اشتراکیت مذہب کی نفی پر مبنی ہے اور اسلامی ریاست خدا کے قانون کی تابع اور اسے قایم کرنے والی ہے ۔

۲۔ اشتراکیت فرد کی مستقل اور جداگانہ شخصیت کو نہیں مانتی اور اسے طبقے میں ضم کر دیتی ہے اور ریاست کو ایک طبقے کا آلۂ کار بنا دیتی ہے ۔ اسلام ان میں سے کسی چیز کو بھی درست نہیں مانتا ۔ وہ فرد کو بنیاد مانتا ہے اور اس کی شخصیت کو مستحکم کرنے اور نشو و ارتقا دینے کے مواقع فراہم کرتا ہے ۔ وہ طبقات کی نفی کرتا ہے اور تمام انسانوں کو مساوی قرار دیتا ہے ۔

۳۔ اشتراکیت کا نظام آمرانہ ہے جب کہ اسلام کا نظام شورائی ہے ۔ اس میں تمام امور لوگوں کی مرضی کے مطابق طے ہوتے ہیں ان پر اوپر سے تھوپے نہیں جاتے ۔

۴۔ اشتراکیت ریاست کے اختیارات کو غیر محدود کر دیتی ہے اور شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی حقیقی ضمانت نہیں دیتی ۔ اسلام ریاست کے اختیارات کو ایک خاص دائرے میں محدود کردیتا ہے اور معصیت میں اطاعت کو یا حقوق انسانی کے بلا حق شرعی ختم کیے جانے کے امکان کو ختم کر دیتا ہے ۔

Marfat.com

وہ حکومت کو مسئول بناتا ہے اور اسے عوام کے مشورے کا پابند کرتا ہے ۔ نیز شخصی اور سیاسی آزادی کی حقیقی ضمانت دیتا ہے ۔ اسلامی ریاست ہمہ گیر تو ضرور ہے لیکن اشتراکیت کی طرح کُلیت پسند نہیں ہے ۔

ان وجوہ کی بنا پر اسلامی ریاست اشتراکی آمریت سے بالکل مختلف ہے ۔

پھر اسلامی ریاست خود مغربی جمہوریت سے بھی مختلف ہے ۔ اسلام کو جمہوریت کے اس پہلو سے تو قطعاً اختلاف نہیں کہ امور سلطنت عوام کے مشورے سے ان کی مرضی کے مطابق اور ان کے اپنے نمایندوں کے ہاتھوں طے ہونے چاہئیں بلکہ وہ جمہوریت کے وکلا سے کچھ زیادہ ہی شد و مد کے ساتھ اس بات کو پیش کرتا ہے ۔ نیز اسے جمہوریت کے اس پہلو سے بھی اختلاف نہیں کہ بنیادی حقوق کی ضمانت ہونی چاہیے اور قانون کی حکم رانی کے اصول پر عمل ہونا چاہیے۔ اسی طرح انسانیت نے بہت سے تجربات کی روشنی میں عوام کی مرضی کو جاننے اور اس کو موثر بنانے کے لیے جو نظام اور جوڈھانچہ وضع کیا ہے اس سے استفادہ کرنے اور اپنے حالات کے مطابق اسے ڈھالنے پر بھی اسلام کو کچھ اعتراض نہیں ۔ اسلام جن چیزوں میں مغربی جمہوریت سے اختلاف رکھتا ہے وہ یہ ہیں ۔

۱۔ حاکمیت اعلیٰ کے اختیارات انسان کو نہیں بلکہ خدا اور اس کے قانون کو حاصل ہیں ۔ انسان کی حیثیت خدا کے خلیفہ کی ہے اور اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ خدا کی ہدایت کے مطابق اپنے معاملات کو طے کرے ، بنیادی قانون قرآن و سنت کا قانون ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ اگر صد فی صد افراد خدا کے قانون کو بدلنا چاہیں تو بھی انہیں اس کا اختیار نہیں ۔ ہاں اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق ان کو حاصل ہے ، یا جن امور میں یہ قانون خاموش ہے ان میں عوام اور ان کے نمایندوں کو حق ہے کہ اسلام کی روح اور عام تعلیمات کو سامنے رکھ کر قانون سازی کریں ۔ نیز جن امور میں صرف اجمالی و عمومی اور اصولی رہنمائی دی گئی ہے ان میں تفصیلات طے کریں ۔ اس طرح جمہور کی قانون سازی کے اختیار مطلق کے مقابلے میں اسلام ان کے محدود اختیار کا تصور پیش کرتا ہے ۔ اور اس باب میں وہ مغربی جمہوریت سے مختلف ہے ۔ جہاں کوئی مستقل اور اعلیٰ تر قانون موجود نہیں۔ ہمارے پاس ایک مستقل ضابطہ ہے اور ہم اپنے معاملات اس کے مطابق ہی طے کرتے ہیں ۔

Marfat.com

۲۔ جمہوریت میں ہر لحظہ مخالفت اور پارٹی بازی کی جو فضا رہتی ہے اسلام اسے بھی پسند نہیں کرتا ۔ وہ جو طریقہ پیش کرتا ہے وہ یہ ہے :

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

نیکی اور تقویٰ کے معاملات میں تعاون کرو اور برائی اور گناہ کے امور میں ہرگز تعاون نہ کرو ۔ (المائدہ ۔ ۲)

وہ تمام گروہوں اور عناصر کے درمیان خیر خواہی اور تعاون کی فضا قایم کرنا چاہتا ہے ۔ اور اس طرح یہ نظام خود جمہوریت سے بھی بہتر اور اعلیٰ تر ہے ۔

۳۔ اسلام اس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ لوگ عہدوں کے حریص ہوں اور ان کے لیے اپنا سب کچھ لٹاتے پھریں ۔ وہ چاہتا ہے کہ ذمہ داری کے مناصب ان لوگوں کو دیے جائیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

" بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدے پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو ۔" (بخاری و مسلم)

" ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود حکومت کے کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو ۔" (ابو داؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی فضا بناتا ہے ۔ نیز وہ عہدہ داروں اور ارباب امر کے لیے اخلاقی صفات بھی تجویز کرتا ہے جب کہ جمہوریت ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں کرتی ۔

۴۔ جمہوریت جغرافیائی قومیت کے ساتھ وابستہ ہو گئی ہے جب کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ہے اور اس کا پیغام عالم گیر ہے ۔

مندرجۂ بالا بحث سے ہمارے سامنے اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یعنی اس کا شورائی اور جمہوری کردار آ جاتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ریاست اشتراکی سیاست اور مغربی طرز کی جمہوری ریاست سے کن باتوں میں مختلف ہے ۔

Marfat.com

۳ فلاحی ریاست

اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک فلاحی اور خادم خلق ریاست ہے۔ اسلام کی نگاہ میں حکومت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ امن و امان قایم کرے اور ملکی دفاع کی خدمات انجام دے، بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں حقیقی اور فطری مساوات قایم کرے، ان تمام رکاوٹوں کو دور کرے جو سعی و جہد کی مساوات کی راہ میں حائل ہیں اور اپنے تمام شہریوں کی، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دے۔ اگر اسلامی ریاست کی حدود میں کہیں بھی فقر و فاقہ، غربت و افلاس ہے، ظلم و جور ہے، تو اس کا قلع قمع کرے اور اپنی تمام قوتیں ان انسانی مسائل کر حل کرنے کے لیے وقف کر دے۔ اسلام ریاست کا محض ایک منفی تصور نہیں رکھتا۔ اس کی قایم کردہ ریاست ایک مثبت ریاست ہے جو قیام انصاف اور ادائیگی حقوق کے ایجابی کام انجام دیتی ہے۔

معاشی زندگی کے بارے میں اسلام نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ اسلامی معاشرے اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ افلاس اور غربت کو مٹانے میں اس طرح سرگرم رہیں جس طرح کفر کی ظلمتوں کو دور کرنے میں ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ”فقر انسان کو کفر کی طرف لے جا سکتا ہے“، اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دعا فرمائی کہ ”اے اللہ! مجھے کفر اور فقر دونوں سے محفوظ رکھ۔“

اسلام ہر فرد میں معاشی جدوجہد کا جذبہ پیدا کرتا ہے اور اسے دعوت دیتا ہے کہ اپنی محنت سے روزی حاصل کرے۔ محنت کی روزی اور پاک اور طیب کمائی پر قرآن و حدیث میں غیر معمولی زور دیا گیا ہے۔

اسلام نے انفرادی ملکیت کا حق دیا ہے اور انفرادی سعی و جہد کے دروازے سب کے لیے کھول دیے ہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرنے کا اہتمام بھی کیا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پیدا کیا ہے کہ یہ ملکیت ایک امانت کی طرح ہے جسے جائز اور صحیح راستوں ھی پر صرف کرنے کا اختیار ہے۔ اگر غلط اور حرام طریقوں سے خرچ کیا جائے گا تو امانت میں خیانت ہوگی۔ فرد کا اختیار محدود ہے غیر محدود نہیں۔ نیز ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری

Marfat.com

ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل کو ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے صرف کرے۔ جو دولت کو جمع کرتے ہیں اور انسانی بہبود کے لیے اسے خرچ نہیں کرتے یا اس میں سے دوسروں کے حقوق نہیں نکالتے، ان کے لیے سخت ترین وعید آئی ہے۔ ہر صاحب نصاب مسلمان پر زکواۃ فرض کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ

توخذ من اغنیاء ہم فترد علی فقراء ھم (بخاری و مسلم)	ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کر دی جائے گی۔

پھر اسے محض ایک خیرات نہیں بلکہ "حق" قرار دیا گیا ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ

ان کے مالوں میں حق ہے مدد مانگنے والے کے لیے اور رزق سے محروم رہ جانے والے کے لیے۔ (الذاریات۔ ۱۹)

یہ حق حکومت کو وصول کرنا ہے اور حقداروں تک پہنچانا ہے۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِہِمْ صَدَقَۃً

(اے نبی) ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجیے۔ (التوبہ۔ ۱۰۳)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان تمام افراد کی کفالت کا بندوبست کرے جو مجبور ہوں، اپاہج ہوں، لاچار ہوں، یا رزق سے محروم رہ گئے ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من مات و علیہ دین ولم یترک وفاء فعلی قضاءہ ومن ترک مالاً فلورثتہ (ابو داؤد)	جو شخص مر جائے اور اس کے ذمہ قرض ہو اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے (اسلامی ریاست کے) ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔
من ترک دیناً او ضیاعاً فلیأتنی فانا مولاہ۔ (ابو داود)	جو شخص قرض چھوڑے یا ایسے پس ماندگان چھوڑے جن کے ضائع ہونے کا خطرہ ہو تو وہ میرے پاس آئے۔ میں اس کا سرپرست ہوں۔
من ترک مالاً فلورثتہ و من ترک کلا فالینا۔ (بخاری و مسلم)	جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے اور جو ذمہ داریوں کا بار چھوڑ جائے تو وہ ہمارے (یعنی حکومت کے) ذمے ہے۔

Marfat.com

امام ابو یوسف "کتاب الخراج" میں ایک جلیل القدر صحابی کی زبان سے یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"خدا کی قسم ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا اگر جوانی میں اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا[1]"

حضرت خالد رض نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں بہ صراحت یہ موجود تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے گا یا جو کسی آفت کا شکار ہوگا یا جو مفلس ہو جائے گا اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی[2]۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ ابن قیم ان تمام آیات و احادیث و آثار کی روشنی میں علما کا یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"اور علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس نے کوئی وارث نہ چھوڑا ہو اسی طرح وہ اس کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے جب کہ وہ قرض کی ادائیگی کے لیے کوئی شے چھوڑے بغیر مر جائے۔ نیز وہ اس کی زندگی میں اس کی کفالت کے لیے بھی ذمہ دار ہوگی جب کہ کوئی اس کی کفالت کرنے والا نہ ہو[3]۔"

علامہ ابن حزم یہ اصول بیان فرماتے ہیں کہ

"اور ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقرا اور غربا کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر مال فئے (بیت المال کی آمدنی) سے ان غربا کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو سلطان (امیر) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے اور ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضروری

---

۱ کتاب الخراج، ص ۷۲

۲ کتاب الخراج، ص ۸۵

۳ زاد المعاد، جلد اول، ص ۵۷

Marfat.com

حاجات کے مطابق روٹی مہیا ہو ، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش ، گرمی ، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے ۱ ۔"

اسلامی ریاست کی یہ حیثیت محض نظری دلائل ہی سے ثابت نہیں ہے بلکہ قرن اول میں مسلمانوں نے اس نظام کو من و عن قایم کیا تھا اور دنیا کی پہلی فلاحی اور خادم خلق ریاست بنائی تھی ۔ مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں :

" اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے ۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج ، از کار رفتہ ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں ۔ لاکھوں سے متجاوز آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی ۔ ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لیے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا اس لیے ہر شخص کے لیے اسی قدر آٹا مقرر تھا غربا و مساکین کے لیے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں ۔"

یہ نظام اپنی معیاری شکل میں مسلمانوں نے قایم کیا ۔ اور یہ چیز اسلامی ریاست کی تیسری خصوصیت کو متعین کرتی ہے ۔

یہاں بھی اسلامی ریاست دنیا کی دوسری ریاستوں سے بڑی مختلف ہے ۔ سرمایہ دارانہ نظام عوام کی کفالت کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا ۔ اس کا اصول یہ ہے کہ

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جائے اس کے لیے کوئی سہارا نہیں ۔ کشمکش حیات میں اس کے لیے مٹ جانا ہی مقدر ہے ، سعی و جہد اور مواقع کی

---

۱ علامہ ابن حزم محلیٰ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں :
"اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریب بھائیوں کی معاشی حاجت کو بدرجۂ کفایت پورا کرنا فرض کر دیا ہے ۔ پس اگر وہ بھوکے ، ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے ، محض اس بنا پر کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے ، تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی باز پرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا ۔"
(محلیٰ ، صفحہ ۱۵۷)

Marfat.com

مساوات بھی اس نظام میں معدوم ہے ، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ امیر کے امیر تر ہونے کے امکانات تو ہر طرف موجود ہیں لیکن غریب کے لیے غربت کے چکر سے نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا ۔ اس نظام میں ظلم اور استحصال کے نت نئے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں اور غیر منصوبہ بند معاشی دوڑ پوری سوسائٹی کو عدم استحکام اور افراط و تفریط کے چکر میں گرفتار کر دیتی ہے ۔ اسلامی ریاست ایک منصفانہ معاشی اصول پر عمل کرتی ہے اور وہ سب کو مساوی مواقع دینے کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر پیمانے پر گرتوں کو تھامنے کا کام بھی انجام دیتی ہے ۔

یہ فلاحی ریاست اشتراکیت سے بھی مختلف ہے اس لیے کہ یہ کفالت کی ضمانت تو دیتی ہے لیکن آزادی اور انفرادیت کی قیمت وصول کر کے نہیں ۔ کلی قومی ملکیت اسلام کے مزاج کے منافی ہے ۔ وہ مالکانہ حقوق اور آزادی جہد دینے کے بعد توازن اور انصاف قایم کرتی ہے ۔

نیز جدید طرز کی ایک مخلوط اور فلاحی ریاست سے بھی یہ مختلف ہے کہ اس میں سماجی خدمات اور بنیادی کفالت ایک حق کے طور پر کی جاتی ہے محض سیاسی احتجاج کا منہ بند کرنے کے لیے نہیں ۔ یہاں اس کا حصول مطالبات اور احتجاجات پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ ایک بنیادی اصول ہے جسے ہر قیمت پر اور ہر حال میں پورا کرنا ہے ۔ یہ سارا کام جبر اور رسہ کشی کے ساتھ نہیں بلکہ دلی تعاون اور جذبۂ عبادت کے ساتھ ہوتا ہے ۔ یہاں صرف معیار زندگی ہی کو بلند نہیں کیا جاتا بلکہ معیار اخلاق کو بھی بلند کیا جاتا ہے ۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور بہتر ہے اور اخلاقی اور دنیاوی دونوں حیثیتوں سے بہت اونچا ہے ۔

۴- معلم اور داعی ریاست

اسلامی ریاست کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے سپرد محض معاشی کفالت کی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج بھی اس کے ذمے ہے ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔“ وہ ریاست جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نیابت کرتی ہے اپنے شہریوں کی بالخصوص اور تمام انسانوں کی بالعموم تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرتی ہے ، اور پوری دنیا کے لیے حق کی شاہد اور اسلام کی علم بردار کی حیثیت رکھتی ہے ۔

Marfat.com

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ   علم کا حصول ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے ۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس فریضے کی بجا آوری کے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کی ۔ اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیجیے کہ غزوہ بدر میں کفار کے جو قیدی گرفتار ہوئے ان میں سے بعض تعلیم یافتہ قیدیوں کا فدیہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہی قرار دیا کہ مسلمانوں کے کچھ بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں ۔ بعض لوگوں کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دوسری قوموں کی زبانیں سیکھنے کا اہتمام کیا تاکہ بین الاقوامی معاملات کے سلسلے میں وہ حکومت کو اپنی خدمات سے فائدہ پہنچا سکیں ۔ بالغ عوام میں تعلیم کو پھیلانے کے لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مختلف مقامات پر وقتاً فوقتاً تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجتے رہتے تھے مسجد نبوی کے باہر ایک چبوترہ تھا جسے "صفہ" کہتے ہیں اور جو اسلام کا پہلا مدرسہ بنا ۔ یہاں سے تربیت دے کر لوگوں کو پورے عرب میں تعلیم کے لیے بھیجا جاتا تھا ۔ مدینے سے باہر کے مسلمانوں کے لیے یہ قاعدہ تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے باصلاحیت افراد کو مدینہ بھیجتے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقے میں تعلیم پھیلاتے ۔ باہر سے جو وفود آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان میں سے ذہین اور ذی صلاحیت لوگوں کو ان کی قوم کی تعلیم پر مقرر کرتے ۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر فرماتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے ۔ مثلاً جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بنایا تو سب سے پہلے یہ ہدایت دی کہ

"وہ حق پر قایم رہیں جیسا کہ اللہ نے حکم دیا ہے ، اور لوگوں کو بھلائی کی خوش خبری اور بھلائی کا حکم دیں ۔ اور لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان میں اس کی سمجھ پیدا کریں اور لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو ہاتھ لگانے سے روکیں اور لوگوں کی دل داری کریں یہاں تک کہ لوگ دین کا فہم پیدا کرنے کی طرف مائل ہو جائیں[۱] "

---

۱ سیرت ابن ہشام، جلد ۴ ، صفحہ ۲۴۱

Marfat.com

تعلیم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کو بڑھانے کے لیے سوسائٹی کے ہر شعبے میں شرف و اعزاز کا معیار علم کو قرار دیا گیا اور مسجد کی امامت سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک کے تقرر میں جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا تھا وہ قرآن و حدیث کا علم ہے - پوری اسلامی قلم رو میں بے شمار افراد کو اس کام پر مقرر کردیا گیا تھا کہ لوگوں میں پھیل جائیں اور ان کی تعلیم کا کام انجام دیں - اور یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر قریہ قریہ ، محلہ محلہ اور گوشے گوشے میں پہنچ گیا اور دوسری طرف اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے با صلاحیت اور سمجھ دار کارکن میسر آتے گئے جو زندگی کے ہر شعبے کی قیادت کر سکیں -

مسلمانوں کی پوری تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱- تعلیم کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی گئی اور حکومت اور اہل ثروت نے اس کی دل کھول کر سرپرستی کی - یہ ریاست کی ذمہ داری تھی کہ تمام شہریوں کے لیے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے -

۲- تعلیم کے نظام میں اولین اہمیت علوم دین کو دی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ ان تمام علوم کی ترویج کی گئی جو دفاع دین اور قیام حیات کے لیے ضروری ہیں - نیز فضول اور لغو مضامین سے اجتناب کی کوشش کی گئی -

۳- تعلیم ہر دور میں مفت رہی - مسلمانوں نے ایک دن کے لیے بھی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم کو بھی فیس کے ساتھ وابستہ نہیں کیا .. علم اور اونچے سے اونچے درجے کے علم کے دروازے ہر شخص کے لیے بلا فیس کھلے رہے -

۴- تعلیم کے ساتھ کردار سازی اور اخلاق تربیت ایک جزو لاینفک کی طرح موجود رہی -

پھر یہ ریاست صرف اپنے شہریوں ہی کی تعلیم کا بندوبست کرکے مطمئن نہیں ہو جاتی بلکہ پوری دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو اپنے قول و عمل اور مثال سے پیش کرتی ہے - قرآن کا ارشاد ہے :

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں (کی اصلاح) کے لیے میدان میں لائی گئی ہے
تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔
(آل عمران - ۱۱۰)

Marfat.com

اور امت کا یہ فرض مقرر کیا گیا ہے کہ

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

تم کو ایسی امت بننا چاہیے جو بھلائی کی طرف دعوت دے، نیکی کا حکم کرے اور برائی سے روکے۔ (آل عمران۔ ۱۰۴)

اور اس امت کے ذمے شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا:

لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

تاکہ پیغمبر تمہارے بارے میں شاہد ہوں اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ بنو۔ (الحج ۷۸)

یہ بحث اسلامی ریاست کی ایک بنیادی خصوصیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ ریاست ایک معلم کی طرح ہے اسے اپنے تمام شہریوں کی تعلیم و تربیت کا بندوبست بھی کرنا ہے اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پیش بھی کرنا ہے۔ اس طرح یہ ریاست ایک طرف لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو بلند کرتی ہے اور دوسری طرف ایک عالم گیر پیغام کی داعی ہے۔ یہ قومیت کے کسی تنگ نقطہ نظر سے وابستہ نہیں اس کی دعوت تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس پہلو سے یہ ریاست بالکل منفرد ہے۔

اسلامی تصور قومیت

اسلامی ریاست کی بنیادی خصوصیات کے اس مطالعے کے بعد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً اسلام کے تصور قومیت پر بھی گفتگو کرلی جائے۔

مدنی اور اجتماعی زندگی کا ایک بنیادی تقاضا ہے کہ انسانوں کے درمیان اشتراک اور تعاون ہو۔ قوم سے مراد انسانوں کا وہ گروہ ہے جس میں اجتماعی وحدت پائی جاتی ہو اور جو ساتھ رہنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ اشتراک اور اتحاد کے اس احساس کا نام قومیت ہے۔ یہ احساس ایک عصبیت پیدا کرتا ہے جس کے نتیجے میں اپنی قوم کے افراد سے محبت اور ان افراد سے غیریت پیدا ہوتی ہے جو اس دائرے سے باہر ہوں۔ اس طرح قومی مفاد کا جذبہ رونما ہوتا ہے جو اگر تیز تر ہو جائے تو انسان سے کہلوا دیتا ہے کہ "میری قوم! خواہ حق پر ہو یا ناحق پر!

Marfat.com

اس وحدت و اشتراک کو پیدا کرنے والے عوامل بہت سے رہے ہیں ان میں سے اہم یہ ہیں:

نسل — یعنی ایک خاص نسل سے وابستہ ہونا ۔ یہ "نسلیت" کو پیدا کرتا ہے ۔ دور جدید میں صیہونیت اور نازی‌ازم اس کی مثالیں ہیں ۔

رنگ — یعنی ایک خاص رنگ کے لوگ اپنے کو ایک قوم سمجھیں اور دوسرے رنگ کے لوگوں کو اپنی قوم میں شامل نہ ہونے دیں ۔ افریقہ کا نسلی امتیاز اس تصور پر مبنی ہے ۔ یہی صورت امریکہ میں بھی ہے ، خصوصیت سے جنوبی ریاستوں میں ۔

زبان — زبان فکری وحدت پیدا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے اور قومیت کی تشکیل میں ایک اہم قوت بن جاتی ہے ۔ عرب قومیت کی بنیاد زبان ہی پر ہے ۔

معاشی اغراض اور نظام حکومت — ایک ہی معاشی نظام یا ایک ہی سلطنت سے وابستگی بھی قومیت کا جذبہ پیدا کرنے والے عوامل رہے ہیں ۔

وطن — یعنی ایک خاص خطہ زمین پر آباد ہونا ۔ یہ وطنیت ہے اور اس وقت سب سے زیادہ چلن اسی کا ہے ۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جو انسانی تاریخ میں آج تک قومیت کی تشکیل کرتے رہے ہیں ۔ اسلام کا نقطہ نظر اس باب میں یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کلی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا اور یہ سب مل کر بھی انسان کی حقیقی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے ۔

نسل ، رنگ ، زبان یا وطن کو قومیت کی اساس بنانا غیر عقلی اور غیر فطری ہے ۔ محض کسی نسل سے وابستہ ہونا انسانی اتحاد کے لیے کافی نہیں ۔ خون کے رشتے کی ایک اہمیت ہے لیکن چند نسلوں کے بعد یہ رشتہ کمزور اور غیر موثر ہوتا جاتا ہے ۔ پھر کون اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ کسی خاص گروہ کی رگوں میں خاص اسی نسل کا خون گردش کر رہا ہے اور کوئی دوسرا میل اس میں نہیں ہوا ۔ پھر اگر نسل ہی کو لینا ہے تو اس حقیقت کو کیوں نہ ملحوظ رکھا جائے کہ تمام نسل انسانی ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے ۔ اسلام رشتہ رحم کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا ، قطع رحم کو منع کرتا ہے اور خاندان اور کنبہ کے

Marfat.com

حقوق متعین کرتا ہے لیکن قومیت اور سیاسی مرکزیت کے لیے اسے ایک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد، اور حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا دین و عقیدہ کے اختلاف کی وجہ سے اس قومیت کا جزو نہ بن سکے جس کی دعوت انبیا علیہم السلام دیتے رہے ہیں۔

رنگ کی بنیاد پر تفریق ایک سراسر غیر عقلی، غیر فطری اور غیر منصفانہ فعل ہے۔ اسی لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں" اور فرمایا کہ "اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔"

زبان و ادب قومی یک جہتی کو مضبوط کرنے میں بڑا حصہ ادا کرتے ہیں لیکن یہ بھی قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ زبان کے اشتراک سے زیادہ ضروری چیز افکار، نظریات، عقاید اور جذبات کا اشتراک ہے جن کے اظہار کا ایک ذریعہ زبان ہے۔ امرا'القیس عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر تھا لیکن جن نظریات کی اس نے تبلیغ کی وہ غلط اور باطل تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں فرماتے ہیں "اشعر الشعراء و قائد هم الی النار۔" (یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے) - معلوم ہوا کہ اسلام کی نگاہ میں اصل چیز صحت فکر اور پاکیزگی بیان ہے، محض ایک خاص زبان و ادب کی پوجا نہیں۔ یہی حال معاشی اغراض اور سیاسی قسمت کے اشتراک کا ہے۔ یہ اپنا کوئی مستقل اور پائیدار وجود نہیں رکھتیں اور ایک پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتیں۔

آخری چیز وطن کا اشتراک ہے اور بلا شبہہ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ لیکن سوچنے کی چیز یہ ہے کہ کیا محض وطن انسانی معاشرے میں قومیت کی بنیاد بن سکتا ہے؟ وطن کی اصل یہ ہے کہ ایک شخص ایک خاص علاقے میں پیدا ہوا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو جس زمین پر ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ ایک یا دو مربع گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر اس ایک یا دو مربع گز کو وسیع کرکے ایک ملک کی حدود تک لایا جاسکتا ہے تو آخر پوری دنیا تک اس کو وسیع کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

وطن سے ایک حد تک لگاؤ فطری ہے اور اسلام اس کو نہیں مٹاتا لیکن زندگی کی بنیادی وفاداری اور اتحاد کی اصل بنیاد وطن کے بجائے اصول اور نظریہ،

Marfat.com

مسلک اور دین کو قرار دیتا ہے، جس کی خاطر اگر ضرورت پیش آجائے تو وطن سے ہجرت کو بھی ضروری سمجھتا ہے۔ اقبال نے بہت صحیح کہا کہ ہجرت نبوی کے نتیجے میں اسلامی ریاست کا قیام وطنی قومیت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔

یہ تمام عوامل قومیت کے لیے کوئی عقلی اور اصولی بنیاد فراہم کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جس قسم کی قومیت کی تشکیل کرتے ہیں وہ غیر فطری ہے، اس میں تنگ نظری اور تعصب پایا جاتا ہے اور انسانوں کے معاملات پر خالص انسانی اور اصولی نقطہ نظر سے، حق و باطل کے اصولوں کی روشنی میں غور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ در اصل انسانوں کو جوڑنے کے بجائے بانٹتی اور ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتی ہیں، غلط عصبیتوں کو جنم دیتی ہیں اور انسانیت کو تباہیوں کی طرف دھکیلتی ہیں۔

اسلام ان کے مقابلے میں ایک انقلابی پیغام دیتا ہے۔ وہ تمام انسانوں کو برابر سمجھتا ہے اور اپنی قومیت کی بنیاد خود اسلام پر رکھتا ہے جو ایک عالم گیر نظریہ ہے۔ ہر وہ شخص جو اس دین کو قبول کرے ملت اسلامیہ کا جزو بن جاتا ہے اور جو اس کا باغی ہو وہ ملت کفر میں چلا جاتا ہے۔ اقبال نے صحیح کہا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

*اسلام نے رنگ، نسل، وطن، زبان، معیشت و سیاست کی غیر عقلی تفریقوں کو اٹھا دیا اور خالص عقلی بنیادوں پر ایک نئی قومیت کی تعمیر کی۔ اس قومیت کی بنا بھی امتیاز پر تھی مگر مادی اور ارضی امتیاز پر نہیں بلکہ روحانی اور جوہری امتیاز پر۔ اس نے انسان کے سامنے ایک فطری صداقت پیش کی جس کا نام "اسلام" ہے۔ اس نے خدا کی بندگی و اطاعت، نفس کی پاکیزگی و طہارت، عمل کی نیکی اور پرہیزگاری کی طرف ساری نوع انسانی کو دعوت دی۔ پھر کہہ دیا کہ جو اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم سے ہے اور جو اس کو رد کر دے وہ دوسری قوم سے ہے۔ ان دونوں قوموں کے درمیان ہنائے امتیاز نسل

* یہاں سے آگے کے چار پیراگراف مولانا مودودی صاحب کے مضمون "اسلامی تصور قومیت" سے ماخوذ ہیں۔

Marfat.com

اور نسب نہیں اعتقاد اور عمل ہے ۔ ہو سکتا ہے کہ ایک باپ کے دو بیٹے اسلام اور کفر کی تفریق میں جدا جدا ہو جائیں اور دو بالکل اجنبی آدمی اسلام میں متحد ہونے کی وجہ سے ایک قومیت میں مشترک ہو جائیں ۔ وطن کا اختلاف بھی ان دونوں قوموں کے درمیان وجہ امتیاز نہیں ہے ۔ یہاں امتیاز حق اور باطل کی بنیاد پر ہے جس کا کوئی وطن نہیں ۔ ممکن ہے کہ ایک شہر ، ایک محلہ، ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک حبشی رشتہ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک مراکشی کا قومی بھائی بن جائے ۔

رنگ کا اختلاف بھی یہاں قومی تفریق کا سبب نہیں ۔ یہاں اعتبار چہرے کے رنگ کا نہیں ، اللہ کے رنگ کا ہے اور وہی بہترین رنگ ہے :

صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً

اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔
(البقرہ - ۱۳۸)

ہو سکتا ہے کہ اسلام کے اعتبار سے ایک گورے اور ایک کالے کی ایک قوم ہو اور کفر کے اعتبار سے دو گوروں کی دو الگ قومیں ہوں ۔

زبان کا امتیاز بھی اسلام اور کفر میں وجہ اختلاف نہیں ہے ، یہاں منہ کی زبان نہیں محض دل کی زبان کا اعتبار ہے جو ساری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اس کے اعتبار سے عربی اور افریقی کی ایک زبان ہو سکتی ہے اور دو عربوں کی زبانیں مختلف ہو سکتی ہیں ۔

معاشی اور سیاسی نظاموں کا اختلاف بھی اسلام اور کفر کے اختلاف میں سے نہیں ہے ۔ یہاں جھگڑا دولت زر کا نہیں دولت ایمان کا ہے ، انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے ۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور جو خدا کے ہاتھ پر اپنی جانیں فروخت کر چکے ہیں وہ سب ایک قوم ہیں خواہ کہیں رہتے ہوں اور جو خدا کی حکومت کے باغی ہیں وہ ایک دوسری قوم ہیں خواہ کسی سلطنت کی رعایا ہوں ۔

اس طرح اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے ۔ اس دائرے کا محیط ایک کلمہ ہے —

Marfat.com

لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ — اسی کلمہ پر دوستی بھی ہے اور دشمنی بھی ، اسی کا اقرار جمع کرتا ہے اور اسی کا انکار جدا کرتا ہے ۔

اس بحث سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام میں ملت اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول ہے ۔ اور اگر حالات کی مجبوری کی وجہ سے ملت بہت سے ممالک میں بٹی ہوئی ہو تب بھی ہر ملک کو خالص وطنی قومیت کے مقابلے میں اسلام کی نظریاتی قومیت کو بنیاد بنانا چاہیے اور آہستہ آہستہ اتحاد اسلامی یا مسلمانوں کی دولت مشترکہ کو قایم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے ۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ بہت سی ریاستیں اسلام کی بنیاد پر قایم ہوں اور اپنے اپنے دائرے میں اس انقلابی دین کو قایم کرنے کی کوشش کریں ۔

دور حاضر میں پاکستان کا وجود اسلامی قومیت کا مظہر ہے ۔ یہ ملک خالص نظریاتی بنیادوں پر قایم ہوا اور پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے قیام کے لیے جدو جہد کی ۔ یہ نہ ایک جغرافیائی وحدت ہے ، نہ اس میں ایک زبان ہے ، نہ اس کے رہنے والوں کی نسل ایک ہے اور نہ ان کا رنگ ایک سا ہے ۔ جس چیز نے ان کو جوڑ کر ایک وحدت بنا دیا ہے وہ ان کا دین و ایمان اور ان کا نظریہ حیات ہے جسے غالب کرنے کے لیے انہوں نے ایک ملک قایم کیا ہے ۔ اور یہ ملک ہمارے لیے مقدس اس لیے ہے کہ یہ اسلامی نظریہ کا علم بردار ہے ۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

ایک اہم سوال پر بحث کی مزید ضرورت ہے ۔ یعنی وہ ملک جو اسلامی نظریے کو لے کر اٹھے اس کی خارجہ پالیسی کے اصول کیا ہوں ؟ ملت اور ریاست کے تعلقات دوسرے ممالک اور اقوام سے کن بنیادوں پر استوار ہوں ؟ ذیل میں ہم ان اصولوں کی مختصر تشریح کرتے ہیں ۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ ملت اسلامیہ اور اسلامی ریاست کی حیثیت پوری دنیا کے سامنے خدا کی شریعت کے علم بردار اور اس کے پیغام کے داعی کی ہے ۔ قرآن اس کو ”امت وسط“ کہتا ہے اور اس کے منصب کو ”شہادت حق“ سے تعبیر کرتا ہے ۔ یعنی یہ وہ امت ہے جو خدا کی طرف سے پوری انسانیت پر گواہ بنائی گئی ہے ، جو اپنے قول و عمل اور پالیسی اور پروگرام کے ذریعے سے خدا کے دین کی شہادت دیتی ہے ۔

Marfat.com

اس لیے ''اسلام'' میں '' سیاست خارجہ'' کا پہلا اصول یہ قرار پاتا ہے کہ یہ اسلام کی مبلغ اور حق کی شہادت دینے والی ہے اور یہ کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرسکتی جو کسی طرح اس کی حیثیت کو مجروح کرنے والا ہو۔

(۲) وطن کی محبت اور اس کے مفاد کا تحفظ اس کی دوسری بنیاد ہے ۔ وطن کی محبت سے مراد یہ ہے کہ ملک اور اس کے بسنے والوں کی حقیقی خیر خواہی ، ان کے مفاد کا تحفظ ، ان کے حقوق کے لیے جدوجہد اس کے اولین فرائض میں سے ہوں گے ۔ اسلام وطن سے سچی محبت کو ایمان کے ثمرات میں سے سمجھتا ہے ۔ لیکن یہاں اسلام کے نقطۂ نظر میں جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ اسلام ''میرا ملک! حق یا ناحق!'' کے اصول کو صحیح نہیں سمجھتا ، بلکہ وہ حق کی صورت میں ہر ممکن تعاون اور جدوجہد ، اور ناحق کی صورت میں مخالفت اور درست کرنے کی کوشش فرض کرتا ہے ۔

مثلاً ، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اپنے بھائی کی مدد کرو ، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔'' صحابہ نے پوچھا ''یا رسول اللہ ! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد سمجھ میں آتی ہے ، لیکن اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے؟'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا ''اس کی مدد اس طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔'' بس یہی اصول اسلام خود قومی پالیسی کے لیے بھی تجویز کرتا ہے ۔

(۳) اسلام کی سیاست خارجہ کا یہ بھی ایک اہم پہلو ہے کہ وہ پوری امت مسلمہ کی وحدت کا داعی ہے ، اور ریاست کو ایسی تدابیر اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے جو تمام مسلمانوں کو جوڑنے والی اور ان میں تعاون اور بھائی چارہ قایم کرنے والی ہوں ۔ ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کی بہت سی ریاستیں ہوں لیکن ان کو اپنی ایسی '' دولت مشترکہ'' بنانی چاہیے جو ہر حیثیت سے ان کو ایک دوسرے کا معاون و مددگار بنادے ۔ قرآن میں ہے :

وَإِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱتَّقُونِ

اور دیکھو ! یہ تمہاری امت فی الحقیقت
ایک ہی امت ہے اور میں تم سب کا
پروردگار ہوں پس تقویٰ اختیار کرو۔
(المومنون - ۵۲)

Marfat.com

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی
سے تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔
(آل عمران - ۱۰۳)

پھر اس کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں عام تعاون ہو بلکہ سیاست خارجہ کا ایک خاص مقصد پورے عالم اسلام کی سیاسی آزادی ہے - مسلمان آزاد رہنے اور صرف خدا کی غلامی کے لیے پیدا ہوا ہے - اور اگر دنیا کے سینے پر ایک مسلمان بھی غیر اللہ کی غلامی میں گرفتار ہے تو سارے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ اس کو طاغوتی نظام سے آزاد کرائیں - اسلامی فقہ کا ایک مسئلہ ہے کہ " اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو اہل مغرب پر فرض ہے کہ اس کو فدیہ دے کر چھڑائیں - خواہ اس سلسلے میں تمام مسلمانوں کا مال ہی کیوں نہ دینا پڑے [1] -" ظاہر ہے اگر ایک عورت کو غلامی اور قید سے چھڑانے کے لیے یہ مسئلہ ہے تو پورے اسلامی ممالک کو اغیار کی غلامی اور مشرق و مغرب کے استعماروں سے آزاد کرانے کے لیے ہمارا مسلک کیا ہو سکتا ہے ؟

(۴) اسلام فتنہ اور فساد کو ختم کرنے اور امن قایم کرنے کے لیے آیا ہے۔ اور اس کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہوگا - قرآن انسانی خون کے بہانے کو گناہ عظیم قرار دیتا ہے الا یہ کہ حق کے ساتھ ہو :

مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَآ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا

جس نے سوائے اس کے کہ قصاص لینا ہو یا ملک میں فساد پھیلانے والوں کو سزا دینی ہو، کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کا خون کیا اور جس کسی نے کسی کی جان بچائی گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی - (المائدہ - ۳۲)

پھر قرآن ہر قسم کی زیادتی کی مخالفت کرتا ہے :

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا

اور دیکھو ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی
تمہیں اس بات پر ابھار دے کہ راہ انصاف
سے ہٹ جاؤ - (المائدہ - ۸)

---

۱ الشرح الصغیر بحوالہ حسن البناء " الاخوان المسلمون اور ان کی دعوت "

Marfat.com

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد امن قایم کرنا اور انسانی زندگی کو سکون کی دولت سے مالا مال کرنا ہے ۔ لیکن اسلام نے صرف اتنی بات کہہ کر معاملے کو ختم نہیں کر دیا ہے ورنہ اس میں اور اھنسا میں کوئی فرق نہ رہتا ۔ اسلام نے ان اسباب کو دور کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ ھیں اس لیے کہا گیا ہے کہ طاغوت کی قوت کو ختم کرو اور زمین سے فتنے کو بالکل مٹادو ۔ تب ھی حقیقی امن قایم ہو سکتا ہے :

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۝

" اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے ۔ اور دین اللہ کے لیے خالص نہ ہو جائے ۔ اگر وہ فساد سے باز آ جائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیے ۔ " (البقرہ ۔ ۱۹۳)

اس طرح اسلام ان اسباب کو بھی دور کرتا ہے جو امن کو تہ و بالا کرنے والے ھیں ۔

(۵) اسلام جغرافیائی حدود کو انسانیت کو مستقل طور پر بانٹنے والی حدود نہیں مانتا ۔ وہ ایک عالمی انسانی برادری قایم کرناچاھتا ہے جو ایک قانون کے تابع اور ایک مرکز سے وابستہ ہو ۔ اور جس میں انسانوں کو گروھوں میں تقسیم کرنے والی چیز نسل ، رنگ ، زبان اور وطنی حدود نہ ھوں ۔ بلکہ پوری انسانیت ایک خاندان بن جائے ۔ اور اگر کسی بنیاد پر ان میں فرق ھو تو وہ ایمان اور تقویٰ ھوں ، اور یہ ایسی چیزیں ھیں جو کسی قوم ، رنگ یا نسل سے وابستہ نہیں بلکہ پوری انسانیت ان کے سلسلے میں برابر ہے ۔ ھر شخص انہیں حاصل کر سکتا ہے ۔

حدیث میں پوری انسانیت کو " عیال اللہ [1] " کہا گیا ہے :

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیاله (بیہقی)	"ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو عیال اللہ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتا ہے۔"

اس طرح اسلام پوری عالمی انسانی برادری کی تنظیم کا مدعی ہے ۔

(۶) عہد و پیمان کی پابندی بھی اسلام کی بین‌الاقوامی پالیسی کا ایک اصول ہے ۔ اور اسلام اس پر سختی سے عمل کا حکم دیتا ہے :

---

۱ اللہ کا گھرانہ ، خاندان ، برادری

Marfat.com

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ۬ؕ

" اے ایمان والو ! اپنے معاهدے
پورے کرو ۔ " (المائدہ ۔ ۱)

صرف اس صورت میں معاهده توڑا جا سکتا ھے جب دوسرا فریق اس کی خلاف ورزی کرے ، اس صورت میں قرآنی تعلیم یه ھے که معاهده خلاف ورزی کرنے والے فریق کے منه پر دے مارو ، جس سے ظاهر ھے علانیه بے تعلقی کا اعلان هو جائے گا :

فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ

پس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک
پورا کر دو ۔ (التوبه ۔ ۴)

(۷) بین الاقوامی تعلقات میں اسلام بدله لینے کو جائز قرار دیتا ھے لیکن یه لازم کر دیتا ھے که بدله اتنا هی لیا جائے جتنا حق ھے اور ذرا بھی زیادتی نه کی جائے ۔ نیز اگر در گزر اور حسن سلوک کا طریقه اختیار کیا جائے تو یه خوب تر ھے :

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ

برائی کا بدله تو بس اس کے برابر برائی
هی هو سکتا ھے ۔ (الشوریٰ ۔ ۴۰)

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ ۪

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر کی
زیادتی کرکے اپنا بدله لے سکتے هو (اس سے زیادہ نہیں)

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ۝

اور اگر مخالفوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاهیے که ویسی اور اتنی هی کرو جیسی اور جتنی تمھارے ساتھ کی گئی ھے ۔ اور اگر تم نے صبر کیا تو بلا شبه صبر کرنے والوں کے لیے صبر هی بہتر ھے ۔ (النحل ۔ ۱۲۶)

Marfat.com

ان آیات کی روشنی میں سیاست خارجہ کا ایک اصول یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کو دوسرے ممالک سے بدلہ لینے کی اجازت ہے لیکن حسن سلوک کی پالیسی بہ ہر حال قابل ترجیح ہے۔ رہی یہ بات کہ کس موقع پر کون سا رویہ اختیار کیا جائے، تو اس کا فیصلہ حالات واقعات و حقائق کی روشنی میں ہی ہو سکتا ہے۔

مندرجۂ بالا مباحث اسلام کے سیاسی نظام کو واضح کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اپنا ایک سیاسی نظریہ ہے اور وہ ایک مخصوص مزاج کی ریاست قایم کرتا ہے جو دور حاضر کی اور سب ریاستوں سے مختلف اور ان سے بہت اعلیٰ اور بہتر ہے۔

مزید مطالعے کے لیے

مولانا محمد اسحاق سندیلوی، اسلام کا سیاسی نظام۔ مطبع معارف، اعظم گڈھ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور۔

مولانا امین احسن اصلاحی، اسلامی ریاست۔ لاہور۔

پروفیسر عبدالحمید صدیقی، اسلام اور تھیاکریسی۔ مکتبہ چراغ راہ، کراچی۔

حکیم حیدر زمان صدیقی، اسلامی نظریۂ سیاست۔ کتاب منزل، لاہور۔

خورشید احمد (مرتب) چراغ راہ (نظریۂ پاکستان نمبر)۔ مکتبۂ چراغ راہ" کراچی۔

مولانا حامد الانصاری، اسلام کا نظام حکومت۔ ندوۃ المصنفین، دھلی۔

Muhammad Asad (Leopold Weiss), *Principles of State and Government in Islam*, University of California Press.

Marfat.com

۲۱

اسلام کے تقاضے*

اسلام کا تصور دین

دنیا میں اس وقت مذہب کے تین مختلف تصور پائے جاتے ہیں :

(ا) ایک تو یہ کہ دنیا انسان کے لیے حقیقتاً ایک قید خانہ ہے۔ اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسان نجات اسی وقت پاسکتا ہے جب وہ اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے۔ یعنی وہ دنیا کو چھوڑ کر بستیوں سے دور ایک گوشے میں بیٹھ کر خدا سے لو لگائے۔ اور دنیا جہاں کے سارے بکھیڑوں سے آزاد ہوکر خدا کی جناب تک رسائی حاصل کرلے۔ دین اور خدا پرستی کے اس نظریے کا نام " رہبانیت " یا " یوگ " ہے۔

(ب) دوسرے تصور کی رو سے انسان کو دنیا سے منہ موڑنے اور نفس کشی کی حاجت نہیں۔ بلکہ اسے دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنا چاہیے۔ جہاں تک دنیوی معاملات کا تعلق ہے انسان صرف انفرادی زندگی میں دین کا پابند ہے لیکن اجتماعی زندگی میں وہ آزاد و خود مختار ہے کیوں کہ " عبادت " فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ نیز دین انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے۔ چناں چہ عام دنیاوی اور اجتماعی وسائل میں انسان

---

* یہ باب مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب " فریضہ اقامت دین " اور " اسلام ایک نظر میں " سے ماخوذ ہے۔ (مرتب)

Marfat.com

آزاد ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے اور اسے ''ادھوری دین داری'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے ۔

(ج) تیسرا تصور یہ ہے کہ دنیا سے کنارہ کشی اور نفس کشی دونوں غلط ہیں۔ اور دین و بندگی کو صرف نجی اور انفرادی معاملہ تصور کرنا بھی بالکل غلط ہے ۔ صحیح بات یہ ہے کہ انسان اپنی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی میں دین کا پابند اور بندگی کا محتاج ہے ۔ اسے جتنی قوتیں دی گئی ہیں وہ صرف بندگی کے لیے عطیہ ہیں۔ یعنی نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا جائے ، نہ ان کو کچلا جائے۔ صحیح دین داری اور خدا پرستی یہ ہے کہ انسان زندگی کا ہر لمحہ احکام الہٰی کے تحت گذارے اور دنیوی زندگی کا پورا نظام مالک حقیقی کا پسندیدہ ہو۔ یہ اسلام کا تصور دین ہے ۔

اسلام کا یہ تصور دین رہبانیت سے کسی قسم کا لگاو نہیں کھاتا۔ انسان کے رب نے، جو حقیقی فرماں روا اور قانون ساز بھی ہے ، پوری زندگی کے لیے احکام و قوانین مقرر کیے ہیں ۔ اس کے بنیادی عقاید و اعمال مثلاً نماز ، حج اور زکواۃ وغیرہ کی ٹھیک ٹھیک ادائیگی کے لیے اجتماعیت کو ضروری قرار دیا ہے کیوں کہ اجتماعی فضا سے ہٹ کر بہ طور خود نماز روزے کی ادائیگی سے وہ تمام فوائد و مصالح ہرگز نہ حاصل ہو سکیں گے جو شریعت میں مقصود ہیں۔ اور اسلام کے پورے احکام کی بجا آوری اجتماعیت کے بغیر ممکن نہ ہوگی ۔ نیز قرآن و حدیث میں اس سے صاف براءت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ مثلاً :

لا رہبانیۃ فی الاسلام (حدیث) اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں ہے ۔

ایک دوسری حدیث میں ہے ۔ '' ہمیں اللہ تعالیٰ نے رہبانیت کے بجائے آسان اور خالص دین ابراہیمی عطا فرمایا ہے ۔'' اسی طرح قرآن میں ہے :

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ

''اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساخته
راہ اختیار کرلی ہم نے تو انہیں اس
کا حکم نہیں دیا تھا ۔'' (الحدید ـ ۲۷)

Marfat.com

گویا نہ صرف اسلام میں بلکہ خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی شریعت میں بھی رہبانیت کی تعلیم نہیں دی گئی - چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح دین کا مزاج رہبانیت کو برداشت نہیں کرتا اور اس کے بنیادی عقاید و اعمال اس کے مخالف ہیں ، ٹھیک یہی حال اس کی تفصیلی تعلیمات کا بھی ہے - اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس طرز عمل کی ممانعت فرمائی ہے جس میں رہبانیت کی بو تھی اور یا اس کی طرف لے جانے والا تھا - مثلاً نکاح سے بچنا ، ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا ، قوت گویائی معطل رکھنا ، مسلسل شب بیداریاں یا وہ عبادت جس سے جسم آرام اور اہل و عیال اپنے حقوق سے محروم ہو جائیں وغیرہ -

رہبانیت کی طرح دوسرا مذہبی تصور بھی، جسے ہم نے ''ادھوری دین داری'' سے موسوم کیا ہے ، اسلام کے تصور سے بالکل مختلف ہے ، کیوں کہ دین بندے اور خدا کا نجی معاملہ نہیں ہے - اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات انفرادی زندگی کے مسائل تک ہی محدود ہوتیں - وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا ، نماز روزے کا حکم اور اخلاقیات کی تلقین بس کافی تھی - لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے - اسلام کے نزدیک ''دین'' انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر میدان میں ہادی اور واجب الاتباع ہے - اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے - اور ان کے کسی بھی حکم کو دین سے زائد نہیں خیال کیا جا سکتا - یوں بھی سوچیے تو اس طرح کے خیال میں کوئی معقولیت نہ مل سکے گی - ''اسلام'' کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط اطاعت ہے تو اس کے کسی حکم کو آخر دائرہ اطاعت سے کس طرح باہر رکھا جائے گا -

غرض اسلام نہ تو رہبانیت کو درست قرار دیتا ہے اور نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہے - بلکہ وہ تو ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے - اور ملت اسلامیہ یا امت مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جس کا مقصد اسلام کے دیے ہوئے اصولوں پر اپنی زندگی کی پوری عمارت کی تعمیر ہے ، یہ مسلک حیات فطرت کے ٹھوس حقایق پر مبنی ہے ، عالم گیر اور جہانی ہے ، زمان و مکان کی قیود اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماوراء ہے ، غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی

Marfat.com

قطع و برید نہیں کرسکتے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے بلکہ اسلام در اصل اللہ کی رضا کی خاطر جینے اور اسی کی خاطر مرنے کا نام ہے اور مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور اس کے مفاد پر دنیا کے مفاد کو ہرگز مقدم نہ ہونے دے۔

اب اس میں تو کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ اسلام کا قبول کر لینا نجات اخروی کا باعث ہے۔ اور آخرت کی ساری فلاح و کامرانی ایک " مسلم" کے لیے مقرر ہو چکی ہے۔ چناں چہ قرآن میں ہے:

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۝

ہاں جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف کر دیا (یعنی اسلام قبول کر لیا) اور وہ نیکو کار ہوا تو اس کے لیے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا ثواب ہے۔ اور ان (اسلام قبول کر لینے والوں) کو نہ کوئی خوف ہی ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
(البقرہ - ۱۱۲)

لیکن آخرت کے ثواب اور وہاں کی فلاح و کامرانی سے پہلے ہر ایک کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دین کی صحیح پیروی کے بعد مسلمان کی " دنیا " کا کیا نقشہ ہوگا۔ کیا اس کے پاس اس دنیا کی کوئی قابل ذکر چیز باقی رہ جائے گی؟ وہ انفرادی حیثیت سے خوش حال اور اجتماعی حیثیت سے با عزت و با اقتدار بھی باقی رہ سکے گا؟

اسلام کی دنیوی برکتیں

اس سلسلے میں انبیائے کرام علیہ السلام کی دعوتوں کا سرسری جائزہ مفید ہوگا۔ ہر نبی نے اپنی قوم کو اللہ کے دین کی طرف یہ یقین دلاتے ہوئے بلایا کہ میری پیروی تمہیں آخرت ہی کی نہیں دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اس وعدہ الٰہی کا اعلان کیا تھا " لئن شکرتم لازیدنکم " (اگر تم نے شکر گذاری کی روش اختیار کی تو تمہیں مزید بخشش عطا کروں گا) اور جب تک ان کی قوم اس روش پر چلتی رہی اللہ کا وعدۂ بشارت پورا ہوتا رہا، حتیٰ کہ عظمت و شوکت میں ان کی قوم سب سے

Marfat.com

اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچ گئی:

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَنِّي فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِينَ

"اے بنی اسرائیل! یاد کرو میری اس نعمت کو جس سے میں نے تمہیں نوازا تھا اور یہ کہ میں نے تمہیں دنیا کی ساری قوموں پر برتری عطا کی تھی" (البقرہ - ۱۲۲)

لیکن جب انہوں نے یہ راہ ترک کر دی تو ان کے اوپر سے عزت و اقبال کی قبا بھی اتار دی گئی - اور "وضربت علیھم الذلۃ و المسکنۃ" کی مہر ان پر لگا دی گئی - کاش! "اگر یہ اہل کتاب تورات کو اور انجیل کو اور ان ہدایتوں کو قایم کرتے جو ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی تھیں تو رزق ان کے اوپر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی ابلتا -" (المائدۃ)

غرض ساری اقوام کے لیے یہ عمومی قانون الٰہی رہا ہے کہ

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرٰىٓ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ

اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلتے تو ہم ان کے اوپر زمین اور آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے -
(الاعراف - ۹۶)

اور جنہوں نے ایمان اور خدا پرستی کا راستہ اختیار کیا

فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ

تو اللہ نے انہیں دنیا کا بھی اجر دیا - اور آخرت کا بھی بہترین اجر عطا فرمایا -
(آل عمران - ۱۴۸)

ان متفقہ شہادتوں کی موجودگی میں کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور امت مسلمہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ اور فیصلہ بدل جاتا - چناں چہ دنیوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا جیسا پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے - اور یہ ہر مرحلے میں کہا گیا - مکہ کے تاریک و صبر آزما دور میں بھی اور مدینہ کے پر خطر ماحول میں بھی - انہیں بھی خطاب کیا گیا جو اسلام لا چکے تھے اور انہیں بھی جو ابھی دائرۂ اسلام میں نہ آئے تھے - چناں چہ

Marfat.com

مکہ میں قریش کو ایمان کی دعوت دیتے ہوئے اللہ کا ارشاد تھا :

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور پھر اس کی طرف رجوع کرو تو وہ تمہیں زندگی کا اچھا سامان عطا فرماتا رہے گا۔ (ہود - ۳)

اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں یقین دلایا تھا کہ ''اگر تم میرا لایا ہوا پیغام قبول کرلو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہوگا اور آخرت میں بھی۔'' اور ایک موقع پر اپنے چچا ابو طالب سے کہا تھا۔ ''میں انہیں (یعنی قریش کو) صرف ایک بات کی تلقین کرتا ہوں۔ ایسی بات کہ جس کی بدولت سارا عرب ان کا مطیع اور سارا عجم ان کا باج گذار ہو جائے گا۔'' پھر اسی طرح ایمان لا چکنے والوں سے خطاب فرمایا گیا :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کرتے ہیں اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح کہ اس نے ان سے پہلے کے لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے اس دین کی جڑیں بڑی مضبوط جمادے گا جسے اس نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے اور ان کی موجودہ حالت خوف کو حالت امن سے بدل دے گا۔ (النور - ۵۵)

گویا جس طرح آخروی فلاح کے لیے ''ایمان'' اور ''عمل صالح'' ایک لازمی شرط ہے اسی طرح دنیوی فلاح و سعادت کے لیے بھی ''ایمان'' اور ''عمل صالح'' شرط اولین ہے، اور اسی لیے مسلمانوں (امت مسلمہ) کا عروج و زوال اسی شرط پر موقوف ہے :

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۝

نہ تم پریشان ہو اور نہ خوف زدہ۔ کامیابی تمہارے لیے ہے بشرطے کہ تم سچے مومن ہو جاؤ۔ (آل عمران۔ ۱۳۹)

ملت اسلامیہ کے لیے عروج و زوال کا یہ قانون دوسری قوموں سے بالکل مختلف ہے۔ دوسری قوموں کے لیے اللہ کا قانون تو یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی قسم کی انسانی اخلاقیات اپنے اندر پیدا کرلیں اور ترقی کی ضروری مادی تدبیریں اختیار کرلیں تو اوپر اٹھ سکتی ہیں۔ لیکن جب امت مسلمہ کا معاملہ ہو تو صرف یہ چیزیں ترقی کا زینہ بننے کے لیے ہرگز کافی نہیں ہو سکتیں۔ کیوں کہ یہ امت

Marfat.com

اس دنیا میں اللہ کے دین کی علم بردار ، اور دوسری قوموں کے سامنے حق کی گواہ ہے - دوسری کسی قوم کا منصب یہ نہیں ہے - منصب کا اختلاف قطعی طور پر حقوق اور ذمہ داریوں دونوں کا اختلاف چاہتا ہے اور اس اعتبار سے معاملے کے ضابطے بھی مختلف ہوں گے - دوسری قومیں اگر حق کا راستہ چھوڑ کر چلیں تو انصاف کہتا ہے کہ ان کا یہ جرم اتنا سخت اور قابل نفرت نہ ہوگا جتنا کہ امت مسلمہ کی طرف سے سرزد ہونے کی شکل میں ہو سکتا ہے - اس لیے دوسری قوموں کو قدرت کی طرف سے اگر یہ رعایت ملی ہے کہ وہ خدا کی فرماں برداری اختیار کیے بغیر بھی پھل پھول سکتی ہیں اور امت مسلمہ کو نہیں ملی تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا - جو اللہ کے مخصوص فضل سے سرفراز ہوا ہے اسے اس مخصوص فضل خداوندی کی ناقدری کی شکل میں اس کے مخصوص عتاب کا سزا وار بھی بننا ہی پڑے گا -

ان صراحتوں اور شہادتوں سے یہ بات تو واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو دنیا کی فلاح سے بھی خوب نوازتا ہے لیکن یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا کیوں اور کیسے ہوتا ہے ، کہا جا سکتا ہے کہ مذہب تو انسان کو آخرت کی ترغیب دیتا ہے اور دنیا سے بے پرواہ بناتا ہے پھر اسے دین کا دامن پکڑنے کے نتیجے میں یہ دنیا کس طرح ہاتھ آ جاتی ہے ؟

اس سوال کے جواب کے لیے پہلے تو یہ اصولی حقیقت ذہن نشین ہونا چاہیے کہ یہ دولت و عزت اور یہ اقتدار و حکومت وغیرہ ، جنہیں " فلاح دنیا " سے موسوم کیا جاتا ہے ، دین کی نگاہ میں بجائے خود معیوب و معتوب چیزیں نہیں ہیں ، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کا فضل ہیں - چناں چہ قرآن کی بے شمار آیات اس کی شہادت دیتی ہیں - مثلاً اقتدار و حکومت کے لیے سورۂ مائدہ میں ہے " یاد کرو اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو جب کہ تم میں سے انبیا بنائے (پیدا کیے) اور تمہیں بادشاہت (اقتدار و حکومت) سے سرفراز کیا۔" یا دوسری جگہوں پر ، مثلاً سورۂ نحل میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو بھی " انعم اللہ " (اللہ کی نعمتیں) سے تعبیر کیا گیا ہے - اسی طرح سورۂ جمعہ اور دوسرے متعدد مقامات پر ان چیزوں کی " فضل " سے ترجمانی کی گئی ہے :

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

اور اللہ کا فضل تلاش (حاصل)
کرو- (الجمعۃ - ۱۰)

Marfat.com

لیکن یہاں یہ شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ پھر قرآن و حدیث میں " دنیا " اور " طلب دنیا " کی مذمت کیوں کی گئی ہے ؟ اور اس شکل میں اس بات کا مطلب کیا ہوگا کہ " مسلمان وہ ہے جو اپنی نظریں ہمیشہ آخرت پر جمائے رکھے اور دنیا کے کسی مفاد کو آخرت پر ترجیح نہ دے ؟ "

اس سلسلے میں پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ جس دنیا کو ملعون اور اس کی طلب کو مذموم ٹھہرایا گیا ہے وہ اور چیز ہے اور وہ " دنیا " جس کی فلاح کا مومن حق دار اور طلب گار ہوتا ہے بالکل دوسری چیز ہے ۔ اسلام کی نگاہ میں مذموم اور بچنے کے قابل صرف وہ چیزیں ہیں جو انسان کو خدا سے غافل اور اس کے دین کے تقاضوں سے بے پرواہ بنا دیتی ہیں ۔ اور وہ "دنیا" جس کی کتاب و سنت میں مذمت کی گئی ہے در اصل انہی چیزوں کا نام ہے ۔ لیکن جو چیزیں انسان کو خدا سے غافل نہ بنائیں اور جو دین کے تقاضوں کو پورا کرنے میں روک بننے کے بجائے مددگار ثابت ہوں ، وہ ہرگز مذموم اور قابل نفرت نہیں ہیں بلکہ ہر طرح سے پسندیدہ اور مطلوب ہیں ، اور انہیں قرآن مجید میں مذموم و ملعون نہیں بلکہ دنیا کی بھلائی (فی الدنیا حسنہً) اور دنیا کا اجر (ثواب الدنیا) وغیرہ فرمایا گیا ہے ۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ایک مسلمان کے لیے دنیوی فلاح کا مطلب ایسی ہی چیزوں سے ہوتا ہے جو خدا سے غافل کرنے والی نہ ہوں ۔ کیوں کہ فی الحقیقت خدا سے غفلت اور دین کے تقاضوں سے بے پروائی کا اصل تعلق تو انسان کے اپنے نفس سے ہے نہ کہ دنیا کی چیزوں سے ۔ ایک ہی چیز ایک شخص کے لیے خدا سے غافل ہونے کا سبب بن جاتی ہے لیکن دوسرے کے لیے رجوع الی اللہ کا ۔ ایک عام آدمی تو معمولی سی جائیداد پاکر بھی آپے سے باہر ہو جاتا ہے لیکن مسلمانوں کے مثالی حکمران ، جن کو وقت کی عظیم ترین سلطنت کی حکمرانی حاصل تھی ، انہیں ایسی سلطنت بھی خدا سے ذرہ برابر غافل نہ کر سکی ۔ اس لیے اس واقعہ یہی ہے کہ دنیا کی دولت و عزت یا اقتدار و حکومت وغیرہ جیسی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی فی نفسہ بری اور قابل احتراز نہیں ہے ۔ یہ تو در اصل انسان کا اپنا غلط طرز فکر اور غلط طرز عمل ہے جو ان چیزوں کو اس کے حق میں سم قاتل بنا دیتا ہے ۔ لیکن مومن کے بارے میں چوں کہ قرآن اور اسلام کا تصور یہی ہے کہ وہ اللہ کی بخشی ہوئی

Marfat.com

چیزوں کا استعمال غلط طریقے سے نہیں کرتا بلکہ اللہ کی مرضی اور ھدایت کے مطابق ہی کرتا ہے اس لیے اس کے لیے یہ چیزیں وہ ''دنیا'' نہیں جو مذموم و ملعون ہے بلکہ وہ دنیا ہے جو محمود و مطلوب ہے۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کے معنی دنیا سے دست بردار ہو جانے کے نہیں ھیں، بلکہ یہ ھیں کہ اس کے حاصل کرنے میں اور حصول کے بعد اس کے برتنے میں دین کے تقاضوں کو پامال نہ کیا جائے، مقررہ حدود سے تجاوز نہ کیا جائے، اور آخرت کے مفاد کو ٹھیس نہ لگنے دی جائے۔ گویا چند شرعی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہوئے دنیا سے متمتع ہونا صحیح طرز عمل ہے۔ دنیا پر آخرت کو ترجیح دینے کے باوجود مومن کے لیے دنیوی فلاح کی راہ بھی مناسب اور ضروری حد تک بالکل کھلی رکھی گئی ہے۔ یعنی جہاں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مومن کا اصل مطمع نظر فلاح آخرت ھی ہوتی ہے وہاں یہ بھی ایک حقیقت ھی ہے کہ اسلام نے آخرت کی فلاح کا جو راستہ بتایا ہے وہ دنیوی فلاح سے کترا کر نہیں جاتا بلکہ اس کے اندر سے ھوکر گذرتا ہے۔ گویا آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے کا مآل خود دنیا کے مفاد کو بھی حاصل کر لینا ہے نہ کہ اس سے محروم ہو جانا۔

دوسری بات جس کی طرف دوبارہ نشان دھی کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا '' خلیفہ '' اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ھی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ھاتھ میں رکھے، اور اسے اپنے مالک کے احکام اور مرضیات کے مطابق چلائے۔

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ھو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ھیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو۔ کیوں کہ جو چیزیں '' اللہ کی نعمت '' اور '' اللہ کا فضل '' ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے:

قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ

فرما دیجیے کہ یہ ساری (پاک چیزیں) دنیا کی زندگی میں بھی (اصلاً) اھل ایمان (ھی) کے لیے ھیں اور قیامت کے دن تو خالصتہً انہی کے لیے ہوں گی۔
(الاعراف - ۳۲)

Marfat.com

اس کے معنی یہ نہیں کہ ان چیزوں کے اصل حق‌دار اللہ کے فرماں بردار بندے ہی ہیں ۔ اب اگر ان چیزوں کے اصل حق دار اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار بندے ہی ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نا مطلوب کسی طرح نہیں ہوسکتیں۔ اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجے کہ اس کا تقاضا کیا ہے ؟ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاھتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے تو جب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں ۔ اس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہوگی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوئے یہ اقتدار ان لوگوں کے سپرد کردے جو اپنے اس فرض منصبی کے منکر ہوں ، اپنے بارے میں نائب کی حیثیت تسلیم ہی نہ کرتے ہوں اور اس دنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے یا کسی اور کی حاکمیت کے مدعی ہوں ۔ قرآن کی صراحت ہے :

أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ ۝

زمین کے وارث (حاکم) میرے صالح بندے
(ہی) ہوں گے ۔ (الانبیاء - ۱۰۵)

دوسری طرف ان فرض شناس اور خدا کے فرماں بردار بندوں کے لیے بھی یہ بات خود کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ ان قوتوں کے استعمال کرنے سے بے نیازی برتیں جن کے بغیر وہ اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عہدہ برا ہو ہی نہیں سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائے گی ۔ بہر حال ، ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھیے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے گی کہ مسلمان صرف آخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حق دار اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دین داری کا ہی تقاضا ہے ۔

آگے بڑھنے سے پہلے آئیے اب ایک نگاہ باز گشت ڈال کر یہ دیکھ لیں کہ اسلام کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں تاکہ اسلام کے تقاضوں کا صحیح صحیح ادراک ہو سکے ۔

Marfat.com

اسلام کی امتیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا

پچھلے ابواب کے مطالعے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ '' اسلام '' دوسرے تمام مذاهب سے ممتاز و مخصوص ہے ۔ صرف اسلام ہی ہر حیثیت سے کامل دین ہے ، سارے انسانوں کے لیے ہے ، خدا کا آخری پیغام ہے اور نجات کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پیروی کی جائے ۔ خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی جو دعوت پیش کی وہ مکمل اور ایسی جامع تھی جس کے بعد کسی اور تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ۔ اور یہ ہدایت ہمیشہ کے لیے ، ہر زمانے اور ہر قوم کے لیے کافی و شافی ہے ۔

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت عالم گیر ہے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کسی زمین کے کسی خاص خطے یا کسی ایک قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں ۔ بلکہ ساری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں :

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا

'' اے محمد '' ہم (اللہ) نے تمہیں تمام
لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور
ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے ۔ (سبا ۔ ۲۸)

آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کا اعلان خود بھی بہ حکم الٰہی کیا تھا :

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا

لوگو! میں تم سب لوگوں کے لیے اللہ
کا رسول ہوں ۔ (الاعراف ۔ ۱۵۸)

یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے لیے خاص ہے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے جو انبیا آئے تھے ان میں سے کسی کی حیثیت یہ نہ تھی ۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے :

كان النبي يبعث الى قومه خاصة وبعث الى الناس عامة

(بخاری و مسلم بحوالہ مشکوٰۃ)

(یعنی) مجھ سے پہلے کا ہر نبی مخصوص طور پر اپنی ہی قوم کے پاس نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن میں تمام لوگوں کے لیے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔

Marfat.com

اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت جس طرح عالم گیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ و سلم) کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد تک پہنچ کر ختم ہو گیا۔ اور اب قیامت تک کوئی رسول نہ آئے گا۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ

بلکہ وہ اللہ کے رسول اور سارے
نبیوں کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔
(الاحزاب۔ ۴۰)

خود نبی (صلی اللہ علیہ و سلم) کے اپنے الفاظ ہیں:

ختم بی البنیان و ختم بی الرسل۔ (بخاری و مسلم بحوالہ مشکواۃ) — (یعنی) مجھ سے نبوت کی عمارت مکمل ہو گئی اور میرے ذریعے سے رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

انہ لا نبی بعدی۔ (الحدیث) — بلا شبہ میرے بعد کوئی نبی نہ آئے گا۔

اس کے مقابلے میں دوسرے پیغمبروں کی رسالت کا معاملہ کسی شرح و بیان کا محتاج نہیں۔

پھر جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جو دین و شریعت لے کر آئے وہ ہر پہلو سے کامل ہے جب کہ پچھلے تمام دینوں میں سے کسی کو یہ اعزاز نہ ملا تھا۔ یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ " دین کامل " ہو۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(لوگو) آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت
پوری کردی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لیے اسلام کو پسندیدگی کی
سند عطا کردی۔ (المائدہ۔ ۳)

واقعہ یہ ہے کہ پہلے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح و ہدایت کے لیے مخصوص تھا۔ اور جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا نبی بھیجا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا

Marfat.com

کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الانسانی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے ، ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں ۔ قرآن کی مذکورہ بالا آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے ۔

اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب نازل ہوئی وہ جوں کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی جس پر خود قرآن ، حدیث اور تاریخ گواہ ہیں ۔ اور یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو ایک زندہ ہے ۔ کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے ، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں ۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جو ان صفات کی حامل ہو ۔

رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کے پیش نظر کچھ لازمی تقاضے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ چناں چہ اس کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے ۔

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

بلا شبہ اللہ کے نزدیک مقبول دین تو صرف
اسلام ہے ۔ (آل عمران ۔ ۱۹)

اس لیے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم ، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے ورنہ :

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا
طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ
دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا ۔
(آل عمران ۔ ۸۵)

کیوں کہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا ۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف وہ بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں ۔

Marfat.com

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ

هم نے جو رسول بھیجا صرف اسی لیے بھیجا
کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔
(النساء۔ ٦٤)

اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اس کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لائے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اس کی پیروی کرے اگر کوئی شخص آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نہیں بلکہ اس فرماں‌روائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پوری دنیا کا ھادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ھی کی پیروی ضروری ہے حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے عمل میں بھی موجود ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک بھی صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور کسی ایک رسول کی پیروی کافی ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) یہود اور نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے کیوں کہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے صرف یہ کہتے کہ محض تورات اور انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ھی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے مشرکوں کے لیے ضروری قرار دیا تھا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ

اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے ہم نے اتارا ہے جب کہ وہ اس کتاب کی (پیش گوئیوں) کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انہیں پیچھے کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔ (النساء۔ ٤٧)

Marfat.com

نہ صرف یہ کہ آپ (صلی اللہ علیہ و سلم) نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں "کفر" کا مرتکب قرار دیا گیا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ "بدترین کفر" اور انہیں صرف کافر ہی نہیں "پکا کافر" کہا گیا:

"جو لوگ اللہ کے اور اس کے رسولوں کے ساتھ کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کر دیں اور کہتے ہیں کہ بعض رسولوں کو ہم مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کی کوئی راہ اختیار کر لینا چاہتے ہیں وہ پکے کافر ہیں اور ایسے کافروں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔" (النساء ۱۵۰ - ۱۵۱)

یا اہل کتاب کے انکار اسلام پر ایک جگہ یوں تبصرہ کیا گیا:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی تھی اور اس طرح وہ اس کے ماسوا ہدایات الٰہی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں۔" (البقرۃ)

دعوت اسلام کے جواب میں وہ جو کچھ کہتے تھے وہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدت ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے، یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے؟ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہوا؟ وہ اپنی جگہ حق ہے اور یہ اپنی جگہ حق ہے لیکن ان کے اس "فلسفے" کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اسے صاف طور سے "کفر کا فلسفہ" قرار دیتا ہے اور انہیں "یہ بھی حق وہ بھی حق" کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر (کافر) ٹھیراتا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب کوئی دوسری کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن

Marfat.com

بھی کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ صورت حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب ہمارا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ہمیں منسوخ قرار دیا جا چکا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ہر شخص کے لیے اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی اور دین اللہ کے حضور منظور شدہ اور قابل قبول نہیں رہ گیا ہے تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اسلام ہی شرط نجات ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابل قبول ٹھیرا چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا؟ چناں چہ "و من یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ" فرمانے کے بعد وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کر چکا ہے کہ:

وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ۝

اور ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد
رہے گا۔ (آل عمران۔ ۸۵)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلۂ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ "قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت (مراد گروہ انسانی) میں سے جس کسی بھی شخص تک (مثلاً یہودی یا نصرانی تک)، میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا۔" (مسلم)

اس فیصلۂ خداوندی کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں، بلکہ ایک حیثیت سے تو دوسری قوموں اور ملتوں کا معاملہ اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے کیوں کہ دنیا کی ساری قوموں میں سے صرف یہود اور نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن نے صاف و صریح لفظوں میں "اہل کتاب" کہا ہے۔ اور جن کو کسی نبی کا اُمتی اور کسی آسمانی شریعت کا حامل قرار دیا ہے۔ اب اگر ایسی ملتوں کے افراد کے لیے بھی رسالت محمدی کی پیروی شرط نجات ہے تو عقل کہتی ہے کہ ان قوموں اور ملتوں کے لیے اس کا شرط نجات ہونا اور زیادہ ضروری ہوگا جن کو قرآن نے صاحب کتاب و شریعت کے نام سے یاد نہیں کیا ہے۔

غرض، جہاں تک اسلام کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں اپنی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات قرار دیتا

Marfat.com

ہے اور اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جس تک اسلام کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو۔ اور اس پیغام کو پوری انسانیت تک پہنچانے کی ذمہ داری اُمت مسلمہ کی ہے، انفرادی اور اجتماعی طور پر مسلمان اس امر کے ذمہ دار ہیں کہ دنیا کے سامنے اس حق کی شہادت دیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

ان وضاحتوں کے بعد کہ صرف "اسلام" ہی ہر حیثیت سے جامع، کامل، سارے انسانوں کے لیے، اور آخری دین ہے نیز نجات کے لیے اس کی پیروی شرط ہے، عقل کہتی ہے کہ اسلام کو اگر یہ مخصوص حیثیت دی گئی ہے تو اس مخصوص حیثیت کا ایک مخصوص تقاضا بھی ہوگا۔ اور وہ یہ کہ اسے دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچنا چاہیے۔ اور برابر پہنچتے ہی رہنا چاہیے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیے اور پیہم ہوتی رہنی چاہیے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیے اور مسلسل دیا جاتا رہنا چاہیے۔ ورنہ دنیا اسے جان پہچان نہ سکے گی۔ اور جب جان ہی نہ سکے گی تو اس پر ایمان کس طرح لاسکے گی، حالاں کہ وہ اس پر ایمان لانے کی مکلف قرار دی گئی ہے۔ اور اگر ایمان نہیں لاتی تو بد بختی کا شکار ہوتی ہے۔ یہ تو کوئی انصاف کی بات نہ ہوگی کہ لوگوں کے لیے ان کے مالک کی بھیجی ہوئی شریعت ایک راز بنی رہے اور انہیں بے خبری میں پکڑا جائے۔ اس لیے اگر انسانیت کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام ہی کی پیروی کرے تو اس فرض سے پہلے اس کا یہ حق ہے کہ اسے دین سے واقف کرایا جائے۔ اگر یہ نہیں ہوتا تو خود اسلام پر بھی ظلم ہے کہ وہ بڑی حد تک بے مصرف بن کر رہ جاتا ہے اور انسانیت پر بھی ظلم ہے کیوں کہ اس طرح وہ اس نعمت سے لازماً محروم رہ جاتی ہے جس پر اس کا متدر موقوف ہے۔

جب تک اسلام کا لانے والا رسول دنیا میں موجود تھا بلا شبہہ اس نے بہترین طریقے سے انسانیت کا یہ حق ادا کیا مگر اس کے چلے جانے کے بعد بھی تو یہ حق اپنے ادا کیے جانے کا مطالبہ کر رہا ہے اور تا قیامت کرتا رہے گا۔ اب تو کوئی نبی بھی آنے والا نہیں ہے کہ یہ حق اس کا انتظار کرے۔ بہ ہر حال اگر اب اسلام کی اس مخصوص حیثیت کے ضروری تقاضے کا کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا تو ضروری ہے کہ وہ پورا ہو۔ کیسے پورا ہو؟ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جس کا کوئی عملی حل ہونا چاہیے اور صرف اسلام کی زبان سے ہونا

Marfat.com

چاہیے کیوں کہ اگر اسلام خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے فی الواقع ساری دنیا کے لیے اور ہمیشہ کے واسطے بھیجا گیا ہے تو ضروری ہے کہ اس مسئلے کا کوئی مقررہ حل اس کے پاس موجود ہو۔

اس ضرورت کے پیش نظر قرآن اس عظیم مسئلے کا عظیم الشان حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

اور اسی طرح ہم نے تم (مسلمانوں) کو بہتر (درمیانی) امت بنایا ہے تا کہ تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے (ہمارے نازل کردہ دین کے) شاهد ہو اور ہمارا رسول تمہارے لیے شاہد ہے۔ (البقرة ۱۴۳)

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے کہ :

(۱) اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے ، اس کے چلے جانے کے بعد وہ اس کے پیروؤں کے ذمے ہو گیا ہے۔ اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لیے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ و اشاعت نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے "شہادت" (گواہی) کہہ سکیں۔

۳۔ "اسلام کی شہادت" دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان ہر ممکن حد تک ٹھیک اسی طرح کریں جس طرح کہ خود حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ان (صحابہ) تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو امت مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سامنے رکھ گیا ہے۔ مختصراً ، یہ امت اپنے

Marfat.com

مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قایم مقام ہے - اور بہ حیثیت امت اس کی زندگی کا مشن ٹھیک وہی ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کی زندگی کا تھا۔

امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے۔ بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ " ہم نے تمہیں ایک بہتر امت (یا امت وسط) بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دین حق کے گواہ رہو"۔ اس امت کی حیثیت صاف طور سے یہی مقرر کر رہا ہے۔ مزید صراحت اس ارشاد میں ہے " کنتم خیر امۃ اخرجت للناس" (الآیہ) (تم ایک بہتر امت ہو جو سارے انسانوں (کی اصلاح) کے لیے وجود میں لائی گئی ہے)۔ ان لفظوں میں صاف نظر آ جاتا ہے کہ یہ امت صرف اس طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں، بلکہ ایسی امت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے، اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ امت مسلمہ کی اصل قدر و قیمت بھی اسی "شہادت" پر موقوف ہے۔ وہ "امت وسط" اور "خیرامت" فی الواقع اسی وقت تک ہے جب تک کہ دنیا کے سامنے حق کی گواہ بن کر کھڑی رہتی ہے، ورنہ ان خطابات کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی۔ کیوں کہ اس کا یہ نام صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی اسلامی ذمہ داریاں دوسری امتوں کے مقابلے میں دوہری تھیں۔ سورۂ حج کے الفاظ قابل غور ہیں:

> " اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستے کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام " مسلم " رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے (دین حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے شاہد بنو۔ (الحج ۷۸)

اس آیت میں جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ امت مسلمہ کا نام اور مقام کیا ہے وہیں اسے اور ساری دنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اس نام اور کام کی وجہ اس کا وہ مشن ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے۔ اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً " امت مسلمہ " ہے اور اس سلسلے میں وہ خدا کے حضور جواب دہ بھی ہوگی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک مسلمان

Marfat.com

کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دھی کرنی ہوگی وھیں پوری امت کو ایک امت کی حیثیت سے اپنی اجتماعی جواب دھی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ کوئی معمولی جواب دھی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح کی انبیا علیہم السلام کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی۔ کیوں کہ اگرچہ امت مسلمہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے :

فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ۝

پس ہم ضرور حساب لیں گے ان لوگوں سے جن کے
پاس پیغمبر بھیجے گئے اور ان پیغمبروں سے بھی
حساب لیں گے۔ (الاعراف۔ ٦)

شہادت حق

اسلام کی یہ شہادت کیا چیز ہے؟ اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے جو یہاں پہنچ کر لازماً پیدا ہوتا ہے۔ اور جس کا جواب ملنا خود اسلام کو سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

اس سلسلے میں اصولی طور پر اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح اسلام اور دین حق ایک متعین چیز ہے اسی دین حق کی اس شہادت کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے۔ اور یہ تعین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔

"شہادت" یا گواہی عرف عام میں اس بات کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعے یا کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہو دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتا دے۔ اس لیے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر اسلام کو جیسا کچھ وہ ہے، پوری طرح واضح کر دیا جائے۔ اب رہا قرآن کا اصطلاحی مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت اور بلندی آ گئی ہے جس کی وضاحت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوہ کی روشنی میں یہ ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(۱) قولی شہادت : قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقاید سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک پوری دنیا کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور

Marfat.com

عبارات میں پیش کیے جائیں ، یہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے بالکل کھلی کتاب بن جائے اور غیر مسلموں کے سامنے ان کے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہ جائے ۔

لیکن اس کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں :

(۱) اسلام کے بنیادی عقاید پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید ، رسالت ، آخرت وغیرہ پر جس زور و قوت کے ساتھ اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں ، اس کا اتباع بنیادی ضرورت ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام کے احکام اور ان کی تفصیل پیش کی جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے ۔

(۲) غیر اسلام پر سنجیدہ اور مدلل تنقید کی جائے ۔ اس تنقید کے لیے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر مسلم دنیا پیروی کر رہی ہے ، اور جو اس وقت کے مذہب ، تہذیب ، اور فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں ۔ اس کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کیے ہوئے عملی نتائج کو بھی بتایا جائے جنھیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا ۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید شہادت اسلام کی راہ کا ایک نا گزیر مرحلہ ہے ۔

(۳) اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دل نشیں اور جدید ترین انداز میں انجام دیا جائے ۔ اس زبان میں ہو جس سے وقت کا انسان مانوس ہے ، اس طرز کا ہو جو آج کل کے ذہنوں کو اپنی طرف مائل کر سکے ، اس طریقے کا ہو جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیوں کہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں ہے بلکہ دین حق کی تبلیغ اور توضیح کی خاطر ہے ۔ قرآن نے بھی اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان ، انداز ، اسلوب اور طرز استدلال انتہائی مناسب ، مانوس ، معیاری اور واضح اختیار کیا ہے جو مخاطب کے لیے سب سے زیادہ موثر ہے ۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حق کی دعوت دینے کے بارے میں یہ ہدایت کی تھی کہ دنیا کو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور ضرورت کے وقت بہترین انداز سے بحث و مباحثہ کرو ۔ (اُدع الیٰ سبیل ربک بالحکمۃ و الموعظۃ الحسنۃ و جادلھم بالتی ھی احسن) ۔

(۴) اس تبلیغ و دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور، کوئی حریفانہ جذبہ، اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز کار فرما نہ ہو ۔ بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و اللہیت کے ساتھ نکلے ۔ اور محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر نکلے ۔

(ب) عملی شہادت : عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں ۔ ان میں توحید ، آخرت ، رسالت اور دوسرے عقاید پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق و آداب ، معیشت و معاشرت ، سیاست و معاملات غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ الٰہی نقشے کے مطابق تعمیر ہو ۔ " عملی شہادت " کا مرتبہ " قولی شہادت " سے مقدم ہے ۔ اس لیے جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی دعوت دے ، کیوں کہ نتیجے کے اعتبار سے بھی اس کی کوشش زیادہ بار آور نہ ہوگی ۔

اس سلسلے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسوۂ حسنہ کے متعلق کچھ عرض کرنا بالکل غیر ضروری ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب بھی ایمان کی دعوت دی تو اس حال میں کہ پہلے خود ایمان و ایقان کے پیکر بن چکے تھے اور جب دوسروں کو اللہ کا حکم سنایا تو اس طرح کہ سر مبارک اس کے آگے پہلے جھک چکا تھا ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ارشادات ، " انا اول المؤمنین" (میں سب سے پہلا ایمان لانے والا ہوں) اور " انا اول المسلمین " (میں سب سے پہلا اطاعت کرنے والا اور سر تسلیم خم کرنے والا ہوں) اس پر دلالت کرتے ہیں ۔

Marfat.com

*انسان کی ذہنیت ایسی ہے کہ وہ پست ، درماندہ اور محکوم اقوام کے طریقۂ زندگی ، فلسفہ اور دین کی طرف راغب نہیں ہوتا - لہذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ علمی اور اقتصادی میدانوں میں دوسروں کے پیچھے نہ رہ جائیں - اس وقت مسلمانوں کی درماندگی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ان میں جوش عمل اور محنت کی عادت کا فقدان ہے اور سہل انگاری ، کاہلی اور کم ہمتی ان کی خصلت میں شامل ہوگئی ہیں - جب تک مسلمان ان خرابیوں میں گرفتار رہیں گے نہ ان کا اخلاق معیار بلند ہوگا اور نہ دنیوی فلاح انہیں حاصل ہوگی ؛ وہ پست اور درماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بدنام رہے گا اور دوسری اقوام کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے گا ، بلکہ خود مسلمانوں کے ذہن اسلام سے ہٹ کر اور راستے تلاش کریں گے - یہ ایک ایسی لعنت ہے جس کے زہر آلود اثرات اس وقت بھی اسلامی معاشرے کو بربادی کی طرف لیے جا رہے ہیں - مسلمان اسلام کا شاہد اس وقت ہو سکتا ہے جب وہ اپنی کوشش ، ایثار ، اور محنت سے اپنے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے قابل ہو -

موانع اور ان کا سدباب

یہ دنیا خیر اور شر دونوں کا مسکن ہے - یہاں بھلائی اور برائی دونوں کی طاقتیں موجود ہیں - اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے - جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں - اور ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں - اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے - اور نہ صرف یہ کہ اس کے "شاہدوں" کی شہادت قبول نہ کی جائے بلکہ سرے سے اس شہادت کو برداشت بھی نہ کیا جائے ، جیسا کہ ہر دعوت کی تاریخ اور آئے دن کا مشاہدہ بتاتا ہے -

اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں امت مسلمہ کا رویہ کیا ہونا چاہیے ؟ اسلام اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے ، مسلسل اور آخری حد تک کی جائے - اس کوشش کو شریعت نے " جہاد فی سبیل اللہ " کا نام دیا ہے - جہاد کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کی جائیں اور اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت لگا دی جائے -

* یہ پیرا گراف اضافہ ہے -

Marfat.com

اس لیے " راہ خدا " میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو انسان کے بس میں ہو - پوری قوتیں اس مقصد میں صرف کر دینے کا نام جہاد ہے -

جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کیا ہو، اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں - حالات کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں - اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے تین مختلف شکلیں مقرر کی ہیں یعنی (۱) داخلی جہاد؛ (۲) دعوتی اور فکری جہاد؛ (۳) مسلح جہاد -

۱- داخلی جہاد - داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھائیں ان کے خلاف جدوجہد کی جائے - اور برائیوں کو ختم کرکے نیکیوں کو پروان چڑھایا جائے - کیوں کہ یہ اندر کی برائیاں شہادت اسلام کی راہ کی بڑی خطرناک رکاوٹ ہوتی ہیں - اس بارے میں نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے طویل ارشاد کا ایک حصہ یہ ہے - " پس جس نے ان (نافرمان؛ اللہ و رسول کے احکام کو پس پشت ڈالنے والوں) کے خلاف اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا وہ مومن ہے - اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے - اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے - اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہوتا" (مسلم بہ حوالہ مشکوٰۃ) - اس حدیث سے یہ دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں کہ

(ا) مسلم معاشرے کے اندر جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش " جہاد " ہے -

(ب) اس کوشش یا "جہاد" کی عملی صورتیں کیا کیا ہوسکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے؟ سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس برائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے، اور اپنے ہاتھوں سے اس کو ختم کر دیا جائے - لیکن، اگر اس کا اختیار یا اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر زبان سے اس کی برائی کو واضح کیا جائے - برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے - نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے،

Marfat.com

اللہ کی ناراضگی سے ڈرایا جائے ، اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجروتنبیہ بھی کی جائے ۔ لیکن اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو ایسا تو لازماً ہونا چاہیے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے ۔ وہ آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھتی رہے ۔ آرزو اور دعائیں کی جائیں کہ یہ برائی جلد سے جلد مٹ جائے ۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں ۔ اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں ۔ ان میں سے ہر شکل ''جہاد'' ہے ۔ کیوں کہ یہ حق کے قایم رہنے اور اسلام کی شہادت انجام پانے کی کوششوں کا ایک حصہ ہے ۔ اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام ''جہاد فی سبیل اللہ'' ہے ۔

پھر برائیوں کے مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے ٹھیک انہی کو بعض احادیث میں '' تغیر منکر '' سے اس طرح موسوم کیا گیا ہے '' تم میں سے جس شخص کو کوئی برائی (منکر) نظر آئے تو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے ۔ اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس کی بھی جراءت نہ رکھتا ہو تو یہ کوشش اپنے دل سے کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے ۔'' اور ان ہی کوششوں کو '' نہی عن المنکر '' کے پیرائے میں بھی ادا کیا گیا ہے ۔ چناں چہ سورہ لقمان میں ہے ۔ '' وأمر بالمعروف وانہ عن المنکر '' یعنی بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو ۔ ایک حدیث میں ہے :

ائتمروا بالمعروف و تنا ھوا عن المنکر	نیکی کی ایک دوسرے کو تلقین کرو اور برائی سے ایک دوسرے کو روکو ۔

یہ '' جہاد '' امت کا اجتماعی فریضہ ہے ۔ اس فریضے سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں اور نہ ریاست ، بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں سبھی شریک ہیں ۔ سورہ توبہ میں ہے :

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں ۔ وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں ۔ (التوبہ - ۷۱)

Marfat.com

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بھلائی (معروف) کا حکم دینا اور برائی (منکر) سے لوگوں کو باز رکھنا مسلمان کی کبھی نہ ختم ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایمان کی فطرت ہے۔ یہ اسلام کا خاصہ ہے۔ جہاں مسلمان ہوگا یہ کام بھی وہاں ضرور کیا جا رہا ہوگا۔ اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

مسلمان جب قوت و اقتدار کے مالک ہوں تو ان کی ذمہ داری یہ قرار دی گئی ہے، یا دوسرے لفظوں میں اسلامی ریاست کی خصوصیت یہ بیان کی گئی ہے، کہ

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قایم کریں گے، زکواۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔ (الحج - ۴۱)

گویا مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ برائی پنپے اسی طرح صاحب اقتدار ہوکر بھی وہ اسے برداشت نہیں کرے گا۔ بلکہ منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہوگا۔

۲۔ دعوتی اور فکری جہاد۔ دعوتی اور فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو پیش کیا جائے، جو اعتراضات اٹھائے جائیں، جو دلیلیں دی جائیں، ان کا مناسب جواب دیا جائے۔ اور کوئی شبہہ یا اعتراض یا دلیل رد کیے بغیر ایسی نہ چھوڑی جائے جو اسلام کے چہرے کا باریک سا بھی حجاب بن سکتی ہو۔ مکّی دور سراسر اس جہاد کا دور تھا، جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو حکم دے رکھا تھا:

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا

تم ان منکرین اسلام کا کہنا نہ مانو اور
قرآن کے ذریعے سے ان سے پورا پورا جہاد
کرتے رہو۔ (الفرقان - ۵۲)

قران کے ذریعے سے جہاد کا مطلب غالباً یہی ہو سکتا ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی دلیلوں کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچائی کو اور

Marfat.com

ان کے وجوہ انکار کی بے وقتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں ۔ اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری برابر عیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے ۔ یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بنی معقول بات نہ رہ جائے اور ہر طرف سے گھیر کر ان کے منہ بند ہو جائیں ۔

نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بھی اس کام کو ''زبان کا جہاد'' ہی فرمایا ہے ۔ چناں چہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ارشاد ہے :

جاھدوا المشرکین باموالکم و انفسکم و السنتکم (ابو داؤد)

مشرکوں سے اپنے مالوں ، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعے سے جہاد کرو ۔

اس طرح دعوتی اور فکری جہاد در اصل عقل و استدلال کے اسلحہ سے لڑنے کا نام ہے ۔ اور یہ لڑائی اس وقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلالی قلعے مسمار نہ ہو جائیں ، چاہے وہ کسی قسم کے ہوں ۔ چناں چہ قرآن پاک نے عربوں کی ایک ایک دلیل اور ان کے اٹھائے ہوئے ایک ایک اعتراض کے جس طرح پرخچے اڑائے وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں ، اس کا جال معلوم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے ان فیصلہ کن الفاظ کو سن لینا کافی ہے جس کا اس سلسلے میں اعلان فرما رکھا تھا :

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ؕ

اے محمد ! یہ لوگ تمہارے سامنے جو انوکھے سے انوکھا اعتراض بھی لے کر آئیں گے ہم اس کے جواب میں تمہیں ٹھیک بات اور بہترین وضاحت والی دلیل ضرور بتادیں گے ۔ (الفرقان ۔ ۳۳)

پھر یہ فکری اور استدلالی لڑائی جس انداز سے لڑنا چاہیے اس کے لیے قرآن نے یہ اصولی ہدایت دی ہے کہ '' بحث و مباحثے کا وہ طریقہ اختیار کرو جو سب سے اچھا ہو '' (و جادلھم بالتی ھی احسن) ، یعنی یہ کہ وہ خیرخواہانہ ، دل نشین ، اور مدلل ہو جس میں مخاطب کے ذہن ، عقل و فہم ، اور نفسیات کی رعایت رکھی گئی ہو ۔ پھر اس جہاد کی ایک لازمی شرط '' صبر و استقلال '' ہے تاکہ داعی طعن و تشنیع ، سخت کلامی ، دل آزاری ، ایذا رسانی اور مخالفتوں کے طوفان میں عالی ظرفی ، حق پسندی، دل سوزی ، معقولیت اور سنجیدگی کا ثبوت

Marfat.com

دے ۔ صحابہؓ کرام رضؓ تک کو اللہ تعالیٰ نے خبردار کیا تھا :

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا ۚ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

اور تمہیں اہل کتاب کی طرف سے بھی اور مشرکوں کی طرف سے بھی بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی ۔ اگر ایسے وقت تم نے صبر سے کام لیا اور تقویٰ کی روش پر جمے رہے تو بلا شبہہ یہ بڑے حوصلے کی بات ہوگی ۔ (آل عمران ۔ ۱۸۶)

لیکن اس کا مطلب پست ہمتی ، حق سے اعراض اور مصالحت کا خیال ہرگز نہ سمجھنا چاہیے :

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ

جس بات کا تمہیں حکم دیا گیا ہے
اسے واشگاف طور سے سنا دو اور مشرکوں
کی پرواہ نہ کرو ۔ (الحجر ۔ ۹۴)

۳ ۔ مسلح جہاد ۔ اس کی تیسری شکل مسلح جہاد ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے ، اور اس وقت تک کی جائے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے ۔ یہ جہاد کی آخری اور افضل ترین شکل ہے کیوں کہ مسلمان اس میں اپنا مال ، وقت ، صلاحیت اور بالآخر اپنی جان خدا کی راہ میں صرف کر دیتا ہے ۔ عملی طور پر یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے ، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلامی ریاست موجود ہو ۔ اور تاریخ کا ہر طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ ریاست اور نظام اجتماعی کے تحفظ کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے ، جیسا کہ (مسلح) جہاد کا حکم دیتے ہوئے واضح کر دیا گیا تھا :

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ

مسلمانو ! تم پر لڑائی فرض کر دی گئی ہے اگرچہ وہ تم کو ناگوار محسوس ہورہی ہو ۔ لیکن ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور فی الواقع وہ تمہارے حق میں بہتر ہو ۔ (البقرہ ۔ ۲۱۶)

یہ قتال اور یہ جہاد اسلام کے حق میں " بہتر " کس طرح ہے ؟ اس کی وضاحت اُن آیتوں میں ملے گی جہاں جہاد کی غرض و غایت بتائی گئی ہے ۔ مثلاً " وقاتلوا ھم حتی لاتکون فتنہ و یکون الدین اللہ " (اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ و فساد باقی نہ رہ جائے اور دین (اطاعت) اللہ کے لیے ہوجائے) ۔ یعنی جنگ کا

Marfat.com

حکم اس لیے دیا گیا ہے تا کہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے اور " فتنے "کی حالت ختم ہو جائے ۔ " فتنہ " قرآن کا اصطلاحی لفظ ہے ۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اسلام کی پیروی کا حق نہ دیا جائے اور انہیں اپنے معبود حقیقی کی بندگی سے روکا جائے ۔ ظاہر ہے یہ ایک ایسا ظلم ہے جس سے بڑا اور کوئی ظلم نہیں ہو سکتا ، حتیٰ کہ خون ناحق کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں ۔ کیوں کہ اگر کسی کی جان لی جائے گی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسے دنیا کی چند روزہ بہار سے محروم کر دیا گیا لیکن اگر کسی سے اس کی " خدا پرستی " لے لی گئی اور اپنے رب کا بندہ بننے سے اس کو روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی تباہ کردی گئی ، اور اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے محروم کردیا گیا ۔ بلا شبہہ دونوں ہی چیزیں نا پسندیدہ ہیں ، لیکن جب دونوں میں سے ایک کا انتخاب ضروری ہو تو ایک احمق بھی پہلی کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کرے گا ۔ اسی لیے قرآن اس کی تصدیق اس طرح کرتا ہے ۔ " والفتنہ اشد من القتل " (فتنہ قتل سے بھی زیادہ (بڑی) چیز ہے) ۔ ایک اور آیت مسلح جہاد کی ضرورت پر منفی پہلو سے روشنی ڈالتی ہے :

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ

اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعضوں کے ذریعے سے دفع نہ کیا کرتا تو ڈھا دیے جاتے صومعے اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے ۔ اور اللہ ان لوگوں کی ضرور مدد کرتا ہے جو اس (کے دین) کی مدد کرتے ہیں (الحج ۔ ۴۰)

اس آیت سے اور زیادہ واضح ہو گیا کہ اگر دین کی حفاظت کی خاطر تلوار نہ اٹھائی جائے اور "فتنہ" کی جڑ نہ کاٹ دی جائے تو خود دین کی جڑ کٹ جائے گی ۔ فتنہ پسند عناصر خدا کی زمین کو فساد سے بھر دیں گے اور خود خدا کا نام لینا دو بھر کر دیں گے اور خدا پرستی کے ایک ایک نشان کو مٹا کر دم لیں گے ۔ اس لیے دین کی بقا اور تحفظ کے لیے مسلح جہاد کی ضرورت ناگزیر ہے ۔

* لیکن یہاں اس بات کی وضاحت بے محل نہ ہوگی کہ اسلام تبلیغ دین

• اضافہ از مرتب ۔

Marfat.com

کے لیے قوت کے استعمال کو ممنوع قرار دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ

دین کے معاملے میں زبردستی نہیں - (البقرہ - ۲۵۶)

مسلح جہاد کی اجازت جن مقاصد کے لیے ہے وہ یہ ہیں ۔

(۱) دفاعی : یعنی جب دوسرا آپ پر حملہ کرے تو دین اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لیے تلوار استعمال کی جائے ۔

(ب) دفع فتنہ: یعنی جب انسانوں پر ظلم کیا جائے اور دعوت دین کے دستوری اور قانونی راستے بند کر دیے جائیں اور خدا کے بندوں کو انسانوں کی غلامی میں جکڑ لیا جائے تو شر اور فتنے کا مقابلہ کرنے کے لیے اور منکر کے تسلط کو توڑنے کے لیے قوت استعمال کی جائے۔

اسلام طاغوت کے بت کو توڑنے کے لیے تو قوت استعمال کرتا ہے لیکن کسی انسان یا گروہ کو جبریہ مسلمان بنانے کی کلی مخالفت کرتا ہے ۔ ہر شخص کے سامنے دین کی دعوت پیش کر دی جائے ۔ حق کو باطل سے ممتاز کر دیا جائے اور پھر آخری فیصلہ اس کے ضمیر پر چھوڑ دیا جائے ۔ اسے حق ہے کہ جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ ہمارا فرض طاغوت کے پھیلائے ہوئے جالوں کو توڑنا ، ظلم کے بندھنوں کو کاٹنا اور حق کی دعوت پہنچا دینا ہے ۔ پھر اگر کوئی اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو وہ امت مسلمہ کا جزو ہے اور اگر قبول نہیں کرتا تو اسے اس کا بھی پورا پورا اختیار ہے ؛ اور اگر وہ اسلامی ریاست اور مسلم معاشرے میں رہتا ہے تو اس کا مال اور اس کی جان ہمارے لیے اتنی ہی محترم ہیں جتنی کسی مسلمان کی ۔ ہماری ذمہ داری حق کی دعوت پہنچا دینے کی ہے ۔ اور اگر ہم یہ فرض ٹھیک ٹھاک ادا کر دیتے ہیں تو ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں گے ۔ لیکن ، اگر ہم دین کی دعوت دنیا کے سامنے پیش کرنے میں کوتاہی کرتے ہیں تو ہم سے لازماً باز پرس ہوگی ۔

Marfat.com

مزید مطالعے کے لیے

مولانا محمد منظور نعمانی ، **دین و شریعت** ' صفحات ۱۹۹ - ۲۳۲ - مکتبہ الفرقان ، لکھنؤ -

مولانا صدرالدین اصلاحی ' **اسلام ایک نظر میں** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

مولانا صدرالدین اصلاحی ، **فریضۂ اقامت دین** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ، **شہادت حق** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور -

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ' **الجہاد فی الاسلام** - اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ، لاہور -

مولانا ابوالکلام آزاد ' **امر بالمعروف و نہی عن المنکر** - لاہور -

Marfat.com

اشاریہ

آخرت — تصور اسلامی ، ۲۵۹

آدم علیہ السلام ، ٦٦ ، ۱۳۳ ، ۲۱٦ ، ۲۲۱ ، ۲۸۰

آرتھر کیتھ ، ۱۹۲

آرنلڈ ، میتھیو ، ۵۰

آریا ، ۵۳

آزاد ، غلام علی بلگرامی ، ۴۳۳

آزادی، اجتماع ، ۴۹۲-۴۹۳

آزادی — نقل و حرکت ، ۴۹۲-۴۹۳

آمنہ (حضرت) ، ۲٦۹

آئیڈیولوجی ، ۴

ابراہیم علیہ السلام ، ۴۹ ، ٦٦ ، ۸۰ ، ۲۵۷ ، ۲۵۸ ، ۲۷۱ ، ۳۳۰ ، ۳۳۲ ، ۵۰۵

ابلیس ، ۱۳۴

ابن جریر ، ۴۷۰

ابن حزم ، ۳٦۰ ، ۴۷۳ ، ۴۹۸

ابن شہاب زہری ، ۳۷۷

ابن عباس ، ۲۷٦ ، ۳۷۴ ، ۳۷۵

ابن قیم ، ۴۹۸

ابن کثیر ، ۴۷۰

ابن مسعود ، ۲٦۲ ، ۳۷۹

ابوبکر (حضرت) ، ۲۷۸ ، ۳٦۰ ، ۳۸۰

ابوجہل ، ۲۵۴ ، ۲۵٦

ابوذر (حضرت) ، ۲۷٦

ابو سفیان ، ۴۷۹

ابو طالب (حضرت) ، ۵۱۹

ابو لہب ، ۲۵۴

ابو موسیٰ اشعری ، ۳۷۹

ابوہریرہ ، ۳۷۹

ابو یوسف ، ۴۲۱ ، ۴۹۵

آپنشد ، ۵۴

اتباع رسول (صلعم) ، ۲۵۱-۲۵۲

اجتماع، تنظیم بندی اور نقل و حرکت کی آزادی ، ۴۹۲-۴۹۳

اجتہاد ، ۳۸۰

اچھوت ، ۵۴

احترام روایات ، ۴۱۸

احرام ، ۳۳۰

احساس بندگی و روزہ ، ۳۱۵ ، ۳۱۹

احسان ، ۳۹٦ ، ۳۹۷

اخلاق — اہل تجارت ، ۴۵۹

اخلاق — نظریہ اسلامی ، ۳۸۷

ارتکاز دولت کی ممانعت ، ۴٦۰

ارسطو ، ۳۴

اسپی نوزا ، ۲۹

اسحاق (علیہ السلام) ، ۲۲۱

اسرائیل ، ۸۲

اسکاٹ ، چارلس اینڈرسن ، ٦۵

اسلام ، ۳-۴ ، ۱۰ — اصلاحی اور انقلابی تحریک ، ۱٦۲-۱٦۳ — الہامی نظام ، ۱۵۰-۱۵۲ — امتیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا ، ۵۲۴ — اور تھیا کریسی، ۴۸۳ — اور زندگی کے بنیادی مسائل ، ۲۷-۳۱ — اور جمہوریت ، ۴۹۳ — پسندیدہ صفات ، ۳۹۴ — تصور خدا ، ۲۰۸-۲۱۱ — تصور دین ، ۵۱۴ — تصور کائنات ، ۱۲۸-۱۳۰ — تمدن ، ۲۹ — سادہ اور عقلی مذہب ، ۱۵۹ — عقائد ، ۱٦٦-۱٦۹ — عقیدہ آخرت ، ۲۹۱ — نصب العین، ۱۴۵ — نظام حیات، ۱۵۰ — نظریہ اخلاق ، ۳۸٦ — نظریہ انفرادی و اجتماعی زندگی ، ۱۳۸ —

Marfat.com

نظریہٴ حیات ، ۱۵۰-۱۶۳ — نظریہ کا عقلی مقام ، ۱۳۷ — نظریہ تعلیم ، ۴۲۰ — معاشی اصول، ۱۵۲ — دنیوی برکتیں ، ۵۱۷ — مکمل ضابطہٴ زندگی ، ۱۵۲ — میں عقیدہ کا مقام ، ۱۶۶ — میں شخصی آزادی ، ۳۹۱
اسلامی تصور آخرت ، ۲۸۳ — تصور عبادت ، ۳۰۱-۳۰۸ — تصور قومیت ، ۵۰۳ — تہذیب کی خصوصیات ، ۱۷۷ — تہذیب کے قیام میں ایمانیات کا حصہ ، ۱۷۵
اسلامی ثقافت — روح ، ۱-۲
اسلامی ریاست — خصوصیات ، ۴۷۴
اسلامی نظریہ حیات — تعریف ، ۴-۵
اسلامی نظریہ کا علمی مقام ، ۱۱۱
اسماء الرجال ، ۲۶۱، ۳۳۶
اسماعیل علیہ السلام ، ۲۲۱، ۲۵۸، ۳۳۰، ۳۳۳
اسوہٴ محمدی ، ۲۳۷-۲۳۸ — تاریخی پہلو، ۲۶۱ — کی جامعیت، ۲۶۸ — عالمگیر اور دائمی نمونے ، ۲۵۶
اشتراکیت ، ۸۲، ۸۸، ۸۹، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۱۵۰، ۴۸۰، ۴۹۳-۴۹۴ — تصور ریاست، ۹۶ — فلسفہٴ حیات ، ۸۹
اشراق ، ۳۱-۳۲
اشراقی تمدن ، ۲۶-۲۷
اشوکا (راجہ)، ۵۷ ، ۲۵۵
اصول فقہ ، ۳۴۹، ۳۸۲
اصولی و نظریاتی ریاست ، ۴۷۴
اطاعت رسول (صلعم)، ۲۵۰ ، ۲۵۷
افریقہ ، ۵۰۴
افغانستان ، ۲۵۷
افلاطون ، ۴۴ ، ۲۵۴ ، ۴۲۰
اقبال ، ۴۲۵ ، ۴۲۸
اقلیدس ، ۱۶۵
"الاحکام فی اصول الاحکام" ، ۳۸۰
العفو ، ۳۶۲
"الفصل بین المال و النحل" ، ۳۶۰
الموافقات ، ۳۸۱
الوہیت ، ۱۸۵، ۱۸۶، ۲۲۲
الہ آباد ، ۴۴۳
الہامی تمدن ، ۲۹
الہامی نظام ، ۱۵۰-۱۵۲
الیگزانڈر ہملٹن ، ۴۴۰
اُم سلمہ (حضرت) ، ۳۵۸
امام الحرمین ، ۳۳۶
امالت ، ۳۹۶
امت مسلمہ کی ذمہ داریاں ، ۵۳۰
امریکہ ، ۶۵، ۵۰۴
انبیا علیہم السلام ، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۳۱، ۲۴۵، ۲۵۵ — خصوصیات ، ۲۰۱ ، ۲۲۱ ، ۲۲۶ — ضرورت، ۲۱۷، ۲۲۱ — مقصد بعثت ، ۱-۲
انجیل ، ۶۸، ۲۶۰
انس بن مالک ، ۳۷۹
انسان کا نصب العین ، ۱۴۳، ۱۴۴
انسانی زندگی ، ۲۸
انصار ، ۳۷۸
انصاف ، بے لاگ اور بے معاوضہ ، ۴۹۲
انفاق ، ۳۶۱
انفرادیت اور اجتماعیت میں توازن، ۱۵۶، ۴۳۰
اودھ (صوبہ)، ۴۴۲
اورنگ زیب عالمگیر ، ۴۳۸
اہنسا ، ۲۹۰
اٹرنے ، پروفیسر، ۸۰
ایران ، ۶۸، ۱۴۲، ۲۵۴، ۲۵۶
ایشیائے وسطی ، ۲۵۷
ایمان ، ۱۲۳، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۷۰ — ۱۷۴، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۸۰، ۱۸۳، ۱۸۵، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۸، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۱
ایمانیات ، ۱۶۹، ۱۷۵، ۱۷۹، ۱۸۰
ایمانیات ، بنیادی — اور عقل، ۱۶۹

Marfat.com

ایوب علیہ السلام ، ۲۷۱
ایوجین گائی ، چارلس ، ۱۹۳

بابل، ۶۸-۶۹
باسورتھ اسمتھ ، ۲۶۵، ۳۷۷
باہمی رضامندی ، ۳۵۸
بحرقلزم ، ۳۶۰
بحرین ، ۳۶۰
بخت نصر ، ۶۸
بدر، ۵۰۱
بدھا (بودھ) ، بدھ مت ، ۵۰ ، ۵۲ ، ۵۵ ، ۵۸، ۶۷، ۶۹، ۱۰۳، ۱۳۸، ۲۵۵، ۲۵۶
برما ، ۵۵، ۵۸
برنی ، ضیاء الدین ، ۴۳۰
برونو ، ۷۴
برھما ، ۵۵، ۵۶، ۵۷
برھمن، ۵۵
بصرہ ، ۲۶۹
بغداد ، ۴۳۶
بریفالٹ ، رابرٹ ، ۴۸۵
بشریت انبیا ، ۲۸۲
بطلیموس ، ۳۸، ۴۰
بلال (حضرت) ، ۹۵
بلبن ، ۴۳۲
بنو امیہ ، ۴۳۷
بنی اسرائیل ، ۵۸، ۵۹، ۲۲۶، ۲۴۴
بنی صفرہ ، ۳۷۸
بنی فزارہ ، ۳۷۸
بنی نضیر ، ۳۶۶، ۳۷۰
بہادر شاہ ظفر ، ۴۳۷
بہار (بردوان) ، ۴۴۴
بہمنی ، ۴۳۲
بھوٹان ، ۵۸

پاکستان ، ۱۷۰، ۲۸۶، ۴۷۲، ۵۰۸
پاسٹیور ، ۳۷
پانک ، روانسٹون ، ۴۸۴
پروٹسٹنٹ ، ۶۵
پوپ ، ۶۳، ۶۷

تاریخ کی مادی تعبیر (مارکسی) ، ۹۰
تاریخیت ، ۲۵۷
تبت ، ۴۸۴
تجارت — جائز و مباح ، ۴۵۸
تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ ، ۴۵۷
ترکستان ، ۲۸۵
تزکیۂ نفس ، ۳۱۰، ۳۲۳
تعلیم ، ۴۲۱ - ۴۲۴
تعلیم ، بے عقیدہ — نتائج ، ۴۲۴ — تاریخی روایت ، ۴۲۴ - ۴۲۷ — تعمیر کردار ، ۴۳۲ — تکمیل حیات ، ۴۳۳ — مقصد ۴۲۸ ؛ اسلامی اصول ، ۴۲۷
تعلیمی ارتقا — بر عظیم ، ۴۳۷-۴۴۴
تعمیر سیرت ، ۳۰۹، ۳۱۶
تعمیر کردار اور تعلیم ، ۴۳۲
تقویٰ ، ۳۹۸
تکمیل حیات ، ۴۳۳
تمیم داری ، ۳۷۸
تمدن ، اشراقی ، ۲۶ - ۲۷ — الہامی ، ۲۴ - ۳۰ — انقلاب انگیز اثرات ، ۱۸ — حسی ، ۲۴-۲۷ — عقلی ، ۲۶
تناسخ ، ۲۸۹-۲۹۰
”تنزیہ الفرقان“ ، ۳۵۹
توحید ، ۶۶، ۱۵۹، ۱۸۳، ۱۸۷، ۲۱۷، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۲۳، ۲۶۰ — اثرات انفرادی و اجتماعی ، ۲۱۱ ، ۲۱۵ ، — دلائل، ۲۰۱
توراۃ ، ۶۰، ۶۷، ۲۶۰
تہذیب ، ۷۲، ۱۶۹ ، ۱۷۰ ، ۱۷۷ - ۱۸۱ — اسلامی ، ۱۷۷-۱۸۱ — ایمانیات ، ۱۷۵

Marfat.com

ٹائن بی، آرنلڈ جے، ۱۰۱، ۳۸۱
ٹھٹھہ ، ۳۳۰
ٹیلر ، ای - بی ، ۵۰

جابر بن عبداللہ ، ۳۷۹
جاپان ، ۹۹، ۳۸۳
"جان جہاں" (تاریخ) ، ۳۳۲
جان ڈیوی ، ۳۲۳
جان و مال اور ناموس کی حفاظت ، ۳۹۰
جائز و مباح کی تجارت ، ۳۵۸
جبرئیل (علیہ السلام) ، ۳۵۸
جذبۂ قوم پرستی ، ۸۰
جرمنی ، ۸۰، ۹۳، ۹۹
جزیرہ ، ۳۶۱
جمرات ، ۳۳۱، ۳۳۳
جمہوریہ ، ۳۲۰
جوا اور سٹہ وغیرہ کی ممانعت ، ۳۵۹
جہاد ، ۶۷ — داخلی، ۵۳۷ — دعوتی اور فکری ۵۳۹ — مسلح ، ۵۳۱
جوڈ ، پروفیسر ، ۱۹۱
جہانگیر ، ۳۳۲
جہینہ ، قبیلہ ، ۲۷۸
جین مذھب ، ۲۵۹
جینز ، سر جیمس ، ۱۸۹، ۱۹۱
چین ، ۵۸، ۸۷، ۲۵۷، ۳۳۲، ۳۳۱

حاکمیت اعلیٰ ، ۳۹۳
حاکمیت جمہور ، ۷۸
حج ، ۶۷، ۳۲۹-۳۳۳ — مراسم ، ۳۳۰ — شان جامعیت ، ۳۳۳
حجراسود ، ۲۷۰، ۳۳۲
حجیت حدیث و سنت ، ۳۶۲ — اندرونی شہادت، ۳۶۳ — خارجی شہادت، ۳۶۵
حدود و تعزیرات ، ۳۱۹
حدیث، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۴، ۳۷۷، ۴۰۹ —

کتابت ، حفاظت ، تدوین ، ۳۷۵
حرام ، ۳۳۷
حرص ، ۳۹۹
حرمت سود ، ۳۵۶
حسن، امام (حضرت) ، ۲۷۰
حسن (بصری) ، ۳۷۰
حسین ، امام (حضرت) ، ۲۷۰
حق سوئی زکواۃ ، ۳۶۲
حقوق العباد ، ۳۹۷
حقوق اللہ ، ۳۹۷
حقوق و فرائض ، ۳۷۸
حقیقت کائنات ، ۲۸
حلال و حرام کی تمیز ، ۳۵۵
حلیمہ سعدیہ ، ۲۶۹
حمزہ (حضرت) ، ۲۷۹
حمورابی ، ۲۵۶
حواس، ۱۸، ۱۹، ۲۳
حیرہ ، ۳۹۸
حیوانی ازدواج کا نظریہ ، ۸۱

خاتم النبین ، ۲۳۳
خالد بن سعید ، ۳۵۸
خالد بن ولید ، ۳۹۸
خاندان ، ۳۱۶
ختم نبوت ، ۲۳۳، ۲۳۶
خدیجہ (حضرت) ، ۲۷۰، ۲۷۵
خطیب بغدادی ، ۳۸۹
خلیفۃ اللہ ، انسان بہ حیثیت ، ۱۳۳-۱۳۷
خیبر ، ۲۶۹، ۳۳۷
خیر خواہانہ فضا ، ۳۱۴

دارا ، ۲۵۳
داؤد علیہ السلام ، ۶۱، ۱۷۱، ۲۶۹
دروغ گوئی ، ۴۰۰
دعوت اسلام ، ۱
دور نبوی میں تعلیمی روایت ، ۳۳۳ —
ادوار مابعد میں تعلیمی روایت ، ۳۳۵

Marfat.com

دھرم شاستر ، ۲۵۶
دھلی ، ۳۳۹، ۳۴۰
دیانت ، ۳۵۸
دین — تعریف، ۲ — قرآن کی زبان میں، ۲-۳
— نصرت ، ۳۲۵ — مفہوم ، ۲
دین و دنیا کی وحدت ، اسلام میں ، ۱۵۳
دیو جانس کلبی ، ۲۵۳

ڈارون ، ۳۷، ۸۳، ۸۴، ۱۹۴، ۱۹۵
ڈوسر ، ای۔ڈی، ۳۳۸
"ڈیلی گزٹ"، ۹۸
ڈیمنٹ ، پروفیسر ، ۳۴۷
ڈیون پوٹ ، جان ، ۲۶۳

ذخیرہ اندوزی کی ممانعت، ۳۵۸
ذرائع علم ، ۱۸-۲۴
ذمہ داری کا تصور ، ۳۱۵

راڈویل، ڈاکٹر، ۳۶۰
راک فیلر ، ۳۲۶
رام ، ۵۵
رائے اور مسلک کی آزادی ، ۳۹۱
رسالت ، ۶۶، ۱۵۹، ۱۷۲، ۱۷۶، ۲۱۷،
۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵،
۲۲۸، ۲۴۴
رسل، الفرڈ دلاس، ۱۹۵
رسول کی اطاعت ، ۲۵۰-۲۵۱
رشتہ نکاح ، ۳۱۴
رمضان ، ۳۲۰
رواداری ، ۳۹۶
روح ، اسلامی ثقافت ، ۱
روح القدس ، ۶۴
روزہ ، ۳۱۴-۳۲۱ — اجتماعی اثرات ، ۳۱۹
— اجتماعی فوائد، ۳۱۹-۳۲۰ — احساس
بندگی ، ۳۱۵ — اطاعت امر ، ۳۱۵
۳۱۶ — امداد باھمی کی روح ، ۳۲۱
— تعمیر سیرت ، ۳۱۶-۳۱۷ — تقوی
اور پاکیزگی، ۳۲۰ — جماعتی احساس
۳۲۰-۳۲۱ — ضبط نفس، ۳۱۷-۳۱۸
روس ، ۸۲، ۸۷، ۹۴، ۹۸، ۹۹
روسو ، ۶۸
روم ، ۵۴، ۲۵۴، ۲۵۶، ۳۸۵
رھبانیت ، ۱۵۴، ۲۹۰
ریاست — اصولی و نظریاتی ، ۴۷۴ — تصور
اشتراکیت ، ۹۶ — نظریہ ، ۸-۱۰

زرتشت ، ۲۵۷
زکریا علیہ السلام ، ۲۵۸
زکواۃ — ۶۷، ۳۲۱، ۳۲۹، ۳۶۰ — امداد
باھمی ، ۳۲۴ — معاشی نقطہ نظر، ۳۲۷
— مقاصد ، ۳۲۳ — کی مقدار، ۳۲۵ — کے
مصارف ، ۳۲۶
زندگی اور عقیدہ آخرت ، ۱۵۸، ۲۸۶،
۳۹۹
زندگی کی وحدت ، ۸
زندگی کے بنیادی مسائل اور اسلام ، ۲۷-۳۱
زھری ، ابن شہاب ، ۳۷۷
زید بن ثابت ، ۳۵۸

سادہ اور عقلی مذھب ، ۱۵۹
ساروکن، پروفیسر ، ۱۰۱
سائبیریا ، ۹۹
سائرس ، ۶۸
سچائی اور راست بازی ، ۳۹۵
سراقہ بن مالک ، ۳۷۸
سرمایہ دار ؛ سرمایہ داری ، ۹۶
سعد بن ربیع ، ۳۷۹
سعد بن عبادہ ، ۳۷۹
سقراط ، ۲۵۴
سلجوقیہ ، ۴۳۶
سنت ، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵،

Marfat.com

۳۶۷، ۳۶۸، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲،
۳۷۳، ۳۷۴ — تعریف و معنی، ۳۶۱
سکندر، ۲۵۴
سلمان بن قیس، ۳۷۹
سلیمان علیہ السلام، ۵۹، ۶۱، ۲۷۱، ۳۶۹
سمرہ بن جندب، ۳۷۹
سولن، ۲۵۵
سولیون، پروفیسر، ۱۹۰
سومنات، ۴۳۷
سیام، ۵۸
سید محمد، علامہ، ۳۵۱
سیکولرزم، ۴۸۲
سیلون، ۵۸
سینا، کوہ، ۶۰

شاطبی، امام، ۳۸۱
شافعی، امام، ۳۷۱
شام، ۱۴۲، ۲۷۷
شاہ جہاں، ۴۴۳
شبلی نعمانی، ۴۹۹
شخصی آزادی اور اسلام، ۴۹۱
شرق اردن، ۶۵
شرک اور کفر، ۲۱۲، ۲۱۵
شریعت، ۴۴۴، ۴۴۷ — اسلامی کے ماخذ،
۳۴۹ — کا مقصد اور اسکی ہمہ گیری،
۳۴۵ — محمدیہ — ۳۴۶ — معنی و
مفہوم، ۳۴۳
شمیٹ، پروفیسر، ۵۲
شودر، ۵۳، ۵۴
شورائی اور جمہوری ریاست، ۴۸۶
شہادت حق، ۵۳۳
شیوا، ۵۵

صالح علیہ السلام، ۳۵۸
صالح، ملا، ۴۳۸
صبح الاعشیٰ، ۴۳۹

صبر، ۳۹۴
صحابہ، ۳۷۱، ۳۷۵، ۳۷۷
صحاح ستہ، ۳۷۰، ۳۸۰
صدرالدین، منشی، ۴۴۳
صدقات واجبہ، ۴۶۱
صفا، ۳۳۳
صفات خدا، ۳۹، ۴۲
صفات مذمومہ، ۳۹۸
صفہ، ۴۴۳
صیغۂ زکوٰۃ کے کارکن، ۳۲۶

ضبط نفس، اور روزہ، ۳۱۰ — اور نماز، ۳۱۷

طائف، ۳۶۰
طبری، ۳۶۱
طبقاتی نزاع، ۹۴
ظلم، ۴۰۰

عائشہ (حضرت)، ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۷۷، ۲۷۸،
۲۷۹
عبادات — تصور اسلامی، ۳۰۳-۳۰۸
عباس، ۲۷۹، ۲۸۰
عبدالعلی بحرالعلوم، ۴۴۴
عبداللہ ابن ربیعہ، ۳۷۹
عبداللہ بن عمرالعاص، ۳۷۹
عبداللہ (حضرت) بن مطلب، ۲۶۹
عثمان (حضرت)، ۹۵، ۳۶۱
عثمان بن مالک انصاری، ۳۷۹
عدل اجتماعی کی ضمانت، ۴۶۳
عدل و انصاف، ۳۹۵
عراق، ۴۶۳
عرب، ۱۵۹، ۲۷۳
عرفات، ۳۳۱
عروہ بن زبیر، ۳۷۹
عصمت انبیا، ۲۲۷
عفو و درگذر، ۳۹۶

Marfat.com

عقل ، ۱۲، ۱۹، ۲۳، ۱۷۱، ۱۷۲، ۲۰۱
عقل کی کسوٹی ، اور بنیادی ایمانیات ، ۱۶۹
عقلی تمدن ، ۲۶
عقیدۂ آخرت ، ۶۶، ۱۵۵، ۱۷۸، ۱۸۳، ۲۲۱، ۲۸۱، ۲۹۱ — زندگی پر اثرات ، ۲۹۹ — عقل کا فیصلہ ، ۲۹۱ — عقلی استدلال سے آگے ، ۲۹۵ — قرآنی استدلال ، ۲۹۷
عقیدۂ توحید اور اجتماعی زندگی ، ۲۱۵
علم (تصور) ، ۳۲۷
علم کے ذرائع ، ۱۸-۲۳
علم اخلاق ، ۳۳۵، ۳۸۶
علم کے ذرائع ، ۱۸ — علم کی وحدت اور ہم آہنگی ، ۳۳۱
علی (حضرت) ، ۳۷۹، ۳۶۳، ۳۸۹، ۳۹۲
علی گیلانی ، حکیم ، ۳۴۳
علمیت ، ۲۶۰
عمان ، ۳۶۰
عمر (حضرت) ، ۳۶۱
عمرو بن حزم ، ۵۰۱
عمرہ بنت عبدالرحمان ، ۳۷۹
عملی شہادت ، ۵۳۵
عیسائی ، عیسائیت ، ۵۱، ۵۲، ۵۸، ۵۹، ۶۱-۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۱۰۳، ۱۳۹، ۱۶۳، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۷۱، ۲۸۰

غالب ، ۱۹۶
غزالی ، امام ، ۳۴، ۳۵، ۳۰۹، ۳۳۶، ۳۵۳
غزنی ، ۳۳۶
غزوۂ احد ، ۲۷۹
غلام السیدین ، خواجہ ، ۳۲۸
غوری ، معزالدین ، ۳۳۷
غیبت ، ۳۰۱

فارس ، ۳۶۰، ۳۶۱
فارقلیط ، ۷۰
فاطمہ (حضرت)، ۲۷۰، ۲۷۷
فدک ، ۲۶۹
فرانس، ۹۵
فرشتہ ، ابوالقاسم ، ۳۳۶
فرض شناسی، ۳۰۸
فرعون، ۲۵۴، ۲۵۶
فریاد ، اعتراض اور تنقید کا حق ، ۳۹۲
فرینک ایڈیلوٹ ، ۳۲۵
فرینک ایلن ، ۱۹۳
فقراء ، ۳۲۶
فقہ ، اصول ، ۳۴۹ ، ۳۸۲ — اسلامی کے ماخذ ، ۳۴۹
فلسطین ، ۵۹، ۶۰، ۶۱
فلسفۂ تناسخ ، ۲۸۹
فلسفۂ مادیت ، ۷۷
فیروز تغلق ، ۳۴۲

قاسم بن محمد ، ۳۷۹
قانون ، ۳۵۴
قانون وراثت، ۳۶۱
قانونی مساوات ، ۵۲۲
قرآن ، تدوین ، جمع و ترتیب اور حفاظت ، ۳۵۴ — موضوعات ، مقصد اور انداز تخاطب، ۳۵۲ — قرآنی استدلال، ۲۷۳
قرابت ، ۱۷۴
قرض دار ، ۳۲۷
قرطاجنہ ، ۲۵۴
قریش ، ۲۴۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۶۴، ۲۶۶، ۲۷۸، ۲۷۹
قطب الدین ایبک ، ۳۳۷، ۳۴۲
قوت نافذہ ، ۳۹۰
قولی شہادت ، ۵۳۴
قیصر ، ۲۵۴، ۲۵۶، ۳۷۸

کاہن ، افریقہ، ۹۷

Marfat.com

کامل زندگی ، ۲٦۴
کائنات کی حقیقت ، ۲۸
کائنات و انسان ، ۱۲۷
کپل وستو ، ۵۵
کتابت، حفاظت اور تدوین حدیث ، ۳۷۵ ، ۳۸۰
کراچی ، ۲۸٦
کرشن ، ۵۵
کریوھنٹ ، آر۔این، ۳۸۰
کسریٰ ، ۲۵٦، ۳۷۸
کعبہ ، ۲۷۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳ — کعبہ کی اہمیت ، ۳۳۰
کنفیوشس ، ۲۵۸ — کنفیوشسی مت ، ۵۰
کوپرنیکس ، ۳۸، ۴۱، ٦۴
کومت ، آگست ، ۳۳، ۳۵، ۳٦
کیتھولک ، ٦۵
کیریل ، الیکسس ، ۸۱
کین ، ایچ۔جی ، ۳۴۲

گبن ، ۲٦۵
گلیلیو ، ٦۴، ۷۴
گوبلز ، ۸۷
گوتم بدھ ، دیکھیے بدھا

لاپلاس ، ۳۷، ۱۸۸
لادینیت ، ۷۸، ۳۰۷
لوتھر ، ٦۷
لاھور ، ۲۸٦
لوقا ، ٦۸
لی کامتے دونوائے ، ۱۹۰
لینڑ ، پروفیسر ، ۱۹۰
لیڈز ، جے۔بی ، ۱۹۴
ماخذ ، اسلامی نظام کے اخلاق ، ۳۸۹
— شریعت اسلامی کے ، ۳۴۹ — اول الکتاب ، ۳۵۰ — دوم ، السنہ ، ۳٦۱
— سوم ، اجتہاد ، ۳۸۰

مادہ پرستوں کا نقطۂ نظر ، ۲۸۴
مادیت ، فلسفہ ، ۷۷
مارکس ، ۸۳، ۸۴، ۸۹، ۹۰، ۹۲، ۹۳، ۹۴
مارگولس ، ۲٦۳
مباح ، ۳۴۷
متیٰ ، ٦۸
مجوسی ، ۲۵۷
محبت ، ۲۵۲-۲۵۳
محرکات ، اسلامی نظام اخلاق کے ، ۳۹۱
محمد بن قاسم ، ۳۴۷
محمد تغلق ، ۳۳۹
محمد شاہ ، ۳۴۲
محمود غزنوی ، ۳۳٦، ۳۴۷
مدینہ ، ۹۳، ۲۵٦، ۲٦۹، ۳٦۰، ۳۷۸، ۴۳۳، ۵۰۱
مذاہب کا تقابلی مطالعہ ، ٦۷
مذہب ، ۱۲ — اور تمدن ، ۲۳-۲۷
مذہب کی ضرورت کا مسئلہ ، ۳۲ — ایک بنیادی خلط مبحث ، ۳۵
مرتضیٰ ، علامہ سید ، ۳۵۹
مرقس ، ٦۸
مرود ، ۳۳۳
مریم (حضرت) ، ٦۲، ٦۴
مساکین ، ۳۲٦
مساوات ، ۳۹۷، ۴۱۱
مسجد ، اسلام کا معاشرتی پروگرام اور ، ۴۱۸
مسولینی ، ۸۸
مسیح علیہ السلام ، ٦۱-٦۷، ٦۸، ۲۲۳
مشرقی تقلید پسندی ، ٦۵
مصر ، ۵۹، ۱۴۲، ۳٦۱
مطاع ، نبی بہ حیثیت ، ۲۲۹
معاذ بن جبل ، ۳۸۱، ۴۳۴
معاشرتی ارتقا کا تصور ، ۸۳ — کے بنیادی اصول ، ۸۵

Marfat.com

معاشرتی اصلاح ، ۳۱۱
معاشرتی مساوات ، ۳۹۲
معاشی اصول ، اسلامی ، ۴۴۹
معاشی جدو جہد ، ۴۵۰
معاشیات اور اخلاق ز مذہب ، ۴۴۹
معروف، ۳۴۶ ، ۳۴۷، ۳۴۸ ، ۳۸۷
معزالدین غوری ، ۴۴۷
مغربی تہذیب کا مستقبل ، ۹۹
مقدونیہ ، ۲۵۴
مقریزی ، ۴۳۹
مقصد تعلیم ، ۴۲۸
مقصد حیات کی یاددہانی، اور نماز ، ۳۰۸
مقوقس ، ۳۷۸
مکمل ضابطۂ زندگی ، ۱۵۲
مکہ ، ۲۵۶، ۲۹۹، ۳۶۰، ۳۸۷
مل ، جان اسٹورٹ ، ۴۲۲
ملک شاہ سلجوق ، ۴۴۱
ملکیت و تصرف کا حق، اسلام میں، ۳۶۲
مناسک حج کی حکمتیں ، ۳۳۱
مناظر احسن گیلانی ، ۴۳۸
منصب رسالت، ۲۰۲-۲۰۸ ، ۲۲۷-۲۳۳
منصب نیابت کی حقیقت ، ۱۳۴
منکر ، ۳۴۶، ۳۴۷ - ۳۴۸، ۳۸۷
منوجی ، ۲۵۵
منیٰ ، ۳۳۱، ۳۷۵
موانع ، ۵۳۶
موسیٰ علیہ السلام ، ۵۲، ۵۹، ۶۰، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۲۲۱، ۲۲۳، ۲۵۶، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۷۱
موسیٰ ابن میمون ، ۶۰
مولفۃ القلوب ، ۳۲۶
مکروہ ، ۳۴۸
موئین جو دارو ، ۵۳
مہا بھارت ، ۵۴
مہایان ، ۵۷، ۵۸
میکاولی ، ۷۶، ۸۷
نبی ، نبوت — بشریت، ۲۲۲ — پیشوا اور نمونہ، تقلید ، ۲۳۱ — تعلیمات من جانب اللہ ، ۲۲۴ — شارح کتاب اللہ ، ۲۲۹— شارع اور قانون ساز ، عصمت، ۲۲۵، ۲۳۲ — قابل اطاعت، ۲۲۸ — قاضی اور حکیم، ۲۲۳ — معلم و مربی، ۲۳۰ — ہر قوم کے لیے ، ۲۲۶
نپولین ، ۲۵۴
نجاشی ، ۳۷۸
نجد ، ۳۶۰
ندوی ، مولانا سید ابوالحسن علی ، ۱۶
نصاریٰ ، ۵۲۹
نصب العین ، اسلامی، ۱۳۳، ۱۳۶
نظام الملک طوسی ، ۴۳۶، ۴۴۱
نظام تعلیم ، اسلام کا، ۴۱۹
نظریۂ اخلاق ، اسلامی ، ۳۸۷
نظریۂ ارتقا ، ۱۹۴، ۱۹۵
نظریۂ تعلیم ، اسلامی ، ۴۱۹
نظریۂ توحید ، ۴۱۲
نظریۂ حیات ، اسلامی ، ۱۵۰-۱۶۲
نظریۂ حیات ، مغربی ، ۵-۶
نظریۂ ریاست ، ۸-۱۰
نظریۂ قدر زائد ، اشتراکیت کا ، ۹۵
نکولاس میلیبرانش ، ۱۸ (حاشیہ)
نماز ، ۶۷، ۳۰۸، ۳۱۱، ۳۳۴ — اجتماعی فوائد ، ۳۱۱ - ۳۱۴ — تعمیر سیرت ، ۳۰۹
نمرود ، ۴۹، ۲۵۴
نوح علیہ السلام ، ۲۲۱، ۲۲۷، ۲۵۸، ۲۷۱
نیپال ، ۵۸
نیوٹن ، ۳۷، ۳۸
واجب ، ۳۴۷
والٹر لپ مین ، ۴۲۶
والٹر موبرلے ، ۴۲۶
والٹیر ، ۲۶۵

Marfat.com

وائٹ ہیڈ ، اے - این ، ۵۰، ۳۲۸
وجدان ، ۲۰-۲۱
وجود باریٰ تعالیٰ : ۱۸۸ — قرآن کا استدلال ، ۱۹۶
وحدت زندگی ، ۸
وحی ، ۲۱-۲۳ — خفی ، غیر متلو ، ۳۶۴
— کی حقانیت ، ۲۲
وشنو ، ۵۵
ولی اللہ ، شاہ ، ۳۴۲، ۳۷۳
ولیم ، میور ، ۳۶۰
وہب بن منبہ ، ۳۷۹
وہبیت ، ۲۲۳
وید ، ۵۴
وین ہارڈ ، جان ، ۹۸

ہٹلر ، ۸۷
ہڈسن شاہ ، مسٹر ، ۸۲
ہکسلے ، جولین ، ۳۷
ہمام بن منبہ ، ۳۷۹
ہندو ؛ ہندو مت ، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۸، ۵۸، ۶۷، ۶۹، ۱۰۴، ۲۲۷، ۲۵۷

ہندوستان ، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۲۵۷، ۳۳۹، ۳۸۴، ۵۰۸
ہندہ ، ۲۸۹
ہنیبال ، ۲۵۴
ہود علیہ السلام ، ۲۵۸
ہیرلڈ ، ایچ - ٹیٹس ، ۳۲۷
ہیگل ، ۳۴، ۸۳، ۸۴

یحییٰ علیہ السلام ، ۲۵۸
یروشلم ، ۶۰
یعقوب علیہ السلام ، ۵۸، ۵۹، ۲۵۸، ۱۷۱
یمامہ ، ۳۶۰
یمن ، ۲۷۷، ۳۶۰، ۳۶۱، ۵۰۱
یوحنا ، ۶۸
یورپ، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۶، ۷۸، ۸۰، ۳۵۴
یوسف علیہ السلام ، ۱۷۱؛ ۳۶۹
یوم آخر ، ۱۷۲
یونان ، ۲۵۴، ۳۲۰، ۳۸۵
یونس علیہ السلام ، ۲۷۱
یہود ؛ یہودی ؛ یہودیت ، ۵۱، ۵۲، ۵۸، ۶۱، ۶۸، ۶۹، ۲۲۶، ۳۷۸، ۵۲۹

ا
لو
لی
لیۃ
لیڈر
ماخ

Marfat.com

اسلامی نظریۂ حیات

مؤلفہ

خورشید احمد

شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ
جامعہ کراچی

Marfat.com